تمام گمراہیوں سے نجات کا

صرف ایک راستہ

(ساتواں ایڈیشن)

مصنفہ: عبدالکریم مشتاق

پیشکش

جماران پبلی کیشنز۔ لاہور

تقسیم کار

العمران بکڈپو۔ امامیہ مسجد حسنین روڈ نزد شباب چوک

سمن آباد۔ لاہور

دعاء سورۃ فاتحہ برائے

(مصنف کتاب)

عبدالکریم مشتاق مقتول ومرحوم

(الف)

سپاس گزاری

مصنف کتاب بارگاہِ خداوندی میں بصد عجز و انکسار سجدہ ریز ہے کہ اُسے اس کارِ سعید میں حصہ لینے کی توفیقات عطا ہوئیں اور منبعِ ہدایت "ثقلین" سے تمسک رکھنے کی نصیحت نصیب ہوئی۔ اس کارِ خیر میں جن جن احباب و اکابرین نے میری اعانت فرما کر حوصلہ افزائی کی ہیں اُن کا فرداً فرداً شکر گزار ہوں۔ خصوصاً مندرجہ ذیل حضرات کا ممنونِ احسان ہوں کہ جنھوں نے باوجود ناقابلِ فراموش مصروفیات کے اپنا دامنِ تعاون کشادہ رکھا اور تحریر کردہ شعبوں میں اپنی قیمتی آراء و پُرخلوص کاوشوں سے نوازا۔

١۔ اصلاح و نظرِ ثانی:۔ عالیجناب مولانا شیخ محمد علی پٹیالوی صاحب مدظلہ العالی لاہور۔

٢۔ معاونِ خصوصی:۔ جناب محمد یحییٰ خالد صاحب (بی۔اے) چونیاں ضلع لاہور (حال کراچی)

٣۔ قانونی مشاورت:۔ محترم جناب شیخ محمد اکرم صاحب ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔ ایڈوکیٹ کراچی۔

٤۔ مشاورت:۔ جناب حاجی شیخ ظہیر علی جاوا صاحب لاہور۔

٥۔ اعانتِ انتقال:۔ جناب محمد اسلم صاحب بی۔اے۔ کراچی۔

٦۔ مشاورت متعلقہ بجلی:۔ جناب فردوس خاں فردوسی صاحب۔ کراچی۔

٧۔ مشاورت طب:۔ جناب عبدالرشید صاحب کراچی۔

٨۔ امدادِ نقل:۔ جناب چوہدری لال خاں صاحب کراچی۔

٩۔ تعاونِ کتابت:۔ جناب سید تہذیب حسین نقوی امروہوی صاحب کراچی۔

١٠۔ اعانتِ نشر و اشاعت:۔ جناب اکبر ابنِ حسن صاحب۔ کراچی

سپاس گزار

عبدالکریم مشتاق

3/6/11/B ناظم آباد۔ کراچی ١٨

مآخذ

مؤلف حقیر تمام علمائے کرام، مصنفین عظام اور ناشران محترم کا تہ دل سے ممنون ہے کہ اس کتاب کی تدوین میں اُن کے علمی و قابلِ قدر شہ پاروں سے استفادہ حاصل کیا گیا۔ لہٰذا اُن کتابوں کی فہرست درج کر دی جاتی ہے تاکہ قارئین تحقیق مزید کے لئے استفادہ حاصل کر سکیں۔

۱۔ قرآن مجید، ۲۔ مواعظ حسنہ، ۳۔ فلسفۂ اسلام، ۴۔ لآلی مصنوعہ، ۵۔ اطراف ۶۔ صواعق محرقہ، ۷۔ خصائص کبریٰ، ۸۔ ترمذی شریف، ۹۔ سنن حاکم، ۱۰۔ سنن ابوداؤد ۱۱۔ سنن نسائی، ۱۲۔ صحیح بخاری، ۱۳۔ صحیح مسلم، ۱۴۔ موطا، ۱۵۔ مشکوٰۃ المصابیح، ۱۶۔ تحفہ اثناعشریہ، ۱۷۔ ینابیع المودۃ، ۱۸۔ ارجح المطالب، ۱۹۔ مناقب مرتضوی (کوکب دری) ۲۰۔ تفسیر در منثور، ۲۱۔ تفسیر ثعلبی، ۲۲۔ تفسیر حسینی، ۲۳۔ سفینۂ نوح، ۲۴۔ اوسط۔ ۲۵۔ ذکر حسین، ۲۶۔ تفسیر صافی، ۲۷۔ عیون اخبار رضا، ۲۸۔ کنز العمال، ۲۹۔ لسان المیزان ۳۰۔ جمع الجوامع، ۳۱۔ مسند احمد بن حنبل، ۳۲۔ حلیۃ الاولیاء، ۳۳۔ فردوس اخبار، ۳۴۔ مستدرک، ۳۵۔ خصائص نسائی، ۳۶۔ استیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ۳۷۔ انوار اللغت ۳۸۔ ازالۃ الخفاء، ۳۹۔ تاریخ الخلفا، ۴۰۔ شواہد النبوۃ، ۴۱۔ مفاتیح الجنان، ۴۲۔ حدیث مفضل، ۴۳۔ نہج البلاغہ، ۴۴۔ توحید الآئمہ، ۴۵۔ رسالہ ذہبیہ، ۴۶۔ اکابرین اسلام کا سائنسی شعور، ۴۷۔ تہذیب اسلام، ۴۸۔ حلیۃ المتقین، ۴۹۔ علم معاشیات، ۵۰۔ تاریخ الحسین نقد و تحلیل، ۵۱۔ الفاروق، ۵۲۔ مروج الذہب، ۵۳۔ سیرت امیر المومنین ۵۴۔ تاریخ اسلام، ۵۵۔ روضۃ المناظر، ۵۶۔ روضۃ النضرہ، ۵۷۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، ۵۸۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری، ۵۹۔ البلاغ المبین، ۶۰۔ اصول کافی، ۶۱۔ فروع کافی، ۶۲۔ یقین محکم، ۶۳۔ فلک النجاۃ، ۶۴۔ ثبوت خلافت، ۶۵۔ خلافت و

ملوکیت پر اعتراضات کا تجزیہ، ۶۷۔ حقیقتِ خلافت و ملوکیت، ۶۸۔ خلفائے راشدین
۶۹۔ خلافت معاویہ و یزید، ۷۰۔ جہادِ اسلامی، ۷۱۔ البدایہ والنہایہ، ۷۲۔ معراجِ انسانیت۔
۷۳۔ نظامِ ربوبیت، ۷۴۔ عروج و زوالِ اُمّت، ۷۵۔ نورِ ایمان، ۷۶۔ کرشمۂ قدرت
۷۷۔ ہمارے جانور، ۷۸۔ سیرۃ النبیؐ، ۷۹۔ مفتاح القرآن، ۸۰۔ ضمیمہ مولانا مقبول احمد،
۸۱۔ نور اور ذرۂ نور، ۸۲۔ رموزِ قرآن، ۸۳۔ سیرۃ فاطمۃ الزہراء، ۸۴۔ بائبل نیا و پرانا عہد نامہ
۸۵۔ التفریق والتحریف فی الاسلام، ۸۶۔ تحفۃ العوام، ۸۷۔ اثبات پردہ، ۸۸۔ بینات
۸۹۔ تاریخ حسن مجتبیٰ، ۹۰۔ رویتِ ہلال، ۹۱۔ صحیفہ کاملہ، ۹۲۔ بحار الانوار، ۹۳۔ مجمع البحرین
۹۴۔ جلاء العیون، ۹۵۔ غنیۃ الطالبین، ۹۶۔ کشف المحجوب، ۹۷۔ مدارج النبوۃ، ۹۸۔ تجدید
علوم، ۹۹۔ تفسیر قادری، ۱۰۰۔ مقام حدیث، ۱۰۱۔ الامامت والسیاسۃ، ۱۰۲۔ الملل والنحل
۱۰۳۔ ریاض النضرہ، ۱۰۴۔ سیرت نعمان، ۱۰۵۔ تاریخ کامل ابن اثیر، ۱۰۶۔ تاریخ طبری
۱۰۷۔ قیامتِ صغریٰ، ۱۰۸۔ حق خلافت، ۱۰۹۔ الصادق، ۱۱۰۔ تعلیمی جغرافیہ، ۱۱۱۔ علم حیاتیات
ایک نظر میں، ۱۱۲۔ رسالہ حسنیہ، ۱۱۳۔ علم نباتیات، ۱۱۴۔ حاشیات، ۱۱۵۔ اصابہ فی تمیز الاصحاب
۱۱۶۔ حقیقۃ الفقہ، ۱۱۷۔ فتاویٰ عالمگیری، ۱۱۸۔ فتنۃ الکبریٰ، ۱۱۹۔ تذکرہ، ۱۲۰۔ تاریخ خمیس
۱۲۱۔ تجدید و احیائے دین، ۱۲۲۔ فتاویٰ عزیزی، ۱۲۳۔ تیسیر الباری، ۱۲۴۔ شرح نووی۔
۱۲۵۔ ترجمہ قرآن مجید مولانا فرمان علی، ۱۲۶۔ ترجمہ قرآن مجید اشرف علی تھانوی، ۱۲۷۔ تاریخ
اعثم کوفی، ۱۲۸۔ مذہب اور زندگی، ۱۲۹۔ حیوٰۃ الحیوان، ۱۳۰۔ مناقب شہر آشوب، ۱۳۱۔ حقیقتِ بتول
۱۳۲۔ تہذیب، ۱۳۳۔ من لا یحضرہ الفقیہ، ۱۳۴۔ استبصار، ۱۳۵۔ آکسفورڈ ڈکشنری (انگریزی)
۱۳۶۔ پولیٹیکل سائنس (انگریزی)، ۱۳۷۔ اتقان، ۱۳۸۔ ایزی سوکس انگریزی، ۱۳۹۔ اسلام
کا نظریۂ ملکیت، ۱۴۰۔ صحابیت، ۱۴۱۔ ہماری شہزادیاں، ۱۴۲۔ ہسٹری آف محمڈن انگریزی
۱۴۳ ایسنشلز آف اکنامکس ۱۴۴۔ انسائیکلوپیڈیا، ۱۴۵۔ سیرت ہشام، ۱۴۶۔ تفسیر
موضح القرآن، ۱۴۷۔ چودہ ستارے، ۱۴۸۔ اسلام میں آزادی کا مفہوم، ۱۴۹۔ عائلی قوانین
۱۵۰۔ شرح سنت بغوی، ۱۵۱۔ گلزار شمس وغیرہ۔

فہرست

فصل اوّل

علم طب جراحی و حفظان صحت

جرّاحی

فصل دوم

علم اقتصادیات و معاشیات

فصلِ سوم

علمِ سیاسیات و قضایا

فصل چہارم

علم جغرافیہ و سیارگان

فصل ہفتم

علم حیوانات

فصل ہشتم

علم ریاضی (اعداد و ہندسیات)

فصل نہم

علم امور خانہ داری

فصل دہم

علم جفر و اسرار الحروف

حُکمِ رسولؐ

"صرف ایک راستہ"

"تحقیق میں تم لوگوں میں دو ایسی عالی قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم اُن کو پکڑے رکھو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ اِن دونوں میں سے ہر ایک دوسری سے بڑی چیز ہے۔

(۱) اللہ کی کتاب حبل ممدود ہے اور

(۲) میری عترت میرے اہلبیتؑ

خبردار (یاد رکھو) کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے کبھی جُدا نہ ہونگی۔ حتّٰی کہ حوض کوثر پر میرے پاس دونوں اکٹھی وارد ہوگی"۔
(متفق بین الفریقین)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ٥

اِنتساب

آج جبکہ میں اپنی اس کتاب "صرف ایک راستہ" کا آغاز تحریر کر رہا ہوں ۲۵ محرم الحرام ۱۳۹۵ھ ہے جو شہادتِ بیمارِ کربلا۔ اسیرِ کوفہ و شام سرکارِ سید الساجدین امام زین العابدین حضرت علی ابن الحسینؑ کی سیزدہ صد سالہ یادگارِ شہادت کا دن ہے۔ میں اپنی یہ ادنیٰ قلمی کوشش سرکارِ سجّاد علیہ السلام کی بارگاہِ لُطف و کرم و جُود میں پیش کرتا ہوں ؎

سجّادؑ اسیرِ جور ہوئے صد حیف کسی نے یہ نہ کہا
"یہ پاؤں سُتونِ کعبہ ہیں زنجیر کسے پہناتا ہے"

گدائے درِ حضرتِ سجّادؑ

عبد الکریم مشتاق

(بروز جمعہ ۷۔ فروری ۱۹۷۵ء)

مقصدِ تحریر

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اے بنی نوعِ انسان! بلا شک وشبہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے نصیحت آگئی جو لوگوں کی بیماریوں کی شفا اور مومنین کیلئے ہدایت ورحمت ہے" لیکن دورِ حاضر کا بحرِ ظلمت میں ڈوبا ہوا انسان، اس واضح اعلانِ الٰہی کی جانب توجہ ہی نہیں دیتا۔ نام نہاد مہذب و ترقی یافتہ طبقے نے ضرورتِ دین ومذہب ہی سے انکار کر دیا ہے۔ ایسے لوگ حیاتِ انسانی کو تین مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔
(۱) دورِ جہالت وخرافات (۲) دورِ مذہب (۳) دورِ علم وعرفان یعنی یہ لوگ دورِ مذہب کو علم وعرفان سے محروم قرار دیتے ہیں۔ ان منکرینِ مذہب نے بہت لوگوں کو دین ومذہب سے اس قدر بیزار بنا دیا ہے۔ کہ وہ مذہب کو "خرافات کی گٹھری" اور "سبب پسماندگی" سمجھنے لگے ہیں۔ مذہب کے بارے میں اس غلط مفروضے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اہلِ مذہب نے صرف چند عبادتوں (PRAYERS) کو ہی محورِ مذہب بنا لیا اور مذہب کو عبادت گاہوں تک ہی محدود کر دیا۔ اُمّتِ محمدیہؐ میں شریر منافقوں نے تفرقہ بازی کا ایسا زہریلا بیج بو دیا کہ جس کی وجہ سے وفاتِ رسولؐ ہوتے ہی اختلافات کی آگ بھڑک اٹھی اور اُس دن سے آج تک باہمی اختلافات کے سلسلے میں شدید نبرد آزمائیاں ہوتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ محاسنِ تعلیماتِ اسلام سے مستفیض نہ ہو سکے۔ اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم کے شاندار اسلامی اصولوں کو غلط سیاست اور اندھی عقیدت وتقلید کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ چنانچہ دشمنانِ اسلام کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملا۔ "اقوامِ عالم میں مسلمانوں کی پسماندگی وپستی و ذلت کا سبب اُن کا دین ہے۔" دوسری جانب اہلِ مذہب بالعموم یہ بات دہراتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کے زوال اور اُن کی ترقی میں پسماندگی کا سبب مذہب سے بیگانگی، بے علمی، بدکرداری، غداری اور تفرقہ بندی ہے لیکن معترضین کے لئے یہ جواب مبہم اور غیر تسلی بخش ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس جواب کو پوری وضاحت کے ساتھ مدلل طریقے سے پیش کیا جائے، اور یہ بھی بتایا جائے کہ مسلمانوں میں مذہب سے بیگانگی کیوں پھیلتی جا رہی ہے؟ آخر تفرقہ بازی کا مرض مسلم قوم

میں کیوں پیدا ہوا؟ عروج و ترقی کی راہ سے مُسلمان کیوں محروم ہو گئے؟ بے عملی و بدکرداری کی بیماریاں مسلمانوں میں کیوں پیدا ہوئیں؟ یہ سوالات فی زمانہ مُسلمانوں کے لئے نہایت اہم ہیں اور انہی سوالوں کا جواب پیش کرنا اس کتاب کا مقصدِ تحریر ہے۔

مجھے اس مُقام پر یہ کہنا ہے کہ مذہب سے بیگانگی و غداری، بے عملی و بدکرداری، تفرقہ بازی اور عروج و ترقی کی راہ سے محرومی یقیناً گمراہی کے نتیجے ہیں۔ اگر اُمّت ہر گمراہی سے محفوظ رہ جاتی تو اس اُمّت پر کبھی زوال نہ آتا۔ لہٰذا معلوم یہ کرنا چاہئے کہ آخر اُمّت میں گمراہی کیوں آئی؟

مُسلمانوں کے لئے مُقام غور و فکر ہے، کہ کیا رُسول خدا صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے اپنی اُمّت کو کوئی ایسا پیغام نہیں دیا تھا جس میں ہر گمراہی سے محفوظ رہنے کا طریقہ بتایا ہو؟ اگر یہ کہا جائے کہ حضورؐ نے ایسا کوئی پیغام نہیں دیا تو ایسی صُورت میں دینِ اسلام کی جامعیت و اکملیت کا دعوٰے بیکار ہو جائے گا لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ہاں ایسا پیغام دیا تھا۔ اور ہر گمراہی سے محفوظ رہنے کا طریقہ بتا دیا تھا تو ضروری ہو گا کہ وہ پیغام تلاش کیا جائے۔ اور معلوم کیا جائے کہ گمراہی سے محفوظ رہنے کا رُسولِ خدا نے کیا طریقہ بتایا تھا؟

کسی پیغام کی اہمیت و عظمت اُتنی ہی ہُوا کرتی ہے جتنا کہ مقصدِ پیغام اہم ہو۔ نیز یہ کہ پیغام دینے والا جتنی اہمیت و عظمت کا مالک ہو۔ اُتنا ہی اُس کا پیغام اہم و عظیم سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مُسلمانوں کے لئے خدا کے بعد حضرت محمد مُصطفٰےؐ ہی کی ذاتِ اقدس سَب سے زیادہ اہم و عظیم ہے۔ اس لئے بعد از خدا حضورؐ ہی کا پیغام سَب سے زیادہ اہم و عظیم ہے، بلکہ حق تو یہ ہے کہ حضورؐ وحی کے بغیر کلام ہی نہ فرماتے تھے۔ لہٰذا حضورؐ کا ہر حُکم اور ہر پیغام واجب التسلیم اور واجب التعمیل ہے۔ اور خاص طور سے وہ پیغام تو مسلمانوں میں انتہائی اہم و عظیم مانا جائے گا جس میں حضورؐ نے ہر گمراہی سے محفوظ رہنے کا طریقہ بتایا ہو، لہٰذا مُسلم قوم کے لیے حضورؐ کا یہ پیغام انتہائی اہم و عظیم ہے۔ جس میں آپؐ نے فرمایا:۔

"بلاشُبہ میں تم لوگوں میں دو گرانقدر (یعنی عالیشان) چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جو ایسی ہیں کہ اگر تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے (یعنی دونوں کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو گے) تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے (ہر گمراہی سے محفوظ رہو گے) وہ ہیں

اللہ کی کتاب (قرآن مجید) اور میری عترتؑ میرے اہلِ بیتؑ۔ نہ تو کبھی قرآن اہلِ بیتؑ سے جُدا ہو گا اور نہ کبھی اہلبیتؑ قرآن سے جُدا ہوں گے۔ حتیٰ کہ اسی طرح اکٹھے ہی میرے پاس حوضِ کوثر پر وارد ہو جائیں گے۔"

کتابِ ہٰذا میں اسی پیغامِ رسولؐ کی روشنی میں مجھے ثابت کرنا ہے، کہ قرآن مجید اور عترتِ اہلِ بیتؑ سے تمسک رکھنے ہی میں زوالِ اُمت کا مداوا ہے۔ اور تمسک بالثقلین ہی میں فلاحِ دُنیا و آخرت ہے۔ یہی راہ نجات ہے، اسی میں شفائے امراضِ اُمت ہے۔ یہی ہدایت و رحمت ہے۔ مسلم قوم کے لیے یہی راہِ عروج و ترقی ہے۔ یہی علاجِ تفرقہ بازی ہے۔

مُصنّف

دیباچہ

قرآن مجید کا سورۂ فاتحہ جو نمازِ پنجگانہ میں ضرور پڑھا جاتا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اللہ کے نام سے (شروع)، جو بڑا ہی مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ تمام شایانِ شان تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پرورش فرمانے والا، بڑا ہی مہربان، نہایت رحم والا، روزِ جزا کا حاکم ہے (اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی اعانت کے طلبگار ہیں۔ تو ہمیں سیدھی راہ کی (اور) ہدایت فرما ان کی راہ کی جن پر تو نے انعام خاص فرمایا۔ اُن کی راہ کی نہیں جن پر تیرا غضب ہوا۔ اور نہ ہی گمراہوں کی راہ کی۔"

اسی سورۂ فاتحہ سے قرآن شروع ہوتا ہے۔ اور قرآن مجید کا اختتام سورۃ النّاس پر ہوتا ہے۔ جس میں خدا کو پہلے رَبّ النّاس، اُس کے بعد مَلِکِ النّاس اور پھر اِلٰہ النّاس فرمایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عالمین کی پرورش کرنے والا ہی سلطنت و اقتدار کا حقیقی مالک ہے۔ جیسا کہ سورۂ فاتحہ کے مطابق قرآن مجید کی ابتدا حمدِ خدا سے ہوتی ہے۔ اور خدا لائقِ حمد ہے کیونکہ وہ تمام عالمین کا پروردگار ہے۔ یعنی مخلوقات کی پرورش کا ذمہ دار ہے۔ اور سورۃ النّاس کے مطابق اللہ ہی سلطنت و قوت و اقتدار کا حقیقی مالک ہے۔ کیونکہ رُبُوبیت کا مالک و ذمہ دار ہے۔

ہم اسی پروردگارِ عالمین، شہنشاہِ ازلی و اَبدی و سرمدی کے جاری فرمائے ہوئے نظامِ ربوبیت و سلطنت یعنی نظامِ قدرت (LAW OF NATURE) کی روشنی میں، یہ ثابت کریں گے کہ عصرِ حاضر کا ضلالت میں پھنسا ہوا انسان جو بحرِ ظلمات میں ڈوبا ہوا ہے اور ضرورتِ دین کا منکر ہے۔ اسے نجات و فلاح کے لیے بالآخر اسلام ہی کی چوکھٹ پر تسلیم و نیاز جھکانا پڑے گا۔ افسوس دُنیا اس امر سے ناآشنا ہے کہ اسلام کا مطمح نظر فلاحِ خلق ہے۔ جس سکون و اطمینان کے لیے انسان مارا مارا پھرتا ہے وہ اسلام ہی سے مل سکتا ہے۔ اسلام ہی میں تمام امراضِ انسانیت کا صحیح علاج موجود ہے۔ اسلام ہی میں شفائے دوام ہے:۔ اسلام نام ہے اس مکمل آزادی کا جو ہر اُس اقتدارِ اضی

کا خاتمہ کر دے، جو راہِ فلاح و خیر میں رکاوٹ بنے۔ منشورِ اسلام کے مطابق خوراک، لباس، علاج کی سہولت، رہائشی جگہ، بنی نوعِ انسان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ اسلام ہر اس قوت کا خاتمہ چاہتا ہے، جو انسانوں کی عزتِ نفس، غیرت و حیا و خودداری، آزادیٔ فکر اور جان و مال کی دشمن ہو۔ اسلام ہر ظلم کا خاتمہ چاہتا ہے، اور ذہنِ انسان کو تمام باطل قوتوں کی غلامی و پرستش سے ہٹا کر خدائے واحد کی عظمت کا تصوّر پیدا کرتا ہے۔ اسلام ہی وہ مذہبِ حرّیت ہے جو انسان کو اس کی اپنی خواہشاتِ نفسانی (ہوا و ہوس) تک کا غلام نہیں بننے دیتا۔ بلکہ اسلام تو کہتا ہے کہ حرّیتِ ضمیر کے لیے جان تک قربان کر دی جائے۔ انسان زندہ رہنے کی خواہش تک کا غلام نہ بنے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ خواہشِ زیست کے لیے حرّیتِ ضمیر کو قربان کر دے۔

سرکارِ سیّد الانبیاءؑ والمرسلینؐ، تاجدارِ ختمِ نبوت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا عظیم الشان اور نورِ ہدایت سے پُر پیغام "حدیثِ ثقلین"، ساری کائنات کے لیے ایک دعوتِ فکر ہے جس میں قرآن مجید اور عترتِ اہل بیتؑ رسالت سے تمسک رکھنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اسی تمسک سے اہلِ اسلام کو اپنے تمام مسائل کا حل مل سکتا ہے۔

رسولِ خدا کا فرضِ منصبی پیغام کو پہنچا دینا تھا۔ جو حضورؐ نے پورا کر دیا۔ اس کے بعد امّت کا فرض ہے کہ وہ حکمِ رسولؐ کو تسلیم کر کے ثقلین سے تمسک رکھے۔ تاکہ تمام گمراہیوں سے نجات حاصل کر سکے راہِ عروج و ترقی پر گامزن ہو سکے۔

حضرت رسولؐ خدا نے "حدیثِ ثقلین" میں مندرجہ ذیل امور بالوضاحت بیان فرمائے ہیں:۔

(۱) "میں تم میں دو گرانقدر (یعنی بڑی ہی قابلِ قدر اور عالی شان) چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، قرآن اور میرے عترت اہلبیتؑ (یعنی نسبی اہلبیتؑ: کیونکہ اہلبیتؑ رسالت عترت سے باہر نہیں اور عترت بغیر نسب کے نہیں)

(۲) "اگر تم قرآن حکیم اور میرے نسبی اہلبیتؑ کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو گے

تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے" (یعنی ہر گمراہی سے محفوظ رہو گے۔ لہٰذا راہِ عروج و ترقی سے نہ بھٹکو گے)۔

(۳) قرآن مجید اور میرے نسبی اہلبیتؑ ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے" (یعنی نسبی اہلبیتِ رسالت، قرآن کے عین مطابق حکم دیں گے۔ اُن کا ہر قول اور فعل روحِ تعلیماتِ قرآن کے بالکل مطابق ہوگا۔ ان کا علم علمِ قرآن ہوگا یعنی جتنا علم قرآن میں ہے وہ سب کا سب اہلِ بیتؑ کو حاصل ہے۔ اور وہ ہر قرآنی لفظ و حرف کے صحیح مفہوم کا علم رکھتے ہیں)

کتاب ہٰذا میں ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ اگر ہم پیغمبرِ خدا کے اس اہم پیغام پر عمل پیرا ہو جائیں تو دیگر اقوامِ عالم کے مقابلے میں ہمارا دقار زیادہ بلند ہو سکتا ہے۔ افسوس! آج ترقی یافتہ اقوامِ عالم کے مقابلے میں ہمارا معیارِ زندگی نہایت پست ہے۔ مادی ترقی کے ہر علمی و فنی و اقتصادی میدان میں ہماری حالت اطمینان سے خالی اور قابلِ رحم ہے۔ اس کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے مادی ترقی و خوشحالی کے سلسلے میں پیغمبرِ الٰہی کے بتلائے ہوئے دونوں رہبروں (قرآن و عترتِ اہلِ بیتؑ) کا دامن نہ پکڑا۔ یعنی اُن سے علومِ خوشحالی و ترقی کو حاصل کرنے کی جانب توجہ نہیں دی۔ ہم نے مندرجہ ذیل بارہ علوم کے بارے میں خاص طور سے معروضات پیش کئے ہیں۔

(۱) علمِ طب و جراحی و حفظانِ صحت (۲) علمِ اقتصادیات و معاشیات۔
(۳) علمِ سیاسیات و قضایا (۴) علمِ جغرافیہ و سیارگان (۵) علمِ جمادات۔
(۶) علمِ نباتات (۷) علمِ حیوانات (۸) علمِ حساب و اعداد و ہندسہ (۹) علمِ خانہ داری (۱۰) علمِ جفر و جامعہ

ہم نے اس سلسلے میں اہلِ بیتؑ کے ساتھ ساتھ اہلبیتؑ کے پیرو کاراکابرینِ اسلام کے علمی کارناموں کی بھی نشاندہی کی ہے اور ہمارا دعوےٰ ہے کہ اگر اُن آثارِ تحقیق و محنت سے کام لیا جائے تو مسلم قوم سربلندی حاصل کر سکتی ہے۔ کیونکہ حق ہمیشہ سربلند ہوتا ہے اور سرنگوں نہیں ہوتا۔

مطالعۂ کتاب ہٰذا سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ پیغمبرِ خدا کا

پیغام "حدیث ثقلین" ہر لحاظ سے واجب التسلیم ہے اور وہی کامیابی کا راستہ ہے حضورؐ کے بعد قرآن کے ہی جدا نہ ہونے والے ساتھی صرف وہی ہادیان برحق ہو سکتے ہیں جنکو اللہ نے ہادی مقرر فرمایا ہو اور وہ رسولؐ خدا کے نسبی اہلبیتؑ سے باہر نہیں ہو سکتے۔ کتاب ہذا میں ہم نے اہل بیتؑ اطہار کے جو علمی شاہکار پیش کئے ہیں اگر کسی دوسرے نے ایسے شاہکار چھوڑے ہوں یا اہلبیت پاک جیسے کارہائے نمایاں سرانجام دئیے ہوں تو اس شخص کا نام بتایا جائے اس کے وہ علمی شاہکار اور کارہائے نمایاں با ثبوت پیش کئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی اہلبیتؑ جیسا ہوا اور نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں آن اہل بیت اطہارؑ کی حقیقی معرفت اُن کی فرمانبرداری کی توفیق اور اُن کے علوم سے فیضیاب ہونے کی سعادت بخشے تاکہ ہم زوال و پستی سے نجات حاصل کرکے راہ ترقی و خوشحالی پر تمام اقوام عالم سے آگے ہو جائیں۔

محب اہلبیتؑ

عبدالکریم مشتاق

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ۔

سائنسی علوم کی روزافزوں ترقیوں نے جہاں نوعِ انسانی کی متعدد اجتماعی و اقتصادی گرہوں کو کھول کر نیز آرام و آسائش کا غیر معمولی سامان مہیا کر کے بشریت کی قابلِ قدر خدمت کی ہے۔ وہاں اس کے لیے بہت سی مشکلات بھی پیدا کر دی ہیں۔ عالمی جنگ اور ایٹمی تباہی کے شدید خطرات پیدا ہوگئے ہیں۔ ان مشکلات کا دائرہ اگر سائنسی علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا تو انسان اتنی بڑی تباہی سے دوچار ہو جائے گا کہ جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مشاہدہ گواہ ہے کہ ان پیدا شدہ مشکلات و خطرات کا موجودہ علمی و صنعتی ترقی کے ساتھ نہایت گہرا اور براہِ راست تعلق ہے۔ ان مشکلات کو حل کرنے کا واحد ذریعہ دامنِ دین کی پناہ گاہ ہے۔ ہم آئندہ اس ضمن میں روشنی ڈالیں گے کہ اسلام محض چند عبادات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ پورا "نظامِ ربوبیت" اور "اقتدار" دین ہی کے اہم شعبے ہیں۔ اور کسی بھی شعبۂ حیات کو دین سے جُدا سمجھنا تحریفِ دین ہے۔ راحت و سکون سے زندگی بسر کرنے کے لئے لازم ہے کہ دین کے بیان کردہ اُصولوں پر کاربند رہا جائے۔ موجودہ غیر اسلامی تہذیب و تمدن کے نقصان دہ پہلوؤں سے بچنے کا واحد علاج "اتباعِ دین" ہے۔

اگر "دین" کو دُنیا سے کوئی ماوراء شے تسلیم کر لیا جائے تو اس کی کوئی بھی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی اور مسلمانوں کی باہمی تفرقہ بازی کا ایک سبب یہ غلط نظریہ بھی ہے کہ دین اور دُنیا الگ الگ چیزیں ہیں۔ حالانکہ ابتدا ہی سے خلّاقِ عالم نے اس غلط تاویل کی بیخ کنی فرما دی۔ فرمایا کہ میں ہی عالمین کا رب ہوں" اقتدارِ اعلیٰ میرا ہی ہے اور خدا نے تفرقہ بازی سے بھی منع فرمایا ہے جیسا کہ پارہ ۲۵ سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ہے کہ "اللہ نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر فرمایا جس کا نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جس کی (اے رسولؐ) آپ کی جانب وحی کی اور جس کا ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ

کو حکم دیا تھا کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفریق نہ ڈالنا؟

لیکن افسوس مفاد پرستوں نے مسلمانوں میں تفرقہ بازی کا فتنہ پیدا کر کے یہ غلط نظریہ پھیلا دیا کہ دین و دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس کا اصل سبب ثقلین کو نظرانداز کرنا ہے قبل از اسلام دیگر مذاہب کا منتہائے نظر محض اخروی نجات تھا دنیا کے معاملات میں مذہب سے کوئی سروکار نہیں رکھا جاتا تھا لیکن اسلام نے اس غلط نظریہ کی مخالفت کی اور نظام حیات ارضی کو جزو دین بنا کر مکمل رہنمائی کر دی۔

مگر مسلمانوں نے عملاً خدا کے اس رہنما اصول کی پرواہ نہ کی۔ دین کو مسجد و منبر کے دائرے میں محدود کر دیا۔ اور خدا کے عطا کردہ ضابطہ حیات کے مطابق زندگی کے مسائل حل کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔ جس کے نتیجہ میں آج ہمیں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

اسلام کا یہ دعویٰ جیسے ہم سنتے اور پڑھتے رہے ہیں کہ یہ دین اکمل و جامع ہے۔ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ ہمیں تو اس دعوے کے سچا ہونے میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں لیکن غیر مسلم لوگ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آخر اس کا ثبوت کیا ہے؟ چنانچہ ہم اسی پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس دعوے کی صداقت کے بیّن ثبوت مہیا کریں گے اور ثابت کریں گے کہ علوم اسلامیہ ہمیشہ کے لیے باعث رشد و ہدایت ہیں۔

اسلام کے حقیقی راہبران (حضرت محمدؐ و آل محمد علیہم السلام) نے تمام علوم کے بارے میں آج سے صدیوں پہلے وہ اہم انکشافات کیے جنہیں آج کے مدبرین انتہائی ترقی کے مدارج پر پہنچ جانے کے باوجود بھی معلوم نہیں کر سکے ہیں۔ حضرت محمدؐ و آل محمدؐ کا یہی علم ان کی عظمت و حقانیت کو ثابت کرتا ہے۔ وہ حضرات جو ہر وقت مذہب کی مذمت اور اہل مغرب و اہل دہریت کی مدح کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں اگر اس "بحر علوم" کی طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھ لیتے تو وہ کبھی منکرین اسلام (اہل مغرب و اہل دہریت) کی ترقی سے ہرگز مرعوب نہ ہوتے۔ اہلبیتِ اطہار کی شانِ علم اتنی روشن ہے کہ اگر آفتاب و ماہتاب بھی ان کے سامنے آ جائیں تو شرمندہ ہو کر رہ جائیں۔

حقیقی علم کیا ہے؟

یوں تو کسی نامعلوم چیز کو جان لینے ہی کو علم کہا جاتا ہے مگر علم کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ علم ایک مقولۂ کیف ہے جو اپنے محل پر واضح ہو جائے یعنی ایک ایسی کیفیت جو ذہن میں صورت پذیر ہو کر اس کے آثار ظاہر میں منکشف ہو جائیں لیکن یہ کوئی مکمل وجامع تعریف نہیں۔ کیونکہ علوم ناقصہ والوں کی بنائی ہوئی تعریفات بھی ناقص ہیں۔ مثلاً "علم منطق" کی تعریف یہ بنائی گئی ہے کہ "علم منطق ایک آلۂ قانونیہ ہے کہ اگر اس کا لحاظ رکھا جائے تو انسان کا ذہن فکر میں خطا کرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے منطقیوں نے صرف مقدمات سے نتائج اخذ کرنے ہی میں نہیں بلکہ نفسِ ترتیبِ مقدمات میں بھی غلطیاں کی ہیں۔ حتیٰ کہ صدر الدین شیرازی جیسے حضرات بھی کئی ایسی شدید غلطیاں کر گئے ہیں جو منطق جاننے والوں سے مخفی نہیں۔ لہٰذا یہ علوم مثلِ صرف و نحو و منطق و فلسفہ وغیرہ کیونکر "حقیقی علم" کہلا سکتے ہیں۔ جبکہ ان کے حدود و تعریفات تک صحیح اور مکمل نہ ہوں۔ جہاں تک علم سائنس کا تعلق ہے۔ اس کے نظریات بھی بدلتے رہتے ہیں مثلاً پہلے تو سائنس کا یہ نظریہ تھا کہ ایٹم تقسیم نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب ایٹم "الیکٹرون" و "پروٹون" میں تقسیم ہو گیا تو پہلا نظریہ غلط قرار دیا گیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ علم سائنس کے نظریات میں سائنسدانوں نے بھی بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ لہٰذا جو غلطیوں سے محفوظ نہ ہوں ان علوم کو "علم حقیقی" کہنا غلط ہے۔ پس وہ علوم جنہیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے وہ اصل میں علوم خادمہ ہیں جو "علم حقیقی" کے حصول میں "معاون" تو کہلا سکتے ہیں "حقیقی علم" نہیں مانے جا سکتے۔ یہ علوم خادمہ صنعتوں اور حرفتوں کی مانند ہیں۔ جس طرح بعض لوگ اپنے بچوں کو دستکاری وغیرہ سکھاتے ہیں یہ "حقیقی علم" نہیں۔ اسی طرح محدثین و مفسرین نے بھی تفسیر و حدیث کی کتابوں میں غلط روایات و مفاہیم لکھ کر شدید غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ پس لوگوں کا سوچ کر یا تجربوں سے بنایا ہوا کوئی بھی علم علم حقیقی نہیں ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے علوم کو اگر حقائق واقعیہ کی روشنی میں پرکھا جائے تو ان کا بڑا حصہ باطل ثابت ہو گا۔ اسی لیے کسی ایک علم میں بھی کسی اکتسابی

علم رکھنے والے کو پورا کمال حاصل نہیں ہوتا اور وہ شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو کچھ میں معلوم کر چکا ہوں وہ اُس علم کا حرفِ آخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ماہرین اساتذہ کی غلطیاں ان کے شاگردوں نے پکڑی ہیں۔ اگر لوگوں کی قیاسی "فقہ" کو دیکھا جائے تو اس میں بھی شدید اختلافات پائے جاتے ہیں اور اُن قیاسی فقہا میں اختلافات موجود ہیں۔ لہذا ثابت ہوتا ہے کہ ان کے قیاسی علم فقہ میں بھی غلطیاں موجود ہیں۔ حقیقی علم تو وہی ہو سکتا ہے جس میں کوئی غلطی موجود ہونے کا امکان ہی نہ ہو۔ جو اختلافات و تفرقہ بازی کا مرض پیدا نہ کرے اور جس سے دُنیا و آخرت کی بھلائی حاصل ہو سکے۔ لہذا علم حقیقی وہی ہو سکتا ہے جو منجانب خدائے علیم و حکیم عطا ہوا ہو اور ایسے افراد سے حاصل کیا جائے جن کے غلطی کرنے کا امکان ہی نہ ہو۔ ایسے افراد معصوم عن الخطا ہوں گے۔ جن کو غلطی سے پاک رکھنے کا اللہ نے خود ذمہ لیا ہو اور اُس کا اعلان فرمایا ہو۔ پس اہلِ بیتؑ اطہار یقیناً ایسے ہی ہیں کیونکہ ان کی طہارتِ کاملہ کا اعلان اللہ نے قرآن مجید کی آیتِ تطہیر میں کیا ہے۔

اقسامِ علمِ حقیقی

(۱) علم ذاتی سرمدی (۲) علم وہبی امری (۳) علم اکتسابی (۴) علم بدیہیات فطری۔ چاروں کا فرق یوں ہے:۔

علمِ ذاتی سرمدی سرمدی اس کو کہتے ہیں جو ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا یعنی ازلی بھی ہے اور ابدی بھی۔ اور وہ صرف اللہ کی ذات واجب الوجود ہے۔ اللہ کے صفات عین ذات ہیں۔ لہذا اس کا علم عینِ ذات ہے۔ زائد از ذات نہیں۔ یعنی اس کی ذات اور اس کا علم دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ خداوند عالمین کی ذات ظرفِ علم نہیں کہ علم اس کا مظروف ہو بلکہ ذاتِ خدا خود علم ہے۔ خدا ذات و صفات کا مرکب نہیں۔ بلکہ اس کے صفات عین ذات ہیں۔ اور اسنے علم کسی سے نہیں لیا بلکہ اس کا ذاتی ہے۔ پس علم ذاتی سرمدی صرف اللہ سبحانہٗ کا ہے اور کسی کا نہیں۔

علم وہبی امری | یہ وہ علم ہے جو خدا نے اپنے مقرر کردہ ہادیان برحق کو اپنے امرِ خاص سے عطا فرمایا ہے۔ یہ علم اکتسابی نہیں لیکن یہ علم جس جس کو عطا ہوا اس کی ذات اور علم دو الگ الگ چیزیں ہیں، یعنی علم زائد از ذات ہے، عینِ ذات نہیں۔ نہ تو وہ ہادیان برحق سرمدی ہیں اور نہ ہی ان کا علم سرمدی ہے۔ کیونکہ وہ خدا نہیں، خدا کے شریک نہیں بلکہ خدا کے مخلوق ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ نے اپنی ذات کو "علیم" کہا ہے۔ لیکن وہ کسی کا بنایا ہوا علیم نہیں۔ بلکہ اس کی ذات ہمیشہ ہی سے خود علیم ہے۔ قرآن مجید میں اللہ کے مقرر کئے ہوئے ہادیوں کو بھی "علیم" کہا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ یوسفؑ میں حضرت یوسفؑ کیلئے لفظِ "علیم" آیا ہے سورہ ذاریات اور سورۂ حجر میں حضرت اسحٰقؑ کے لیے موجود ہے۔ لیکن یہ ہادیانِ برحق، خدا کے بنائے ہوئے علیم ہیں۔

قرآن مجید سے علم وہبی کی مثال | قرآن مجید میں قصۂ آدمؑ بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو مٹی سے بنایا اور پھر اس میں اپنی ایک خاص روح پھونک دی اور تمام اسماء کا علم فرما دیا۔ یعنی ذریعۂ علم وہ روحِ خاص تھی یا امرِ الٰہی تھا۔

حضرت خضر کی مثال | قرآن مجید کے سورۂ کہف میں حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ارشادِ قدرت موجود ہے کہ "اس کو ہم نے اپنے پاس سے علم سکھایا تھا" پس یہ علمِ خضر اکتسابی نہ تھا بلکہ خدا کا عطا فرمایا ہوا تھا یعنی وہبی تھا اور ذریعہ علم امرِ خدا تھا یا روحِ خاص تھی جو عام لوگوں کے لیے نہیں بلکہ ہادیانِ برحق کے لیے مخصوص ہے۔

علم اکتسابی | یہ علم وہبی امری نہیں ہوتا۔ بلکہ جو لوگ علم وہبی امری سے محروم ہیں اُن کو اکتساب سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہبی علم سے محروم افراد اس امر کے محتاج ہیں کہ وہ علمِ حقیقی وہبی امری کو اُن ہستیوں سے حاصل کریں جنھیں اللہ نے علم وہبی دے کر ہادیانِ خلق مقرر فرمایا ہے۔ حصول علم اکتسابی کیلئے عوام الناس

کو اللہ نے کان، آنکھ اور دل عطا فرمائے ہیں جیسا کہ سورۂ نحل میں ارشاد ہے کہ "خدا ہی نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے نکالا جب کہ تم کوئی چیز نہ جانتے تھے اور تم کو کان دیئے، آنکھیں عطا کیں اور دل عنایت فرمائے تاکہ تم شکر ادا کرو۔" سورۂ نحل کے اس ارشاد الہٰی میں کانوں کو آنکھوں سے مقدم رکھا گیا ہے۔ یہ اس امر کی جانب اشارہ ہے کہ اوّل آلۂ اکتساب علم "کان" ہے۔ اور پھر آنکھیں اور یہ امر ظاہر ہے کہ اندھا بھی تعلیم حاصل کر سکتا ہے لیکن مادر زاد بہرہ تعلیم نہیں پا سکتا مگر بہت ہی خفیف اور کم۔

علم بدیہیات فطری

یہ علم فطری طور سے ہر شخص کو عطا ہوا ہے جیسا کہ ضروری بدیہی امور کو ہر شخص جانتا ہے مثلاً ہر کوئی جانتا ہے کہ صداقت اچھی چیز ہے، اور جھوٹ برا ہے یا یہ کہ دودھ سفید ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہیں امور کو مستقلات عقلیہ کہتے ہیں۔ اسی علم کے متعلق اللہ نے قرآن مجید کے سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا ہے کہ "تم لوگوں کو علم نہیں دیا گیا مگر قلیل" اگر خدا انسان کو فطری علم نہ دیتا تو انسان اکتساب علم کے قابل ہی نہ ہوتا۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ذات صمد وغنی کسی سے علم حاصل کرنے کی نہ کبھی محتاج تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ہادیان برحق علم وہبی حاصل کرنے میں خدا کے محتاج تھے۔ اسی طرح عوام الناس اکتساب علم کے لیے اُن ہستیوں کے محتاج ہیں جن کو اللہ نے علم حقیقی وہبی امری عطا فرما کر ہادیان خلق مقرر فرمایا ہے۔

اُن ہادیان برحق میں فرق مراتب یقیناً ہے جیسا کہ قرآن مجید کے سورۂ یوسفؑ میں اللہ نے فرمایا کہ "صاحب علم سے بڑھ کر ایک اور عالم ہے" اور سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے کہ "اُن میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے" لہٰذا فرق فضیلت اور فرق مراتب کے مطابق ہادیان برحق کے علم وہبی میں بھی کم اور زیادہ کا فرق ہے۔ اللہ نے ہر نبی اور ہر وصی کو اتنا ہی علم وہبی بخشا جتنا کہ اس نبی کا دائرۂ تبلیغ تھا۔ جتنا زمان و مکان کی ضرورت و مصلحت کے مطابق چاہیے تھا اور جیسی جس ہادی کی شان تھی اُسے ویسا ہی علم عطا فرمایا پس وہبی علم والے ہادیان برحق میں سے جس کے پاس

جو علم نہ ہو وہ اس دوسرے سے اکتساب کرسکتا ہے جس کے پاس وہ علم ہو۔ اسی لیے پروردگار عالمین نے حضرت موسیٰؑ کو حضرت خضرؑ سے اکتساب علم خاص کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور دُنیا سے پہلے جتنے انبیاء گزرے ان کی شان یہ تھی کہ کوئی ایک خاندان کا نبی تھا۔ کوئی ایک بستی کا نبی تھا۔ کوئی ایک شہر کا یا ایک قوم کا نبی تھا۔ کوئی صرف انسانوں کا نبی تھا۔ اسلئے اُنکے دائرہ تبلیغ و نبوت کیمطابق ہی انکو علم دیا گیا لیکن حضرت محمد مصطفیٰ تمام عالمین کے نبی و رسول ہیں انکا علم بھی اُنکے دائرہ نبوت و رسالت کی زیادہ وسعت کے مطابق تمام انبیاء و مرسلینؑ سے زیادہ وسیع ہے۔ اسی وجہ سے اللہ نے حضورؐ ہی کو سید الانبیاءؑ و المرسلینؑ بنایا۔ اور حضورؐ ہی کو مُصدقُ الانبیاءؑ و المرسلینؑ بنایا۔ تمام دیگر انبیاءؑ و مرسلینؑ کو حضورؐ کا اُمتی بنایا۔ پس حضورؐ کے پاس تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ کے علوم کلی موجود ہیں اور اُن سے زیادہ بھی۔ لہٰذا دیگر تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ حضورؐ سے اکتساب علم کرنے کے محتاج ہوئے۔

چونکہ حضورؐ کو تمام عالمین پر گواہ قرار دیا گیا ہے۔ اسلئے آپؐ تمام عالمین کے احوال اور تمام مخلوقات کے افعال و اعمال سے باخبر ہیں۔ عالمین کی کسی بات سے بے خبر نہیں۔ عالمین کے رسولؐ ہیں اور عالمین کے شاہد و بشیر و نذیر تبھی کہلا سکتے ہیں جب کہ تمام عالمین پر حاضر و ناظر ہوں۔ اللہ نے اسی لیے حضورؐ کو "شہید" کہا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے سورہ نساء میں اللہ نے فرمایا ہے کہ "اس وقت کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت سے گواہ طلب کریں گے اور (اے رسولؐ!) آپؐ کو اُن سب پر گواہ کی حیثیت سے طلب کریں گے" ظاہر ہے کہ بغیر دیکھے گواہی مقبول نہیں ہوا کرتی۔ اسی لیے جہاں قرآن مجید میں آپؐ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ آپؐ جانب طور یا جانب غربی موجود نہ تھے تو وہاں جسم ظاہری سے موجود ہونا مُراد ہے۔ اسی طرح جہاں قرآن مجید میں کسی بات کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ آپؐ اُسے نہیں جانتے تھے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے علم عطا فرمائے بغیر آپؐ نہیں جانتے تھے لیکن یہ بات ظہورِ دُنیا کے بعد سے متعلق نہیں بلکہ اس وقت سے متعلق ہے جب نورِ محمدیؐ

کے سوا کچھ نہ تھا یعنی جب اس نوری عالم میں خدا نے حضورؐ کو علم وہبی عطا فرمایا اس سے بیشتر حضورؐ نہیں جانتے تھے کیونکہ حضورؐ اس عالم نور میں خدا کے شریک نہ تھے بلکہ مخلوق تھے۔ لہٰذا آپ کا علم اللہ کی طرح ازلی نہیں بلکہ اللہ کا عطا فرمایا ہوا ہے۔ حضورؐ "علیم" ہیں مگر بغیر تعلیمِ الٰہی خود ہی "علیم" نہیں بن گئے بلکہ حضور کا علم بھی تعلیمِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔

جہاں تک اِس سوال کا تعلّق ہے کہ "حضور کا علم کتنا ہے؟ اس کا جواب قرآن مجید کے سورۃ نساء میں اللہ نے ان الفاظ میں دیا ہے وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ "یعنی "جو کچھ آپؐ نہ جانتے تھے وہ سب کچھ آپؐ کو سکھا دیا" لہٰذا حضورؐ کا علم تمام عالمین پر حاوی ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضورؐ علیم علم اوّلین و آخرین عالمین ہیں۔ یہ سب علم عطیۂ الٰہی ہے۔ پس حضورؐ کے بعد حضورؐ کا جانشین وہی ہو سکتا ہے جو حضور کے علم کا وارث ہو یعنی جو علیم علم اوّلین و آخرین عالمین ہو۔ حضور کے بعد مسندِ ہدایتِ عالمین پر بیٹھنے کا حق اُسی کو حاصل ہے۔ حضورؐ کے بعد ایسے علیم کا وجود ہر زمانے میں ضروری ہے کیونکہ جب تک اُمّت کو احتیاجِ اکتسابِ علم وہدایت ہے ایسے "علیم" ہادی کا وجود نہایت ضروری ہے۔

پس جو علم غیب عالمین سے تعلق رکھتا ہے حضورؐ اُس کے بھی "علیم" ہیں۔ مگر یہ علم غیب بھی اللہ کا عطا فرمایا ہوا ہے۔ قرآن شاہد ہے کہ اللہ نے اپنے مجتبیٰ رسُولوں کو علم غیب عطا فرمایا ہے۔ جیسا کہ سورۃ آلِ عمران میں ارشادِ الٰہی ہے کہ "اللہ ایسا نہیں کہ تم عام لوگوں کو غیب سے مطلع فرمائے لیکن اللہ (اس کے لیے) اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے مجتبیٰ کر لیتا ہے" (یعنی علم غیب سے مطلع کرنے کے لیے چُن لیتا ہے) پس چونکہ حضرت محمد مصطفےٰؐ اللہ کے سب سے بڑے مجتبیٰ رسولؐ ہیں اس لئے اللہ نے انہیں عالمین سے تعلق رکھنے والا علم غیب یقیناً عطا فرمایا ہے۔ صرف پروردگارِ عالمین کی کُنہ ذات کا علم غیب ایسا ہے جو اللہ ہی کی ذات سے مخصوص ہے کیونکہ اُس تک

رسائی کی صلاحیت کسی مخلوق کو حاصل ہونا ممکن ہی نہیں اسی لیے رسولِ خدا کو بارگاہِ الٰہی میں عرض کرنا پڑا کہ (اے مالک!) جتنا تیری معرفت کا حق تھا اُتنا تجھے ہم نے نہیں پہچانا" یعنی تیری کُنہ ذات کے ہم بھی عالم نہیں ہوئے۔ یہی وہ علم غیب ہے جس کی عالم صرف ذاتِ خدائے علیم و حکیم ہے۔

دو جنبے وہی علم والے ہادیانِ برحق حججُ اللہ ہیں۔ ہر حجّت خدا میں دو جنبے ہوتے ہیں۔ ایک جنبہ جسمانی اور دوسرا جنبہ روحانی ہوتا ہے جیسے خداوند تعالےٰ نے "نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ" فرماکر واضح کر دیا ہے جس کے مطابق روحِ آدم علیہ السّلام روحِ خاص ہے۔ جو روحِ نوری علمی ہے۔ جو عوام الناس کو حاصل نہیں خدا کے مقرر کردہ تمام ہادیانِ برحق (انبیاءؑ و مرسلینؑ و آئمہؑ) کو اسی طرح روحِ خاص عطا ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ شکمِ مادر ہی سے "علیم" پیدا ہوئے ہیں حضورؐ کی روح سب سے زیادہ علیم ہے۔ لہٰذا حضورؐ دُنیا میں علیم ہی پیدا ہوئے اور تمام مخلوقات سے زیادہ عالم ہیں۔

درجاتِ علم وہ علوم جو علیم مطلق پروردگار سے بذریعہ تعلیم روحانی پہنچے ہیں اُنکے بھی مختلف درجات ہیں۔ ہر پیغمبر کا علم حسبِ ضروریاتِ زمان و مکان اور مطابقِ مصالح دوسروں کے علم سے مختلف بھی رہا ہے۔ خلقتِ آدمؑ سے علم درجہ بدرجہ ترقی کرتا رہا۔ اس لحاظ سے انبیاء کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ ہر جماعت (درجے) کے لئے کورس علیحدہ ہوتا ہے یعنی جو نصاب (کورس) درجہ دوم (جماعت دوم) کے لئے ہوتا ہے وہ پہلی جماعت کے لئے نہیں ہوسکتا کیونکہ درجہ اوّل (پہلی جماعت) کے طالبِ علم اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تاوقتیکہ وہ پہلی جماعت کا نصاب نہ پڑھ لیں اگرچہ ہر جماعت کا نصاب اپنی جگہ پورا ہوتا ہے نیز ہر درجہ کے لئے معلّم بھی ویسی ہی قابلیت اور استعدادِ علمی کے مقرر کئے جاتے ہیں۔ پہلی جماعت کا معلّم میٹرک کے طالبِ علم کو نہیں پڑھا سکتا۔ لیکن اس کے برعکس جو بڑی جماعت کا معلّم ہوگا وہ چھوٹی جماعت کو بخوبی و بطریقِ احسن پڑھا سکے گا پس جب تعلیم کا آخری درجہ آجائے تو اُس درجہ کا معلّم ایسا ہونا چاہیے جو تمام سابقہ درجات (گذشتہ

جماعتوں) کے علوم پر مکمل دسترس اور عبور رکھتا ہو پس اسی مثال کے مطابق ابتدائی درجہ کے معلم حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم اسماوی چیزوں کے نام بتلاتے جس طرح پہلی جماعت یا درجۂ اوّل کے طالب علم کو تصاویر کے ذریعہ سے اشیاء کے نام پڑھائے جاتے ہیں اور حروف تہجی لکھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں۔ اگرچہ آدم کو علم الاسماء مع مفہوم و مصادیق عطا ہوا لیکن اس علم الاسماء میں تمام حقائق و بواطن جمع نہیں تھے کیونکہ یہ علم کی پہلی منزل تھی اور ابتدائی دور کے لوگ تمام حقائق و بواطن کو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ حضرت آدمؑ کے مقابلے میں ملائکہ کا امتحان ہوا جس کا قصہ قرآن مجید میں موجود ہے جس میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ نے ملائکہ سے فرمایا کہ اگر تم اپنے استحقاقِ خلافت کے دعوے میں سچے ہو تو مجھے "ان" کے نام بتاؤ اور ظاہر ہے کہ لفظ "ان" (یعنی ھٰؤُلاءِ) حاضر و موجود چیزوں کے لئے (جمع کا) اسم اشارہ ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وقت امتحان "ھٰؤُلاءِ" کے مصادیق کا محض لفظی وجود نہ تھا بلکہ وہ اپنے وجودِ اصلی کے ساتھ موجود و حاضر تھے۔ اور اُن کی صورتیں تھیں جن میں پہچان کے لئے امتیاز بھی موجود تھا۔ جبھی تو خدا نے کہا کہ "اُن کے نام بتاؤ"۔

آدمؑ کے بعد زمانہ نوحؑ میں نصاب علم میں ترقی ہوئی۔ اور شریعت کے احکام خاص نافذ کئے گئے۔ پس نوح علیہ السلام کا علم اُن کی اپنی شان کا تھا۔ پس اسی طرح حضرت ابراہیم خلیل خدا تشریف لائے تو اُن کو حقائق اشیاء کا علم خاص دیا گیا۔ اور ملکوت سموات و ارض دکھا کر درجات نبوت و رسالت و خلت کے بعد درجۂ امامت عطا فرمایا گیا۔ اور اُن کو یہ شان عطا فرمائی کہ امامت کو قیامت تک کے لئے انہیں کی اولاد میں منحصر و محدود قرار دیدیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ امامت ظالموں (یعنی گنہگاروں، مشرکوں، کافروں اور منافقوں کو نہیں ملے گی) کو نہیں ملے گی۔ اور قرآن مجید میں حضرت خلیل خدا، ابراہیم علیہ السلام کی قوت روحانیہ امامیہ کو یوں ظاہر فرمایا ہے کہ اللہ نے ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ "لوگوں کو حج کے لئے پکار تو تیرے پاس پیدل چلتے اور اونٹوں پر سوار ہو کر دُور دُور سے چلے آئیں"۔ تفاسیر سے ثابت ہوتا ہے کہ جب ابراہیمؑ

خلیل اللہ نے آواز دی تو اس آوازِ خلیلؑ کو اُن تک نے سُنا جو صُلبوں میں تھے۔ پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ اور جنہوں نے لبیک کہا انہیں حج نصیب ہو جاتا ہے اور آج بھی "لبیک" کی صدا بلند ہو رہی ہے۔ اسی طرح علم نبوت و رسالت ترقی کرتے رہے اور آخر وہ منزلِ کمال آئی جو مقام ختمِ نبوت ہے حضورؐ آخری نبی و رسول ہیں۔ اور تمام انبیائؑ و مُرسلین و آئمہ طاہرینؑ کے سردار ہیں۔ حضورؐ کی شریعت تمام شریعتوں سے زیادہ اعلیٰ، قیامت تک کے لئے نافذ، ناقابلِ ترمیم و اضافہ مکمل و جامع اور آخری شریعت ہے جس کے آجانے کے بعد گزشتہ تمام شریعتیں منسوخ ہوگئیں۔ کسی نئے نبی یا کسی نئے رسول اور کسی نئی شریعت کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ کیونکہ حضورؐ پر دین بالکل مکمل ہوگیا جس میں تمام انسانی مسائل کا حل موجود ہے۔ اور تمام علوم کے خزانے بھی ہیں۔ لیکن وہ حل اور خزانے تبھی حاصل ہو سکتے ہیں جب مسلم قوم حضورؐ کے پیغام "حدیثِ ثقلین" کے مطابق قرآن مجید اور وارثانِ علمِ رسولؐ، عترت اہلِ بیتِ رسالت سے رہنمائی حاصل کریں۔ اور انہیں اپنے ہادی تسلیم کریں کیونکہ وہ حضرت ابراہیمؑ سے بھی اعلیٰ ترین درجے کی امامت پر فائز ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس رسُولِ خدا کا تمام علم موجود ہے۔ اور وہ علم رسولؐ کے وارثانِ حقیقی ہیں۔ ہر ظلم و گناہ سے پاک اور غلطی کرنے سے قطعاً محفوظ ہیں۔ اور قیامت تک کی ضروریاتِ انسانی سے باخبر ہیں۔ اُن کی امامت حضرت ابراہیمؑ کی امامت سے اس لئے اعلیٰ ہے کہ ابراہیمؑ کو قرآن مجید میں اللہ نے "للناس اماما" یعنی صرف انسانوں کا امام قرار دیا ہے جبکہ آئمہ اہلبیتؑ عالمین کے رسُول کی نیابت پر فائز ہونے کی وجہ سے تمام عالمین کے امام ہیں۔ اسی لئے رسُولؐ خدا نے صرف انسانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام عالمین کے لئے فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں (خواہ وہ انسان ہو، جن ہو، ملک ہو یا نبی و رسول ہو یا ابراہیمؑ جیسا امام ہو) اس اس کے علیؑ مولا ہیں۔ یعنی ولایت و امامتِ علیؑ کا دائرہ ابراہیمؑ کی طرح صرف انسانوں تک محدود نہیں ہے۔ اسی طرح آئمہ اہلبیتؑ کے آخری امام حضرت مہدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اقتدا میں حضرت عیسیٰؑ کا نماز پڑھنا

حضور کی احادیث سے معلوم ہے جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ آئمہ اہلبیتؑ (سوائے رسولؐ خدا کے) انبیاؑ کے بھی امام ہیں۔

باوجود اس کے کہ مسلمانوں کا دین سب ادیان سے اعلیٰ و اکمل ہے۔ اور پیغمبر اسلام تمام انبیاء و اصفیا کے سردار ہیں، مسلمان قعرِ مذلت میں گرے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ عامتہ المسلمین نے پیغمبر اسلام کے فرمانِ تمسک بالثقلین کی بجائے قیاس کو اپنا رہنما خود ہی بنا لیا یا صرف ایک ثقل قرآن مجید کو کافی کہکر علیم و حکیم رسولؐ کی شدید مخالفت کا ارتکاب کیا حالانکہ عقلی و فطری لحاظ سے اکیلی کتاب بلا معلّم کے کبھی کافی نہیں ہو سکتی حالانکہ معلم کتاب بغیر کتاب کے بھی سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے پر حاوی ہوتا ہے اس واضح حقیقت کے خلاف صرف کتاب کو کافی سمجھنا محض ہٹ دھری ہے۔ اگر کتاب اللہ بغیر معلّم کتاب کے کافی ہوتی تو خدا قرآن کے ساتھ رسولؐ خدا کو کیوں بھیجتا؟ حقیقت یہ ہے کہ رسولؐ خدا خود قرآن ناطق ہیں۔ اور اسی طرح حضرت علیؑ نے فرمایا کہ "میں قرآن ناطق ہوں" (تاریخ الخلفا جلال الدین سیوطی)۔

اور جن لوگوں نے فرمانِ حدیثِ ثقلین کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اُن پر ظالم حکومتوں اور تفرقہ باز فسادی عناصر نے مظالم کے ایسے پہاڑ توڑے کہ وہ اہلبیت اطہارؑ کے علوم کو نہ تو پھیلا سکے اور نہ ہی اُن پر تحقیق و محنت کرنے کے مواقع اُن کو میسر آسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم قوم تعلیماتِ عترتِ رسولؐ سے فیضیاب نہ ہو سکی۔ اور راہِ عروج وسعادت و ترقی سے ہٹ کر قعرِ مذلت میں گر پڑی لیکن متبعین اہلبیتؑ میں سخت آلام اور شدید مصائب کے باوجود ایسے علمائے بے بدل پیدا ہوئے جن کی نظیر دنیا کے کسی گروہ میں نہیں ملتی۔ کتاب ہٰذا کے آئندہ صفحات میں اس کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ سرکار رسالت مآبؐ کی ذات علیم و حکیم نے جن ثقلین سے تمسک رکھنے کی ہمیں تاکید فرمائی ہے انکے بارے میں اب ہم ان دونوں ہی کی شان اور ارشادات سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ تاجدارِ ختم نبوت کے فرمان کے مطابق فی الحقیقت ایسے ہی ہیں کہ اگر ان دونوں سے تمسک رکھا جائے تو تمسک رکھنے والا ہر گمراہی سے یقیناً محفوظ رہتا ہے۔ دونوں ثقل کیسے ہیں؟ ذرا ملاحظہ فرمایئے۔

ثقلِ اوّل قرآنِ مجید کی شان

سورۂ واقعہ میں ارشادِ رب العزت ہے "بیشک وہ قرآن ہے بہت عزت والا۔ پوشیدہ کتاب میں (لکھا ہوا) ہے۔ اس کو نہیں چھوتے مگر وہ جو مطہر ہیں۔ اس کی تنزیل تمام عالمین کے پروردگار کی جانب سے ہے"

سورۂ واقعہ کے اس ارشاد میں "لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ" جملہ خبریہ ہے جیسا کہ "یمسہ" مضارع ہے صیغۂ امر نہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا یہ نہیں فرما رہا کہ جب تک تم پاک نہ ہو اس کو مت چھوؤ۔ بلکہ مفہوم آیت یہ ہے کہ جو قرآن کریم ایک خاص پوشیدہ کتاب میں ہے (نہ کہ ظاہر کتاب میں) اس کو طہارت (ظاہری و باطنی) سے محروم لوگ چھوتے ہی نہیں یعنی چھو سکتے ہی نہیں۔ خواہ کتنی ہی کوشش کریں۔ لیکن جہاں تک کتاب ظاہر والے قرآن کا تعلق ہے اس کو غیر مسلم تک چھو لیتے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ سورہ واقعہ کی منقولہ آیت مقدسہ میں قرآن کریم سے مراد قرآن کا وہ حقیقی علم ہے جو لوح محفوظ میں یا قلبِ رسالت مآب میں ہے۔ پس جب تک طہارت (ظاہری و باطنی) حاصل نہ ہو جائے اس علم اور اس کے فیوض تک رسائی ممکن نہیں۔ لہٰذا کتابِ ظاہری والا قرآن اکیلا کافی نہیں بلکہ تزکیہ کرنے والے رسولؐ کی بھی ضرورت تھی۔ جو منزل طہارت تک پہنچا سکتے تھے اور رسولِ خدا کے بعد ہر زمانہ میں ایک ایسے ہی تزکیہ کرنے والے کی یقیناً ضرورت ہے جو مطہر بنا سکے۔ اور ایسے افراد وہی ہو سکتے ہیں جن کو خود طہارتِ کاملہ حاصل ہو۔ اور وہ از روئے آیۂ تطہیر اہل بیتؑ ہی ہیں۔ اسی لئے رسولِ کریم نے ان ہی کو قرآنِ مجید کے ہمیشہ ہمیشہ کے ساتھی قرار دیا ہے۔ اور صرف قرآن ہی سے تمسک کی نہیں بلکہ قرآن اور عترت اہلبیتؑ دونوں سے تمسک رکھنے کی تاکیدی ہدایت فرمائی اور قانونِ فطرت کے مطابق بھی معلم کو کتاب پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ علم کتاب تک رسائی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کے معلم و شارح سے ہدایت نہ لی جائے۔ تمام عالمین کے لئے قرآن مجید کے شارح اوّل اور معلم اوّل حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں اور حضورؐ کے بعد ثقل دوم یعنی عترت اہل بیتِ رسالت۔ اور صرف

طریقۂ طہارت جسمانی سیکھ لینے پر بات ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ جسمانی طہارت کے بعد کتاب ظاہری کو مس کرنا تو جائز ہو جاتا ہے لیکن جب اس سے استفادۂ علم وہدایت کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے تو یہ کتاب ظاہری خود کہتی ہے کہ "اس کتاب میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں (مگر یہ) متقین کے لئے ہدایت ہے" معلوم ہوا کہ یہ کتاب صرف متقین ہی کی راہ نمائی فرماتی ہے۔ غیر متقین کے لئے یہ ہادی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اس کتاب سے ہدایت لینا مقصود ہو تو پہلے جامۂ تقویٰ پہننا پڑے گا متقی بننا پڑے گا۔ اور متقی بننے کے لئے تزکیہ کرنے والے شارح کتاب کی جانب رجوع کرنا پڑے گا اور امام المتقین کی اطاعت و پیروی لازم ہوگی۔ تو پھر بھی یہی بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اکیلی کتاب بغیر معلم کے ہرگز کافی نہیں ہے۔ اگر ہم متقی بن گئے تو امام المتقین کی جماعت میں داخل ہو جائیں گے کیونکہ امام المتقین کا منکر ہرگز متقی نہیں ہو سکتا۔ پس قرآن مجید کا جو ارشاد ہے کہ "ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے پس کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟" یہ ارشاد الٰہی متقین ہی کے لئے ہے۔ کیونکہ نصیحت بھی ہدایت ہے۔ جو صرف متقین ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح بھی مفہوم یہی رہا کہ تحصیل نصیحت و ہدایت اسی وقت آسان و ممکن ہوگی جب رسول خدا اور عترت اہلبیت رسول کا دامن تھام لیا جائے بصورت دیگر ہدایت یافتہ ہونا ہر طرح سے محال ہے۔ اگر تفسیر قرآن تمام لوگوں کے لئے بلا معلم برحق ہوتی تو لوگوں کے خود اخذ کردہ مفاہیم میں اختلاف ہرگز نہ ہوتے۔

اکیلی کتاب کے ناکافی ہونے کے بارے میں کتاب خدا مزید وضاحت اس طرح کرتی ہے کہ

"جس طرح تم لوگوں میں ہم نے ایک رسول کو بھیجا، تمھیں میں سے، جو تم پر ہماری آیات کی تلاوت فرماتے، اور تمہارا تزکیہ کرتے ہیں اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور تمہیں ایسی باتوں کا علم دیتے ہیں جنہیں تم نہیں جانتے" (سورۂ بقرہ)

پس اگر علیم مطلق پروردگار کے اس ارشاد کے مطابق علم کتاب کو معلم برحق

سے حاصل کیا جائے گا تو ہمیں کامیابی نصیب ہوگی۔ صحیح مفاہیم قرآن ملیں گے اور ہمیں وہ علوم حاصل ہوں گے جنہیں ہم نہیں جانتے۔ پس قرآن مجید کے وہ معلّمین برحق حضرت محمد مصطفیٰؐ اور آپؐ کے عترتِ اہلِ بیتؑ طاہرین ہیں۔ اس بات کی صحت پر قرآن مجید کے ساتھ ساتھ حدیثِ ثقلین کے علاوہ دیگر بہت سے ارشاداتِ رسولؐ بھی شاہد ہیں۔

فضائلِ کتاب

کتابِ الٰہی کے تمام فضائل تو خدا ہی جانتا ہے یا وہ ہستیاں جانتی ہیں جنھیں اللہ نے پوری کتاب کا علم عطا فرما کر "علیم القرآن" بنایا ہے۔ تاہم قرآن یہ اعلان فرماتا ہے کہ

"زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں گرتا اور نہ کوئی تر چیز ہے اور نہ کوئی خشک چیز ہے مگر (سب کا علم) کتابِ مبین میں موجود ہے (سورہ انعام) پس اگر اس عظیم کتاب کا علم معلمین برحق سے لیا جائے تو ہر خشک تر چیز کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ سورۂ انعام کی منقولہ آیت ثابت کرتی ہے کہ قرآنِ مجید ہر جہت سے مکمل ہے۔ مگر اس کی علمی تفاصیل اور صحیح تاویل معلمین برحق ہی جانتے ہیں جو "راسخون فی العلم" کے مصداق ہیں اور یہ علم انہیں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر عام "علماء" کو تفصیل و تاویل کا علم حاصل ہوتا تو کم از کم آئمہ ہی کے مفہوم پر متفق ہو جاتے۔ پس جو آئمہ کے مفہوم تک پر متفق نہ ہو سکیں۔ بھلا ایسے لوگوں کے پاس علم تفصیل و تاویلِ قرآن کیا مل سکتا ہے۔

پس اس کتاب کے انوارِ ہدایت سے وہی ہستیاں فیضیاب کر سکتی ہیں جو خود نور ہوں اور جن کے پاس پوری کتاب کا علم موجود ہو۔ اور وہ تمام رموزِ قرآن کے عالم ہوں۔

ثقلِ دوم عترتِ اہلبیتِ رسولؐ

قبل اس کے کہ ہم حضرت محمد مصطفیٰؐ کے اس دعوے کو کہ "اگر تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے" حقائق واقعیہ سے ثابت کریں۔ اس بات پر مزید غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ "قرآن مجید کے موجود ہوتے ہوئے ثقل دوم (عترت اہلبیتؑ) سے تمسک رکھنے کا حکم دینا، رسولؐ خدا نے کیوں ضروری

سمجھا؟

اس حکم رسولؐ کا ایک بہت بڑا مقصد مسلمانوں کو تفرقہ سے محفوظ رہنے کا صحیح طریقہ بتانا تھا چونکہ جناب ختمی مرتبتؐ کو علم تھا کہ آپؐ کے بعد مختلف مکاتیب فکر اور متفرق مراکز تفسیر سے قرآن کی مختلف تفسیریں کی جائیں گی۔ ایک ایک آیت کے کئی کئی مختلف مفہوم بنا لئے جائیں گے اور ان مختلف تفاسیر اور مختلف و متصادم مفاہیم کو اخذ کرنے کی وجہ سے مسلمانوں میں اعتقادی اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ اور تفرقہ بازی کے فتنے کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ جس کی وجہ سے اُمّت کے اتحاد کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اسی لئے حضورؐ نے فرمادیا تھا "(میں جانتا ہوں) کہ میری اُمّت کے عنقریب ۷۳ فرقے ہو جائیں گے جو سوائے ایک کے، سب ناری ہوں گے"۔

پس جب حضورؐ کو یہ علم پہلے ہی سے تھا تو حضورؐ کا یہ فرض منصبی تھا کہ آپؐ اپنی اُمّت کے لئے قرآن مجید کی صحیح تفسیر کا اور علوم قرآن کی صحیح تعلیم کا "مرکز واحد" خود قائم کر جائیں تاکہ حضورؐ کے بعد قرآن مجید کی صحیح تعلیمات کا سلسلہ جاری رہ سکے اور اُمّت کو گمراہی و تفرقہ سے محفوظ رہنے کا طریقہ بھی معلوم ہو جائے۔

اس مقصد عظیم کی اہمیت و عظمت کے مطابق رسولؐ خدا کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ایسے معلمین قرآن کا پتہ بتائیں جو "راسخون فی العلم" کے مصداق اور حضورؐ کے علم کا دروازہ ہوں۔ اور ایسے عالم و طاہر ہوں کہ اپنے کسی قول و فعل میں کبھی اور کسی بھی حالت میں قرآن مجید سے جدا نہ ہوں۔ اُن کا کوئی قول یا فعل قرآن کے خلاف نہ ہو۔ اُن کے اقوال قرآن کی صحیح تشریح اور اُن کے افعال قرآن کی سچی تفسیر ہوں۔ یعنی وہ خود قرآنِ ناطق ہوں۔ اسی لئے حضورؐ نے اپنی عظیم الشان حدیث میں جب قرآن کے ساتھ اپنی عترتِ طاہرہ کو مرکزِ ہدایت مقرر فرمایا تو اس امر کے خود یوں ضامن ہوئے کہ "اللہ کی کتاب اور میرے عترت اہلبیتؑ ایک دوسرے سے تاقیامت کبھی جدا نہ ہوں گے حتیٰ کہ حوض کوثر پر بھی میرے پاس دونوں اکٹھے ہی آئیں گے اور اگر تم لوگ ان دونوں سے تمسک کرو گے ان دونوں سے مضبوط وابستگی رکھو گے تو میرے

بعد تمہارے گمراہ ہونے کا کوئی امکان و اندیشہ ہی باقی نہ رہے گا۔" (یعنی بصورت دیگر جہالت و گمراہی و تفرقہ بازی میں مبتلا ہو جاؤ گے)

پس جب جناب حبیب خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس عظیم پیغام کو پس پشت ڈال کر ہدایت کے اس مرکز واحد کی بجائے امت نے اپنے اپنے مختلف اور خود ساختہ مراکز اپنا لئے تو ۷۳ فرقے ہونے کی بنیاد قائم ہو گئی اور امت کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ پھر آج تک اتحاد صحیح قائم ہی نہ ہو سکا۔

تفریق امت کی ذمہ داری

حضور پر نہیں بلکہ امت کے ان افراد پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے رسول خدا کے فرمان "حدیث ثقلین" سے روگردانی کی اور مسلمانوں میں یہ پروپیگنڈہ کیا کہ "ہمارے لئے قرآن ہی کافی ہے" ان لوگوں نے اور ان کے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہونے والوں نے تفسیر بالرائے کو اپنا لیا اور ہر آیت کی اپنی اپنی رائے کے مطابق علیحدہ علیحدہ تفسیر کر کے امت میں تفریق و اختلافات کی بنیاد رکھ دی۔

حدیث سازی

ان تفریق پیدا کرنے والوں نے ستم بالائے ستم یہ کیا کہ لوگوں کو مرکز اتحاد سے ہٹانے کے لئے کئی حدیثیں وضع کیں۔

جیسا کہ قرآن مجید کے واضح حکم اتحاد "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" سورۂ آل عمران ۱۰۳ کے صریحاً خلاف یہ "حدیث" بنالی کہ (معاذ اللہ) حضور نے فرمایا کہ "میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔" (نعوذ باللہ من ذالک)

ایک جھوٹے شخص کی روائت

عترت اہلبیت سے دور رکھنے کے لئے ایک اور حدیث ثقلین بنائی گئی۔ جس میں "عترتی اہلبیتی" کی بجائے لفظ "سنتی" داخل کیا گیا۔ اسکی وضعیت یوں معلوم ہوتی ہے "لآلی مصنوعہ" جلال الدین سیوطی مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۲۹ میں ہے کہ اس روائت کا راوی کثیر بن عبداللہ بن عمر و کذاب ہے۔ ابن حبان کہتا ہے کہ اس کے پاس ایسی روایات کا ایک نسخہ موضوعہ تھا جن کی وہ اپنے باپ اور دادا سے

روایت کرتا تھا۔ محمد دار قطنی نے کہا کثیر ضعیف ہے۔ پھر موطا مالک سے یہ روایت "کتاب اللہ و سُنتی" لکھ کر اُسے مُرسل لکھا کہ اس کو ابن عبد البر نے تمہید میں اسی طریق سے (یعنی کثیر عن ابیہ عن جدہ) روایت کیا۔ ابن حجر اپنی کتاب اطراف میں لکھتے ہیں کہ مالک نے یہ حدیث اُسی کثیر سے لی ہے۔"

پس ایسے جھوٹے اور موضوع روایات کا مجموعہ رکھنے والے ناقابلِ اعتبار شخص کی ایسی کمزور بلکہ موضوع روایت کو جو نسخہ موضوعہ میں سے بھی صحیح حدیث ثقلین کے مقابلے پر پیش کرنے کو بغض اہلبیتؑ کی علامت نہ سمجھا جائے تو کیا سمجھا جائے؟ جبکہ "عترتی اہلبیتی" والی حدیث ثقلین کے متعلق صواعق محرقہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر ص ۸۹ میں لکھا ہے کہ "اس حدیث کو بیس سے زیادہ صحابیوں نے روایت کیا ہے۔ اور خصائص کبریٰ سیوطی جلد ۲ ص ۲۶۶ میں ہے کہ ترمذی نے اسے روایت کیا اور حسن کہا۔ اور حاکم نے روایت کیا اور صحیح کہا۔ اور صواعق محرقہ ص ۸۹ میں یہ حدیث باسناد احمد لکھ کر تحریر کیا گیا ہے۔ اس کی سند میں کوئی حرج نہیں ہے۔ عبدالعزیز محدث دہلوی نے کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" میں کتاب و عترت اہلبیتؑ والی حدیث ثقلین کو صحیح تسلیم کر کے لکھا ہے کہ رسُولِ خدا نے امورِ دین میں ہمیں انہی دو چیزوں کے سپرد کیا ہے۔ ان دونوں میں کسی ایک کا مُنکر گمراہ اور دین سے خارج ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قرآن مجید اور عترت اہلبیتؑ رسالت سے تمسک شرطِ ایمان ہے۔ اور ہدایت یافتہ ہونے یا ہدایت پر قائم رہنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔"

سرکارِ مدینۃُ العلم کی عظیم الشان حدیثِ تمسک بالثقلین میں عالمگیر پیغامِ ہدایت ہے جو آج بھی دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ یہی وہ مرکزِ ایمان اور نقطۂ اتحاد ہے جس کے ذریعے سے مُسلمانوں کی تفریق، اتحاد میں بدل سکتی ہے اور زوال عروج میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

ثقل دوم عترت اہلبیتؑ کی شان و عظمت حضورؐ نے یوں بیان فرمائی ہے کہ "قرآن اور عترت اہلبیتؑ ایک دوسرے سے کبھی جُدا نہ ہوں گے" حضورؐ کے اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہلبیتؑ قرآن مجید کا ایک ایک نسخہ ہر وقت

حائل کیسے رہا کریں گے بلکہ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اہلِ بیتؑ کا کوئی حکم، کوئی قول کوئی فعل، کوئی حالت، کوئی قدم، کوئی حرکت، کوئی سانس اور ان کا بتایا ہوا کوئی مفہوم قرآن کے ہرگز خلاف نہیں ہو سکتا۔ یہ بات عترت اہلبیتؑ کی عصمت اور طہارت کاملہ کی دلیل جمیل ہے۔ اسی سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ عترت اہلبیتؑ جسمانی لحاظ سے بھی ہر وقت پاک ہیں۔ کیونکہ حالتِ نجاست قرآن سے جُدا کرتی ہے۔ اور عترت اہلبیتؑ، قرآن مجید سے کسی وقت اور کسی لمحہ جُدا نہیں ہو سکتے لہٰذا عترت اہلبیتؑ کی طہارت میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی تعطّل نہیں آسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کو رسولؐ خدا نے "بتول"[۵] فرمایا اور حضرت علیؑ کے گھر کا دروازہ مسجد کی طرف کھُلا رہنے کی اجازت دیکر نیز حضرت علیؑ کو ہر وقت اور ہر حالت میں مسجد نبویؐ میں آنے کی اجازت[۶] دے کر ثابت کر دیا تھا کہ یہ پاک ہستیاں ایسی ہیں جو طہارت سے کسی بھی وقت محروم نہیں ہوتیں۔ اسی لئے اللہ نے قرآن مجید میں آیت تطہیر نازل فرما کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اہل بیتؑ کی طہارت پر مُہر تصدیق لگادی لہذا اہلبیتؑ طاہر۔ نہ صرف وہی ہستیاں ہیں جو ہمیشہ پاک ہی رہیں اور ہر مہینے مصلّے نہ چھوڑنا پڑے اور مسجد نبویؐ میں داخلہ کسی وقت بھی منع نہ ہو کیونکہ جو عورت بتول نہ ہو اسے ہر مہینے چند روز کے لئے نماز چھوڑنا پڑتی ہے اور جس مرد پر غسل واجب ہو وہ غسل کئے بغیر مسجد نبوی میں داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ شخص ناپاک ہے لیکن آیت تطہیر اور ارشادات رسولؐ سے ثابت ہے کہ عترت اہلبیتؑ کسی وقت بھی ناپاک نہیں ہو سکتے اسی لئے "پنجتن پاکؑ" کہا جاتا ہے۔ ان کے دامنِ حیات پر کفر و شرک کا کوئی دھبّہ نہیں۔ وہ بالکل پاک ہیں۔ رسولؐ علیم و حکیم نے اہلبیتؑ کی پہچان کروانے کے لئے لفظ "عترتی" پہلے فرما دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اہلِ بیتؑ صرف وہ ہیں جو "عترت" ہیں۔ "عترت"

---

۵ ینابیع المودۃ وارجح المطالب۔ ۶ مناقب مرتضویؑ

"نسب" سے بحث ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی لطیف اور قابلِ غور ہے کہ حضورؐ کے ارشادِ حدیثِ ثقلین میں "عترتی" اور "اہلِ بیتی" کے درمیان واؤ نہیں ہے۔ اگر واؤ ہوتا تو کوئی شخص یہ بات بنا سکتا تھا کہ عترتؑ اور اہلبیتؑ دونوں کو الگ الگ رکھا ہے اور دونوں الگ الگ ہیں۔ مگر پھر ہم یہ ضرور پوچھتے کہ پھر رسولؐ خدا نے کیوں نہ فرمایا کہ "میں تین چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں" لیکن حضورؐ نے دو ہی چیزیں بیان فرمائی ہیں لہذا تسلیم کرنا پڑے گا جو عترتؑ سے باہر ہوں وہ اہلبیتؑ نہیں ہیں۔ اہلِ بیتؑ وہی ہیں جو عترت ثابت ہو جائیں اور اُن کی طہارتِ کاملہ بھی ثابت ہو۔

لفظِ "عترتی" کے تقیید نے بالکل واضح کر دیا کہ جو حضورؐ کے "ہم نسب" یعنی حدی اقربا" نہ ہوں انہیں "اہلِ بیت" سمجھنا ضروری نہیں۔ "اہلِ بیت کبھی قرآن سے جُدا نہ ہوں گے" فرما کر یہ بھی ظاہر فرما دیا کہ جو قرآن کے حکم کے خلاف عمل کریں غلط جنگ لڑیں ہزاروں آدمیوں کو بے گناہ مروادیں اور اسی طرح قرآن سے جُدا ہو جائیں انہیں "اہلبیت" نہ سمجھنا۔

علاوہ ازیں جب آیتِ تطہیر اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (الاحزاب ۳۳) نازل ہوئی تو رسولؐ خدا نے صرف چار پاک ہستیوں (یعنی حضرت علیؑ، حضرت فاطمۃ الزہراؑ، حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ) کو اپنے ساتھ چادر میں جمع کیا اور جب یہ پنجتنؑ پاک چادر میں جمع ہو گئے تو رسولؐ پاک نے فرمایا "اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلُ بَيْتِي" "اے اللہ! یہ ہیں میرے اہلِ بیت" اسی لئے انہیں "آلِ عبا" یعنی چادر میں آنے والی آل" کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی اس وقت اور بھی "اہلبیتؑ" میں داخل ہوتا تو حضور اس کو بھی چادر میں جمع فرماتے اس کو بھی "اہلِ بیت" کہتے۔ حضرت اُمّ سلمہؓ کو بھی چادر میں آنے کی اجازت دیدیتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب ہم حدیثِ ثقلین کی تائید میں حدیث و قرآن سے شانِ عترتِ اہلبیتؑ کے اور شواہد پیش کرتے ہیں۔

حدیثِ سفینہ[۱] حضرت محمد مصطفیٰ نے اہلبیتؑ کی شان میں فرمایا کہ "میرے اہل بیتؑ کی مثال سفینۂ نوحؑ کی مثال کی مانند ہے جو اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو اس سے پیچھے رہ گیا وہ غرق ہو گیا" (تفسیر دُرِ منثور سیوطی جلد ۱ ص ۷ اور مشکوٰۃ وارجح المطالب وغیرہ) حضورؐ کے اس فرمان سے ثابت ہوا کہ اہلِ بیتؑ ذریعۂ نجات ہیں اور اُن کا مخالف نجات سے محروم رہے گا۔ لیکن اہل بیتؑ ذریعۂ نجات اُسی کے لئے ہو سکتے ہیں جو اُن سے تمسک رکھے اور اُن کو ہادیانِ دین و دُنیا تسلیم کر کے اُن سے علم و ہدایت لے لہٰذا یہ حدیث سفینہ، حدیثِ ثقلین کی تائید کرتی ہے۔

حدیثِ حطہ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے اہلبیتؑ کی مثال بنی اسرائیل کے باب حطہ (یعنی دروازۂ بخشش) کی مانند ہے جو بھی اس میں داخل ہوا اس کی مغفرت ہو گئی" (تفسیر دُرِ منثور سیوطی جلد ۱ ص ۷) ظاہر ہے کہ گمراہوں کے لئے مغفرت نہیں ہے۔ اور عترت اہلبیت کا ذریعۂ مغفرت ہونا اس حدیث سے ثابت ہے لہٰذا یہ بھی ثابت ہوا کہ اہلِ بیت گمراہی سے بچانے والے ہیں ورنہ ذریعہ مغفرت نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تم قرآن اور میرے عترت اہلبیتؑ سے وابستہ رہو گے تو میرے بعد ہرگز

---

[۱] طوفانِ نوحؑ کے موقع پر اوپر نیچے پانی ہی پانی تھا جیسا کہ قرآن مجید پ ۲۷ سورہ قمر آیت ۱۱ میں ارشادِ قدرت ہے "پس ہم نے آسمان کے دروازوں کو موسلا دھار پانی سے کھول دیا اور زمین سے چشموں کو جاری کر دیا پس (دونوں طرف کا پانی) مل گیا۔ اس امر پر جو مقرر ہو چکا تھا" لہٰذا ایسے حالات میں وہ کشتی کام ہی نہیں دے سکتی جو آبدوز نہ ہو پس واقعہ نوحؑ سے آبدوز کشتی کا تصور نقل اوّل نے سینکڑوں سال پہلے دیدیا تھا۔ واضح ہو آبدوز کشتی ستاروں کی محتاج نہیں ہوتی۔ اسی لئے سفینہ نوحؑ کے چلنے کا دارومدار ستاروں پر نہیں بلکہ اللہ سورۂ قمر میں فرماتا ہے کہ "وہ ہماری نگرانی میں چل رہی تھی"۔

گمراہ نہ ہوگے۔

حدیثِ امان

صواعقِ محرقہ ابنِ حجر کی مطبوعہ مصر صفحہ ۱۴۰ و صفحہ ۹۱ میں حدیثِ امان موجود ہے۔ ابنِ حجر لکھتے ہیں کہ "صحیح روایت ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا" ستارے زمین والوں کے لئے غرق ہونے سے امان ہیں اور میرے اہلبیت میری اُمّت کے لئے اختلاف سے امان ہیں پس جب کوئی گروہ اُن سے اختلاف کریگا تو وہ گروہ ابلیس ہوگا۔"

یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ اہلِ بیت وہ "مرکزِ اتّحاد" ہیں جو اختلاف سے بچاتا ہے اگر اختلاف ہی نہ ہو تو تفریق بھی پیدا نہیں ہوسکتی لیکن جہاں تفریق ہوگی وہاں گمراہی کا وجود یقیناً ہوگا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اہلبیت اختلاف و تفریق کی گمراہی سے بچانے والے ہیں پس یہ ارشادِ رسولؐ بھی "حدیثِ ثقلین" کی تائید کرتا ہے۔ اور یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اہلبیت کی مخالفت کرنے والے گروہ ابلیس میں داخل ہیں۔

اہلِ بیت ہی "اہل الذکر" ہیں

قرآن مجید کے سورۃ نحل میں ارشاد ہے کہ "اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ ذکر سے پوچھو" اسکے معنی یہ ہیں کہ "اہل الذکر" کو اللہ نے تمام علوم عطا فرمائے ہیں۔ اور لوگ اس امر کے محتاج ہیں کہ وہ "اہلِ ذکر" سے اکتسابِ علوم کریں پس اگر کوئی شخص کسی سوال پر عاجز ہو جائے اور جواب دینے سے قاصر رہے اور دوسروں سے پوچھنے پر مجبور ہو جائے تو وہ ہرگز "اہل الذکر" میں سے نہیں ہے جس شخص کا بعض سوالوں پر عاجز رہ جانا اور جواب دینے سے قاصر ہونے کی وجہ سے حضرت علیؑ سے جاکر پوچھنا پھر حضرت علیؑ سے صحیح جواب حاصل کرکے یہ اعتراف کرنا کہ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا"[۱] پوری طرح ثابت ہو وہ اہل الذکر میں سے نہیں۔ اس کے برعکس حضرت علیؑ کا دعویٰ "سَلُونِی سَلُونِی عَمّا شِئْتُمْ" بہت سی کتابوں میں مذکور ہے کہ "مجھ سے پوچھو، مجھ سے پوچھو، جو چاہو

---

[۱] دیکھئے کتاب "ذکرِ حسینؑ" مولینا کوثر نیازی اور "سفینۂ نوحؑ" مولوی محمد شفیع اوکاڑوی

پوچھو" اوراس دعوے کے بعد کسی بھی سوال پر حضرت علیؑ عاجز نہیں ہوئے اور کسی موقع پر بھی جواب دینے سے قاصر نہیں رہے کیونکہ وہ "اہل الذکر" میں سے ہیں۔ جیساکہ تفسیر ثعلبی وغیرہ میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت موجود ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایاکہ "اہل الذکر ہم ہیں[1]" اور "اہل الذکر" وہی کہلا سکتے ہیں جو پورے قرآن کے عالم ہوں اور اُن کے پاس عالمین کی ہر شے کا علم حقیقی موجود ہو[2] لہٰذا حضرت علیؑ پورے قرآن کے عالم ہیں اور اُنہیں عالمین کی ہر شے کا علم حاصل ہے۔ اسی لیے حضرت علیؑ نے فرمایاکہ "میرے پاس اوّلین کا علم ہے۔ اور میں آخرین کے علم کی پوشیدہ کان ہوں"۔ (دیکھئے ینابیع المودۃ)

صاحب علم الکتاب

سورۂ رعد میں اللہ نے فرمایاکہ "اے رسولؐ) فرمادیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان (میری رسالت) کی گواہی کے لئے اللہ اور وہ شخص جس کے پاس علم الکتاب ہے کافی ہیں"۔ تفسیر ثعلبی "تفسیر حسینی" "واعظ کاشفی" "ینابیع المودۃ" محمد سلیمان حنفی نقشبندی" "ارجح المطالب" اور "سفینۂ نوحؑ" مولانا محمد شفیع اوکاڑوی میں صاف لکھا ہوا ہے کہ وہ شخص جس کے پاس "علم الکتاب" ہے وہ علیؑ ابن ابی طالب ہیں"۔

حضرت علیؑ قرآن کے ساتھ

"حدیث ثقلین" میں رسولؐ خدا نے فرمایا کہ "قرآن اور عترت اہلبیتؑ آپس میں کبھی جدا نہیں ہوں گے"۔ اسی کے مطابق فرمایا "علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کیساتھ ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے حتّٰی کہ اکٹھے ہی حوض کوثر پر وارد ہوں گے"۔ حضورؐ کی یہ حدیث طبرانی نے "اوسط" میں حضرت اُمّ المومنین اُمّ سلمہؓ سے

---

[1] مزید دیکھئے "سفینۂ نوحؑ" مولانا محمد شفیع اوکاڑوی حصہ اوّل ص۴۳

[2] تفسیر صافی اور عیون اخبار رضا میں مروی ہے کہ سورۂ طلاق میں اللہ نے رسولؐ خدا کو "ذکر" قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہم اہل رسولؐ "اہل الذکر" ہیں۔

نقل کی ہے۔ ارجح المطالب اور دیگر کتب میں بھی موجود ہے۔

حق اور علیؑ کا دائمی ساتھ

حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا کہ "علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ دونوں اس حالت میں رہیں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوں" (ابن مردویہ نے حدیث امّ سلمہؓ سے روایت کی ہے اور دیگر کتب میں بھی موجود ہے)

علاوہ ازیں جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا "اے علیؑ حق آپ کے ساتھ ہے، آپکی زبان پر ہے، آپ کے دل میں ہے، اور آپ کی آنکھوں میں ہے" (ارجح المطالب) یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ اگر راہ حق چاہیئے تو علیؑ سے مل سکتی ہے۔ کیونکہ حق علیؑ سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ آپ کی زبان پر بھی حق ہے۔ لہٰذا ان کا کوئی قول باطل نہیں ہو سکتا۔ آپؑ کے دل میں بھی حق ہے اسلئے اس میں شک و شبہ یا اور کسی قسم کا باطل کبھی نہیں آسکتا۔ نیز ہر وہ علم جو حق ہے آپکے دل میں موجود ہے۔ اور آپؑ کی آنکھوں میں حق ہے لہٰذا آپؑ کی نظر کبھی دھوکہ نہیں کھاسکتی اور تمام حقائق عیاں کو دیکھ چکی ہے۔ اسی لئے حضرت علیؑ نے فرمایا کہ "اگر پردہ ہٹادیا جائے تو میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا" یعنی میں یقین کی آخری منزل کمال پر ہوں۔ ایسا ہی ہادیٔ برحق، گمراہی سے بچا سکتا ہے۔ اسی لئے رسولِ خدا نے اہل بیت سے مضبوط وابستگی رکھنے کا حکم دیا ہے تاکہ گمراہی سے تحفظ حاصل رہے۔ اور حق نصیب ہو۔

علمِ رسولؐ کا دروازہ

تمام فرقوں کے علماء نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ سرکارِ دوجہاں محمّد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں پس جو علم حاصل کرنے کا ارادہ کرے اُسے چاہیئے کہ دروازے ہی سے آئے" یعنی حضرت علیؑ کا دامن تھامے بغیر علم رسولؐ نصیب نہیں ہوگا۔ حدیث "اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا الخ......" صحیح ہے دیکھئے کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۱۵۲ لسان المیزان حافظ ابن حجر جمع الجوامع سیوطی اور استیعاب مطبوعہ برحاشیہ اصابہ جلد ۳ صفحہ ۳۸۔

ظاہر ہے کہ علیؑ اہلبیتؑ ہی میں سے ہیں۔ لہٰذا اہلِ بیتؑ سے تمسک رکھے بغیر علم رسولؐ نصیب نہیں ہوسکتا اور گمراہی سے وہی ہادیانِ برحق بچا سکتے ہیں جو علمِ رسولؐ کا دروازہ ہیں پس حدیث "انا مدینۃ العلم..... الخ" سے "حدیث ثقلین" کی تائید ہوجاتی ہے۔

حکمتِ رسولؐ کا دروازہ

رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ "میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں" (ینابیع المودۃ)۔ پس رسولِ خداؐ کی حکمت حضرت علیؑ ہی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ جو اہلبیتؑ ہی میں سے ہیں۔ لہٰذا اہلبیتؑ کے بغیر حکمتِ مصطفےٰؐ کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اہلِ بیتؑ سے وابستگی یعنی تمسک ضروری ہے اور "حدیث ثقلین" کا بھی یہی مقصد ہے۔

راسخون فی العلم

قرآن مجید کی تاویل کو وہی جانتے ہیں جو "راسخون فی العلم" ہیں جیسا کہ سورہ آلِ عمران میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اس کی تاویل کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ اور راسخون فی العلم کے" بس علمِ تاویلِ قرآن حاصل کرنے کے لئے راسخون فی العلم سے تمسک کرنا ضروری ہے۔ راسخون فی العلم وہی ہیں جو تاویل کے عالم ہیں۔ اس سلسلے میں یہ حدیث قابلِ غور ہے کہ حضرت رسولِ خداؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا "تم میں ایک شخص ایسا ہے کہ لوگوں سے قرآن کی تاویل پر جنگ کریگا جس طرح میں نے قرآن کی تنزیل پر جنگ کی"! ایک شخص نے کہا "یا رسولؐ اللہ! کیا وہ شخص میں ہوں"؟ حضورؐ نے فرمایا "نہیں"۔ پھر ایک دوسرے شخص نے کہا "یا رسولؐ اللہ! کیا وہ شخص میں ہوں"؟ فرمایا "نہیں"، لیکن وہ جوتا سینے والا ہے"۔ (نوٹ:۔ اس وقت حضرت علیؑ حضور نبیؐ اکرم کا جوتا سی رہے تھے) دیکھئے مسند احمد حنبل، خصائص مرتضوی امام نسائی، شرح سنت بغوی طبرانی، حلیۃ الاولیا ابونعیم اصفہانی اور دیلمی نے فردوس اخبار میں اور مستدرک میں حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث شرطِ شیخین پر صحیح ہے۔

حدیث مندرجہ بالا سے ثابت ہوا کہ حضرت علی علیہ السلام تاویلِ قرآن کے عالم تھے اسی لئے غلط تاویل کرنے والوں سے اُن کو جنگ کرنا پڑی۔

ینابیع المودۃ میں مولانا محمد سلیمان حنفی مفتیٔ اعظم قسطنطنیہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایک خطبہ میں فرمایا "وہ لوگ کہاں ہیں جو ہمارے سوا "راسخون فی العلم" ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہم پر جھوٹ بکتے ہیں اور زیادتی کرتے ہیں۔ اللہ نے ہمیں بلند کیا اور اُن کو پست۔ ہمیں عطا کیا، اُن کو محروم رکھا (علم سے) ہمیں داخل کیا اور اُن کو باہر رکھا ہماری وجہ سے ہدایت حاصل ہوتی ہے۔ اور ہماری ہی وجہ سے نابینائی، بینائی کی روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

پس راسخون فی العلم بابِ مدینۃ العلم اور اُن کے علم کے وارث ہی ہیں۔ جو صرف عترت اہلبیت رسولؐ ہیں۔ اسی لئے علم تاویل حاصل کرنے کے واسطے ان سے وابستگی واجب ہے کیونکہ اس کے بغیر تاویل غلط کی گمراہی میں اُلجھ جانے کا شدید خطرہ ہے۔ پس "راسخون فی العلم" والی مندرجہ بالا آیتِ قرآن بھی "حدیثِ ثقلین" کی صحت کی دلیل ہے۔

ینابیع المودۃ ہی میں ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ "حضرت علیؑ نے مجھے بائے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے نقطہ کی تفسیر رات کے وقت بتانی شروع فرمائی۔ لیکن صبح کے ستون نمودار ہو گئے اور نقطہ کی تفسیر ختم نہ ہوئی۔ میں نے اپنے آپ کو حضرتؑ کے پہلوئے مبارک میں یوں محسوس کیا جیسے ایک بحرِ متلاطم و زخار کے پہلو میں ایک چھوٹا سا گڑھا ہے۔" (یہ اعتراف عبداللہ ابنِ عباسؓ نے کیا ہے جنکو بحرِ علم مانا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ) حضرت علیؑ نے فرمایا "اگر میرے لئے مسند بچھائی جائے اور میں اس پر بیٹھ جاؤں تو میں (اس مسندِ قضا پر) توریت والوں کو توریت سے، انجیل والوں کو انجیل سے اور قرآن والوں کو قرآن سے احکام دے سکتا ہوں۔" یہی وجہ ہے کہ صحابہ حضرت علیؑ کی طرف احکامِ قرآن حاصل کرنے کے لئے رجوع کرتے تھے۔ اور حضرت علیؑ سے فتوے لیتے تھے۔ اسی سلسلے میں حضرت عمرؓ نے بے شمار مرتبہ کہا ہے کہ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔" رسول اللہ نے فرمایا "علیؑ ابنِ ابی طالب میری اُمت میں سب سے بڑے عالم ہیں۔" (ینابیع المودۃ)

نوٹ:۔ حضرت عمر کا یہ قول کہ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوجاتا" جناب کوثر نیازی صاحب نے بھی اپنی کتاب "ذکرِ حسینؑ" میں بھی نقل کیا ہے۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ کا اعتراف موجود ہے کہ "اگر میں دو سال حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں نہ رہتا تو ہلاک ہوجاتا" (ارجح المطالب)۔

اِن تمام چیزوں سے اہلبیتؑ کے "راسخون فی العلم" ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ اس سلسلے میں نہایت ہی قابلِ غور بات یہ ہے کہ نواب صدیق حسن بھوپالی کے مشہور شاگرد علّامہ اہلِ حدیث وحید الزماں اپنی کتاب انوار اللغۃ پ ۵ ص ۹۳ میں لکھتے ہیں کہ "امام جوادؑ محمد بن علی بن موسیٰ رضا جو بارہ اماموں میں سے ہیں۔ جب آپ کی عمر دس سال کی تھی اس وقت تیس ہزار مسئلے آپ سے پوچھے گئے اور آپ نے سب کا برابر جواب دیا۔" علّامہ وحید الزماں کی اس تحریر سے بھی اہلبیتؑ کے "راسخون فی العلم" ہونے کا شاندار ثبوت ملتا ہے اور یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اہلبیتؑ کا علم اکتسابی نہیں بلکہ وہبی ہے۔ کیونکہ دس سال کی عمر میں علم کا اکتساب کرنے والا اس منزلِ کمال پر نہیں پہنچ سکتا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دس سال کے سن میں امام محمد تقیؑ کا مامون عباسی کے دربار میں تیس ہزار مسائل علمی حل کرنا اور اپنے زمانے کے تمام علماء پر چھا جانا، اور ان کو عاجز کر دینا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اہل بیتؑ ہم جیسے بشر نہیں ہیں بلکہ نوری بشر ہیں۔

قرآنِ ناطق | ولی اللہ محدث دہلوی اپنی مشہور کتاب "ازالۃ الخفا" جلد ۱ ص ۵۲۳ میں لکھتے ہیں کہ "حضرت مرتضیٰؑ نے فرمایا یہ قرآن خاموش ہے اور میں قرآن بولنے والا ہوں" حضرت علیؑ کا یہ ارشاد "تاریخ الخلفاء" جلال الدین سیوطی میں موجود ہے۔

قرآنِ صامت کی شان | قرآن مقدس کے پارہ ۱۱ سورہ یونسؑ میں

صداقت اسلام، صدقِ رسولؐ اور قرآن کے الہامی ہونے کی ایک نہایت ہی واضح اور ناقابلِ تردید بُرہان موجود ہے۔ اس میں پروردگار عالمین فرما رہا ہے کہ

"ہم نے بنی اسرائیل کو دریا پار کرا دیا۔ پس فرعون اور اُس کے لشکروں نے ان کا پیچھا کیا سرکشی اور دشمنی کے ساتھ حتیٰ کہ جب فرعون غرق ہونے لگا تو کہا کہ میں ایمان لایا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر قوم بنی اسرائیل ایمان لائی ہے۔ اور میں تسلیم کرنے والوں میں سے ہوں (تو اللہ نے جواباً فرمایا) اب (مرنے کے وقت۔ ڈوبنے سے گھبرا کر ایمان لاتا ہے) حالانکہ پہلے نافرمان رہا اور تو مفسدین میں سے تھا۔ پس آج ہم صرف تیرے بدن کو (ختم ہونے سے) بچالیں گے۔ تاکہ تو اپنے بعد والے لوگوں کیلئے نشانِ عبرت رہے۔ حالانکہ بلاشک و شبہ لوگوں کی اکثریت ہماری نشانیوں سے غافل ہے۔"

رسولِ خدا، سرورِ کونین، نور الحرمین، صاحبِ قابَ قوسین، جدِ الحسنؑ والحسینؑ، نبی المشرقین والمغربین، حبیبِ کبریا، سیدالانبیاء، امام المرسلین، رحمۃ للعالمین، احمدِ مجتبیٰ محمدِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب فرعون کے متعلق ان آیات کی تلاوت فرمائی اس وقت تک لاش فرعون دریائے نیل سے نکالی ہی نہ گئی تھی، بلکہ وہ لاش غرقابی کے ہزاروں سال بعد قرآن کی مندرجہ بالا آیات کے ظہور کے سینکڑوں سال بعد انگریزوں نے برآمد کی۔ ہزاروں سال پانی میں رہ کر بھی بدنِ فرعون خراب و ختم نہ ہوا اور اس طرح برآمدگی لاش سے سینکڑوں سال پہلے قرآن نے اس کے بدن کے محفوظ رہنے کی جو خبر دی تھی وہ سچی اور الہامی ثابت ہوگئی۔ کیونکہ قرآن سے پہلے کسی کتاب میں اس خبر کا کوئی وجود نہ تھا اور نہ ہی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے کسی پہلی کتاب سے یہ خبر اخذ فرمائی ہو۔ نہ ہی حضورؐ نے اس لاش کو خود برآمد کر لیا تھا۔ تو تمام دنیا کے مفکرین و سائنس دان حضرات کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو اس خبر کو الہامی تسلیم کرتے ہوئے صداقت اسلام و قرآن کے قائل ہو جائیں یا وہ ذریعہ بتائیں کہ رسولِ خدا نے یہ خبر کہاں سے حاصل کی؟ یہاں یہ امر واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ لاشِ فرعون لندن کے عجائب گھر میں آج تک موجود ہے۔ اور قرآن کے الہیٰ ارشاد کے مطابق منکرینِ خدا کے لئے نشانِ عبرت ہے۔

اور یہ بات قرآن کی تمام الہامی کتابوں پر فوقیت ثابت کر رہی ہے۔

قرآنِ صامت کی ایک دلیل الہامیت و صداقت "غلبۂ روم بر فارس" کی پیشگوئی ہے جو قرآنِ حکیم کے اکیسویں پارے سورۂ روم میں یوں وارد ہوئی ہے کہ "قریبی زمین میں روم کی قوم مغلوب ہوگئی۔ اور وہ (مغلوب رومی لوگ) مغلوب ہوجانے کے بعد چند برس میں پھر عنقریب غالب ہوجائیں گے۔

سورۂ روم مکی ہے لہٰذا قرآن نے یہ پیشگوئی مکہ میں فرمائی اور ہجرت کے بعد جب چند ہی سال گزرے تھے پوری ہوگئی۔

قرآنِ مجید کے الہامی کتاب ہونے کی ایک دلیل اس کا یہ دعویٰ ہے جو سورۂ بنی اسرائیل میں یوں کیا گیا ہے کہ "اے رسولؐ! فرما دیجئے اگر تمام انس و جن اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا (کلام) لے آئیں تو اس جیسا کبھی نہ لا سکیں گے۔ اگرچہ وہ اس مقصد کے لئے ایک دوسرے کے مددگار ہوجائیں۔"

اس دعوے کو قریباً چودہ سو برس گزر گئے لیکن باوجود اس کے کہ دنیا میں بڑے بڑے فصیح و بلیغ انسان، علما، حکما اور سائنسدان ہو چکے ہیں۔ سائنس کی ترقیاں ہوتی رہیں۔ ایمٹی ایجادات ہوگئیں لیکن اس دعوے کو آج تک کوئی باطل نہ کرسکا۔ اور عرب کے اس وقت کے فصحا و بلغا و شعرا بھی سب کے سب عاجز ہوکر یہ کہنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ "ما ھٰذا کلام البشر"، یعنی جب صرف سورۂ کوثر جیسی ایک سورۃ تک بنانے میں عاجز رہ گئے تو تسلیم کرلیا کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے۔ پورے قرآن جیسا تو درکنار قرآن کا تو یہ دعویٰ بھی ہے کہ اس کی ایک سورۃ جیسی ایک سورۃ بھی کوئی نہیں لا سکتا۔ جیسا کہ سورۂ یونس اور سورۂ بقرہ میں صاف طور پر دعویٰ کیا گیا ہے۔ چودہ سو برس گزر جانے کے بعد اس دعویٰ کا اپنی جگہ لاجواب رہنا قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کی شاندار دلیل ہے۔

قرآن ناطق کی شان

جس طرح آج تک کوئی شخص قرآنِ صامت کے کسی ارشاد کو غلط ثابت نہیں کرسکا اسی طرح قرآنِ ناطق،

امام برحق، امیرالمومنین، امام المتقین، قائد الغرالمحجلین، یعسوب المومنین، فاتح بدر وحنین والد حسنؑ وحسینؑ، زوج بتول، وصی رسول، امام المشارق والمغارب، اسداللہ الغالب حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کا یہ عظیم الشان علمی دعویٰ کہ "جن جانداروں کے کان ظاہر ہیں وہ بچے دیتے ہیں اور جن کے کان ظاہر نہیں وہ انڈے دیتے ہیں" آج تک اپنی جگہ قائم ہے اور تمام دنیا کے علماء و حکماء، سائنسدان اور ماہرین علم حیوانات اس دعوے کو غلط ثابت نہیں کر سکے۔ حالانکہ جس وقت قرآن ناطق نے یہ دعویٰ کیا تھا۔ اس وقت تک آپؑ سے پہلے کسی شخص نے نہ یہ بات کہی تھی اور نہ لکھی تھی کہ یہ کہا جائے کہ علیؑ نے یہ کلیہ علم حیوانات کے فلاں ماہر یا سائنسدان سے سیکھ لیا تھا۔ لہٰذا کسی درسگاہ دنیا میں تعلیم حاصل کئے بغیر عرب کے نہایت ہی پسماندہ ملک میں پیدا ہو کر جبکہ نہ کوئی سائنسی ادارے بنے تھے نہ ہی آلات تحقیق ایجاد ہوئے تھے نہ ہی علیؑ نے ریسرچ کے لئے تمام دنیا کے سفر کئے تھے اور نہ ہی علیؑ کو کسی نے سمندر کی گہرائیوں میں آکسیجن ماسک پہنے ہوئے کبھی اترتے ہوئے دیکھا تھا ایسی صورت میں تمام غیر آبی حیوانات کے متعلق ایک حتمی اور ناقابل تردید کلیہ بیان کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت علیؑ تمام عالمین کے حقائق کے وہبی طور سے عالم تھے اسی لئے مولاؑ نے فرمایا تھا "تمام آسمانی کتب کا علم قرآن میں موجود ہے۔ تمام قرآن کا علم سورۂ فاتحہ میں موجود ہے۔ تمام سورۂ فاتحہ کا علم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں موجود ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا علم بائے بسم اللہ میں موجود ہے اور بائے بسم اللہ کا علم اس کے نقطے میں موجود ہے اور وہ نقطہ میں ہوں"۔ مراد یہ ہے کہ سابقہ آسمانی کتب اور قرآن مجید کے تمام علوم میرے پاس موجود ہیں جس طرح قرآن صامت میں تمام علوم موجود ہیں۔ یعنی میں بولتا قرآن ہوں۔ (ینابیع المودۃ)

اسی لئے عہد رسالتؐ کے مشہور و ممتاز قاری، صحابی رسولؐ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے کہا تھا کہ "قرآن مجید سات حرفوں میں نازل ہوا ان قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ علی علیہ السلام کے پاس قرآن کے ظاہر کا بھی علم ہے اور باطن کا بھی"۔
(ینابیع المودۃ)

اور حضرت علی علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ اللہ کے ارشاد "ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے مصطفےٰ کیا ہے" کے مطابق ہم اس قرآن کے وارث ہیں جس کے ذریعے سے پہاڑ چلنے لگ جاتے ہیں۔ شہروں کی مسافت ختم ہو جاتی ہے۔ مُردے بولنے لگ جاتے ہیں۔ اور ہمیں اس کے ذریعے یہ علم حاصل کیا ہے کہ پانی کہاں ہے اور کہاں نہیں ہے۔ اور ہم اس کتاب کے وارث ہیں جس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔" (ینابیع المودۃ)

حضرت علیؑ کے اس ارشاد سے ثابت ہے کہ قرآن مجید میں وہ علوم موجود ہیں جنکے ذریعہ سے پہاڑ چلائے (یا ہٹائے) جاسکتے ہیں۔ مُردہ زندہ کرنے کا علم بھی قرآن میں موجود ہے اور زمین کا سردے کرکے جن علوم و قواعدِ تجزیۂ زمین کے ذریعے سے آج یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ مختلف دھاتیں، پانی یا یورانیم وغیرہ کہاں موجود ہیں۔ وہ تمام علوم و قواعد بھی قرآن مجید میں ہیں مگر یہ عترت اہلبیتؑ ہی سے حاصل کئے جاسکتے ہیں جو قرآن کے حقیقی وارث ہیں۔

پس جس طرح حضرت علیؑ تمام عالمین کے علوم کے وہی عالم ہیں اسی طرح سے دیگر آئمۂ اہلبیتؑ بھی تمام علوم کے وہی عالم ہیں جو قرآن کے ہمیشہ ہمیشہ کے ساتھی ہیں۔ اگر اُن سے تمسک رکھا جائے تو مُسلم قوم اپنے گُم کردہ عروج و وقار کو پھر حاصل کر سکتی ہے۔ اور اقوامِ عالم کی قیادت اس کو نصیب ہو سکتی ہے۔ اسی لئے سید العالمین محمد مصطفےٰؐ نے اُمت کو قرآنِ صامت اور قرآنِ ناطق (یعنی اہلبیتِ طاہرینؑ) سے ہمیشہ مضبوطی کے ساتھ وابستگی (تمسک) رکھنے کی بار بار تاکید فرمائی اور "حدیثِ ثقلین" کو ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ مختلف موقعوں پر بار بار ارشاد فرمایا۔

لوگوں کے احوال کا علم

قرآنِ ناطق حضرت علی مُرتضیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا کہ "اگر میں چاہوں تو تم میں سے ہر شخص کو اس کے تمام حالات سے آگاہ کر دوں۔ میں ایسا ضرور کر سکتا ہوں۔ مجھے ہر شخص کے بارے میں یہ علم ہے کہ وہ کس حالت سے نکلا ہے۔ اور کس حالت میں

داخل ہوگا۔ میں یہ سب کچھ بتا سکتا ہوں لیکن مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کہیں تم اس کی وجہ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منکر نہ ہو جاؤ۔ البتہ میں کچھ خاص لوگوں کو ضرور آگاہ کروں گا جو اس بات (یعنی میرے علم) پر ایمان لا چکے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے حضورؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اور حضورؐ کو تمام مخلوقات پر برگزیدہ فرمایا ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ بالکل سچ ہے" (ینابیع المودۃ)

آئندہ واقعات کا علم

ملا عبدالرحمٰن جامی نے اپنی کتاب شواہد النبوۃ میں ایسے کئی واقعات لکھے ہیں جن کی اطلاع حضرت علیؑ نے پہلے ہی دے دی تھی۔ اُن میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں:۔

شہادتِ جنابِ قنبرؒ کی خبر

ایک روز حجاج بن یوسف نے اپنے خادموں سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ اصحابِ علیؑ میں سے کسی کو گرفتار کروں اور اس کو قتل کر کے خدا کا قرب حاصل کروں"۔ اس کے خادموں نے کہا "حضرت علیؑ کا ساتھی قنبر سے بڑھ کر اس وقت کوئی ہمیں معلوم نہیں"۔ پس حجاج نے جناب قنبرؒ کو طلب کر کے اُن سے کہا کہ "علیؑ کے دین و مذہب سے بیزاری و نفرت ظاہر کر"۔ قنبرؒ نے کہا "مجھے بتا کہ علیؑ کے دین سے بہتر دین کونسا ہے؟" حجاج بولا "میں تجھے ضرور قتل کروں گا۔ تو جس طرح سے قتل ہونا چاہتا ہے پسند کر لے"۔ قنبر نے کہا "جس طرح سے تو چاہے قتل کر لے مگر جس طرح سے آج تو مجھے قتل کرے گا اسی طرح سے کل (روزِ قیامت) میں تجھے قتل کروں گا۔ کیونکہ مجھے مخبرِ صادق، وصیِ برحق علیؑ ابن ابی طالبؑ نے پہلے ہی خبر دے دی تھی کہ تجھے ظالم حجاج، ظلم سے قتل کریگا"۔ الغرض حجاج بن یوسف نے حضرت قنبر رحمۃ اللہ کو ظلم سے شہید کر دیا۔ (شواہد النبوۃ جامی)

حضرت قنبرؒ نے حجاج بن یوسف جیسے سفاک دشمنِ اہلبیتؑ کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر بہترین جہاد کیا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا گئے کہ حضرت علیؑ آئندہ واقعات کے عالمِ ربانی ہیں۔ اُن کے دین سے بہتر کوئی دین نہیں ہے کیونکہ وہ اللہ اور رسول اللہ کا دین ہے۔ حضرت قنبرؒ شہید، حضرت علیؑ کے وفادار غلام ہیں جن کی شان نہایت

بلند ہے۔ حضرت شمس تبریزؒ جیسے انسان اپنے آپ کو قنبرؓ کا غلام کہتے اور اس غلامی پر فخر کرتے ہیں جیسا کہ اُن کے کلام میں موجود ہے ع

شمسؒ غلامِ قنبرت دَم ہمہ دم علیؑ علیؑ

یعنی (اے مولا علیؑ!) شمسؒ تو آپ کے قنبرؓ کا غلام ہے جس کے ہر ہر سانس کا وظیفہ "علیؑ" "علیؑ" ہے۔

حضرت کمیلؓ کی شہادت کی خبر

حضرت علیؑ کے مصاحبینِ خاص میں حضرت کمیلؓ کو بڑا مقام حاصل ہے۔ ان کو حضرت علیؑ نے وہ دُعا تعلیم فرمائی جو دُعائے کمیلؓ کے نام سے مشہور ہے اور مفاتیح الجنان وغیرہ میں موجود ہے۔ ان کے متعلق مولانا جامی لکھتے ہیں کہ ایک دن حجّاج بن یوسف نے کمیلؓ کو طلب کیا۔ کمیلؓ بھاگ گئے۔ حجّاج نے اُن کی قوم کے وظیفے بند کر دیئے۔ کمیلؓ نے اپنے دل میں کہا کہ میری عُمر کا آخری دَور ہے۔ مناسب نہیں ہے کہ اپنی قوم کی محرومی کا سبب بنوں۔ پس خود ہی حجّاج کے پاس چلے گئے۔ حجّاج نے دیکھا اور کہا "میں یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح تجھ پر قابو پاؤں۔" حضرت کمیلؓ نے کہا، "میری عُمر تو تھوڑی ہی رہ گئی ہے۔ جو تیرا جی چاہے کرلے، کیونکہ میرے مولا امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالب نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ میرا قاتل تو ہی ہے۔" (شواہد النبوۃ)

حضرت کمیلؓ پر سلام ہو جو شہید ہوتے وقت بھی یہ بتا گئے کہ میرے مولا علی مرتضیٰ علیہ السلام آئندہ واقعات کا علم رکھتے تھے۔ اور ہمیں آئندہ واقعات کی خبریں بتا گئے تھے۔

شہادتِ جنابِ رشید ہجریؓ کی خبر

مولانا محمد صالح چشتی نے اپنی کتاب مناقبِ مرتضوی میں مصابیح القلوب کے حوالے سے مصاحبِ علیؑ، حضرت رشید ہجریؓ کی شہادت کے جو واقعات لکھے ہیں وہ یہ ہیں کہ ایک دن حضرت علیؑ شہر کوفہ میں اپنے دوستوں کی ایک جماعت کے ساتھ ایک نخلستان میں ایک دَرخت کے نیچے بیٹھے ہوئے خُرما تناول فرما رہے تھے۔

رشیدؒ ہجری نے کہا "کیسا اچھا خرما ہے۔" حضرت علیؑ نے فرمایا "اے رشید! میری وفات کے بعد تجھے اسی درخت کی لکڑی پر سُولی پر چڑھا دیا جائے گا۔" جناب رشید ہجریؒ، حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد ہر روز اس درخت کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے کہ خشک نہ ہو جائے۔ ایک دن وہاں جاکر دیکھا کہ وہ درخت مُرجھا گیا ہے۔ رشیدؒ ہجری نے کہا میری اجل قریب آگئی ہے۔ دوسرے روز جب پھر وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس درخت میں آدھا تنہ کاٹ کر کنوئیں کی چرخی کا ستون بنا لیا گیا ہے۔ اس سے اگلے روز ہی ایک شخص نے آکر رشیدؒ ہجری سے کہا کہ عبید اللہ ابنِ زیاد نے تجھے بلایا ہے۔ جب رشید ہجریؒ عبید اللہ ابنِ زیاد کے محل (دارالامارہ) کے دروازے پہنچے تو دیکھا اسی درخت کا آدھا تنہ وہاں پڑا ہے۔ جناب رشیدؒ نے اُسے ٹھوکر مار کر کہا "مجھے تیرے ہی لئے لائے ہیں۔" الغرض ابنِ زیاد کے سپاہی اُن کو ابنِ زیاد کے پاس لے گئے۔ ابنِ زیاد نے رشیدؒ ہجری سے کہا "علیؑ ابنِ ابی طالب کے کچھ جھوٹ بیان کر" (نعوذ باللہ من ذالک۔ چونکہ حضرت رشیدؒ ہجری اکثر حضرت علیؑ کی پیشگوئیاں بیان کر کے علم علیؑ کو ظاہر کیا کرتے تھے۔ اسی بات سے جل کر ابنِ زیاد نے لفظ "جھوٹ" کہکر دشمنی کی وجہ سے گستاخی کی) حضرت رشیدؒ ہجری نے جواب دیا کہ خدا کی قسم، میرے مولا علیؑ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور مجھے مولا علیؑ نے پہلے ہی یہ خبر دیدی تھی کہ تو میرے ہاتھ پاؤں اور زبان کاٹ کر سولی پر چڑھائیگا اور مجھے وہ درخت بھی بتا دیا تھا جس کی لکڑی پر مجھے سُولی چڑھا دیا جائے گا۔" یہ سُن کر عبید اللہ ابنِ زیاد نے کہا "میں علیؑ کو جھوٹا کر دونگا صرف تیرے ہاتھ پیر کاٹوں گا زبان کو چھوڑ دوں گا، نہیں کاٹوں گا اور علیؑ کو جھوٹا ثابت کروں گا (معاذ اللہ) پس ابنِ زیاد مردود کے حکم سے رشیدؒ ہجری کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سُولی پر لٹکا دیا گیا۔ زبان نہیں کاٹی گئی۔ لیکن مظلوم و باوفا رشیدؒ اسی حالت مصیبت میں، ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے، سُولی پر لٹکے ہوئے عظمتِ شانِ اہلبیتِ طاہرینؑ کی احادیث بیان فرماتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ لوگو! یہ حدیثیں لکھ لو اس سے پیشتر کہ میری زبان کاٹ لی جائے۔ مجھے علم ہے کہ میری زبان ضرور کاٹی جائے گی۔ کیونکہ میرے مولا علیؑ کی بات کبھی غلط نہیں

ہوسکی۔ جب ابنِ زیاد کو اس خبر کی اطلاع ملی تو آگ بگولا ہوگیا اور سخت قہر و غضب کے ساتھ اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ "رشید ہجری کی زبان کاٹ لو" (تاکہ وہ احادیثِ فضائل اہلبیت بیان نہ کر سکیں) پھر وہ دم بھی نہ مار سکے گا۔ جب ابنِ زیاد کے سپاہیوں نے زبان کاٹنے کے لئے رشید ہجری سے کہا کہ "زبان نکالو" تو جناب رشید نے فرمایا کہ "شقی ابنِ زیاد نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ میری زبان چھوڑ کر، میرے مولا علیؑ کو معاذ اللہ جھوٹا بنائے گا۔ لیکن وہ شقی خود جھوٹا ثابت ہوگیا۔ یہ کہکر زبان نکالی۔ جب زبان کٹ گئی تو جناب رشید ہجری رحمۃ اللہ علیہ شہید ہوگئے۔" سبحان اللہ! کیا شانِ ایمان و وفا ہے کہ سُولی پر بھی ذکرِ علیؑ کرتے رہے اور دُنیا کو بتا گئے کہ حضرت علیؑ کو آئندہ واقعات کا علم خدا کی طرف سے حاصل تھا۔ رشید ہجریؒ کا صبرِ عظیم ایمان والوں کے لئے شاندار نمونۂ وفا و صبر ہے۔ اے رشیدؒ باوفا! آپ پر لاکھوں سلام ہوں۔

حضرتِ میثم تمارؒ کی شہادت کی خبر

مناقبِ مرتضویؑ میں مولانا محمد صالح کشفی جشتی نے لکھا ہے کہ ایک روز حضرتِ امیر المومنین علیہ السّلام نے اپنے مصاحب خاص حضرت میثم تمارؒ سے فرمایا "اے میثمؒ! اگر حاکمِ شام تجھے بُلائے اور مجھ سے اظہارِ بیزاری و نفرت کرنے کو کہے تو تُو کیا کرے گا؟" جناب میثمؒ نے عرض کیا "مولا! میں یہ کام ہرگز نہ کروں گا۔ اور آپ کی دوستی کا دامن کبھی نہ چھوڑوں گا۔" حضرت علیؑ نے فرمایا "خدا کی قسم! وہ تیرے قتل کا اور تجھے سُولی چڑھانے کا حُکم دے گا۔ اور تیرے منہ میں لگام بھی دلوائے گا۔" حضرت میثمؒ نے کہا "یا مولا! میں صبر کروں گا۔ اپنا سر اور جان بچانے کی خاطر آپ کی محبت و مودّت سے اور اپنے اعتقاد سے ہرگز روگردانی نہیں کروں گا۔" حضرت علیؑ نے فرمایا "اگر تو ایسا کرے گا تو آتشِ دوزخ سے محفوظ و مصون رہے گا اور بہشت میں میرے ساتھ ہوگا۔"

پھر مدت گذر جانے کے بعد آخر وہ وقت آگیا کہ حاکمِ شام کے حکم سے جناب میثم تمارؒ کو گرفتار کر کے اس کے سامنے لایا گیا۔ تو حاکمِ شام نے کہا "اے میثمؒ! اگر تو اپنی

زندگی چاہتا ہے تو علیؑ ابن ابی طالبؑ سے نفرین کر" (نعوذ باللہ من ذالک) حضرت میثمؒ نے فوراً فرمایا کہ "حضرت امیرالمومنین علیؑ کے دشمنوں اور علیؑ پر نفرین کرنے والوں پر ابدالآباد تک اللہ کی لعنت ہو۔ اور اے حاکم شام سن لے جو تو نے کہا ہے وہ ظلم ہرگز نہ کروں گا۔" تب حاکم شام کے حکم سے عمران بن حریث کے گھر کے دروازے پر حضرت میثمؒ کو اُلٹا لٹکا دیا گیا۔ چار روز کے بعد میثمؒ کے دہن مبارک سے خون جاری ہو گیا۔ لیکن اُس حالت کرب شدید میں بھی علیؑ کے عظیم وفادار میثمؒ تمار یہ کہہ رہے تھے کہ "آؤ مجھ سے پوچھو تاکہ میں تم لوگوں پر بنی اُمیّہ کے فسادات وعیوب ظاہر کر جاؤں۔" جب حاکم شام کو اس بات کی اطلاع پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ "میثمؒ کے منہ میں لگام دے دو تاکہ وہ بات ہی نہ کر سکے۔" پس جس روز جناب میثم رحمۃ اللہ علیہ کے منہ میں لگام دی گئی اُسی روز میثمؒ کی شہادت ہو گئی۔ حضرت علیؑ نے سب حال پہلے ہی بتا دیا تھا۔ حضرت میثم رحمۃ اللہ علیہ پر لاکھوں سلام، جنھوں نے جان قربان کر دی محبت علیؑ کو نہ چھوڑا۔

اِن واقعاتِ شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ آئندہ کے واقعات کا وہبی علم رکھتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ حضرت قنبرؒ، حضرت رشید ہجریؒ اور حضرت میثم تمارؒ کی مظلومیت اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ عترتِ اہلبیتؑ سے تمسّک رکھنے والوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جاتے رہے۔ اسی لئے "تمسّک بالثقلین" رکھنے والے علوم اہلبیتؑ کی نشر و اشاعت سے بہت زیادہ محروم رہے اور مظلوم و مقہور ہونے کی وجہ سے اہل بیتؑ کے ارشادات کے مطابق، علوم ترقی پر زیادہ کار تحقیق نہ کر سکے اور ظالموں کے ظلم و ستم کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُمّت زوال و پسماندگی کا شکار ہو گئی

اہلبیتؑ کے علم وہبی کی ایک شاندار مثال

ارجح المطالب میں حاکم کا حوالہ دے کر یہ واقعہ لکھا ہے کہ "محمد بن عیسیٰ بن حبیب کہتا ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو خواب میں دیکھا کہ ہمارے شہر کی مسجد میں آپؐ فروکش ہوئے ہیں۔ میں حضورؐ کے سلام کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ اور سرکار کے سامنے مدینہ کی کھجوروں کے پتّوں کا طبق رکھا ہوا ہے جس میں

صیحانی کھجوریں ہیں۔ آپؐ نے مجھ کو اُن میں سے آٹھ کھجوریں عطا فرمائی ہیں۔ جب اس خواب پر بیس دن گزر گئے تو جناب امام ابوالحسن علی الرضا مدینہ سے تشریف لائے اور اُسی مسجد میں اُترے۔ اور لوگ سلام کے لئے دوڑے۔ میں بھی آپؑ کے پاس گیا۔ دیکھا کہ آپؑ اُسی مقام پر تشریف رکھتے ہیں جس جگہ پر کہ میں نے جناب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو خواب میں دیکھا تھا۔ اور مدینہ کی کھجور کے پتوں کا طبق صیحانی کھجوروں سے بھرا ہوا آپؑ کے سامنے رکھا ہوا ہے۔ میں نے سلام عرض کیا۔ آپؑ نے مجھے قریب بلاکر مٹھی بھر کر کھجوروں میں سے عطا فرمائیں۔ میں نے اُن کو شمار کیا تو اُسی تعداد کے مطابق (یعنی آٹھ) پائیں۔ جو مجھے حضرت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے خواب میں عطا فرمائی تھیں۔ میں نے جناب امام علیہ السّلام سے عرض کیا "آپؑ مجھے زیادہ عطا کریں" آپؑ نے فرمایا "اگر تجھے جناب نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم زیادہ عطا کریں گے تو ہم بھی زیادہ دیں گے (یعنی اگر تجھے حضرت رسولؐ خدا نے خواب میں زیادہ عطا فرمائی ہوتیں تو میں بھی زیادہ دیتا)۔

یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت امام علی رضاؑ کو محمّد بن عیسیٰ بن حبیب کے خواب کا پورا علم تھا جو سوائے وہبی علم کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اہلِ بیتؑ کے پاس وہبی علوم ہیں۔ جن کو حاصل کرنے کے لئے عوام الناس اہلبیتؑ کے محتاج ہیں۔ اسی لئے رسولؐ خدا نے ان سے تمسّک رکھنے کا حکم دیا ہے تاکہ علم حاصل ہو سکے۔ اور اُمّت کو اختلاف و افتراق سے محفوظ رکھنے کے لئے سچّے ہادیوں کا پتہ بتا دیا جائے۔

اہلبیتؑ طاہرین "حَبلُ اللہ" ہیں

تفسیر ثعلبی میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام نے قرآن مجید کی آیۂ مقدّسہ **وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا** کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ "اللہ کی وہ رسّی" "حَبلُ اللہ" ہم ہیں۔ (یعنی ہمارے ذریعہ ہی سے اور ہمیں سے وابستہ

نہ کہ اُمّت مُتّحد ہو سکتی ہے) ینابیع المودۃ میں مولانا محمد سلیمان حنفی مُفتی اعظم قسطنطنیہ لکھتے ہیں کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السّلام نے فرمایا کہ "بدعت نواز لوگ شجرۂ نبویہ کے آئمۂ دین کو چھوڑ گئے تھے۔ بعد میں آنے والے ہمارے اُمرین کوتاہی کرتے ہوئے دُنیا سے چلے گئے۔ ان لوگوں نے اپنے نظریات کا دارومدار قرآن کی متشابہ آیات پر رکھا اور تفسیر اپنی رائے سے کی اور صحیح احادیث پر بہتان باندھے۔ اُمّت اختلاف اور فرقہ بندی میں گرفتار ہو گئی ہے۔ ایک دوسرے پر کُفر کا فتویٰ عائد کرتے ھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب کے وارث ہی آیات کی تفسیر کا حق رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے نجاست کو دُور رکھا ہے۔ اور ان کو ایسا پاک رکھا ہے کہ جو طہارت کا حق ہے"۔ یہ آیۂ تطہیر کی جانب اشارہ ہے جو اہلِ بیت کی شان میں نازل ہوئی۔ پس معلوم ہوا کہ تفسیرِ قرآن کا حق، قرآن کے اُن ساتھیوں ہی کو ہے جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں گے۔ اور وہ عترتِ اہلبیت ہیں۔

اب ہم وہ مختلف علوم سے تعلق رکھنے والے ارشاداتِ ثقلین پیش کرتے ہیں جن سے اُن علوم کے متعلق رہنمائی ہوتی ہے۔

فصلِ اوّل

عِلمِ طِبّ وجرّاحی وحِفظانِ صحت

ہمارا مقصدِ تحریر محض یہ ہے کہ اِن علوم کے بارے میں "ثقلین" نے جو ہدایات دی ہیں یا تعلیمی ارشادات فرمائے ہیں انہیں پیش کرکے یہ دعوتِ غور و فکر دی جائے کہ جو "مسلّمات" مفکرینِ عہدِ جدید نے آج کے مشینی دَور میں معلوم و تسلیم کئے ہیں ہمارے ہادیوں نے ان کی نشاندہی صدیوں پہلے فرمادی تھی۔ چنانچہ صرف "علمِ طبّ و جرّاحی و حفظانِ صحت" ہی کے متعلق اگر "اقوالِ ثقلین" اور اُنکی تشریح کو تحریر کیا جائے تو پُورا دفتر بن جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا ایک مختصر سا حصہ پیش کیا جارہا ہے جس سے علمِ "ثقلین" کے بحرِ بیکراں کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔

اِنسانی تخلیق و تشریح

چونکہ یہ فصل علم طب و جرّاحی و حفظانِ صحت سے متعلق ہے لہٰذا ہم سب سے پہلے اس ضمن میں تشریحِ تخلیقِ انسانی کے بارے میں ثقلین کے چند ارشادات نقل کرتے ہیں۔

تشریحِ تخلیقِ اِنسانی

نقل اوّل قرآنِ حکیم اسے یوں بیان فرماتا ہے کہ "اور ہم نے اِنسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اُسے محفوظ مقام (رحم مادر) میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہمیں نے نطفہ کو جما ہوا خون بنایا۔ پھر ہم نے ہی (اس) جمے ہوئے خون کو گوشت کا لوتھڑا بنا دیا۔ اور پھر ہمیں نے (اس) لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں۔ اور پھر ہمیں نے (ان) ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر

ہمیں نے اس کو (روح ڈال کر) ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔ تمام برکتوں کا مالک اللہ ہی تو ہے جو تمام بنانے والوں سے بہتر ہے۔"

انسان کی خلقت معمولی جرثومے سے ہوتی ہے جو آلۂ خورد بین کے بغیر نظر بھی نہیں آتا۔ حکیم مطلق کی صناعی کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ جب مَرد کے جرثومے کا نمبر عورت کے جرثومے کے نمبر سے زیادہ ہوتا ہے اور یہ آپس میں ملتے ہیں تو انسان کو جنم دیتے ہیں۔ اور آپس میں ملنے کے بعد دو سے چار اور چار سے آٹھ اور اسی طرح آگے حصّوں میں تقسیم ہوتے جاتے ہیں جس سے جسم انسانی بنتا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی طرح احادیث میں بھی تکمیل جسم انسانی کی چھ منازل ہی کا ذکر ملتا ہے۔ اور چھٹی منزل فیضان روح کی ہے۔ ان ہی چھ منازل کے لحاظ سے اگر کسی بھی مرحلے پر اس جنین کو ضائع کر دیا جائے تو اس کی دیت (کفّارہ) یا جُرمانہ مُعیّن کیا گیا ہے۔ چنانچہ نقل دوم کے چھٹے ہادی حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا کہ "دیت کے جو پانچ حصّے ہیں وہ اس لئے ہیں کہ ان میں سے نطفہ کے لئے ایک حصّہ "علقہ" (یعنی منجمد خون) کے لئے دو حصّے، مُضغہ (یعنی لوتھڑے) کے لئے تین حصّے، عظام (یعنی ہڈیوں) کے لئے چار حصّے اور مکمّل تخلیق جسمانی (بلا رُوح) کے لئے پانچ حصّے۔ بعد از دُخولِ رُوح لڑکے کے لئے پانچ حصّے اور لڑکی کے لئے اس کا نصف یہ مکمل دیت ہے لیکن اگر جنین کو حالتِ حمل میں ضائع کر دیا جائے تو نر و مادہ کی نصف نصف۔

اس تعجب خیز تخلیقِ انسانی کے بیان میں عظمتِ خلّاقِ عالم کو مولائے کائنات حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السّلام نے اپنے ایک خطبے میں یوں بیان فرمایا ہے کہ

"تمام حمد و ثنا۔ بندوں کے پیدا کرنے والے اللہ کے لئے ہے (جس نے) زمین کو بچھایا۔ پانی کو بہایا۔ بلند زمینوں کو سرسبز بنایا۔ وہ ازلی ہے اس کی کوئی ابتدا نہیں اور ابدی ہے اس کے "تک" رہنے کی کوئی حد نہیں۔ وہ اوّل ہے اور ہمیشہ بلا مُدّت کے باقی رہنے والا ہے۔ اس کے لئے پیشانیاں خم اور لب توحید سرا ہیں۔ اس نے تخلیق

اعالم کے وقت ہر چیز کی حدیں بنادیں تاکہ کوئی چیز اس سے مُشابہ نہ ہو سکے۔

(اَب) ہم حد بندیوں، حرکتوں اور اعضاء و جوارح سے اس کو محدود نہیں کرسکتے (یعنی وہ محدود نہیں۔ متحرک چیزوں کی طرح نہیں اور اعضاء و جوارح نہیں رکھتا اگر معاذ اللہ ایسا ہوتا تو محدود ہو جاتا پھر خدا نہ ہوتا) اس کیلئے "کب سے تھا؟" نہیں کہا جا سکتا اور "کب تک رہے گا؟" کے الفاظ سے مُدت کی حد مُقرر نہیں کی جاسکتی، وہ ظاہر ہے مگر "کیسے" ؟ نہیں کہا جا سکتا۔ پوشیدہ ہے مگر "کس چیز میں ؟" نہیں کہا جا سکتا۔ وہ جسم نہیں کہ ختم ہو جائے۔ نہ پردے میں ہے کہ گھیر لیا جائے۔ وہ چیزوں میں مل کر (یا چپک کر) قریب نہیں (ہے) نہ اُن سے جُدا ہو کر دُور ہے۔ (یعنی لوازم جسم و مکان سے پیداشُدہ صفتوں کا اس پر بولنا اور اُسے ویسا سمجھنا غلط ہے) اس سے بندوں کی کوئی ذرا سی گردش نظر، کسی لفظ کی تکرار، ٹیلوں پر چڑھنے یا تاریکی شب میں قدم بڑھانے کی کوئی حالت پوشیدہ نہیں۔ اور اندھیری پُرسکون رات ہو یا وہ چاندنی رات ہو کہ جس میں چمکتا چاند اپنی چاندنی پھیلاتا ہے اس سے پوشیدہ نہیں اور جب اندھیری یا چاندنی رات کے بعد روشن سورج کا طلوع ہونا اور ڈوبنا بھی اس سے مخفی نہیں۔ زمانے کے انقلاب (اوقات کی تبدیلی) آنے والی رات کی آمد، دن کا ڈوبنا اور بدلنا وہ بھی اس سے چھپا ہوا نہیں وہ ماضی کی ہر سابقہ مُدت سے پہلے موجود تھا اور سرشمار و حساب سے قبل موجود تھا۔ محدود کرنے والوں کے صفاتی اندازوں اور جسمانی سمتوں کی انتہاؤں، مکان و منزل میں ٹھہرنے والوں کی سی تمام حد بندیوں سے پاک اور بلند ہے۔ اس لئے کہ حدیں تو اس کی مخلوقات کے لئے قائم ہیں۔ جن کی نسبت غیر خدا کی طرف دی جاتی ہے۔ خدا کی طرف نہیں دی جا سکتی۔

چیزوں کی تخلیق ازلی اصولوں پر نہیں کی (کیونکہ اس کے سوا کوئی ازلی نہیں) نہ ابدی ابتداؤں پر (کہ وہ پابند قانون بنا ہو) بلکہ جسے پیدا کرنا تھا اُسے پیدا کر کے اس کی حدیں قائم کیں۔ اور جو تصویر بنانا تھی اُسے بنایا۔ اور بہترین صورت بنی۔ کوئی چیز اس سے پہلو نہیں بچاتی۔ اور کسی چیز کی اطاعت سے اُسے کوئی نفع نہیں ہوتا گزشتہ

مرنے والوں کا اُسے اُسی طرح علم ہے جیسے موجودہ زندوں کے بارے اور بلند آسمانوں میں جو کچھ ہے اس کا علم اسے اسی طرح ہے جس طرح اسے ان تمام چیزوں کا علم ہے جو نیچے کی زمینوں میں ہیں[1]

اے انسانِ معتدل خلقت! اور اے وہ وجود کہ جس کی نشو و نما رحم تاریک اور بے شمار پردوں میں ہوئی۔ تو خالص مٹی سے بنیاد پا کر محفوظ و مضبوط آرام گاہ (رحم مادر) میں مدت معینہ تک رکھا گیا۔ اور تو شکم مادر میں مخفی رہ کر جنبش کرتا رہا ہے۔ اس حالت میں کہ جنین تھا۔ نہ کسی بات کا جواب دے سکتا تھا اور نہ کسی کی آواز سن سکتا تھا۔ پھر اپنی قرارگاہ (رحم مادر) سے ان دیکھی دُنیا میں آ پہنچا۔ اور آیا بھی اس حالت میں کہ اس دُنیا کی راہ سُود و زیاں سے واقف نہ تھا۔ (غور تو کر) تجھے کس نے پستانِ مادر سے دودھ کا چوسنا بتایا؟ اور کس نے ضرورت کے وقت طلب و ارادہ سے آشنا کیا؟

پس وہ کہ ہوا کہ جو شکل و صورت رکھنے والی ہستی کے صفات جاننے سے عاجز ہو وہ اُسے پیدا کرنے والے کے صفات جاننے سے کیوں نہ عاجز ہوگا؟

(حقیقت یہ ہے کہ) مخلوق کے حدود و صفات کے ذریعے خالق کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہی دور از کار بات ہے"

اس خطبہ میں جناب امیرؑ نے انسان کو توجہ دلائی ہے کہ اس کی تخلیق اللہ کی صفتِ خالقیت کا کیسا نمونہ ہے۔ اور خدا کتنا باعظمت ہے جس نے ایسی ہستیاں خلق کیں جو رنگ و مزاج اور ترتیب میں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اور صانع عالم کی صنعت کا شاندار نمونہ ہیں۔

اسرارِ نظامِ تخلیقِ انسانی حضرت امام جعفر صادقؑ انسانی تخلیق کے اسرار پر یوں روشنی ڈالتے ہیں۔

"جس وقت بچہ رحم مادر میں ہوتا ہے۔ اُس کو تین پردے ڈھانپے ہوتے ہیں:۔

---

[1] ان الفاظ میں مولا علیؑ نے یہ واضح کر دیا کہ زمینیں کئی ہیں۔

(۱) پیٹ (ABDOMEN) (۲) رحم (UTRUS) (۳) بچہ دانی۔ اس بے بسی کے عالم میں جنین نہ تو اپنی ذات کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی نقصان۔ رب العالمین اُسے اتنی ہی غذا پہنچا دیتا ہے جتنی اُس کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اور جب اس کی تخلیق مختلف مراحل طے کرتی ہوئی پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے تو اس کا پوست اس قابل ہو جاتا ہے کہ گرمی و سردی کے اثرات برداشت کر سکے۔ اور اس کی آنکھیں اس قابل ہو جاتی ہیں کہ روشنی کی متحمل ہو سکیں تو وہ شکم مادر سے اس دُنیا میں آتا اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ اور اس وقت اُسے وہی غذا دی جاتی ہے جو اس کے لئے مناسب و موزوں ہوتی ہے۔ اب رب العالمین کی ربوبیت دیکھئے کہ وہ گندہ خون جو شکم مادر میں جنین کی خوراک تھی اُسے دودھ کی صورت میں بدل کر ماں کی چھاتیوں میں جگہ دے دیتا ہے اور اس نوزائیدہ کے لئے یہی دودھ کامل ترین غذا ہے۔ نومولود قدرت کے الہام سے اپنی زبان باہر نکالتا ہے اور ننھے ننھے ہونٹوں کو ہلاتا ہے گویا زبان حال سے غذا طلب کر رہا ہے۔ ماں کے دودھ سے نہ صرف اپنی بھوک مٹاتا ہے بلکہ اسی سے نشو و نما کے فوائد بھی حاصل کرتا ہے۔ جب تک بچے کے لطیف مزاج اور نازک طبیعت کے لئے یہ دودھ مناسب غذا ہوتی ہے۔ اسی دودھ پر قناعت کئے رہتا ہے۔ لیکن جونہی جسمانی بالیدگی کے لئے اسے دوسری غذائی چیزوں کی ضرورت دامن گیر ہوتی ہے تو قانونِ قدرت کے مطابق اس کے معدے اور آنتوں میں ہضم و انہضام کی قوت پیدا کر دی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ نسبتاً ذرا ثقیل تر چیزیں بھی ہضم کر سکے۔ اس کے بعد وہ منزل آتی ہے کہ دانت نکلنے لگتے ہیں تاکہ بچہ اپنی خوراک کو پیس کر نرم کر سکے۔ اسی طرح منازلِ طفلی کو طے کرتا ہوا جب حدِ بلوغت پر پہنچتا ہے تو صنف کے مطابق صرف مرد کے چہرے پر بال آ جاتے ہیں تاکہ عورت و مرد کی جنس میں امتیاز ہو سکے۔

خلقتِ انسانی کی یہ ترتیب اور جوڑ بند (JOINT CONSTRUCTION) جو بالآخر مکمل ہو کر رہتے ہیں۔ اور جن میں سے ہر ایک کمالِ قدرت کا نمونہ ہے۔ ان میں کوئی نقص موجود نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ بغیر کسی خالقِ مدبر کے از خود وجود میں آ گئے ہوں؟

اگر جنین کو ماں کے رحم میں غذا نہ پہنچتی تو وہ اس سبزے (گھاس) کی مانند خشک ہو کر رہ جاتا جسے پانی نہ دیا گیا ہو۔ اور اگر دردِ زہ (LABOUR PAIN) بچے کی ولادت کا سبب نہ بنتا تو بچہ زندہ بگور کے مثل ہو جاتا۔ اگر ولادت کے وقت ماں کا دودھ نہ اُترتا تو شدتِ بھوک سے ہلاک ہو جاتا یا لوگ اسے ایسی غذا دیتے جو اس کی لطافتِ مزاج کے مناسب نہ ہوتی۔ اس لئے ایسا کرنا موجب فساد ہوتا۔ اور دیگر غذاؤں کی ضرورت کے وقت اسے دانت ہی نہ دیئے جاتے تو کیونکر انسانی زندگی گزار سکتا اور کاروبارِ زیست میں کیونکر شریک ہوتا؟

بچے کی کم عقلی

اللہ کے ہر کام میں مصلحت کار فرما ہے۔ اگر بچہ پیدا ہوتے ہی صاحبِ عقل و ادراک ہوتا تو آنکھ کھلتے ہی غیر مانوس اشیاء دکھائی دیتیں یا محسوس ہوتیں تو حیران رہ جاتا۔ اس مشاہدہ عالم کے تحمل کی تاب نہ لا سکتا۔ وہ کپڑے میں لپیٹنے، گہوارے میں سُلانے، جھولوں میں جھُلانے، گود اور کاندھوں پر اُٹھانے سے اذیت کا احساس کرتا، مگر نظامِ جاری میں چونکہ اس کے قویٰ ضعیف ہوتے ہیں اس لئے مجبوراً وہ اسی صورت سے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر بچے کو پیدا ہوتے ہی عقل و شعور، قوی الجثہ، مضبوط اعضاء عطا کر دیئے جاتے تو دوسروں کی امداد کے بغیر ہی زندگی بسر کرتا۔ پس دُنیا میں آتے ہی اپنے ماں باپ سے الگ ہو جاتا۔ ان سے اُنس و محبت ہی نہ کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اجتماعی زندگی کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ تربیتِ اولاد کی حکیمانہ مصلحتیں ختم ہو جاتیں اور بڑھاپے میں اولاد اپنے والدین کا سہارا نہ بنتی۔

اعضائے انسانی کی حکمتیں

اگر جسمِ انسانی کے ہر عضو پر فرداً فرداً غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہر عضو میں کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہے۔ پاؤں چلنے کے لئے ہیں۔ آنکھیں دیکھنے کے لئے ہیں۔ دانت و دہن کھانے کیلئے ہیں۔ معدہ ہاضمہ کے لئے ہے۔ جگر زہریلے اجزاء کو جُدا کرنے کے لئے ہے۔

دہریوں کے عذر کا جواب

ممکن ہے کہ بعض لوگ عذر کریں کہ سب کام "فطرت" کے اور "طبیعت" کے کرشمے ہیں۔ تو وہ بتائیں کہ تم جو "طبیعت" یا "فطرت" کا نام لیتے ہو کیا وہ دارائے عقل و شعور اور صاحب قدرت و ارادہ ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ "ہے"۔ تو بس سمجھ لیں کہ خود غرضی و بے دینی کی وجہ سے خداوند کریم کی جگہ 'فطرت' کا نام اور خالق کائنات کی بجائے 'طبیعت' کا نام لیتے ہیں۔ کیونکہ پھر انہوں نے اس اصول کو تسلیم کر لیا کہ تمام کرشمے کسی صاحب قدرت و ارادہ و حکمت کے ہیں۔ اور اگر جواب نفی میں دیں اور کہیں کہ طبیعت شعور و ارادہ نہیں رکھتی تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بے شعور چیز سے یہ تمام باشعور افعال سرزد ہوں اور بے ارادہ و قدرت سے قادرانہ و ارادی اعمال کا ظہور ہو۔ جن کا ہر فعل ان گنت حکمتوں اور مصلحتوں سے بھرپور ہے۔

جسم کے تمام اعضا کی تشریح

ایک عیسائی نے حضرت صادق آل محمد علیہ السّلام سے جسم کے اعضاء کی تشریح دریافت کی۔ آپ نے فرمایا: "خداوند عالم نے انسان کو بارہ جوڑوں پر پیدا کیا ہے اور اس کی ۲۴۸ ہڈیاں اور ۳۶۰ رگیں ہیں جو تمام جسم کو سیراب کرتی ہیں۔ ہڈیاں جسم کو تھامے ہوئے ہیں اور گوشت ہڈیوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اور پٹھے گوشت کو جکڑے ہوئے ہیں۔ دونوں بازوؤں میں ۸۲ ہڈیاں ہیں۔ ہر ایک میں ۴۱ اور ان سے کف دست میں ۳۵ ہڈیاں ہیں اور کلائی میں دو ہیں اور بازو میں ایک ہے اور کندھے میں تین ہیں۔ اور اسی حساب سے دوسرے بازو میں ہر ٹانگ میں ۴۳ ہڈیاں ہیں جن میں ۳۵ پاؤں میں دو پنڈلیوں میں تین گھٹنے میں، ایک ران میں اور دو چوتڑ میں ہیں۔ پشت میں ۱۸ مہرے ہیں۔ دونوں پہلوؤں میں ۱۸ پسلیاں ہیں۔ گردن میں آٹھ ہڈیاں ہیں۔ سر میں ۳۶ ہڈیاں ہیں۔ ان کے علاوہ منہ میں ۲۸ یا ۳۲ دانت ہوتے ہیں۔"

دورِ جدید کے علماء نے امام جعفر صادق علیہ السّلام کی اس تشریح کو درست تسلیم کیا ہے۔ اور اسی تشریح جعفری کی روشنی میں طالبانِ تحقیق مزید معلومات سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔

خاص بات قابلِ تذکرہ یہ ہے کہ علوم و فنون کو تاریخی روشنی میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں لوگوں کے علوم و فنون میں اضافے اور ترامیم ہوتی رہی ہیں لیکن جو نظریات ہادیانِ برحق نے پیش کئے ہیں آج تک ان میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں نکل سکی۔ مثلاً یہی "علم تشریح" باقاعدہ ایک علیحدہ علم بن چکا ہے۔ اور سینکڑوں کتب اس پر لکھی جا چکی ہیں لیکن باوجود اس ترقی کے جو عرفان ان حضرات کے کئی سو سال قبل کے ارشادات میں نظر آتا ہے کہیں اور دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اس میں مزید تحقیقات کا شوق ہو تو "حدیثِ مفضل"[۱] کا مطالعہ فرمایئے۔

جسم کے اجزا کی تقسیم اور ولادت ہونے یا نہ ہونے کی وجہ

سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے ایک سائل نے دریافت کیا جسم میں کون سے اعضا مرد کی طرف سے ہوتے ہیں اور کون سے عورت کی طرف سے؟ آپؐ نے فرمایا "ہڈیاں، رگیں اور پٹھے مرد کی طرف اور گوشت، خون اور بال عورت کی طرف سے ہوتے ہیں"۔ سائل نے عرض کی آپؐ نے سچ فرمایا اور بتایئے کہ کیا وجہ ہے کہ بعض کے اولاد ہوتی ہے اور بعض کے نہیں؟" تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "جب نطفہ سُرخ اور گدلا ہو تو اولاد نہیں ہوتی اور جب نطفہ صاف ہو تو اولاد ہوتی ہے"۔

حضورؐ سرورِ کائنات نے ولادت کے ہونے اور نہ ہونے کے متعلق چودہ سو برس قبل ایک عظیم سائنسی حقیقت کا انکشاف فرمایا جس طرف موجودہ سائنسی دنیا کی ابھی تک رسائی نہیں ہوئی۔ ضرورت ہے کہ اس پر ریسرچ و تجربات کئے جائیں۔

والدین سے مشابہت اور فرق قد

ایک یہودی نے پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا کہ "کونسی چیز بچے کو ماں باپ سے مشابہ کرتی ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا "جب مرد کا مادۂ تولید عورت کے

---

[۱] جو امام جعفر صادقؑ کا خطبۂ توحید ہے جسے مفضلؒ کو امامؑ نے خود لکھوایا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ "توحید الائمہ" مرتبہ مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری عام دستیاب ہے۔

مادۂ تولید پر غالب آجائے تو بچہ مرد کی شکل پر جاتا ہے اور اگر عورت کا مادہ غلبہ پا جائے تو بچہ ماں کی شکل پر ہوگا۔"

قد اسی طرح حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ "قد لمبا یا چھوٹا کیوں ہوتا ہے؟" تو آپؑ نے فرمایا "اگر نطفہ خارج ہو کر رحم میں دائرہ بناتا ہے تو بچہ پست قد کا ہوتا ہے اور اگر نطفہ لمبا گرتا ہے تو بچے کا قد لمبا ہوتا ہے۔

حکمت وضع جسم انسان حضرت امام صادق فرماتے ہیں کہ "اے مفضلؒ! غور کرو کہ انسان کو اس خلقت میں دیگر بہائم پر کیسا شرف وفضیلت حاصل ہے، کہ یہ سیدھا اور کھڑا پیدا کیا اور کیسا برابر ہو کر بیٹھتا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ تمام اشیاء کو اپنے ہاتھوں سے لے سکے اور اپنے اعضاء سے حاصل کر سکے۔ کام کرنا اور تدبیر کرنا اس کے لئے آسان ہو۔ اگر جھکا ہوا یا اوندھا چارپاؤں کی مانند بنایا جاتا تو وہ کبھی کام نہ کر سکتا جو اس حالت میں کر لیتا ہے۔"

جفت وطاق اعضاء جفت وطاق اعضاء کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: غور کرو اے مفضلؒ اُن اعضاء و جوارح میں جو ایک ایک پیدا کئے گئے ہیں اور دو دو۔ اور دیکھو کہ اس میں حکمت کیا ہے؟ اور کیا موزونیت ہے دیکھو سر اُن اعضاء میں سے ہے جو ایک ہی پیدا کیا گیا، ہرگز ممکن نہ تھا کہ اس کے دو سر یا زیادہ بنائے جاتے اگر ایک سر کے ساتھ دوسرا سر بھی لگا دیا جاتا تو انسان پر بلا ضرورت ایک بوجھ بڑھ جاتا کیونکہ تمام ضروری حاسے ایک ہی سر میں موجود ہیں۔ پھر اگر دو سر ہوتے تو اس آدمی کے دو حصے ہو جاتے کیونکہ ایسی صورت میں اگر وہ ایک ہی سر سے گفتگو کرتا تو دوسرا سر محض بیکار ہوتا۔ اگر دونوں سے ایک ہی قسم کی گفتگو کرتا تو ایک فضول تھا اور ایک سر سے کچھ گفتگو اور دوسرے سر سے کچھ اور گفتگو کرتا تو سننے والا یہ بھی نہ سمجھ سکتا کہ کس کی بات قابل قبول ہے۔ اور کس کی نہیں۔ اسی طرح کے اور بھی کئی مبحث پیدا ہوتے۔

اور ہاتھ دو پیدا کئے گئے۔ انسان کے لئے ہرگز بہتر نہ ہوتا، اگر اس کا ایک ہاتھ بنایا جاتا کیونکہ یہ اس کے اُن کاموں میں خلل انداز ہوتا جنہیں وہ کرتا ہے اور جن کی اسے ضرورت

ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ترکھان اور معمار کا ایک ہاتھ شل ہو جائے تو اس بات پر قادر نہ ہوگا کہ وہ اپنے پیشہ کو بخوبی کر سکے اور اگر یہ کوشش کرے گا بھی تو اُسے خوش اسلوبی سے نہیں کر پائیگا اور وہ کام ویسا نہ ہوگا جیسا دونوں ہاتھوں سے ہو سکتا ہے۔

دماغ امام علیہ السلام دماغ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر تم دماغ کو دیکھو تو ایسا پاؤ گے کہ کئی تہ بہ تہ جھلیوں میں لپٹا ہوا ہے تاکہ اُسے آفتوں سے محفوظ رکھا جا سکے اور وہ متحرک نہ ہونے پائے۔ اسی کے اوپر ایک کھوپڑی پاؤ گے جو آہنی خود (یعنی لوہے کی ٹوپی) کی مانند ہے تاکہ ہر وہ ضرب جو اس پر پڑے یا ہر ایسا گزند جو خارج سے اُسے پہنچے آسانی سے مغز پر اثر نہ کر سکے۔ پھر کھوپڑی کو بالوں کا لباس پہنے پاؤ گے۔ تاکہ گرمی و سردی سے اس کی حفاظت ہو سکے۔ کیا خدا کے علاوہ کوئی دوسرا ایسی حکمتوں اور باریکیوں سے اس اہم ترین عضو اور مرکز فہم و ادراک کی نگہداشت کر سکتا ہے؟

کان، آنکھ اور دل اگر انسان آنکھوں سے محروم ہوتا تو حیات اس پر کس قدر گراں ہوتی! یہی وجہ ہے کہ یہ عضو انسانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ صانع عظیم نے آنکھوں کو سر میں مقام عطا کیا تاکہ خطروں سے محفوظ رہے اور اس سے ہر شے دیکھ بھی سکے۔ پھر پلکوں کے ذریعے ان آنکھوں کی حفاظت کا اہتمام فرما دیا اور اگر آنکھوں کا مستقر ہاتھ پاؤں کی مانند جسم کے نچلے حصے میں ہوتا تو کیا کیا آفتیں نہ ہوتیں جو ان تک راہ نہ پاتیں؟ اور اگر آنکھیں پیٹ یا پشت میں لگا دی جاتیں تو ان سے دیکھنا کس قدر دشوار ہوتا۔ ذرا ان پلکوں پر بھی نظر کرو۔ کس خوبی سے پردوں کی طرح ان آنکھوں کے سامنے آویزاں ہیں۔ اور گوشۂ چشم کو حلقہ کی مانند ایسے طریقے سے ترتیب دیا گیا ہے کہ جب بھی انسان چاہتا ہے، لٹکا لیتا ہے۔ اور جب بھی مرضی ہوتی ہے اُٹھا لیتا ہے۔ ذرا سوچو کہ اللہ نے کان کے اندرونی حصے کو کیسا پیچیدہ بنایا ہے تاکہ آواز کان میں پڑ کر پیچ و تاب کھاتی ہوئی کان کے داخلی پردوں سے ٹکرائے۔ اگر آواز ایک ہی مرتبہ پردوں سے ٹکراتی تو امکان یہ تھا کہ نرم و نازک پردے مجروح ہو جاتے۔ اے مفضل! جو شخص بہرہ ہوتا ہے۔ اس کے بہت سے کام بند رہتے ہیں کیونکہ وہ آوازوں کے سننے سے محروم رہتا

ہے اور لوگوں کو اس کے ساتھ معاشرت دشوار ہوتی ہے۔ اور لوگ اُسے مل کر دل میں تنگی محسوس کرتے ہیں (کیونکہ اُسے بات سمجھانا دشوار ہوتا ہے) وہ حاضر ہے لیکن غائب کے مانند زندہ ہے مگر مُردہ کے مانند۔

اے مُفضّلؒ! ذرا اس پر بھی تو غور کرو کہ "دل" جو تمام اعضائے انسانی سے زیادہ حساس واقع ہوا ہے کس عمدگی سے اللہ نے اسے پردوں میں ڈھانپ کر محفوظ کر دیا ہے اس کے ارد گرد مضبوط ہڈیوں کا پنجرہ بنا دیا گیا ہے۔ پھر ان ہڈیوں پہ گوشت و پوست چڑھا دیا ہے تاکہ دل خطرات و آفات سے محفوظ رہے۔

بال اور ناخن

ذرا بال اور ناخنوں پر تو غور کرو! چونکہ یہ بڑھتے ہیں اس لئے انہیں ایسا بے حس بنا دیا کہ ان کے ترشوانے میں انسان کو کوئی تکلیف محسوس نہ ہو۔ اگر بالوں اور ناخنوں میں بھی حس بھر دی جاتی تو کٹواتے وقت یا تو تکلیف برداشت کرتا یا پھر ان کو بڑھے جانے دیتا۔

مُفضّلؒ نے اس مقام پر یہ عرض کی "فرزند رسولؐ! حق تعالیٰ نے انسان کو ایسا ہی کیوں نہ پیدا کر دیا کہ اس کے بال و ناخن بڑھنے ہی نہ پائیں؟" حضرتؑ نے فرمایا "بالوں کی افزائش اور ناخنوں کی نمو سے نیز ان کے کٹوانے اور کوتاہ کرنے سے متعدد امراض جسم سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اسی مصلحت کے پیشِ نظر حکم دیا گیا ہے کہ انسان ہر ہفتے میں ناخن لے اور بال کٹوائے۔ اور جہاں صلاح و فائدہ نہیں ہے۔ وہاں بالوں کو پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ مثلاً اگر آنکھ میں اُگ آتے تو انسان نظر و بینائی سے محروم ہو جاتا۔ اگر مُنہ کے اندر پیدا ہو جاتے تو ذائقہ و مزہ ہی جاتا۔ اور کھانا پینا ناگوار ہو جاتا۔ اسی طرح اگر ہاتھوں کی ہتھیلی میں بال اُگ آتے تو چیزوں کے چھونے میں لُطف نہ آتا۔ اور یہ اہتمام محض اکیلے انسان کے لئے ہی نہیں کیا بلکہ اُن حیوانات کے لئے بھی کیا کہ جن کے جسم پر بال ہیں اُن کے بھی اُن جگہوں پر جہاں فائدہ نہ تھا اللہ نے بال نہیں اُگائے۔ خلقتِ عالم کی ان خوبیوں پر نگاہِ غور و فکر تو ڈالو۔ موجوداتِ عالم کی اس کاریگری کو ملاحظہ تو کرو کہ کس حُسن و خوبی کے ساتھ ہر چیز مصلحت و حکمت

کے ساتھ بنائی گئی جس میں ذرا برابر بد نظمی اور کجی نہیں ہے۔

ناظرینِ کرام "ثقل دوم" کے چھٹے ہادی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے مندرجہ بالا تشریحی اقوال اس قدر اہم اور گرانقدر ہیں جن کو پڑھ کر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ آپ اپنے علم ذاتی سے گویا انسان کی رگ رگ سے واقف تھے۔ سر کے بالوں سے لیکر پاؤں کے ناخنوں تک مکمل شناسائی تھی۔ اور اگر صرف "توحید مفضل" ہی کا مطالعہ کر کے غور کیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ علم تشریح کی جدید روشنی میں امام عالی مقام کے اقوال و نظریات منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اور پوری آب و تاب کے ساتھ درخشندہ ہیں۔ یہ اقوال آج بھی ہدایت کا پیغام دے رہے ہیں۔ انکی دعوتِ فکر آج بھی اسی طرح عام ہے جس طرح تیرہ صدیاں قبل تھی۔ ان ارشادات سے اہلبیتؑ کی علمی عظمت معلوم ہوتی ہے۔

ہندی طبیب کا مناظرے کے بعد مسلمان ہونا

منصور کے دربار میں حضرت صادق آلِ محمدؐ کا ایک ہندی طبیب سے مناظرہ ہوا۔ چنانچہ وہ سوال جواب ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہ واقعہ یوں ہوا کہ دربار منصور دوانقی میں ایک ماہر ہندی طبیب آیا۔ اور اس نے اپنے کمال علم کا اظہار کیا اور اسی دربار میں امام جعفر صادقؑ سے جو گفتگو کی وہ یہ ہے۔

ہندی طبیب:۔ کیا آپ کو میرے اس علم سے اتفاق ہے جو میں نے بیان کیا؟

امامؑ:۔ نہیں۔ ہمارے پاس اس سے کہیں بہتر علم ہے۔

طبیب:۔ (حیرانگی سے) وہ کیا؟

امام صادقؑ:۔ میں حار (گرمی) کا علاج بارد (سردی) سے کرتا ہوں۔ تر کا علاج خشک سے کرنے کا عادی ہوں۔ اور ہر کام میں خدا پر بھروسہ و یقین رکھتا ہوں۔ جو میرے جدّ امجد (رسول اللہؐ) نے فرمایا اس پر عمل کرتا ہوں۔ اے طبیب ہندی! معدہ بیماریوں کا گھر ہے۔ بدن جس چیز کا عادی ہے۔ وہ اس کے لئے مہیّا کرو۔ کیا

طِب اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے ؟ کیا تو خیال کرتا ہے کہ میں نے یہ علم طِب کی کتابوں سے حاصل کیا ہے ؟

طبیب :- ہاں ضرور۔

امامؑ برحق :- خدا کی قسم ایسا نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ پایا خدا ہی سے لیا۔ بتاؤ تم زیادہ عالم ہو یا میں ؟

طبیب :- میں زیادہ عالم ہوں۔

امامؑ :- میں تجھ سے سوال کروں ؟

طبیب :- ضرور کیجیے۔

چنانچہ حضرت صادق آلِ محمدؐ نے مندرجہ ذیل سوالات طبیب ہندی سے کئے اور وہ کسی ایک کا بھی جواب نہ دے سکا۔

۱۔ سر میں درزیں کیوں ہیں ؟
۲۔ سر کے اوپر بال کیوں بنائے گئے ؟
۳۔ پیشانی پر بال کیوں نہیں ہوتے ؟
۴۔ آنکھیں بادام کی طرح کیوں بنائی گئیں ؟
۵۔ بھنوئیں آنکھوں کے اوپر کیوں ہیں ؟
۶۔ پیشانی پر شکن کیوں ہوتی ہے ؟
۷۔ دونوں آنکھوں کے درمیان ناک کیوں بنائی گئی ؟
۸۔ ناک کے سوراخ اس کے نچلے حصے میں کیوں ہیں ؟
۹۔ لب اور مونچھیں منہ کے اوپر کیوں بنائی گئیں ؟
۱۰۔ دانتوں کو تیز، ڈاڑھوں کو چوڑا اور کو نچلوں کو لمبا کیوں بنایا گیا ؟
۱۱۔ مردوں کو داڑھی کیوں دی گئی ؟
۱۲۔ ہتھیلیوں پر بال کیوں نہیں ہوتے ؟
۱۳۔ ناخن اور بال کیوں بے جان ہوتے ہیں ؟

۱۴۔ دل صنوبر کی مانند کیوں بنایا گیا؟
۱۵۔ پھیپھڑوں کو دو حصّوں میں بانٹ کر، دونوں کی حرکت اپنے مقام پر کیوں رکھی گئی؟
۱۶۔ جگر کو محدّب (کبڑا) کیوں بنایا گیا اور گردے کو لوبیا کے دانے کی شکل کیوں دی گئی؟
۱۷۔ گھٹنے کا جوڑ پیچھے کیوں نہیں مڑتا ہے؟
۱۸۔ تلوے کو خالی کیوں رکھا گیا؟

جب طبیب ہندی جواب دینے سے عاجز رہ گیا تو اُسنے کہا ان سوالوں کے جواب آپ ہی ارشاد فرمائیں۔ چنانچہ حضرت صادق نے اِن سوالات کے جوابات یوں بیان فرمائے:۔

۱۔ سَر میں درزیں یا جوڑ ہیں کیونکہ عُضو مجوف اگر بغیر فصل کے ہو تو درد تیزی سے اس کی طرف آئے گا۔ اور اگر الگ الگ رہیں تو درد دور رہیگا۔
۲۔ سر پر بال اس وجہ سے ہیں تاکہ ان کی جڑوں کے ذریعے دماغ تک تیل پہنچ سکے اور دماغ کا بخار ان کے ذریعے سے خارج ہو سکے۔ اور گرمی سردی ان کے ذریعے اندر داخل ہو سکے۔
۳۔ پیشانی کو بالوں سے اس لئے خالی کیا کیونکہ وہ آنکھوں کے لئے روشنی تقسیم کرنے کی جگہ ہے (یعنی اگر اس جگہ بال ہوتے تو مرکزِ تقسیم نُور کو نقصان ہوتا)
۴۔ آنکھ کو بادام کی شکل اس لئے دی گئی کہ اس میں دوائی آسانی سے ڈالی جاسکے۔ اور میل کچیل اِدھر اُدھر سے نکل جائے۔ اگر یہ گول ہوتیں تو دوا یا سُرمہ کی سلائی انکے اندر نہ پہنچ سکتی اور نہ میل کچیل باہر نکلتا۔
۵۔ آنکھوں پر بھنوئیں اس لئے بنائی گئی ہیں تاکہ ان کے ذریعے آنکھوں تک بقدرِ ضرورت نور پہنچے۔ اے ہندی! کیا تو نہیں دیکھتا کہ جب روشنی زیادہ ہوتی ہے تو آدمی اپنا ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیتا ہے تاکہ حسبِ ضرورت آنکھوں تک روشنی پہنچ سکے۔
۶۔ پیشانی پر خطوط اس لئے ہوتے ہیں تاکہ سَر کا پسینہ آنکھوں میں داخل نہ ہو سکے۔ یہ اُن نہروں کی مانند ہیں جو پانی کو روکتی ہیں (اس قولِ امامؑ سے یہ ہدایت ملتی ہے کہ نہروں

کے ذریعے سے سیلاب کا پانی روکا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے دریاؤں میں جب کبھی سیلاب آتا ہے تو اس وقت نہروں کی وجہ سے کافی علاقے نقصان سے بچ جاتے ہیں)

۷۔ آنکھوں کے درمیان ناک اسلئے بنائی تاکہ نور دو طرف تقسیم ہو جائے اور ہر آنکھ کو برابر روشنی ملے۔

۸۔ ناک کے سوراخ نیچے کی طرف اس وجہ سے بنائے گئے تاکہ دماغ سے جو نزلہ و زکام کا پانی بہے وہ باآسانی خارج ہو جائے۔ اور خوشبوان کے ذریعے دماغ تک پہنچ سکے۔ اگر یہ سوراخ اوپر کو ہوتے تو نہ گندہ پانی نکلتا اور نہ ہی خوشبو دماغ تک پہنچ سکتی۔

۹۔ مونچھوں کو ہونٹوں کے اوپر بنایا کہ دماغ سے خارج ہونے والی رطوبت کو روکے رہیں۔ اور اگر یہ نہ ہوتے تو کھانا بے مزہ ہوتا۔

۱۰۔ دانتوں کو تیز اس لئے بنایا گیا کہ چیز کا کاٹنا آسان ہو۔ داڑھوں کو چوڑا اسلئے بنایا کہ چبانے میں دقت پیش نہ آئے۔ اور کوچلوں کو لمبا اس لئے بنایا تاکہ داڑھیں اور دانت مضبوط رہیں وہ ویسے ہی ہیں جیسے عمارت کے لئے ستون ہوا کرتے ہیں۔

۱۱۔ داڑھی مرد کے لئے اس لئے ہے کہ زن و مرد میں تمیز ہو سکے۔

۱۲۔ ہتھیلیوں پر بال اس لئے نہیں کہ اس سے لمس (یعنی چھونے) کا واسطہ ہے۔ ورنہ انسان کو حرارت، خنکی، نرمی (یا ملائمیت)، اور سختی (یا کھردرے پن) کا احساس نہ ہوتا۔

۱۳۔ بال اور ناخن اس وجہ سے بے حس بنائے گئے کہ ان کو کاٹنا ضروری تھا۔ اور اگر ان میں جان ہوتی تو یہ امر تکلیف دہ ہوتا۔

۱۴۔ دل کو صنوبر کے دانہ کے موافق اس لئے بنایا گیا کیونکہ وہ اُلٹا ہے۔ اور اس کا نازک سر پھیپھڑوں میں رکھا گیا ہے تاکہ اس کو خنکی ملتی رہے اور گرمی سے مضطرب نہ ہونے پائے۔

۱۵۔ پھیپھڑوں کو دو حصّوں میں اس لئے بانٹ دیا گیا کہ دل ان کے درمیان جگہ پا سکے۔ اور ان دونوں کی حرکت سے اسے ہوا ملتی رہے۔

۱۶۔ جگر کو محدّب اس وجہ سے بنایا گیا کہ معدہ ثقیل ہے اور وہ اس سے بخار کو کھینچ لیتا ہے۔ نیز گردے کو لوبیے کے دانے کی شکل کا بنایا کیونکہ وہ مادۂ تولید کے قطرہ قطرہ گرنے کی جگہ ہے اگر مربّع یا مدور ہوتا تو پہلا نقطہ دوسرے نقطے میں پھنس جاتا اور اس کے نکلنے میں جاندار کو فرحت حاصل نہ ہوتی۔ کیونکہ مادۂ تولید پشت کے مُہروں سے اترتا ہے یہ مادہ کپڑے کی طرح سکڑتا اور کُھلتا ہے۔ مادۂ تولید مثانہ کی طرف اس طرح جاتا ہے جیسے غلیل سے غُلّہ جاتا ہے۔

۱۷۔ گھٹنا پیچھے کی جانب اس وجہ سے نہیں مُڑتا کیونکہ انسان آگے کی طرف چلتا ہے اگر پیچھے مُڑتا تو گر جاتا۔

۱۸۔ تلوے اس لئے خالی ہوتے ہیں کہ زمین پر چلنا آسان ہو۔

یہ سُنتے ہی طبیبِ ہندی حیران و ششدر رہ گیا۔ بلا تامّل حضرت امام جعفر صادقؑ کی صداقت پر ایمان لے آیا۔ اور مشرف باسلام ہوگیا۔ اس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسولؐ ہیں۔ آپ (امام جعفر صادقؑ) اپنے زمانے کے سب سے بلند پایہ عالم ہیں۔"

یہ تھیں چند جھلکیاں افرادِ ثقلِ دوم کے علم تشریح الابدان کے متعلق، جن کا ایک ایک جملہ اپنے اندر بے پناہ علوم سموئے ہوئے ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ان پر بار بار غور کریں اور ان پر تحقیقات کر کے بنی نوعِ انسان کے لئے افادات مہیا کریں۔ ان ذواتِ مقدسہ نے جملہ قواعد حفظانِ صحت، تشخیص امراض و معالجات وغیرہ پر مکمل ہدایات فرمائی ہیں۔ لہٰذا قارئین کی منفعت کی خاطر ہم تاجدار امامت، امام ہشتم حضرت علی ابنِ موسیٰ الرضا علیہ السلام کے "رسالہ ذہبیہ فی اسرار علوم الطبیہ" سے کچھ ارشادات نقل کرتے ہیں۔

رسالہ ذہبیہ فی اسرارِ علومِ الطبیہ

یہ رسالہ دراصل حضرت امام رضاؑ کا ایک خط ہے۔ جو انھوں نے عبّاسی بادشاہ

"خلیفہ مامون الرشید" کے جواب میں تحریر فرمایا۔ ہمارے زیرِ نظر اس کا اردو ترجمہ ہے جو جناب مولانا حکیم سید مقبول احمد صاحب دہلوی اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے کیا تھا۔ اس رسالے میں امام نے پہلے حمد باری تعالیٰ فرمائی ہے پھر تحریر فرماتے ہیں۔

"میرے پاس بادشاہِ وقت کا خط پہنچا جس میں مجھ سے درخواست کی گئی ہے کہ میں اپنے تجربات اور اپنے بزرگوں کے اقوال کھانے پینے، استعمال ادویہ، فصد کرانے، پچھنے لگوانے، حمام کرنے اور نورہ وغیرہ لگانے کے متعلق یعنی جن جن امور سے اصلاحِ جسم ہوتی ہے اور جن کی ضرورت ہر شخص کو پیش آتی ہے، جمع کر کے بھیجدوں۔ چنانچہ میں نے وہ تفصیل وار جمع کر دیئے ہیں۔ اور بادشاہ کو جو تدبیریں خصوصاً اپنے لئے کھانے پینے میں، استعمال ادویہ میں، فصد کرانے اور پچھنے لگوانے میں قوتِ باہ بڑھانے اور عموماً اصلاحِ جسم میں اختیار کرنی چاہئیں وہ سب مشرح لکھدی ہیں۔ وباللّٰہ التوفیق (ہر توفیق اللہ ہی کی وجہ سے ہے)۔

اے بادشاہِ وقت آگاہ ہو کہ خدا اپنے بندے کو کسی مرض میں مبتلا نہیں کرتا جب تک کہ اس کے لئے دوا مقرر نہ فرما دے۔ جس سے اس کا علاج ہو سکے۔ پس ہر قسم کے مرض کے لئے ایک خاص قسم کی دوا ہے اور ایک علاج تدبیری موجود ہے۔ نیز اس بات سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے کہ جسمِ انسانی کی مثال سلطنت کی سی ہے۔ پس اس ملکِ جسد کا بادشاہ قلب (روح) ہے اور اس کے عامل اعصاب و دماغ۔ دارالسلطنت اس ملک کا "دل" ہے اور جاگیر اس کی کل جسم۔ اور مددگار دونوں ہاتھ، دونوں ہونٹ، دونوں آنکھیں، زبان اور دونوں کان ہیں۔ معدہ اور پیٹ اس کا خزانہ ہے۔ اور سینہ اس کا حجاب ہے۔ ہاتھ ایسے مددگار ہیں کہ بادشاہ کے حکم کے مطابق ہر کام کرتے ہیں۔ جس چیز کو وہ حکم دیتا ہے پاس لے آتے ہیں اور جس چیز کی نسبت حکم دیتا ہے وہ کر دیتے ہیں۔ پاؤں بادشاہ کو جہاں جہاں وہ چاہتا ہے لئے پھرتے ہیں۔ آنکھیں بادشاہ کو وہ چیزیں دکھاتی ہیں جو اس سے پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ بادشاہ خود پس پردہ ہے۔ اس تک کوئی چیز پہنچ ہی نہیں سکتی، مگر آنکھوں کے ذریعے سے

جو چراغ کا کام دے رہی ہیں۔ دو مددگار و پاسبان قلعۂ جسد دونوں کان ہیں۔ جو بادشاہ تک ایسی چیزیں پہنچا سکتے ہیں جو بادشاہ کے مزاج کے موافق ہوں یا بادشاہ اُن کو حکم دے دے۔ پس جب بادشاہ ان کے ذریعے کچھ سنتا ہے تو وہ ایک ڈھول (DRUM) بجادیتے ہیں جو انہیں میں موجود ہے جس کے ذریعے بادشاہ جو کچھ چاہتا ہے سُن لیتا ہے۔ اور جو مناسب سمجھتا ہے جواب دیدیتا ہے۔ بادشاہ کے ارادے ظاہر کرنے کا آلہ زبان ہے جس کی حرکت کئی آلات پر موقوف ہے۔ منجملہ اُن کے سانس کی ہوا۔ معدے کے ابخرات۔ ہونٹوں کی امداد ہے۔ پھر ہونٹوں میں جو قوت ہے اس کا وجود زبان کی موجودگی پر موقوف ہے۔ اسی طرح ایک کا وجود دوسرے کے لئے ضروری ہے۔ اب زبان کا اظہار جس کو کلام کہتے ہیں خوبصورت ہو نہیں سکتا سوائے اس صورت کے کہ ناک میں گونج کرے۔ اسی وجہ سے کلام کی زینت کے لئے ناک پیدا کی گئی ہے۔ جس میں کلام اسی طرح زینت پاتا ہے جیسے نفیری والے کی آواز نفیری میں۔ ناک کے نتھنے علاوہ اس نفیری کے کام دینے کے ایک اور خدمت بھی ادا کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ بادشاہ جن خوشبوؤں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اس تک پہنچاتے ہیں۔ اور بدبودار ہوا بادشاہ کو ناپسند ہوتی ہے ہاتھوں کو حکم دیتا ہے کہ سامنے آکر اس کو روک لیں۔ اس بادشاہ ملک جسم کے لئے ثواب بھی مقرر کیا گیا ہے اور عذاب بھی مگر اس کا عذاب دنیا ظاہری بادشاہوں کے عذاب سے زیادہ سخت ہے۔ اور اس کا ثواب اُن کے ثواب سے بمراتب اعلیٰ۔ اس کے عذاب کا نام رنج ہے اور ثواب کا نام خوشی۔ رنج کی اصل طحال (تلی) میں ہے۔ اور خوشی کی گردوں اور معدے میں جھلی (MEMBRANE) ہے۔ ان دونوں مقامات سے دو رگیں چہرے تک آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خوشی اور رنج کے آثار چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اور اس قسم کی رگیں سب کی سب بادشاہ اور اس کے عمال کے مابین راستے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس وقت کوئی آدمی دوا پیتا ہے۔ رگیں بادشاہ کے حکم سے دوا کے اثر کو بیماری کے مقام تک پہنچا دیتی ہیں۔ اے بادشاہ وقت! آگاہ ہو کہ جسم بمنزلہ عمدہ زمین کے ہے جس کا مقررہ معمول یہ ہے کہ اگر بقاعدہ تردد کیا جائے

اور ٹھیک اندازے سے اس میں آبپاشی کی جائے۔ یعنی نہ تو اتنا زیادہ پانی ہو کہ اس کو ڈبو دے اور نہ اتنا کم کہ خشک رہ جائے۔ تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھیتی قرار پکڑتی ہے اور فصل عمدہ پیدا ہوتی ہے۔ منافع زیادہ ہوتا ہے۔ اور اگر اس سے غفلت کی جائے تو ایسی خراب ہو جاتی ہے کہ ایک تنکا تک اس میں نہیں اُگتا۔ یہی حالت جسم کی سمجھنی چاہیے اگر کھانے اور پانی وغیرہ کی تدبیروں سے اس کی اصلاح کرتے رہیں تو صحیح رہتا ہے اور اس کی صحت سے عافیت برقرار رہتی ہے۔ پس جو چیزیں بادشاہ کے معدے کے لئے موافق ہیں ان کا خیال رکھنا چاہیئے کیونکہ وہ جسمانی قوت کے برقرار رکھنے والی ہیں۔ حتیٰ الامکان انہیں کا استعمال بھی چاہیئے۔ اور اے بادشاہ! یہ بھی یاد رکھ کہ طبیعتیں مختلف ہیں۔ اور ہر طبیعت اُسی شے کو پسند کرتی ہے جو اس کے مطابق اور موافق ہو۔ پس جو چیز بادشاہ کی طبیعت کے مطابق اور موافق ہو انہیں کو غذا میں اختیار کیا جائے۔ اور اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص اندازے سے زیادہ کھانا کھا لیتا ہے اُس سے اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور جو ایسے اندازے سے غذا کھاتا ہے کہ نہ زیادہ نہ کم۔ اس سے فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت پانی کی ہے۔ پس مناسب ہے کہ ضرورت کے مطابق کھانا کھایا جائے اور کچھ اشتہا (خواہش یا بھوک) باقی رہنے پر چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ بادشاہ کے معدے اور جسم کے لئے یہ معمول سب سے بہتر ہوگا۔ کیونکہ اس سے عقل زیادہ صحیح رہے گی۔ اور جسم ہلکا اور تندرست رہے گا۔ (یعنی زیادہ کھانا موٹاپے اور بیماری کا باعث ہے)

اے بادشاہ! موسم گرما میں ٹھنڈی چیزیں کھانی چاہیئں۔ جاڑے میں گرم اور معتدل موسم میں معتدل۔ مگر ضرورت سے زائد کبھی نہیں۔ اور جب کھانا سامنے آئے تو شروع اُن غذاؤں سے کرنا چاہیئے جو زود ہضم ہوں۔ پھر کسی چیز کا زود ہضم یا دیر ہضم ہونا کھانے والے کی عادت، طاقت، خواہش، موسم اور عمر وغیرہ پر موقوف ہے۔ مناسب یہ ہے کہ بادشاہ کے کھانا کھانے کا وقت گیارہ بجے دن کے قریب ہونا چاہیئے (وقت دوپہر مراد ہے)۔ یا تو دن رات میں ایک مرتبہ یا دو دن میں تین مرتبہ اس طرح کہ پہلے دن اوّل صبح پھر شام پھر دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب اور اس دن شام کا کھانا موقوف۔ یہ

وہ حکم ہے جو جدِ امجد جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے جدِ اعلیٰ جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام کو دیا تھا۔ ایک دن ایک مرتبہ کھانا کھایا کرو اور دوسرے دن دو مرتبہ کھانا اس انداز سے ہو کہ نہ کم نہ زیادہ۔ اور کچھ اشتہا باقی رہنے پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ پھر بادشاہ کھانا کھانے کے بعد وہ صاف اور پرانی شراب جس کا پینا حلال ہے اور جس کا نسخہ میں آگے بیان کروں گا استعمال کرنا چاہیئے۔" (یعنی وہ شربت جس کا نام شرابِ صالحین ہے)

اس کے بعد امامِ عالی مقام نے سال کے بارہ مہینوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے ہر مہینے کے لئے الگ الگ ہدایات فرمائی ہیں کہ نزاکت وقت و موسم کے لحاظ سے کن کن چیزوں کا استعمال مناسب ہے۔ اور کس کس چیز سے پرہیز ضروری ہے۔ شائقین "رسالہ ذہبیہ" کا مطالعہ کرکے ان نصائح سے فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ محض قیدِ اختصار کی وجہ سے ہم وہ تفصیل نقل نہیں کر رہے۔

نکتہ "ثقل دوم" کے اس راہنما نے فلسفہ حیات کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ اور خصوصاً "سلطنتِ جسدِ انسانی" کو جس تمثیلی انداز سے بیان فرمایا ہے۔ یہ اسلوب بیان ہی اس حقیقت کی قوی ترین دلیل ہے کہ یہ کسی عام بشر کا کلام نہیں۔ ڈاکٹر حکیم اور معالج باوجود علم طب کی جدید ترقی کے آپؑ کی طبی ہدایات کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اور آپؑ کے نظریات کی مخالفت کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوئی ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ ان فرمودات کی روشنی میں اگر کوئی شخص اپنی حفاظتِ صحت کا انتظام کرے تو وہ کبھی بھی بیمار نہیں ہوسکتا۔ ہمیشہ تندرست رہے گا۔ اس فلسفہ میں عدل قائم رکھنے یعنی "اعتدال" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور اس بات کی بھی نصیحت کی گئی ہے کہ حسبِ پسند غذا حدِ اعتدال میں استعمال کی جائے لہٰذا محض کج عقیدگی کی بنا پر من پسند غذا استعمال نہ کرنا ایک غیر فطری خیال ہوگا۔ اسلئے جو لوگ کہتے ہیں کہ اسلام محض "جَو کے سوکھے ٹکڑے کا دوسرا نام ہے وہ ہم پر افترا باندھتے ہیں۔ حالانکہ "دین" نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ ہاں مگر پرہیز حفظ ماتقدم کے تحت اور اس مسئلہ کو ہم اپنے "اقتصادیات و معاشیات" کے باب میں تفصیل سے بیان کریں گے۔

نسخہ شربت شراب الصّالحین

"شراب الصّالحین" جو مکتوب امام رضاؑ کا نفسِ مضمون ہے۔ اس کے بارے میں امام فرماتے ہیں اس سے جسم انسان کی کامل حفاظت ہوسکتی ہے اور اس کا نسخہ درج ذیل ہے۔

• مویز منقیٰ عمدہ سیاہ رنگ تین سیر لے کر اوّل دھو ڈالیں کہ مٹی وغیرہ صاف ہو جائے۔ اس کے بعد بیج نکال کر صاف پانی میں بھگو دیں۔ پانی چار چار انگل منقیٰ کے اوپر رہے۔ موسم سرما میں تین دن رات اسی حالت میں رکھنا چاہیئے۔ اور موسم گرما میں ایک شبانہ روز جس پانی میں منقیٰ تر کی جائے وہ جہاں تک ممکن ہو بارش کا ہو۔ اور اگر وہ نہ ملے تو ایسے میٹھے دریا یا ندی کا ہو جس کے چشمے کا رُخ مشرق کی طرف ہو۔ کیونکہ اس قسم کا پانی سُبک اور صاف ہوتا ہے۔ اور حرارت و برودت کا اثر فوراً قبول کر لیتا ہے اور پانی کے عمدہ خواص یہی ہیں۔

بھیگنے کی مدت کے بعد ایک صاف پتیلے میں ڈال کر اتنا جوش دیا جائے کہ منقیٰ پھول کر مضمحل ہو جائے اور پھر پتیلہ چولھے سے اُتار کر ٹھنڈا کر لیا جائے۔ اور منقیٰ کو خوب نچوڑ کر عرق لے لیا جائے۔ اور پھر پتیلے میں ڈال کر ایک لکڑی سے اس کی گہرائی ناپ لی جائے۔ اور ہلکی آنچ پر اتنے عرصے تک پکایا جائے کہ دو ثلث ($\frac{2}{3}$) عرق کم ہو جائے۔ (یہ اُسی لکڑی پر نشان لگانے سے اندازہ ہو جائے گا) اس کے بعد اکیس تولے شہدِ خالص کف گرفتہ اس میں ڈال دیا جائے۔ شہد کے ساتھ مندرجہ ذیل ادویات خوب باریک کوٹ چھان کر علیحدہ علیحدہ وزن کر کے ایک باریک کپڑے کی تھیلی میں رکھ کے تھیلی کا مُنہ مضبوط باندھ کر شراب میں ڈال دینا چاہیئے۔

زنجبیل ۳۔مد۔ قرنفل ۱۔مد۔ دارچینی ۱۔مد۔ زعفران ۳۔مد۔ سنبل الطیب ۱۔مد۔ تخم کاسنی ۱۔مد۔ مصطگی رومی ۱۔مد۔

لہ عہدِ جدید کے حکماء نے یہ بات تجربے سے ثابت کی ہے۔

(یعنی سفید سونٹھ ۳ ½ ماشے، لونگ ۱ ۳/۴ ماشہ، دارچینی ۱ ۳/۴ ماشہ، زعفران ۳ ½ ماشے بالچھڑ ۱ ۳/۴ ماشہ، تخم کاسنی ۱ ۳/۴ ماشہ، مصطگی رومی ۱ ۳/۴ ماشہ)

اس کے بعد لکڑی سے ناپ کر پھر نشان لگایا جائے اور کوئلے کی آنچ پر اتنی دیر اور پکایا جائے کہ شہد کے برابر پانی اور جل جائے۔ اور تھیلی کو کفگیر وغیرہ سے برابر پتیلے میں دبائے رہنا چاہیئے تاکہ ادویہ کی قوت شراب میں آتی جائے اور اتنی دیر تک دبائے رہنا چاہیئے کہ شہد کے برابر پانی جل جائے۔ اس کے بعد پتیلہ اُتار کر ٹھنڈا کر کے کسی چینی یا شیشے کے برتن میں بھر کر تین مہینے تک اُسے اس حالت میں رہنے دینا چاہیئے تاکہ ادویہ باہم ہم مزاج ہو جائیں۔ وہ شراب جس کا استعمال جائز ہے یہی ہے۔

جس وقت بادشاہ اس قاعدے سے جو میں بتا چکا ہوں کھانا کھا چکے تو اس شراب میں سے نصف چھٹانک لے کر چھٹانک بھر آبِ خالص میں ملا کر پی لے۔ اس مقدار کے پینے کے بعد مندرجہ ذیل امراض سے ایک دن اور ایک رات یقیناً حفاظت ہوگی۔ کل قسم کے بارد (ٹھنڈے) مزمن (پرانے) درد جیسے نقرس (ٹخنے کا درد) اور ریاح (بادی) وغیرہ اور ہر قسم کے اعصابی، دماغی اور معدے کے درد، اور بعض قسم کے جگر اور طحال (تلی) کے درد اور مرض وغیرہ۔ اگر اس کے بعد پانی کی سچی خواہش ہو تو پہلے جتنا پانی پینے کی عادت ہو، اس سے نصف پینا چاہیئے کہ یہ عمل بادشاہ کے جسم کو تندرست رکھے گا۔ اور مقاربت کی قوت بڑھ جائے گی۔ اس لئے کہ بدن کی صحت اور اس کا قیام اور اس کی خرابیاں سب کھانے اور پینے پر موقوف ہیں۔ اگر کھانے پینے کی اصلاح ہو جائے گی تو بدن کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔ اور اگر کھانے پینے میں فساد ہوگا تو بدن میں بھی فساد ہوگا۔

اے بادشاہ! یہ بھی یاد رکھ کہ نفوس کی قوت، مزاجِ بدن کے تابع ہے اور مزاجِ بدن ہوا کے تابع ہے۔ پس جیسے جیسے ہوا مختلف اوقات و مقامات میں بدلتی رہتی ہے ویسے ہی مزاج بھی بدل جاتے ہیں۔ کبھی ہوا ٹھنڈی ہوتی ہے کبھی گرم ویسا ہی بدن میں بھی اثر ہوتا ہے۔ اور جن مقامات میں ہوا مسلسل گرم یا سرد ہوتی ہے وہاں ویسا ہی

اثر مزاجوں کے مُطابق صورتوں سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور جہاں ہوا معتدل ہوتی ہے وہاں اجسام کا مزاج بھی معتدل ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ مزاجوں کے دیگر تصرّفات و تغیّرات، حرکاتِ طبیعی سے دُرست ہوتے رہتے ہیں۔ حرکاتِ طبیعی یہ ہیں۔ ہضم، مقاربت، سونا، چلنا پھرنا اور آرام کرنا وغیرہ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام اجسام کی بنا (یعنی بُنیاد) چار طبیعتوں پر قرار دی ہے۔ سودا (NIRVOUS)، صفرا (BILLIOUS)۔ خُون (SANGUINE PLETHORIC)۔ بلغم (LYMPHATIC)

دوُ اِن میں سے حار ہیں (یعنی گرم ہیں) اور دوُ بارد (ٹھنڈے)۔ پھر ان دوُ دوُ میں بھی اختلاف رکھ دیا ہے۔ یعنی دونوں حار (گرم) میں ایک رطب (یعنی تر) ہے اور ایک خشک۔ اسی طرح دونوں باردوں (ٹھنڈوں) میں ایک تر ہے اور ایک خشک پھر چاروں خلطوں کو جسم کے چار حصّوں پر تقسیم کیا ہے۔ سر، سینہ، پہلو اور پیٹ کا نیچے نیچے کا حصّہ۔ پس سر، دونوں کان، دونوں آنکھیں، دونوں نتھنے اور مُنہ اس سارے سلسلے میں خون کا غلبہ ہوتا ہے۔ سینے میں بلغم اور ریاح کا، پہلوؤں میں خلط صفرا کا اور پیٹ کے نیچے کے حصّے میں سودا کا غلبہ ہوتا ہے۔

اے بادشاہ! یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ نیند دماغ کی حاکم ہے۔ اور بدن کی قوّت کا مدار اسی پر ہے۔ پس بادشاہ جب سونے کا ارادہ کرے تو پہلے دائیں کروٹ لے اور پھر بائیں بدل لے۔ اور اسی طرح پہلو بدلتا رہے۔ یہاں تک کہ جب سو کر اُٹھے تو داہنی کروٹ ہی سے اُٹھے جس پر سوتے وقت لیٹا تھا اور اپنے نفس کو یہ بھی عادت ڈالے کہ جس طرح رات کو سونے کی عادت ہے اسی طرح سویرے اُٹھنے کی بھی عادت ہو۔ خاص کر جب دوُ گھنٹے رات باقی ہے۔ اس وقت سے اُٹھ کر بیت الخلا جانا چاہیئے اور اس میں ضرورت سے زیادہ نہ ٹھہرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے بواسیر پیدا ہوتی ہے۔

اے بادشاہ! یہ بھی یاد رکھ کہ عمدہ سے عمدہ چیز مسواک کے لئے درختِ جال کی شاخ ہے۔ اس سے نہ صرف دانت ہی صاف ہو جاتے ہیں بلکہ مُنہ بھی خوشبودار ہو جاتا ہے۔ مسوڑھے بھی مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اور دانت، کرم خوردہ (یعنی کیڑا لگے ہوئے)

ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ مگر اس میں بھی اعتدال شرط ہے۔ کیونکہ مسواک کی کثرت بھی دانتوں کو پتلا کر دیتی ہے۔ جو شخص دانتوں کی حفاظت چاہے مندرجہ ذیل منجن استعمال کرے۔

دانتوں کا عمدہ منجن

شاخ گوزن سوختہ۔ کزمارج۔ سعد کوفی۔ گل سُرخ، سنبل الطیب حب الاثل۔ مساوی الوزن۔ نمکِ سنگ چہارم وزن خوب باریک پیس کر بطور منجن استعمال کیا جائے کہ اس سے دانت اور ان کی جڑیں عارض ہونے والی تمام آفات سے محفوظ رہتی ہیں۔ جو شخص دانتوں کو محض صاف ستھرا ہی رکھنا چاہے تو وہ یہ منجن استعمال کیا کرے۔ نمکِ سنگ ایک جزو، کفِ دریا ایک جزو دونوں حل کر کے بطریق منجن استعمال کرے۔

چار حالتیں

اے بادشاہ! یہ بھی یاد رکھ کہ جو حالتیں انسان کی اوقات مختلفہ میں ہوتی ہیں وہ بھی چار ہیں۔ پہلی وہ حالت ہے جو پندرھویں سال سے پچیسویں سال تک رہتی ہے۔ یہ زمانہ اس کے شباب و حُسن اور خوبیوں کا ہے جسم میں خون کا غلبہ ہوتا ہے۔ دوسری حالت پچیس سے شروع ہو کر پینتیس برس تک رہتی ہے۔ اس میں عموماً خلطِ صفرا کا غلبہ ہوتا ہے جسمانی قوت کی انتہا کا یہی زمانہ ہے۔ کیونکہ پھر ایسی قوت کبھی نہیں آتی۔ پینتیس سے پھر تیسری حالت شروع ہوتی ہے۔ یہ ساٹھ برس تک رہتی ہے اس عمر میں خلطِ سودا کا غلبہ ہوتا ہے حکمت، موعظت، معرفت، درایت، انتظامِ امور، انجام بینی، صحتِ رائے اور ثابت قدمی کا یہی زمانہ ہے اور اس کے بعد چوتھی حالت شروع ہوتی ہے۔ اس میں بلغم کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ حالت جس میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ یہی ہے بڑھاپا، عیش کا منغص ہونا۔ زندگی کا وبال معلوم ہونا۔ تمام قوتوں کا گھٹتے جانا۔ جسم میں طرح طرح کی خرابیوں کا پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور انتہا اس کی یہ ہوتی ہے کہ گویا اس سے کبھی واقف ہی نہ تھا۔ یہاں تک کہ جاگنے کے وقت سونے لگتا ہے۔ سونے کے وقت جاگنے لگتا ہے۔ پہلی باتیں یاد نہیں رہتیں۔ اور جو تازہ ہوتی ہیں ان کو بھی بھول بھال جاتا ہے۔ گنتی میں غلطی ہونے لگتی ہے عہد و پیمان بھول جاتا ہے۔ چہرے کی رونق جاتی رہتی ہے۔ اور جو دن زندگی کے باقی

ہیں دن بدن جسم گھٹتا ہی چلا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ زمانہ خلط بلغم کا ہے۔ جس کا مزاج بارد و جامد (سستی) ہے اس کی برودت و جمودت بالآخر اس جسم خاکی کی فنا کا باعث ہوتی ہے "۔

جراحی

فصد و حجامت

"اے بادشاہ! میں یہاں تک تو وہ کُل باتیں بیان کر چکا جو جسم کی حفاظت، اس کے مزاج، اس کے احوال اور اس کی ضرورتوں کے متعلق ہیں۔ اب میں اس کے علاج وغیرہ کے متعلق بھی کچھ ضروری ذکر کئے دیتا ہوں۔ کہ کون کون سی دوائیں اور کون کون سی غذائیں کن کن اوقات میں مُناسب ہیں۔ پس بادشاہ کو پچھنے لگوانے منظور ہوں تو قمری مہینے کی بارہویں سے پندرھویں تک جس تاریخ میں چاہے پچھنے لگوائے کہ یہ صحتِ جسمانی کے لئے بہت مُفید ہوگا۔ مہینے کے آخر میں کبھی بھی پچھنے نہ لگوائے جائیں۔ سوائے اس صورت کے کہ بہت ہی اضطرار ہو۔ سبب یہ ہے کہ خون چاند کے گھٹاؤ کے ساتھ گھٹتا ہے۔ اور بڑھاؤ کے ساتھ بڑھتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ پچھنے کتنی مدت میں لگوانے چاہئیں؟ یہ ہر شخص کی عُمر پر موقوف ہے۔ مثلاً جو شخص بیس برس کا ہے اُسے چاہیئے کہ ہر بیس دن کے بعد ایک دفعہ پچھنے لگوایا کرے۔ اور جو تیس برس کا ہے وہ ہر تیس دن کے بعد ایک دفعہ اور جو چالیس برس کا ہے وہ ہر چالیس دن کے بعد ایک دفعہ اسی طرح اسی نسبت سے۔

اے بادشاہ! یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ پچھنوں سے ان چھوٹی چھوٹی رگوں کا خون نکلتا ہے جو گوشت میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس کی تصدیق اس سے ہوسکتی ہے کہ پچھنوں سے ضُعف نہیں ہوتا۔ جیسا فصد سے ہو جایا کرتا ہے۔ گدّی پر پچھنے لگوانا سر کے بھاری پن کو فائدہ کرتا ہے۔ رُخساروں پر پچھنے لگوانا سر، چہرہ اور آنکھوں کے امراض میں تخفیف کرتا ہے۔ داڑھ کے درد کو آرام دیتا ہے۔ کبھی کبھی فصد بھی پچھنوں کا بدل ہوسکتی ہے۔ کبھی ٹھوڑی کے نیچے پچھنے لگوائے جاتے ہیں۔ اس سے مُنہ آنے کا، مسوڑوں کے فساد کا اور مُنہ کے دیگر امراض کا علاج ہوسکتا ہے۔ اسی طرح دونوں مونڈھوں کے

درمیان پچھنے لگوانا اس خفقان کو دُور کرتاہے جو امتلاً (متلی ۔ قے) اور حرارت سے پیدا ہوا ہو۔ دونوں پنڈلیوں پر پچھنے لگوانا بھی امتلا کو بہت کم کر دیتاہے پُرانے دردوں کو خاص کر گُردے، مثانے اور رحم کے درد کو فائدہ کرتاہے اور ادرار حیض (یعنی حیض کو جاری) کرتاہے۔ مگر اس سے جسم کو لاغری اور سستی ہو جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی اس سے سخت غشی بھی عارض ہو جایا کرتی ہے۔ تاہم ہر قسم کے دُنبل اور پھنسیوں کے لئے فائدہ بخش ہے۔

وہ ترکیب کہ جس سے پچھنوں کی تکلیف کم معلوم ہو یہ ہے کہ پہلے خالی سینگی لگا کر اُسے آہستہ آہستہ چوسا جائے۔ ایسی سینگیاں باربار لگانے سے وہ جگہ سُرخ ہو جاتی ہے اور جلد نرم ہو جاتی ہے۔ جہاں کی فصد کھولنا منظور ہو وہاں کسی روغن کا مَلنا مناسب ہے کہ اس سے تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سینگی کے کناروں کو روغن لگا لینا بھی تکلیف کو کم کر دیتاہے۔ فصد کھولنے والے کو یہ خیال بھی رکھنا چاہیئے کہ جس رگ کی فصد کھولنا مقصود ہو اس میں گوشت کم ہو۔ تاکہ تکلیف میں کمی ہو۔ بہت سی رگیں ایسی بھی ہیں کہ جوڑوں سے زیادہ ملی ہوئی ہیں۔ اور بہت سی جلد کے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ جیسے "باسلیق" اور "اکحل" کہ ان کی فصد میں تکلیف کم ہوتی ہے اور سب سے زیادہ جن رگوں کی فصد میں تکلیف ہوتی ہے وہ "ذراع" اور "قیفال" ہیں۔ کیونکہ یہ مفاصل سے زیادہ قریب ہیں۔ ان پر جلد موٹی ہے۔ "موضع" فصد کو پہلے گرم پانی سے سینک پہنچانا لازم ہے تاکہ خون پگھل جائے۔ خاص کر سردی کے موسم میں اور زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے جلد نرم پڑ جاتی ہے جس سے تکلیف کم اور فصد آسان ہو جاتی ہے۔ اخراج خون کے متعلق جو کچھ ہم نے بیان کیا اس میں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ اس سے بارہ گھنٹے پہلے سے مقاربت سے اجتناب ہو۔ پچھنوں کے دن مطلع صاف ہو۔ بادل نہ ہوں۔ تیز ہوا بھی نہ چلتی ہو۔ اور خون اتنا نکالا جائے کہ رنگت بدلی ہوئی نظر آنے لگے۔ پچھنوں یا فصد کے دن حمام میں ہرگز نہ جائے کیونکہ اس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ سر اور جسم پر گرم پانی بہائے۔ اس میں ایک ساعت کی بھی غفلت نہ ہو اگر

حمام میں ہرگز نہ جائے کیونکہ اس سے دائمی بخار ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ جب پچھنے لگوانے کے بعد غسل کرے تو ایک نرم کپڑا پچھنوں کی جگہ پر ڈال لے۔ خواہ ریشمی ہو یا کسی اور قسم کا۔ اور ایک چنے کے برابر تریاقِ اکبر لے کر کسی شربت مفرح و معتدل میں ملا کر پی لے۔ یا کسی میوے کا عرق پی لیا جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو شربت ترنج پیا جائے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ملے تو تریاقِ اکبر منہ میں رکھ کر گھلائیں۔ اور سردی کا زمانہ ہو تو ایک گھونٹ گرم پانی پی لے۔ اگر گرمی ہو تو سکنجبین عنصلی و عسلی ایک گھونٹ پی لے کہ اس فعل سے بحکمِ خدا فالج، لقوہ، سفید داغ، کلف و جذام سے محفوظ رہے گا۔ انارِ شیریں کھانا مفید ہے۔ کیونکہ اس سے نفس کو قوت پہنچتی ہے۔ اور خونِ صالح پیدا ہوتا ہے مگر نمکین کھانا کھانے کی تین گھنٹے تک اجازت نہیں۔ کیونکہ اس سے کھجلی ہوجانے کا خوف ہے۔ ہاں جاڑے کا موسم ہو تو پچھنے لگوانے کے بعد بٹیر کا گوشت کھا کر شراب الصالحین پی لے۔ روغن خیری، مشک و گلاب سر میں ڈالا جائے۔ اور گرمی کا موسم ہو تو پچھنوں سے فارغ ہو کر ترکاری پڑا ہوا ترشی آمیز سالن یا سرکہ اور گوشت کھائیں۔ مرق یخنی پئیں۔ اور ترش چیزیں کھائی جائیں۔ سر پر روغن بنفشہ یا کدو کا نور گلاب میں آمیز کر کے ملا جائے۔ اور اوپر سے شراب الصالحین کھانا کھانے کے بعد پی جائے اور زیادہ چلنے پھرنے، غصے اور مجامعت سے اس دن پرہیز کیا جائے۔

ہدایاتِ حفظانِ صحت

حضرت امام رضا علیہ السلام نے جو ہدایات تحفظِ صحت کے بارے میں بادشاہ کو تحریر فرمائی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۔ انڈے اور مچھلیاں اکٹھے استعمال نہ کئے جائیں کیونکہ اس سے نقرس۔ قولنج (COLIC یعنی انتڑیوں میں درد) بواسیر اور ڈاڑھ کا درد پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ نبید اور دودھ ملا کر پینے سے نقرس و برص پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ جن گوشتوں اور مچھلیوں کو نمک لگا کر خشک کر لیا جاتا ہے ان کے استعمال

سے کھجلی (ITCH) پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ بکری کا گردہ، کلیجی، پھیپھڑا اور اوجھڑی کھانے سے مثانے میں تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔

۵۔ بھرے پیٹ سے حمام جانا قولنج کو دعوت دیتا ہے۔

۶۔ مچھلی کھا کر ٹھنڈے پانی سے نہانا فالج کا سبب ہو سکتا ہے۔

۷۔ رات کے وقت ترنج کھانے سے بھینگا ہونے کا خطرہ ہے۔

۸۔ حائضہ عورت سے جنسی مقاربت اولاد میں جذام پیدا کرتی ہے۔

۹۔ عورت سے فطری فعل کے بعد فوراً پیشاب نہ کرنا پتھری پیدا کرتا ہے۔

۱۰۔ ایک دفعہ کے بعد دوسری مرتبہ بلا غسل مقاربت کرنا جنونی (یعنی پاگل) اولاد پیدا کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔

۱۱۔ نیم برشت انڈے (یعنی آدھے پکے ہوئے (HALF FRIED OR HALF BOILED) کھانے سے نفخ شکم اور دمہ (ASTHAMA) پیدا ہوتے ہیں۔

۱۲۔ کچا اور بغیر گلا گوشت کھانے سے پیٹ میں کدو دانے (کیڑے) پیدا ہوتے ہیں۔

۱۳۔ زیادہ انجیر کھانے سے جسم میں جوئیں بہت پڑتی ہیں۔

۱۴۔ گرم یا میٹھی چیزوں کے بعد پانی پینے کی عادت سے دانت جلد گر جاتے ہیں۔

۱۵۔ شکاری چوپایوں اور گائے کا گوشت زیادہ کھانے سے عقل میں فتور آتا ہے ذہن بھدا ہو جاتا ہے ادبھول پیدا ہوتی ہے۔ الخ

ہدایات سرکار امیر المومنین علی علیہ السلام

حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ چار باتوں سے دوا و علاج کے محتاج نہیں رہو گے (۱) جب تک بھوک نہ لگے کھانا نہ کھاؤ (۲) کچھ کھانے کی خواہش باقی رہنے پر کھانا ترک کر دو۔ (۳) کھانا خوب چبا کر کھاؤ (۴) سوتے وقت رفع حاجت کر کے سوؤ۔

یاد رکھنے کی باتیں

حضرت امام علی رضاؑ نے مامون الرشید کو چند یاد رکھنے کی باتیں تحریر فرمائیں جن میں سے کچھ کا مفہوم حسب ذیل ہے :۔

۱۔ جو شخص مثانے کی شکایت سے محفوظ رہنا چاہتا ہو اُسے چاہیئے کہ پیشاب کبھی نہ روکے خواہ وہ کسی سواری ہی پر کیوں نہ ہو۔

۲۔ جو شخص معدے کی تکلیف سے بچنا چاہے وہ کھانے کے دوران پانی نہ پیئے اور اگر پیئے گا تو اس کے جسم میں رطوبت بڑھے گی۔ معدہ ضعیف ہوگا اور رگوں میں خوراک کی پوری قوت نہ پہنچ سکے گی۔ کیونکہ پانی کی وجہ سے کھانا لئی سا ہو جاتا ہے۔

۳۔ جو شخص "پتھری" کے کبھی نہ ہونے کا خواہش مند ہو وہ پیشاب کبھی نہ روکے اور مقاربت کے لئے امساک کی تدبیر نہ کرے۔

۴۔ بواسیر سے محفوظ رہنے کے لئے سات برنی خرمے گائے کے گھی میں تل کر ہر شب کھانا اور اپنے خصیوں پر چنبیلی کے تیل کی مالش کرنا چاہیئے۔

۵۔ قوت حافظہ بڑھانے کے لئے نہار منہ تین تولے مونیر منقی کھانا چاہیئے۔

۶۔ عقل بڑھانے کے لئے تین ہڑیں مُربّہ جو شکر میں ڈالا گیا ہو ہر روز کھانا مفید ہوگا۔

۷۔ نسیان کم کرنے کے لئے تین ٹکڑے مربّے ادرک کے جو شہد میں پڑا ہو روزانہ استعمال کرے۔

۸۔ جو شخص کان کے درد سے محفوظ رہنا چاہے اُسے چاہیئے کہ ہر روز سوتے وقت کانوں میں روئی رکھ لے۔

۹۔ جو شخص جاڑے میں زکام (CATARRH) سے بچنا چاہے تین چمچے شہد خالص روزانہ پی لیا کرے یا نرگس کے پھول سونگھ لیا کرے۔

شہد کی شناخت | امام رضاؑ فرماتے ہیں کہ شہد کی بعض شناختیں ہیں جن سے

اُن کے نفع و نقصان پہچانے جاتے ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اگر شہد کو سونگھنے سے فوراً پیاس معلوم ہو تو وہ شہد خالص ہوگا لیکن اگر اس کے چکھنے کے ساتھ ہی شدت کی گرمی معلوم ہو تو یہ قسم زہر قاتل ہے۔

۱۰۔ جسے منظور ہو کہ اس کا بدن ہلکا پھلکا رہے۔ موٹاپا نہ ہو۔ بہت گوشت نہ بڑھے اُسے لازم ہے کہ رات کا کھانا کم کرے۔

۱۱۔ ناف کی شکایت والے کو چاہیئے کہ ناف سے بچنے کے لئے سر میں تیل لگاتے وقت ناف میں بھی لگالیا کرے۔

۱۲۔ اور جو شخص یہ چاہے کہ ہونٹ نہ پھٹیں اور ہونٹوں پر پھنسیاں نہ نکلیں وہ سر میں جو تیل لگائے وہ ابروؤں پر بھی لگائے۔

۱۳۔ ریاحی درد سے بچاؤ کے لئے ہفتہ میں ایک مرتبہ لہسن استعمال کیا جائے۔

۱۴۔ جو شخص چاہے کہ بلغم پیدا ہی نہ ہو تو اُسے لازم ہے کہ ایک مثقال اطریفل صغیر نہار مُنہ کھالیا کرے۔

قواعدِ مسافرت

امامِ عالی مقام حضرت رضا علیہ السلام نے دورانِ سفر کی جو طبی حفاظتی تدابیر بتائی ہیں۔ اُن کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:۔

۱۔ خالی پیٹ یا زیادہ بھرے پیٹ سفر نہ کیا جائے بلکہ حدِ اعتدال پر رہنا چاہیئے۔

۲۔ دورانِ سفر ٹھنڈی مرطوب اشیاء کا استعمال مفید ہے۔ مثلاً تازہ گوشت سبزیاں سرکہ زیتون انگور تازہ۔

۳۔ پتلے جسم والے کو معمولی حرارت زیادہ نقصان دے سکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ خالی از طعام ہو۔ لیکن فربہ جسموں میں وہ فائدہ کرتی ہے۔ مسافروں کے لئے تکلیف سے بچنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ کسی نئی منزل کا پانی وہ اسوقت تک نہ پیئے جب تک کہ اس میں پہلی منزل کا کچھ پانی ملا نہ لے۔ گو ہوائیں

مختلف ہوں۔ تاہم پانی کے تبدیل کر لینے سے اختلاف ہوا کا نقصان بھی رفع ہو جاتا ہے۔

۴۔ مسافروں کو چاہیئے کہ اپنی جائے ولادت اور پروان چڑھنے کی جگہ کی تھوڑی سی مٹی اپنے ساتھ رکھیں اور منزل پر وارد ہو کر وہاں ایک برتن میں وہ مٹی ڈالکر اور پانی بھر کر خوب گھول دیا کریں اور جب پانی خوب صاف ہو جائے تو اُسے پیا کریں۔

طبّی ہدایات متعلقہ جنسیات

جنسیات کا موضوع اکثر احباب زیرِ بحث لانا خلافِ تہذیب و تمیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ طبّی لحاظ اور بقائے نسل کے لئے یہ انتہائی اہم حیثیت رکھتا ہے بلکہ اساس بقائے نسل بنی آدم ہے۔ اگر دین اس غیر معمولی اہمیت کے حامل شعبۂ حیات میں خاموشی اختیار کر لیتا اور اُمّت کو اس میدان میں بے ہدایت چھوڑ دیتا تو اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ (دورِ حاضرہ کی نسبت) معاشرہ اخلاقی برائیوں کا اور زیادہ شکار ہو جاتا۔ چنانچہ اسلام نے اس خطرہ کا بھی سدِّ باب کر دیا۔ اور اس موضوع پر نہایت مہذبانہ اور شائستگی سے متعدّد ہدایات فرمائیں جن پر عمل کرنے سے زندگی کی گاڑی کے دونوں پہیے (مرد اور عورت) صحیح و سالم اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہ سکتے ہیں۔ قرآن مجید (ثقلِ اوّل) میں کئی آیات ایسی ملتی ہیں جو اس موضوع سے متعلقہ ہیں۔ مثلاً ممانعتِ زنا کی آیات، رشتۂ ازدواجی (نکاح و متعہ) کے بارے میں احکام طہارتِ جنابت اور حیض کے بیان میں آیات، حلال و حرام عورتوں کا بیان وغیرہ وغیرہ اگر ان پر ذرا تفصیل سے غور کیا جائے تو ہر حکم اس قدر موزوں نظر آتا ہے کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔ ثقل اوّل یعنی کتاب اللہ کی طرح ثقل دوم (عترتِ اہل بیت) نے بھی اس گوشۂ حیات پر حسبِ ضرورت کافی روشنی ڈالی ہے اور ہم صرف "رسالہ ذہبیہ" سے "آدابِ مقاربت" کے متعلق حضرت علی رضا علیہ السلام کی

ہدایات محض مثال کے طور پر پیش کریں گے۔ امامؑ نے مامون عباسی کو تحریر فرمایا:۔

"اے بادشاہ! صحیح عمل کرنے والے کے لئے میں اس خط میں ضروری سب باتیں بیان کرچکا ہوں۔ اب صرف مُقاربتِ جنسی کے قواعد بیان کرنا باقی ہے۔

موسم گرما ہو یا سرما اوّل شب عورت کے پاس نہ جائے۔ کیونکہ اس وقت معدہ اور سب رگیں ممتلی ہوتی ہیں لہٰذا اس وقت جانے سے قولنج، فالج، لقوہ، نقرس پتھری، تقطیر (قطرہ قطرہ پیشاب آنا) فتق (آنتوں کی مرض ہے) ضعفِ بصارت وغیرہ امراض ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ بہتر ہے کہ جب ارادہ ہو تو آخر شب جائے۔ کہ اس سے جسم کی بھی اصلاح ہوتی ہے۔ اور اولاد پیدا ہونے کی زیادہ اُمید ہے۔ اور اس طرح جو اولاد خدائے تعالیٰ کو دینی منظور ہے وہ عقیل بھی ہوگی..... الخ

ان تدابیر کے بعد امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو شخص میری اس تحریر کے مطابق عملدرآمد کرتا رہیگا اور اپنے جسم کی تدبیرات میں اس کی مخالفت نہ کرے گا وہ بحولِ اللہ وَقُوّتِہٖ ہر مرض سے بری و تندرست رہیگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے عافیت عنایت فرماتا ہے۔ وَالحمد للہ اَوّلاً وَآخَراً وَظَاھِراً وَباطِناً۔"

ہم نے اقوالِ ثقلین کی ہدایات "دربارہَ تحفظِ صحت" نقل کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اور حسبِ توفیق اس حقیقت کی جانب ناظرین کی توجہ مبذول کرائی کہ ہزاروں راز ایسے موجود ہیں جن کا واسطہ محض صحتِ جسمانی سے ہے۔ اور اُن کا موجودہ سائنسی دُنیا میں تصور بھی نہیں ملتا۔ لیکن ثقلین نے صدیوں پیشتر ان کا تذکرہ فرمایا اور وہ اسرار اپنے مقام پر ایسے اٹل ہیں کہ ان میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ اور ہمیں اُن پر مزید نگاہ و تجسس ڈالنی چاہیئے۔

بعض امراض کی منفعت

پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ "زکام خدا کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے اللہ اس کو بیماری پر نازل کرتا ہے کہ وہ مرض کو بھگادے۔ اور فرمایا

کہ چار چیزوں سے کراہت نہ کرو۔ اسلئے کہ وہ فائدہ مند ہیں (۱) زکام سے کیونکہ وہ جذام سے بچاتا ہے (۲) پھوڑوں سے کہ وہ برص سے بچاتے ہیں۔ (۳) آشوبِ چشم سے کہ وہ اندھا ہونے سے بچاتا ہے (۴) کھانسی سے کہ وہ فالج سے محفوظ رکھتی ہے۔

اور فرمایا کہ ہر آدمی میں دو رگیں ہوتی ہیں۔ ایک اس کے سر میں جو جذام پیدا کرتی ہے اور ایک اسکے جسم میں جو برص پیدا کرتی ہے۔ تو جب سر کی رگ ہیجان میں آتی ہے تو خداوند کریم اس پر زکام کو مسلط کر دیتا ہے تاکہ اس کے ذریعے مرض (مادہ) بہہ جائے اور جب جسم کی رگ ہیجان میں آتی ہے تو خداوند کریم اس پر پھوڑوں کو مسلط کر دیتا ہے تاکہ ان کے ذریعے مرض خارج ہو جائے اگر تم میں سے کسی کو زکام ہو جائے یا پھوڑے نکل آئیں تو اسے چاہیئے کہ اپنی عافیت پر خدا کا شکر ادا کرے۔"

اس کلامِ عصمت مآبؑ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امراض میں منفعت کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اس ارشادِ رسولؐ پر تحقیق سے کام لیا جائے تو لاتعداد پوشیدہ حقائق کا آشکارہ ہو جانا زیادہ مشکل نہیں رہے گا۔ اب ہم اس فصل کو مختصر کرتے ہیں ہم نے نمونے کے طور پر مناسب مواد جمع کر کے پیشِ قارئین کر دیا ہے۔ البتہ اب ہم مختلف امراض کے لئے کچھ نسخہ جات نقل کر دیتے ہیں تاکہ ان سے مستفید ہوا جا سکے۔

کھانسی کی دوا

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے کھانسی کی دوائی کا نسخہ اس طرح تعلیم فرمایا ہے۔

فلفل سفید، فرفیون، خربق سفید، قاقلہ، زعفران ایک ایک جزو، اور بذرالبنج دو جزو، ان سب کو باریک پیس کر ریشمی کپڑے میں چھان لو۔ اور تمام ادویہ کے ہم وزن شہدِ خالص کف گرفتہ ملا کر گولیاں بنا رکھو کھانسی کے لئے خواہ وہ پرانی ہو یا نئی ایک گولی عرقِ بادیان (سونف کا عرق) نیم گرم کے ساتھ سوتے وقت کھایا کریں۔

بواسیر کا علاج

بواسیر کے لئے "ثقل دوم" کے آٹھویں ہادی حضرت امام علی رضا علیہ السلام یہ نسخہ تعلیم فرماتے ہیں۔

ہلیلہ سیاہ، بلیلہ، آملہ مساوی الوزن کوٹ پیس کر ریشمی کپڑے میں چھان کر علیحدہ

رکھ لیں اور تھوڑا سا نیلا گوگل آبِ ثمرہ میں تین شب بھگو رکھیں۔ اس کے بعد اس چھنی ہوئی دوا کو اس میں ڈال کر خمیر کر لیں۔ پھر روغن بنفشہ سے ہاتھوں کو چکنا کر کے مسور کے دانے برابر گولیاں بنا کر سائے میں خشک کر کے رکھ لیں۔ مقدار خوراک موسم گرما میں ½۴ ماشے اور موسم سرما میں ۹ ماشے۔ پرہیز مچھلی، سرکہ اور سبزی کا رکھیں۔ یہ مجرب نسخہ ہے جو اس مرض میں مبتلا ہوں اس سے فائدہ حاصل کریں۔

مثانے کی پتھری کا علاج

سیاہ ہڑ، بہیڑہ، آملہ، دارفلفل، دارچینی، زنجبیل شقاقل، انیسون اور خولنجان ہم وزن لیں اور کوٹ چھان کر گائے کے تازہ گھی میں ان سب کو ملایا جائے اور تمام اجزاء سے دُگنی مقدار میں شہد کف گرفتہ یا شکر ملا کر رکھ چھوڑیں اور ایک چلغوزہ کے برابر روز کھا لیا کریں۔

سانپ، بچھو اور زہریلے جانوروں کے کاٹے اور فالج ولقوہ کا علاج دوائے جامع

حضرت امام علی نقی علیہ السلام نے سانپ بچھو کے کاٹے کی دوائی یوں بیان فرمائی:۔

سنبل، زعفران، اقاقلہ (الائچی)، عقرقرحا، خربق سفید، بذرالبنج، فلفل سفید، ہم وزن لے لیں۔ اور فرفیون کل دوائیوں کے مجموعے سے وزن میں دُگنی لے لیں۔ پھر ان سب کو خوب کوٹ لیں۔ پھر انہیں نرم ریشمی کپڑے سے چھان لیں۔ پھر شہد کف گرفتہ میں اُسے گوندھ لیں۔ پھر اس کی ایک گولی کھلا کر ہینگ کا پانی پلا دیں۔ سانپ بچھو کے کاٹے ہوئے کو انشاء اللہ اُسی وقت شفا ہوگی۔ یہ دوائے جامع کہلاتی ہے لیکن فالج و لقوہ کے عارضے میں اس کی ایک گولی عرق مروہ (یعنی تلسی بوٹی کا پانی) میں گھول کر مریض لقوہ یا مریض فالج کے ناک میں ٹپکائیں۔

قوتِ باہ

ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے مردانہ کمزوری کی شکایت کی تو آپؑ نے فرمایا "سفید پیاز لے کر کاٹو! اسے زیتون کے تیل میں تلو جب سرخ ہو جائے انڈا لے کر پیالے میں ڈال کر اس پر تھوڑا سا نمک چھڑک دو۔

پھر اُسے پیاز اور زیتون کے تیل میں ڈال کر ملا دو۔ اور تل لو۔ وہ روزانہ صبح نہار مُنہ کھایا کرو۔

کان بہنے کا علاج

حضرت امام جعفر صادقؑ سے کسی نے کان بہنے (کان سے پیپ و خون آنے) کی شکایت کی آپؑ نے فرمایا "بہت پُرانا پنیر تھوڑا سا لو۔ اُسے باریک پیس کر عورت کے دودھ میں ملا لو پھر آگ پر نیم گرم کر کے اس کے چند قطرے اس کان میں ٹپکا لو۔

ضیق النفس (دمہ) کا علاج

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد حضرت مفضلؒ نے آپؑ سے اپنے مرض دمہ کا ذکر کیا۔ اور عرض کی کہ تھوڑی دُور چلنے سے میری سانس پھُول جاتی ہے۔ اور مجھے بیٹھ کر سانس لینا پڑتا ہے۔ امامؑ نے فرمایا "اونٹ کا پیشاب (بطور دوا) پی لے سانس ٹھہرنے لگے گی"۔

نوٹ :۔ مرضِ دمہ کا یہی علاج "صحیح بخاری" میں حضرت رسولؐ خدا کی حدیث میں موجود ہے۔ لہذا یہ علاج سُنّی و شیعہ دونوں فرقوں میں مستند و مسلّم ہے۔ اور یہ ایسا علاج ہے کہ جس پر کوئی رقم بھی خرچ نہیں ہوتی اس لئے اطباء کے پیچھے بھاگنے، رقوم ضائع کرنے اور مرض و شدتِ مرض میں اضافے سے بچنے کے لئے یہ علاج بہت ہی کارآمد اور یقینی ہے جس سے بہت جلد شفا ہو سکتی ہے۔

نظر ختم ہو جانے کا علاج

حضرت رسولؐ خدا کا ارشاد ہے کہ کمات (کھُمبی) کھانے سے بصارت واپس آجاتی ہے"۔ حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ جنابِ رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ کمات (کھُمبی) اس "من و سلویٰ" میں شامل تھی جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا۔ اور اس کھانے میں بھی شامل تھی جو میرے لئے بہشت سے نازل ہوا تھا۔ اس کا پانی بھی آنکھوں کے لئے شفا ہے۔

نہایت ہی قابلِ توجہ بات | جن لوگوں کی نظر ثانی فائد بخار یا کسی اور جسمانی خرابی سے ختم ہوگئی ہو یعنی آنکھیں ٹھیک ہوں صرف قوّتِ بینائی ختم ہوگئی ہو اُن لوگوں کو قوّتِ بینائی حاصل کرنے کے لئے "کھُمبی" کھانی چاہیئے۔ آنکھوں کی بینائی کی قوت دوبارہ دینے سے ماہرینِ امراضِ چشم اطباء (EYES SPECIALIST) (DOCTOR) قطعاً عاجز ہیں۔ آپریشن کے ذریعے نئی آنکھ لگادیتے ہیں لیکن کھوئی ہوئی قوّتِ بینائی دوبارہ نہیں دے سکتی۔

محمّد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور آلِ مصطفےٰ کے علم وہبی کی یہ بھی ایک مثال ہے کہ جن امراض کے علاج سے اطباء عاجز ہیں اُن کا علاج بھی اُن پاک ہستیوں نے سینکڑوں سال پہلے کسی دُنیوی درس گاہ میں تعلیم حاصل کئے بغیر بتایا اور انسان اس خدا کے شکر کا حق ادا نہیں کرسکتا جس نے اِنسان کے لئے طرح طرح کی مُفید نعمتیں پیدا کیں۔

خطرناک پھوڑوں کا علاج | بعض کتابوں میں یہ واقعہ موجود ہے کہ متوکل عباسی کے جسم میں ایک ایسا پھوڑا نکل آیا تھا جس سے مرجانے کا اندیشہ تھا۔ اور طبیب لوگ خوف کے مارے اس کے چیرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ فتح ابن خاقان وزیر متوکل نے کسی شخص کو حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں بھیجکر متوکل کی یہ حالت عرض کی۔ اور علاج دریافت کیا۔ تو حضرت امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ بھیڑوں کی مینگنیاں جو اُن ہی کے پاؤں کے نیچے آکر کچل گئی ہوں، وہ عرق گلاب میں ملا کر لیپ بنایا جائے۔ اور اُسے پھوڑے پر لگادیا جائے۔ اس شخص نے آکر جب یہ علاج بتایا تو طبیب لوگ ہنسنے لگے۔ لیکن وزیر فتح بن خاقان نے کہا کہ امام علی نقیؑ اس وقت مخلوق خدا میں سب سے زیادہ عالم ہیں۔ لہٰذا اُن کے ارشاد کے مُطابق عمل کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ لیپ استعمال کیا گیا تو تکلیف وجلن تو اُسی وقت مٹ گئی۔ متوکل سو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھوڑا پھُوٹ گیا۔ بہت زیادہ گندہ مواد خارج ہوا۔ اور شفا ہوگئی۔

اس واقعہ سے حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی فراخدلی، اُن کے رحم اور اخلاقی عظمت پر روشنی پڑتی ہے، کہ جس متوکل نے امام حسینؑ کی قبر پر ہل چلوائے، نہر کا پانی چھوڑا، سادات پر طرح طرح کے مظالم توڑے اس ظالم کا دُکھ دُور کرنے کے لئے بھی اپنی بارگاہِ رحمت سے علاج تجویز فرما دیا۔ اور یہ علاج اتنا اہم ہے کہ اگر تجربہ کیا جائے تو بعید نہیں کہ اسی دوا سے سرطان کے پھوڑے کا بھی دفعیہ ہو جائے۔ اس بات پر ڈاکٹروں اور طبیبوں کو خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔

جذام (کوہڑ) برص (پھلبہری) کا علاج

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ "چقندر گائے کے گوشت میں پکا کر کھانے سے سفید داغ جاتے رہتے ہیں" اور آپؑ نے ایک دفعہ یہ بھی ارشاد فرمایا "سفید داغ (برص) والا یا چھیپ والا مریض جب حمام میں جائے تو وہ نُورے میں مہندی ملا کر داغوں والے مقامات پر مل لے داغ ہٹ جائینگے۔

نوٹ:۔ نورا بال صاف کرنے والا پاؤڈر ہوتا ہے جو یونانی طبی طریقے سے بنایا جاتا ہے۔

ضروری ہدایات

حضرت صادق علیہ السّلام نے فرمایا کہ جو شخص پھلبہری میں یا کوہڑ میں مبتلا ہو اس سے دُور رہو۔ اور اس پر نظر نہ ڈالو۔ اور اس کے ساتھ یا قریب نہ رہو۔ کیونکہ یہ امراض متعدی ہیں۔ اور حضرت امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا ہے کہ ہر شخص کے جسم میں جذام کی رگ (اصل یا مادّہ) موجود ہے۔ اس کو شلغم کے کھانے سے تحلیل و دفع کیا جا سکتا ہے۔

طاعون کا علاج

ایک شخص نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے عرض کی کہ میرے بدن میں طاعون (PLERGUE) کا مادّہ پیدا ہو گیا ہے۔ حضرتؑ نے ارشاد فرمایا کہ سیب کھا۔ چنانچہ اُس نے کھائے اور آرام ہو گیا۔

غلبۂ خون (BLOOD PRESSURE) کا علاج

حضرت امام جعفر صادقؑ کے ایک خادم کو خون کے غلبہ کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ اُسے ستّو پلاؤ۔ کیونکہ یہ خون کے ہیجان کو کم کرتے

اور شدتِ حرارت کو ختم کرتے ہیں۔

غصّے کا علاج اہل بیت اطہار کی کئی حدیثوں میں وارد ہوا ہے کہ "جو شخص یہ چاہے کہ اس کا غصّہ کم ہو جائے اور رنج و غم جاتا رہے۔ وہ تیتر کا گوشت کھایا کرے۔

بخار کا علاج حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ چکور کا گوشت کھانے سے ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں اور بخار دُور ہو جاتا ہے۔

نوٹ۔ تیتر اور چکور کے گوشت کے یہ خواص بتانا اہلبیت کے علم طب کے ساتھ ساتھ اُن کے علم حیوانات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

محیر العقول انکشافات

اس دُنیا میں لاکھوں بچے پیدائشی اندھے، پیدائشی گونگے، پیدائشی بہرے، پیدائشی مخنث، پیدائشی مبروص اور پیدائشی فاتر العقل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن دُنیا بھر کے تمام اطباء (DOCTORS) اور سائنسدان آج تک ایسا ہونے کے اسباب معلوم نہیں کر سکے۔ اور نہ ہی کوئی ایسی احتیاطی تدابیر بتا سکے جن کے ذریعے سے انسانی آبادی کے ایک بہت بڑے حصّے کو پیدائشی نابینائی، گونگے پن، بہرے پن وغیرہ سے بچایا جا سکے۔ دُنیا کی کسی طب میں نہ یہ اسباب ملتے ہیں اور نہ احتیاطی تدابیر۔ لیکن عترتِ اہلبیتِ رسالت نے وہ اسباب بھی بتا دیئے اور ان کے انسداد کی احتیاطی تدابیر بھی بیان فرما دیں۔ یہ بات تمام دُنیا کے ماہرینِ طب پر عترتِ اہلبیت کی عظیم فوقیت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس سے ان پاک ہستیوں کا علم وہبی بھی پوری طرح سے ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر لوگ اہلبیتِ اطہار سے تمسک رکھتے ہوئے اُن ہدایات پر عمل کرتے جو ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں تو بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی تعداد ان دُکھوں سے محفوظ رہتی۔ انہیں ہدایات پر عمل کر کے آئندہ کے لئے ان دُکھوں کو روکا جا سکتا ہے۔ یہ ہدایات کتاب حلیۃ المتقین علامہ مجلسیؒ میں موجود ہیں۔

پیدائشی اندھے بچوں کا سبب

حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے "اگر وقتِ مقاربت مرد عورت کی مخصوص جانب دیکھے تو خوف ہے کہ بچہ اندھا پیدا ہو" اور رسولِ کریمؐ کی حدیث میں وارد ہے کہ "وقت مقاربت کوئی شخص اس جانب نہ دیکھے کیونکہ اس وقت ادھر دیکھنا اولاد کے اندھے ہونے کا باعث ہوتا ہے" پس سبب واحتیاطی تدبیر دونوں ظاہر ہیں۔ جو بڑے بڑے ڈاکٹر نہ بتاسکے۔

پیدائشی گونگے بچوں کا سبب

حضرت امام جعفر صادقؑ اور سرکار رسولِ خدا دونوں نے فرمایا ہے کہ "وقتِ مقاربت بولنے یا باتیں کرنے سے خوف ہے کہ بچہ گونگا پیدا ہو۔ پس کوئی شخص اس وقت نہ بولے اور نہ باتیں کرے"۔ یہاں بھی سبب اور اس کے خلاف تدبیر دونوں واضح ہیں۔

پیدائشی بہرے بچوں کا سبب

اسی طرح ارشاداتِ نقل دوم میں وارد ہوا ہے کہ "اگر وقت مقاربت مرد وعورت کے کانوں میں کوئی شور یا آواز پہنچ رہی ہو تو خوف ہے کہ بچہ بہرہ پیدا ہو" اس لئے تاکید کی گئی ہے کہ مکمل خاموشی کے ماحول میں مقاربت ہو۔ یہاں بھی دونوں باتیں ظاہر ہیں۔

پیدائشی مخنث اور دیوانے بچوں کا سبب

اسی طرح ارشاداتِ اہلبیتؑ میں بتایا گیا ہے کہ جس وقت مرد وعورت میں سے کسی نے مہندی کا یا کوئی اور خضاب لگایا یا باندھا ہوا ہو اس وقت مقاربت کرنے سے امکان ہے کہ بچہ مخنث پیدا ہو"۔ علاوہ ازیں رسولِ خداؐ کی حدیث میں وارد ہوا ہے کہ "اگر اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کو دیکھنے سے خواہش مقاربت پیدا ہو جائے تو وہ شخص اس وقت اپنی زوجہ سے مقاربت نہ کرے کیونکہ ایسا کرنے سے جو بچہ پیدا ہوگا مخنث یا دیوانہ ہوگا"۔

پیدائشی مبروص بچوں کا سبب

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "عورت کے مخصوص ایام نجاست میں ہرگز مقاربت نہ کرے۔ کیونکہ ایسی صورت میں جو بچہ پیدا ہوگا وہ مبروص (یعنی سفید

داغوں والا یا سارے جسم سفید والا) یا کوڑھ یا مرضِ بالخورہ میں مبتلا ہوگا۔"

یہ حیرت انگیز اور تمام ماہرینِ طب و سائنس سے چھپے ہوئے اسباب اور اُنکے انسداد کی معقول احتیاطی تدابیر منکشف فرما کر اہلبیتؑ اطہار نے ثابت کر دیا کہ "ہم کسی دُنیوی درس گاہ کے پڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ ہمارے علوم خدا کے ودیعت فرمائے ہوئے ہیں علم الدنی سے ہیں یعنی وہبی ہیں۔ اور ہمارے ہی پاس انسانیت کے دُکھوں کا علاج ہے۔ اس لئے تمسک بالثقلین نہایت ضروری ہے۔

انسانیت کو دُکھوں سے بچانے کے لئے ان باتوں کا بیان کرنا ضروری تھا اسلئے اہلبیتؑ نے ان کو بیان فرما دیا اور اسی وجہ سے ہمیں بھی یہ باتیں تحریر کرنا پڑیں۔

موت کا علاج

فلسفۂ موت پر مختلف مکاتیب فکر کی جانب سے متعدد مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور انسان عرصۂ دراز سے "موت" کو اپنے "قابو" میں لانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہا ہے لیکن اسے اس میدان میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ زمانہ حاضر کے مدبرین نے موت کے اسباب پر تو کسی حد تک تحقیق کر لی ہے۔ اور اس کے کچھ علل و باعث ڈھونڈھ لیے ہیں لیکن باوجود وسائل جدیدہ کے وہ اس کی اصل حقیقت نہیں جان سکے۔ ہمیں عنوانِ موت پر نہ تو کوئی بحث کرنا ہے اور نہ ہی ہمارے مدّنظر اس کا کوئی مقصد و جواز ہے۔ جیسا کہ ہم بار بار اس دعویٰ کو دُہراتے آ رہے ہیں کہ "ثقلین" ہی سے تمسک رکھنے میں تمام مشکلات کا حل بھی ہے اور سب امراض کا علاج بھی لہٰذا یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ثقلِ اوّل کا دعویٰ ہے کہ خدا کوئی مرض اس وقت تک پیدا نہیں کرتا جب تک کہ اس کے علاج کو پیدا نہ کر دے اور اس دعوے کی تصدیق ثقلِ دوم نے بھی کی ہے مگر موت کو بھی مرض کہا گیا ہے۔ اسی لئے خیال ہوتا ہے کہ

لہ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ۝ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۝ (سورہ ق ۱۹۔۲۰ پ ۲۶)۔ "اور موت کی سکر (بیہوشی،

اس کا علاج بھی ہونا ضروری ہے؟ لیکن ہمیں ایسی کوئی مثال نہیں مل پاتی کہ کسی بھی عام طبیب یا ڈاکٹر نے مریضِ موت (یعنی مردہ) کو "علاج" سے شفا بخشی ہو یا کوئی مرا ہوا جاندار زندہ ہوا ہو۔

اس سوال کے جواب میں اگر ہم کوئی معجزاتی انداز میں مثال پیش کر دیتے ہیں تو مذہب دشمن طبقہ اس کا تمسخر اڑا کر بات کو ہوا میں اڑا دیتا ہے اور اب تو ہمیں میں سے کچھ دہریت زدہ افراد نے معجزے ہی سے انکار کرنا شروع کر دیا ہے اور ہر معجزہ کی تاویل و تفسیر بالرّائے کر کے "شرع دین" میں ایک نئی راہ بنا کر تفرقہ بازی میں اضافہ کر دیا ہے۔

جہاں تک بیان کردہ سوال کی اہمیت کا تعلق ہے وہ تو اپنی جگہ قائم ہے۔ بلاشبہ "مرضِ موت" کا بھی کوئی "علاج" ہونا ضروری ہے اس کا نہ صرف معجزانہ انداز ہی میں بیان نقلِ اوّل میں کیا گیا ہے بلکہ تدبیری اسلوبِ بیان سے یہ تذکرے آئے ہیں کہ علم ذاتی رکھنے والے حضرات نے اس مرض کا علاج بھی کیا۔ چنانچہ ہم سب سے پہلے قرآن مجید کی سورۃ البقرہ سے کچھ ہدایات حاصل کریں گے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

"(اور وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے موسیٰؑ سے کہا تھا اے موسیٰؑ ہم تم پر اس وقت تک ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم خدا کو ظاہر بظاہر دیکھ نہ لیں۔ اس پر تمہیں "بجلی" نے لے ڈالا اور تم تکتے ہی رہ گئے پھر تمہیں تمہارے مرنے کے بعد جلا اُٹھایا تاکہ تم شکر کرو"

منقولہ آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ نے مُردوں کو زندہ کیا لیکن بظاہر ان آیات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس زندہ کرنے میں کوئی دوسرا فعل بھی ہو بلکہ صرف یہی پتہ چلتا ہے کہ کچھ مرنے والوں کو دوبارہ زندگی بخش دی گئی۔ اس طرح اسی سورۃ البقرہ میں آگے ارشادِ ربانی ہے۔

بقیہ حاشیہ ص۸۶

غشی طاری ہوگی۔ اسی سے تو بھاگتا تھا (خوف کے مارے) اور صُور پھونکا جائے گا یہی وعدے کا دن ہے۔" قارئین سے گزارش ہے کہ "موت" اور "صور" دونوں الفاظ کو ذہن میں رکھیں کہ آئندہ نتائج کا انحصار انہیں الفاظ پر موقوف ہے۔

"اور جب تم نے ایک شخص کو مار ڈالا اور تم میں اس کی بابت پھوٹ پڑ گئی (کہ ایک دوسرے کو قاتل بنانے لگا) اور جو تم چھپاتے تھے خدا کو اس کا ظاہر کرنا مقصود تھا۔ پس ہم نے کہا کہ اس گائے کا (خاص) ٹکڑا لے کر اس (مقتول کی لاش) پہ مارو۔ اس طرح خدا مُردے کو زندہ کرتا ہے اور تم کو اپنی نشانیاں دکھا دیتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔"

منقولہ آیات پچھلی آیتوں کی نسبت واضح دکھائی دیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک "طریقہ" تعلیم دیا گیا ہے اور مردہ کو بالفعل زندہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں ہم یہ استدلال کر سکتے ہیں کہ ان آیات میں ایک تصوّر دیا گیا ہے کہ تدبیری علاج سے مُردہ زندہ ہو سکتا ہے ورنہ مالک موت و حیات محض اللہ ہی ہے۔ وہی مُردہ کو زندگی بخش سکتا ہے کیونکہ وہ کُن فیکون کی شان کا مالک ہے۔ یہ تدبیری انداز کہ گائے کا (خاص) ٹکڑا مردہ کے جسم سے مَس کروا کر اُسے زندہ کیا گیا دعوتِ فکر دیتا ہے اور آیت کے آخری الفاظ اس استدلال کو مزید قوی بنا دیتے ہیں کہ خلاقِ عالم خود فرما رہا ہے۔ کہ اس کی آیات پر عقل و غور سے تدبّر کرو۔ یہ طریقہ جو اللہ نے مُردے کو زندگی بخشنے کا بیان کیا ہے۔ بظاہر کتنا سادہ اور آسان ہے لیکن بڑا ہی تحقیق طلب ہے۔ سطحی نظر سے دیکھ لینے سے ایک عام ذہن یا مذہب دُشمن اس بات پر تعجب کرنے کے علاوہ کہتے ہیں کہ اتنی بڑی مشکل کا یہ آسان حل! آخری مادّی تشفی کے لئے سائنسِ حاضرہ کی روشنی میں اس واقعہ کو کیونکر مسلم الثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔

بجلی | چنانچہ اپنی استطاعت کے مطابق اور اپنی فہم و فراست کی سطح پر اس واقعہ کو مؤخر الذکر آیات کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ قدرت نے مُردوں کو زندہ کرنے کی بات سے پہلے "بجلی" کا تذکرہ کیا ہے[۵]

---

[۵] اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بجلی کا تذکرہ سب سے پہلے سورۃ البقر کی آیت ۱۹ میں کیا ہے کہ ہم شائقین کی دلچسپی کی خاطر آیت ۱۷ تا ۲۰ کا ترجمہ تحریر کر کے دعوتِ غور دیتے ہیں۔ ارشاد ہے۔ "ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے بھڑکتی ہوئی آگ روشن کی پھر جب اس آگ نے اردگرد کو خوب اُجالا بخشا تو اللہ نے اس کی روشنی

بقیہ حاشیہ صفحہ

نے لی۔ اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چھوڑ دیا کہ اب انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہ لوگ بہرے، گونگے، اندھے ہیں کہ پھر ہماری طرف رُجوع نہیں کرتے (اپنی گمراہی سے باز نہیں آتے) یا یہ کہ آسمانی بارش گرج بجلی اور موت کے خوف کے باعث اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ حالانکہ خدا منکروں کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ برق (بجلی) ان کی آنکھوں کو چندھیا دے۔ جب ان کے آگے بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں چل کھڑے ہوئے اور جب ان پر اندھیرا چھا گیا تو سہم کر کھڑے ہو گئے اور اگر اللہ چاہتا تو یوں بھی ان سے دیکھنے، سُننے کی قوتیں چھین لیتا۔ بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اے بنی نوعِ انسان اپنے رَب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور ان لوگوں کو جو تمہارے قبل تھے پیدا کیا۔ عجب نہیں کہ تم تقویٰ والے بن جاؤ۔"

اس ارشاد میں مندرجہ ذیل امور قابلِ توجہ ہیں۔

۱۔ مثال اس شخص کی بیان ہوئی ہے جس نے آگ روشن کر کے اپنے اردگرد خوب روشنی کر لی۔ کیا اس سے مُراد موجودہ سائنسی ترقی نہیں ہے کہ ہر جگہ بجلی کی آگ سے روشنی ہی روشنی ہو گئی ہے؟ اور اللہ نے اپنی قوت و طاقت کا اظہار فرماتے ہوئے خبردار نہیں کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان کی یہ سائنسی تدبیر اکارت بھی ثابت ہو سکتی ہے اور پھر وہ اندھیرے میں مارے مارے پھریں، لیکن آگے پھر ناصحانہ انداز میں فرمایا یہ صرف ڈھیل دی جاتی ہے مگر یہ لوگ بہرے گونگے اور اندھے ہیں یعنی آلات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور ہماری طاقت و قدرت کو نہیں مانتے۔

۲۔ بجلی اور موت کا تذکرہ یک جا کرنا اشارہ کرتا ہے کہ موت اور بجلی میں کچھ رشتہ ضرور ہے اور کلامِ پاک میں سب سے پہلا بیان ہے۔ ان آیات میں یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ انسان آسمانی بارش (پانی)، گرج (زور دار آواز)، بجلی اور موت (دونوں کا تذکرہ بار دیگر ایک ساتھ ہے) مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ سے خوفزدہ ہو کر انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتا ہے۔ مگر خدا نے ان کو گھیرا ڈال رکھا ہے۔ کیا اس سے یہ اشارہ نہیں ملتا کہ اتنی سائنسی ترقی کے باوجود انسان ان چیزوں سے ڈرتا ہے؟

بجلی کا کارخانہ ہست و بود کے ساتھ ایک بہت اہم رشتہ ہے اور زمانہ حاضر کی ترقی نے "بجلی" کو کسی حد تک اپنے دامِ اختیار میں مقید کرلیا ہے اور ہر شعبۂ حیات میں برقی قوتوں سے استفادہ حاصل کیا جارہا ہے۔ علاوہ دیگر شعبوں کے برق کو علمِ طب میں ارفع مقام حاصل ہے اور بجلی سے علاج کو موجودہ ترقی کا آخری زینہ سمجھا جارہا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ثقل اوّل کے اشارہ میں علمی بجلیاں کوندرہی ہیں۔ فی زمانہ یہ مسلّمہ

بقیہ حاشیہ صفحہ

۳۔ اللہ نے خبردار کیا ہے کہ وہ وقت قریب ہے کہ "برق" ہی ان کی آنکھوں کو چندھیادے گی یعنی انکی مادّی ترقی ہی ان کو اپنے خطرناک پہلوؤں میں اس طرح گھیرا ڈال لے گی کہ ان کو کوئی راہِ فرار نہ مل سکے گی۔ اب تو وہ اس بجلی کی چمک سے روشنی لے کر چل کھڑے ہوتے ہیں لیکن جب ہم ان کی اپنی کارستانیوں کی وجہ سے اندھیرا مسلط کردیں گے تو پھران کے لئے کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔

۴۔ اللہ نے یہ بھی واضح کردیا کہ دیکھ اے انسان تونے اس بجلی سے جو یہ دیکھنے والی قوت کو وسیع کرلیا ہے (فلم کیمرے، ٹیلیویژن وغیرہ بنالئے ہیں) اور سننے کی طاقت پھیلائی ہے (ریڈیو۔ وائرلیس، ٹیلیفون بنالئے ہیں) اگر میں چاہوں تو چھین لوں کیونکہ مجھے ہر شے پر قدرت حاصل ہے۔

۵۔ میں پھر تمہیں موقع دیتا ہوں کہ اپنے رب کی عبادت کرو اس لئے کہ تمہیں اور تم سے قبل جتنے پیدا ہوئے ہیں سب کا میں ہی پیدا کرنے والا ہوں اور ایسا کرنے سے تم ہی فائدہ میں رہوگے کہ متقی بن جاؤگے۔ اور جب متقی بن جاؤگے تو تمہیں حقیقی علم ملنے لگے گا جو تمہاری ساری پریشانیوں کا علاج مہیا کردے گا۔

مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ۔ واضح ہو کہ آیت میں "صواعق" یعنی گرنے والی بجلیوں کو "حذرا لموت" بھی کہا گیا ہے اور حذر کے معنی میں حفاظت، تدبیر و علاج بھی آتے ہیں نیز لفظ "من" بھی اس جانب روشنی ڈالتا ہے کہ بجلیوں میں سے کوئی خاص بجلی ہے جس کی تلاش کی جاسکتی ہے۔

بات ہے کہ مرض کی انتہائی خطرناک صورت میں بجلی سے آخری علاج کی تدبیر آزمائی جاتی ہے۔ اب جب کہ موت سے بڑا کوئی مرض نہیں تو بعید نہیں کہ موت کا علاج بھی بجلی سے کیا جاسکے لیکن اس برق کی کئی قسمیں[1] ہیں۔ جن پر علیٰحدہ علیٰحدہ بحث کی تو یہاں ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] MODERN THEORY OF ELECTRICITY **بجلی کی جدید ترین تعریف**:۔ بجلی ایک ایسی قوت ہے جو دکھائی نہیں دیتی (معلوم ہوا کہ جو "قوت" دکھائی نہ دے اس کی موجودگی کا محض دکھائی نہ دینے پر انکار خلاف عقل ہے۔ اسلئے علیٰ کُلِ شیئٍ قدیر کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ کبھی نظر نہ آئے گا) اس کا وزن یا جسم بھی نہیں (تو پھر خدا کا انکار محض جسم و وزن نہ ہونے کی وجہ سے کرنا کیونکر درست ہوگا؟) بجلی کی قوت کے وجود کا یقین اس کے اثرات سے ہو سکتا ہے (تو خدا کی قدرتیں اس کے یقین کا سبب ہیں)۔

پرانے نظریہ کے مطابق بجلی قدرت کا ایک گراں قدر عطیہ تصور کیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں "اٹامک تھیوری" ATOMIC THEORY کی دریافت سے سائنس دانوں نے بجلی کی اس قدر جامع اور واضح تشریح کی جس سے اس کی ماہیت کو ذہن نشین کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ جدید "ذراتی نظریہ" کے مطابق کائنات کی ہر شے لاتعداد سالمات (MOLECULES) کا مجموعہ ہے۔ ہر سالمہ اگرچہ ننھا سا ذرہ ہوتا ہے تاہم اس کی جسمانی اور کیمیائی خاصیتیں بدستور قائم رہتی ہیں۔ جوہر (ATOM) سالمہ کی مزید تقسیم کرتا ہے جس کے مادی خواص زائل ہوجاتے ہیں۔ اگرچہ یہ چھوٹا سا ذرہ ہوتا ہے تاہم یہ بھی مزید انتہائی چھوٹے چھوٹے جوہروں ATOMS سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ مثلاً پانی اور سالمہ میں دو جوہر ہائیڈروجن اور ایک جوہر آکسیجن کا ہوتا ہے۔ ماہرین طبیعات نے جوہر کی مزید تقسیم کر کے ثابت کردیا ہے کہ جوہر کے مرکز میں نہایت ہی لطیف ذرات ہوتے ہیں جنھیں قلبیے (PROTONS) کہتے ہیں

بقیہ حاشیہ ص۹۱

جو باہمی طاقت کشش کی وجہ سے ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ قلبیوں کے ان مرکزی اتصال کے ارد گرد اسی قسم کے دوسرے چھوٹے چھوٹے ذرات نہایت ہی تیزی سے گردش کرتے رہتے ہیں۔ انہیں برقیے (ELECTRONS) کہتے ہیں۔ یہ ذرات ایک خاص دباؤ کے ذریعے قلبیوں سے علیحدہ کئے جا سکتے ہیں۔ ہر مادّی شے اسی قسم کے لاتعداد قلبیوں اور ان گنت برقیوں کا مجموعہ ہے (بنی نوع انسان بھی اسی میں شامل ہے اور وہ تمام جاندار بھی جو مادّی حیثیت رکھتے ہیں)۔

اگر ایک خاص قسم کے دباؤ (PRESSURE) کے تحت کسی موصل CONDUCTOR کے برقیوں کو اسی طرح حرکت دی جائے کہ ان کی مسلسل رَو (لہر) جاری ہو جائے تو اسے برقی رو ELECTRIC CURRENT کہتے ہیں۔ یا اُسے ELECTRICITY کہا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں برقیوں ELECTRONS کا بہاؤ کہہ لیتے ہیں۔ اور روزمرہ کے استعمال میں لائے جانے والے آلاتِ برقیہ میں ان ہی برقیوں کو گذار کر قابلِ عمل و استعمال بنایا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بجلی پیدا کرنے والی مشین (الیکٹرک جنیریٹر) ELECTRIC GENRATOR، ڈینمو یا بیٹریاں وغیرہ درحقیقت بجلی پیدا نہیں کرتیں۔ بلکہ وہ ایسی نوعیت کا دباؤ PRESSURE پیدا کرتی ہیں جو ان گنت برقیوں کی اجتماعی روانی کا باعث بنتا ہے۔ (مطلب یہ ہوا کہ اصل ماحصل دباؤ یعنی PRESSURE ہے اور حرکت و عمل کا انحصار اُسی پر ہے)

بجلی کی تمام مصنوعات کے ساتھ دو تار ہوتے ہیں جو دباؤ پیدا کرنے والی مشین کے ساتھ متصل کئے جاتے ہیں۔ ایک تار کے ذریعے بجلی آلہ کی طرف کام کرنے جاتی ہے جسے مثبت تار (یعنی POSITIVE) کہتے ہیں۔ آلہ میں کام کرنے کے بعد یہی برق دوسرے تار کے ذریعے PRESSURE مشین میں واپس لوٹتی ہے اور اُسے منفی تار (NEGATIVE WIRE) کہتے ہیں۔ برق کا جنریٹر سے نکل کر مثبت تار کے ذریعے آلے میں جانا اور کام کر کے واپس آجانا اصطلاحی زبان میں "تکمیل برقی رو" کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر جنریٹر اور آلے کے درمیان لگے ہوئے

بقیہ حاشیہ ص ۹۲

مذکورہ دونوں تاروں میں سے کوئی تار کسی مقام پر بھی ٹوٹ جائے تو برقی رو نامکمل ہونے کی وجہ سے وہ آلہ کام نہیں کرتا ہے۔"

بیان کردہ DEFINITION حتمی ہے یا آئندہ اس میں ردوبدل ہوگا۔ اس کا انحصار مستقبل پر ہے۔ تاہم ہمارے مقصد کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اب آپ حضرات خود اس تھیوری کے خطوط پر ہمارے استدلال کو پرکھیں اور اس پر مزید ریسرچ فرمائیں اور قواعد و فوائد نکالیں۔ ہم نے عرض کر دیا ہے کہ "بجلی" نہ تو موضوع کتاب ہے اور نہ ہی اس پر کوئی مزید بحث کرنا مقصود ہے۔ ہم نے محض ایک راہِ امکان کی نشاندہی کرا دی ہے۔ لیکن اس تشریح کے ایک اہم پہلو پر کہ "بجلی کا جسم یا وزن بھی نہیں" ہم ارشاداتِ ثقلین کی روشنی میں ضرور جرح کریں گے۔

ناظرین کرام کی توجہ سورۃ الرعد کی آیت ۸ کی جانب مبذول کراتے ہیں۔

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ۝ "اور ہر شے اس کے نزدیک ایک مقدار (اندازے) سے ہے" یعنی خدا نے ہر شے کو ایک اندازے سے خلق فرمایا ہے۔ اس اندازے میں ذرا سی تبدیلی کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے۔ مثلاً بجلی ہی کی تعریف میں آپ نے مطالعہ کیا کہ پانی اور سالمہ میں دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن ہوتا ہے۔ ماہرین کی رائے ہے کہ اگر اس تناسب میں ذرہ برابر بھی خلل واقع ہو جائے تو پانی زہر قاتل بن جائے اسی طرح کوئی سی شے لیجئے تو یہی معلوم ہوگا کہ وہ مختلف گیسوں اور مادوں کو کسی تناسب کے مطابق ملانے سے جامہ وجود میں آتی ہے اور ان اجزائے ترکیبی میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ دوسری چیز جامہ وجود پہنتی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ وہ وزن بھی رکھیں۔ اور ثقل اول کے ارشاد کے مطابق ہر چیز کا اندازہ ہے۔ اسی بات پر ہم ثقل دوم کے چوتھے معلم سید الساجدین، امام زین العابدین کے وہ الفاظ پیش کرتے ہیں جن سے اس نکتے پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام بارگاہِ رب العزت میں دعا فرماتے ہیں "اے اللہ! میں تیری پاکیزگی بیان کرتا ہوں تو آسمانوں کے وزن کو جانتا ہے۔ (۲) تو وہ رب سبحان ہے کہ زمینوں کے وزن کو جانتا ہے (۳) میں

لیکن ہمیں یہ کہنا ہے کہ اتنا تو سب جانتے ہیں کہ مخصوص نوعیت کی دو چیزیں آپس میں مل کر بجلی پیدا کرتی ہیں اور پانی سے بجلی حاصل کی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر قابلِ غور امر یہ ہے کہ پانی کے بہاؤ سے بجلی پیدا کرنے کا تصور سائنس میں تو ہماری موجودہ صدی ہی کا مرہونِ منت ہے لیکن ثقلین نے اس حقیقت کا انکشاف چودہ سو سال قبل کر دیا تھا جیسا کہ ثقلِ اوّل قرآن مجید میں سورۂ روم میں ارشاد ہوتا ہے " اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں خوف دلانے کے لئے اور امید دلانے کے لئے بجلی دکھاتا ہے اور آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے مردہ زمین کو زندگی عطا کرتا ہے۔"

یہ آیت بھی ہمارے موقف کو تقویت پہنچاتی ہے کہ "بجلی" کا موت و حیات سے بہت ہی گہرا تعلق ہے اس سے "خوفناکی" اور "پُرامیدی" دونوں پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز یہ بیان از خود اس بات کی تشریح کرتا ہے کہ پانی اور بجلی دونوں کے اٹوٹ رشتے

بقیہ حاشیہ ص ۹۳

تیری تسبیح کرتا ہوں کہ تو تاریکی اور روشنی کے وزن کو جانتا ہے (۴) میں تیری پاک شان کو بیان کرتا ہوں کہ تو سائے اور ہوا کے وزن کو جانتا ہے (۵) میں تیرا تسبیح خواں ہوں کہ تو ہر خوشبو اور بدبو کے وزن کو جانتا ہے۔ کہ وہ کتنے ذرات کے برابر ہے (سبحانک تعلم وزن الریح کم ھی من مثقال ذرۃ)" خط کشیدہ الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان ذرات میں ہر ایک ذرہ ایٹم سے چھوٹا ہے اور یہ وہی تصور ہے جو آج جدید تعریفِ برق میں آپ پہلے ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

اب سائنس کی تحقیقِ مزید سے ثابت ہو گیا ہے کہ ذرات میں وزن کا وجود ہے لیکن کتنا؟ یہ سوال حل طلب ہے۔ اس لئے بجلی کا وزن بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ ہوا کا وزن معلوم ہو چکا ہے لیکن سایہ کا وزن معلوم نہیں ہوا ہے۔ اس طرح تاریکی کا وزن معلوم کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور جوں جوں دریردہ رازوں سے حجاب اٹھیں گے حقانیت اقوالِ ثقلین ثابت ہوتی رہے گی۔

ہیں چنانچہ سائنسدانوں نے یہ معلوم کیا ہے کہ بادلوں میں جب بجلی کی چمک پیدا ہوتی ہے تو اس کی چمک سے اردگرد کی آکسیجن نائیٹروجن میں بدل جاتی ہے اور بارش کے قطرات اس نائیٹروجن کے ذخیرے کو زمین پر اپنے ساتھ لے آتے ہیں یہی نائٹروجن نباتات کی خوراک ہے. بادلوں میں بجلی کی چمک بھی اللہ کی رحمت ہے چنانچہ مفکرین سائنس نے اس آسمانی بجلی ہی کو دیکھ کر پانی سے بجلی پیدا کرنے کا تصوّر لیا۔ اور آخر کوشش کرکے کامیابی حاصل کرلی۔ لیکن پانی سے بجلی کے پیدا ہونے کے تصوّر کو آج سے ایک ہزار چار سو سال قبل نقل دوم کے اوّل ہادی مولائے کائنات جناب امیرالمومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے بڑے کھلے الفاظ میں بیان کیا "اگر میں چاہوں تو اس عالم کی آبشاروں سے ایسا نور پیدا کردوں جس سے سارا عالم جگمگا اٹھے"۔ (کلمات الصغائر) جناب امیر علیہ السلام کا انداز کلام یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ کو ایسی بجلی پیدا کرنے پر مکمل عبور ہے جس سے پورا عالم جگمگا اُٹھے۔

آمدم بر سر مطلب کہ بجلی بنانے کے طریقوں میں یہ بھی ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز سے رگڑتے ہیں یا مَس کرتے ہیں۔ قرآن میں عہدِ موسیٰ علیہ السلام کا جو واقعہ آیا ہے کہ گائے کا ایک حصّہ مُردے سے مَس کیا گیا تو مُردہ زندہ ہوگیا اور اللہ نے وہیں پر یہ بھی فرمایا کہ "اس طرح ہم مُردے کو زندہ کردیتے ہیں"۔ وہ معجزہ تھا لیکن اس واقعہ سے ہمیں یہ خیال بھی ملتا ہے کہ گائے کے کسی حصّے میں مُردہ زندہ کرنے والی برقی قوت موجود ہونے کا امکان ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ریسرچ کرکے وہ حصّہ معلوم کیا جائے اور یہ بھی پتہ لگایا جائے کہ اسے جسم کے کون سے حصّے پر لگانے سے زندگی کی لہر دوڑ سکتی ہے (ممکن ہے کہ یہ عمل PRESSURE کی تھیوری کے تحت ٹھیک ثابت ہوجائے)۔

ایک امر اور تشریح طلب ہے۔ ہم نے اوپر بیان کیا "سکرالموت" تمام امراض

ل‍ہ نکتہ عجیب "اللہ ہی فوت کرتا ہے نفسوں کو بوقتِ "موت" اور اُن (جانوں) کو بھی جن کا وقتِ موت نہیں جیسے اُن کے سونے کے وقت۔ پھر ان جانوں کو تو روک

سے اونچا بلکہ آخری ہے اور مُشاہدہ گواہ ہے کہ موجودہ ڈاکٹروں اور حکیموں میں یہ قاعدہ ہے کہ جس قدر سنگین نوعیت کا مرض ہوگا اسی حیثیت و قابلیت کا مالک ڈاکٹر اس کا علاج کرے گا۔ اور ان معالجوں میں کسی کو بھی تمام بیماریوں پر مکمل دسترس نہیں ہوتی بلکہ ہر ایک بیماری یا عضو کے الگ اسپیشلسٹ ہوتے ہیں اور بلحاظ مرض لوگ متعلقہ ڈاکٹر ہی سے رُجوع کرتے ہیں لہٰذا اسی نسبت سے ہم یہ عرض کرینگے کہ "مرض موت" کا معالج بھی اسی حیثیت و صلاحیت کا حامل ہونا ضروری ہے کہ جیسی نوعیت مرض کی ہے۔

جس طرح یہ مرض انتہائی حیثیت کا ہے اسی طرح اس کا معالج بھی اعلیٰ ڈگری کا مالک ہوگا۔ اور یہ ملکہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب اُس کا علم وہبی ہو یا وہ کسی عالم و علیم وہبی کا شاگرد رشید ہو۔ اب چونکہ حضرت موسیٰ اپنی قوم میں سب سے زیادہ عالم تھے لہٰذا یہ کارنامہ انہیں کے ہاتھ سے سَرانجام پایا۔

ایک اور بات قابلِ غور ہے کہ جب موجودہ سائنسدان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جسم انسانی میں الیکٹریسٹی (ELECTRICITY) موجود ہے تو حضرت عیسےٰ کا یا کسی اور معصوم ہستی کا مُردے زندہ کر دینا ناممکن تصور نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ سائنس کے لحاظ سے جسم کی برقی رو سے مُردے کو زندہ کرنا ممکن نظر آتا ہے لہٰذا مُردہ زندہ کرنے کے معجزے پر اعتراض غلط ہے وہ عظیم امری قوت ہے جس سے معصومین معجزے دکھاتے رہے ہیں۔

جسم انسانی میں بجلی کی موجودگی پر مجھے باقر العلوم سیدنا امام محمد بن علی الباقر

بقیہ حاشیہ ۹۵

لیتا ہے جن پر حکم موت صادر کر چکا ہے۔ اور باقی جانوں کو ایک معین میعاد تک رہا کر دیتا ہے" (ان آیات کو بجلی کی تھیوری تکمیل برقی کے ساتھ بار بار غور کر کے عمدہ عمدہ نتائج برآمد کئے جا سکتے ہیں۔ فوت کرنا کہیں OFF اور سپلائی منقطع ہونا تو نہیں ہے اور پھر نفسوں کو روکنا اور رہا کرنا کہ سرگرم عمل رہیں۔ آخر سب ہی تو الفاظ اپنے اندر عمیق گہرائیاں رکھتے ہیں اور اسی آیت میں اللہ نے فرمایا' غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں بہت نشانیاں ہیں)۔ سورہ الزمر آیت ۴۲

علیہا السلام کا ارشاد یاد آگیا جس میں انہوں نے غصہ و غضب کے بارے میں ارشاد کیا ہے اور اس قول امام سے "ارتھ" (EARTH) کی تھیوری کی جانب بڑی روشن تعلیم ملتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"یقیناً یہ غضب ابن آدم کے دل میں شیطان کی سلگائی ہوئی چنگاری ہے۔ تم میں سے جب کوئی حالتِ غصہ میں ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور نتھنے پھول جاتے ہیں شیطان اس میں داخل ہوتا ہے پس تم میں سے جب کسی کو اپنی ذات پر اس کا خوف لاحق ہو تو وہ اپنے آپ کو زمین سے ملالے (یعنی کھڑا ہے تو بیٹھ جائے اور اپنے آپ کو زمین سے متصل کر دے) کیونکہ شیطان کی سلگائی ہوئی غضب کی نجاست ایسا کرنے سے دور ہو جائے گی۔"

سائنس میں یہ امر ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ زمین بجلی کو گزار دینے کا اہم ذریعہ ہے اور انسان میں بھی بجلی ہے لہٰذا غضبناک ہونے کی صورت میں انسان جب زمین پر بیٹھ کر اپنے ہاتھ وغیرہ زمین پر لگائے گا تو اس جسم سے حرارت کی لہر یا بجلی کا کرنٹ زمین کے ذریعے سے خارج ہو جائے گا جس سے غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اسی اصول کو آج کی سائنس "ارتھ" کہتی ہے جسے ثقل دوم نے کتنی مدت قبل بیان کر دیا۔ ناظرین گرامی قدر کی توجہ ثقل اوّل کی سورۃ البقرۃ کی آیات ۲۵۸ تا ۲۶۰ کی جانب مبذول کی جاتی ہے۔

"(اے رسولؐ) کیا تم نے اس شخص (یعنی نمرود) پر نظر نہیں کی جو صرف اس برتے پر کہ خدا نے اُسے سلطنت دی تھی ابراہیمؑ سے ان کے پروردگار کے بارے میں اُلجھ پڑا۔ جب ابراہیمؑ نے (اس سے) کہا کہ میرا پروردگار تو وہ ہے جو (لوگوں کو) جلاتا (یعنی زندہ کرتا) اور مارتا ہے۔ تو وہ بھی (شیخی مار کر) کہنے لگا۔ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا خُدا تو آفتاب کو پورب سے نکالتا ہے تو بھی اس کو پچھم سے نکال۔ اس پر وہ کافر ہکا بکا ہو کر رہ گیا (مگر ایمان نہ لایا) اور خدا ظالموں کو منزلِ مقصود تک پہنچایا نہیں کرتا۔ (اے رسولؐ) اس بندے (یعنی عزیرؑ) پر بھی نظر کر جو ایک گاؤں پر سے گزرا۔ اور ایسا اُجڑا

تھا کہ اس کی چھتیں الٹ گئی تھیں۔ یہ دیکھ کر وہ بندہ کہنے لگا کہ اللہ اس گاؤں (والوں) کو اس کی موت کے بعد بھلا کس طرح زندہ کرے گا قَالَ اَنّٰى يُحْيِىْ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ اس پر خدانے اس کو مار ڈالا اور) سو برس تک مُردہ رکھا۔ پھر اس کو دوبارہ زندہ کیا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ البقرۃ ۲۵۹ پوچھا تم کتنی دیر پڑے رہے؟ عرض کیا ایک دن پڑا رہا۔ یا ایک دن سے بھی کم۔ فرمایا نہیں تم (اس حالت میں) سو برس پڑے رہے۔ اب ذرا کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ ابھی تک خراب نہیں ہوئیں اور ذرا اپنے گدھے (سواری) کو تو دیکھو کہ اس کی ہڈیاں ڈھیر پڑی ہیں۔ اور ہم نے یہ سب اس واسطے کیا ہے کہ لوگوں کے لئے تمہیں اپنی (قدرت کے ثبوت کی) نشانی بنائیں۔ اور اچھا اب گدھے کی ہڈیوں کی طرف نظر کرو کہ ہم کیونکر ان کو جوڑ جاڑ کر ڈھانچہ بناتے ہیں۔ پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس (جب یہ ان پر ظاہر ہوا تو بے ساختہ) بول اٹھے کہ اب میں بالیقین کامل جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

اور (اے رسولؐ وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب ابراہیمؑ نے (خدا سے) درخواست کی کہ اے میرے رب تو مجھے دکھلا دے کہ تو مُردے کو کیونکر زندہ کرتا ہے۔ خدا نے فرمایا کیا تو اس پر ایمان نہیں لا چکا۔ ابراہیمؑ نے عرض کیا (ہاں ایمان تو ہے) مگر اطمینانِ قلب کی خاطر (آنکھوں سے) دیکھنا چاہتا ہوں۔ فرمایا (اچھا اگر یہ چاہتے ہو) تو چار پرندے لو اور ان کو اپنے پاس منگوالو (اور ٹکڑے ٹکڑے کر دو) پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو۔ اس کے بعد ان کو بلاؤ (پھر دیکھو) وہ سب کے سب تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اور (علمی طور سے) جان لے کہ اللہ عزیز و حکیم ہے۔"

ان آیات کے مطالعہ سے سب سے پہلے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت رسول خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے تخاطب کا انداز ایسا ہے جیسے آپؐ خدا کے ان تمام بیان کردہ واقعات کے عینی شاہد ہیں اور ہم ابتدا ہی میں اس نکتہ پر اجمالاً بحث کر چکے ہیں کہ حضورؐ کا شہید ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ حضور کو تمام واقعات کا علم حاصل ہے۔

دوسری بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے توحید باری تعالیٰ کے

بارے میں نمرود کے سامنے یہ دلیل پیش کی کہ خدا ہی لوگوں کو زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے تو نمرود نے اس دلیل کے وزن کو تسلیم نہ کیا بلکہ شیخی مار کر کہا کہ میں بھی تو لوگوں کو جلاتا اور مارتا ہوں (نعوذ باللہ) باوجود کہ اس میں اس قدرت کا شائبہ قطعی طور پر مفقود تھا تاہم اس نے نخوت میں آکر ایسا دعویٰ کر دیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے موت کے گھاٹ اُتارنے کو "موت دینا" اور سزائے موت پانے والے کی جان بخشی کو زندگی بخشنا" بنالیا. بہرحال ایسا کر دینا اس کی نظر میں کسی خاص کمال کا نتیجہ نہ تھا چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اس کا یہ غلط جواب سُنا تو آپ نے اس پر بحث وجرح کی ضرورت محسوس نہ کی، کیونکہ زندہ کرنے کے فعل کا مخلوق سے ظہور میں آنا ابراہیمؑ بھی ممکن جانتے تھے۔ جیسا کہ انبیائؑ نے مُردوں کو زندہ کیا، چنانچہ فوراً حضرت ابراہیمؑ نے اس نمرود نامراد کو لاجواب کرنے کے لئے دوسری دلیل پیش کر دی کہ "اللہ" سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال کر دکھادے۔" بیانِ قرآن ہے کہ اس پر وہ لاجواب ہو کر ہکا بکا رہ گیا کیونکہ واقعی یہ فعل اس کے لئے بالکل ناممکن تھا۔ اور اس زمانے کی علمی استعداد کے مطابق اس دور میں سورج کو مغرب سے نکالنا محال سمجھا جاتا تھا۔

سورج کا مغرب سے طلوع

زمانۂ جنابِ خلیلؑ میں یہ "توحید" کی قطعی دلیل قرار پائی۔ لیکن جُوں جُوں وقت گزرتا گیا مشکلات آسانیوں میں تبدیل ہوتی گئیں چنانچہ ایک گھڑی ایسی آگئی کہ مشکل کُشائے زمانہ نے اس مشکل کو بھی آسان کر دیا۔ نقل اوّل کی آیت کی عملی تفسیر نقل دوم کے حاکمِ اوّل نے پلٹتے ہوئے سورج کو واپس لوٹا کے کر دی اور مخلوقِ خدا پر واضح کر دیا کہ سورج کا مغرب سے نکلنا محال نہیں ہے۔ یہ کام تو اللہ کا ایک بندہ بھی کر سکتا ہے۔ اللہ کی شان اس سے بہت ہی بلند ہے۔ علامہ ابن حجر مکی اپنی کتاب "صواعقِ محرقہ" میں تحریر کرتے ہیں۔ "حضرت علیؑ کے واضح کرامات میں سے ایک کرامت یہ بھی ہے کہ حضرت علیؑ کی خاطر سورج واپس لوٹا تھا۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب رسولِ خدا کا سرِ مبارک آپ کی

گود میں تھا اور حضرت علیؑ نے عصر کی نماز ادا نہیں کی تھی۔ اور سورج غروب ہو گیا تھا تو رسولؐ اللہ نے فرمایا: "اے میرے اللہ! علیؑ تیری اور تیرے رسولؐ کی اطاعت میں معروف تھے۔ ان کے لئے سورج کو واپس لوٹا دے۔ غروب ہونے کے بعد سورج پھر نمودار ہوا۔"

اس روایت میں سرکارِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی دُعا کا نتیجہ ہے! اسی طرح علامہ شیخ سلیمان قندوزی اپنی کتاب "ینابیع المودۃ" میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت یوں نقل کرتے ہیں:۔

"امام محمد باقرؑ اپنے باپ حضرت زین العابدینؑ سے اور وہ آپؑ کے دادا امام حسینؑ علیہم السلام سے روایت کرتے ہیں کہ جب میرے والد (جناب امیر علیہ السلام) جنگِ نہروان سے واپس ہوئے تھے تو آپ کا گزر سرزمینِ بابل سے ہوا تھا۔ نمازِ عصر کا وقت آگیا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ یہ ایسی زمین ہے جس کو اللہ نے تین مرتبہ دھنسایا ہے نبیؐ کے وصی کیلئے اس پر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ جویرہ بن مسہر عبدی کا بیان ہے کہ لوگوں نے وہاں نماز ادا کی۔ میں سواروں کے ساتھ امیر المومنینؑ کے ہمراہ رہا۔ آخرکار ہم نے زمینِ بابل کے سفر کو طے کر لیا اور سورج غروب ہو گیا تھا۔ حضرت سواری سے اُتر پڑے اور مجھے فرمایا میرے لئے پانی لے آؤ۔ میں نے حضرتؑ کی خدمت میں پانی پیش کیا۔ آپؑ نے وضو فرمایا اور کہا کہ عصر کی اذان کہو۔ میں نے دل میں سوچا کہ ہم لوگ عصر کی نماز کیسے پڑھیں گے۔ سورج تو غروب ہو چکا ہے۔ میں نے اذان کہہ دی مجھے فرمایا اقامت کہو۔ میں نے اقامت کہنا شروع کیا میں ابھی اقامت کہہ ہی رہا تھا کہ حضرتؑ کے دونوں لب متحرک ہوئے۔ فوراً گیا ہوا سورج لوٹ آیا۔ ہم نے آپؑ کے پیچھے نماز ادا کی۔ جب ہم لوگ نماز سے فارغ ہو گئے تو سورج جلدی سے ایسے غائب ہو گیا جیسے چراغ پانی کے طشت میں رکھا ہوا غائب ہو جاتے ستارے جگمگانے لگے۔ حضرت میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "اے کمزور یقین رکھنے والے۔ نمازِ مغرب کی اذان کہو۔"[۱]

---

[۱] قرآن میں "رب المشرقین ورب المغربین" کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرق دو ہیں اور مغرب بھی دو۔ لہٰذا روایت مذکورہ کی تائید قرآن مجید سے بھی ہو جاتی ہے ورنہ دو مشرق اور دو مغرب سے کیا معنیٰ؟

اس معجزہ کو بھی اگر سائنس کے میزان پر جانچئے تو یہ کوئی ایسا فعل نہیں ہے جو علم کی حدود سے باہر ہو۔ تمام اسلامی معجزات اُصولوں پر مبنی ہیں۔ ان میں سے کچھ ثابت ہو چکے ہیں اور کچھ مزید غور و فکر کرنے سے ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس دورِ جدید میں مصنوعی سیّارے تیار کر لئے ہیں اور ان کے حرکات مرضیِ انسان کے مطابق ہیں۔ عام علم ابھی مصنوعات کی حد تک ہے جب "علم خاص" کا دَور دورہ ہوگا تو یہ اصلی چیزیں خود بخود عیاں ہو جائینگی۔

سورج کے بارے میں "ثقلین" کے علم افروز ارشادات ہم اگلے صفحات میں درج کرینگے یہاں صرف ضمناً یہ عرض کرتے ہیں کہ سورج ہمکلامی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ صاحبِ ینابیع المودۃ" لکھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا "اے اباالحسن! (علی علیہ السلام) آپ سورج سے بات چیت کریں وہ آپ سے گفتگو کریگا" میں نے آفتاب سے کہا "اے اللہ کے فرمانبردار بندے تم پر سلام ہو" آفتاب نے جواب دیا "یا امیر المومنین، امام المتقین، قائد الغرالمحجلین آپ پر سلام"۔ میں اللہ تعالیٰ کے سجدۂ شکر میں گر گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا "اے میرے بھائی اور میرے حبیب آپ اٹھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی وجہ سے آسمان والوں پر فخر و مباہات کرتا ہے"۔ ان ذواتِ گرانقدرؑ کی (جو بجائے خود معجزہ ہیں) خصوصیت یہ ہے کہ جب بھی کوئی کرامت دکھاتے ہیں فوراً شکرِ خالقِ کائنات بجالاتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس خالق کے شاہکار ایسے ہیں وہ خود کیسا ہے۔

پس جس طرح سورج کا مغرب سے طلوع کرنا ممکن ثابت ہوا اسی طرح سورج کا کلام کرنا بھی ناممکن نہیں بلکہ اسلام کے مطابق سنگریزوں نے کلمۂ شہادت پڑھا ہے۔ اسی طرح حجرِ اسود نے امامت کی گواہی دی ہے بلکہ اسلام کہتا ہے کہ قیامت کے دن اعضائے جسمِ انسانی اعمال کی گواہی دیں گے۔

اگلی آیت میں خداوند تعالیٰ نے خود ہی "موت و حیات" کا تذکرہ اس انداز میں کیا ہے کہ ایک صاحب یعنی حضرت عزیرؑ اُجڑی بستی کو دیکھ کر اس قریہ کی موت کو زندگی میں تبدیل کرنے کا طریقہ دریافت کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ انہیں محض تھیوری نہیں

بتلاتا بلکہ انہیں ایک سو سال کے لئے پریکٹیکلی (PRACTICALLY) موت کی نیند سُلا دیا جاتا ہے اور پھر زندہ کر کے انہیں پریکٹیکل تعلیم بذریعہ مُشاہدہ و تجربہ دی اور دو رُخ سامنے رکھے۔ ایک حیات کا کہ ان کا سامان خورد و نوش تازہ و قابلِ استعمال رہا اور دُوسرا موت کا کہ ان کی سواری یعنی گدھا ہڈیوں کا پنجر ہو گیا۔ اس واقعہ سے کولڈ سٹوریج اور ریفریجریٹر کا تصوّر ملا لیکن اللہ ہی جانتا ہے یا وہ ہستیاں جانتی ہیں جن کو اس نے اس دولتِ علم سے مالا مال کیا کہ آخر وہاں کس پاور و نوعیت کے کولڈ سٹوریج یا ریفریجریٹر جیسا ماحول بنایا گیا جس میں کہ سو سال بھی سامانِ خورد و نوش خراب نہ ہوا۔ لیکن اِتنا ضرور ہے کہ جو تعلیم جناب عزیرؑ کو دی گئی اس میں اسی تصوّر کا لازمی دخل ہے کہ طویل مُدت تک ذخیرہ کرنے کے لئے بھی حفاظتی سامان تیار کیا جا سکتا ہے یعنی موجودہ ایجادات جیسے فریج، سَرد خانے وغیرہ کو اور بہتر بنانے کی جانب رہنمائی ہوتی ہے۔

دوسرے پہلو "موت" کو اللہ تعالیٰ نے ایسے انداز سے بیان فرمایا ہے کہ چودہ سو سال پیشتر لاش، ہڈیوں اور گوشت پر تجربات کرنے کا تصوّر دے دیا۔ آج کل میڈیکل کالجوں کی لیبارٹریوں میں لاش پر تجربات ہوتے ہیں اور اس سارے اہتمام کی وجہ قدرت نے خود ہی بتا دی ہے کہ یہ سب اس خاطر کیا کہ تمہیں لوگوں میں نمونہ بنایا جا سکے۔ گدھے کی ہڈیوں کی طرف نظر کرانا۔ پھر ان کے جوڑ توڑ سے ڈھانچہ بنانے کے بارے میں تعلیم فرمانا۔ گوشت چڑھانے کا ذکر کرنا۔ یہ سب تھیوری اور پریکٹیکل ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور اس وقت تک سبق جاری ہے جب تک کہ طالب علم (عزیرؑ) خود اقرار نہیں کر لیتے اور شکریہ ادا نہیں کرتے کہ اب میں عالم ہو گیا اور ربا! شُبانے اعلیٰ ترین معلّم تجھے تمام علوم کے ہر پہلو پر پوری پوری قدرت حاصل ہے اب تحقیق سے یہ استدلال کیا جائے گا کہ حضرت عزیرؑ ان رموزِ موت و حیات سے واقف قرار دیئے گئے۔

اس سلسلے میں حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کو بھی یہی تعلیم عملی و نقلی دی گئی۔ ایک ہی تھیوری کو دوسرے اندازِ تجربہ (پریکٹیکل) میں پیش کیا گیا۔ یعنی اس تجربہ کا طریقہ دُوسرا اختیار کیا گیا۔ وہاں مُردوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاگرد

کچھ اونچی جماعت کا ہے۔ لہٰذا نصاب کلاس کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں پیچیدہ تجربہ سے گذرا۔ پہلے شاگرد ابتدائی کلاسوں میں تھے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ کے لئے ایک آدمی کی لاش (گوشت۔ پوست سمیت) پر تجربہ کروایا جاتا ہے اور دوسرے صاحب کے لئے گدھے کو بغیر گوشت پوست صرف ہڈیوں کے پنجر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جہاں درجہ جماعت اونچا ہے۔ وہاں تجربہ بھی اُسی نسبت سے کچھ مشکل سامنے آتا ہے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوتا ہے کہ چار پرندے لیں۔ اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پہاڑوں پر رکھ دیں (یہ مقام بھی اس امر کو طاقتور بناتا ہے کہ قدرت نے یہاں بھی تدبیری راہ اختیار کر کے موت کو حیات میں بدلا ہے نہ کہ اپنی خاص صفت استعمال کی ہے) اور پھر ان کو بلائیں۔ تو وہ دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے اس تجربہ میں "صوت" ابراہیمؑ کا استعمال کروایا گیا ہے۔ اور جدید تعلیم نے آواز کی لہروں کو تسلیم کیا ہے[1]۔ بالفاظِ دیگر آواز میں برقی قوت ہے۔

جیسا کہ اتفاق اُمت ہے کہ قیامت میں صُور پھونکا جائے گا۔ جس کی آواز سے سب مر جائیں گے۔ چنانچہ جو تجربہ و مشاہدہ حضرت ابراہیمؑ کو کروایا گیا اس سے بھی آواز کی قوت کا اشارہ ملتا ہے۔ جناب ابراہیمؑ نے پرندوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جیسا کہ تفاسیر میں ہے کہ انھوں نے قیمہ کر دیا اور ان کی چونچیں اپنی جیب میں ڈال لیں۔ اور پھر ان کو آواز دی اور وہ اپنی اصلی حالت پر لوٹ کر زندہ ہو گئے۔ یہ آواز سے زندگی ملنے کی دلیل ہے۔ نیز یہ بھی قرآن مجید میں ہے کہ ہر شخص کے اعضاء۔ اس کے خلاف

---

[1] اس صوتی قوت برقیہ کی تعلیم ایک جگہ بھی دی گئی ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے لوگوں کو ندائے حج دی اسے ہر شخص نے سُنا خواہ وہ صلب میں تھا یا عالم ارواح میں۔ حضرت ابراہیمؑ کے اس واقعہ میں آواز کی برقی اور مقناطیسی قوت کے بارے میں غور و فکر کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس واقعۂ ابراہیمؑ میں قدرت الٰہی سے پرندے زندہ ہوئے لیکن کم از کم اس سے یہ تصور تو ملتا ہے کہ آواز میں ایک خاص و مقناطیسی طاقت ہے۔

شہادت مہیا کرینگے۔ حالانکہ جب مردے کو سپرد خاک کئے ہوئے ایک عرصہ گزر جاتا ہے تو اس کے اعضائے جسمانی کیڑوں وغیرہ کی یا مٹی کی خوراک بن کر بالکل منتشر یا مٹی ہو جاتے ہیں لیکن وقت شہادت جب وہ اپنی حالت میں دوبارہ آئینگے تو واقعہ بالکل ویسا ہی ہوگا جس کا مشاہدہ حضرت ابراہیمؑ کو عملاً کروایا گیا۔ کہ وہ اس طرح زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جس طرح کہ دنیا میں وہ گوشت پوست کے انسان تھے۔ لہٰذا یہ اسلامی عقیدہ بھی موجودہ عقل و سائنس کے خلاف نہیں ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آواز کی لہریں دوسری بجلی کی لہروں سے طاقتور ہیں تو اس کا ثبوت دورِ حاضرہ کی سائنس سے ملتا ہے۔ سائنسدانوں کا اتفاق ہے کہ "آواز" فضا میں ہر وقت محفوظ رہتی ہے۔ اور سنا ہے کہ اس سلسلے میں پہلے کی نکلی ہوئی آوازوں کو ریکارڈ بھی کیا گیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ آواز کی لہروں کا خاتمہ نہیں جبکہ بجلی کی لہریں ادھر کر جاتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔ آواز کی لہروں کو سائنس نے تسلیم کرنے کے علاوہ ان کی اس خاصیت سے بھی اتفاق کیا ہے کہ آواز جب نکلتی ہے تو گونجتی رہتی ہے۔ ایکو سسٹم بھی ہے اور شاید اب آواز کی قوت بھی قابو میں آجائے۔ مشاہدہ میں دھماکہ کی آواز ایک مثال ہے جس سے بڑی بڑی مضبوط عمارتیں ہل جاتی ہیں اور بعض اوقات مخدوش ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اس پر مزید ریسرچ ہونا ابھی باقی ہے۔ اس کے علاوہ ہم ناظرین کی توجہ قرآن مجید سورہ کہف کی آیت نمبر ۹۹ کی طرف مبذول کراتے ہیں: "اور ہم چھوڑ دیں گے اس دن لہروں کو گذشتہ حالت میں ایک دوسری میں۔ صور پھونکا جائے گا۔ "صعق" والا تو جو لوگ آسمانوں اور زمینوں میں ہیں بے ہوش ہو کر گر جائیں گے سوائے ان کے جن کو خدا چاہے گا۔ پھر پھونکا جائے گا تو سب کے سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔"

واضح ہو کہ مُردہ زندہ کرنے کے واقعہ دربارۂ حضرت موسیٰؑ میں دعوتِ غور و فکر دی گئی ہے وہاں تشکر کا ذکر نہیں ہے بلکہ طلب تشکر ہے اور ان سے اگلے حضرت عزیزؑ کے تذکرے میں متشکرانہ انداز بھی کلام پاک کی فصاحت و بلاغت

ہی کا حصہ ہے کہ سپاس گذاری بایں طریق کی جاتی ہے "میں علم رکھتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ لیکن تیسرے مقام یعنی حضرت خلیلؑ کا یہ انداز تھوڑا سا مختلف ہے لیکن حسنِ کلام کو چار چاند لگا رہا ہے "علم حاصل کر لو کہ اللہ عزیز و حکیم ہے"۔

اندریں بیان یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ حاملِ یقین ہونے کے باوجود "اطمینانِ قلب" کی خاطر یہ علم سیکھ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جو "نفسِ مطمئنہ" ہوتا ہے اس کا درجہ یقین کے حامل سے بھی بلند ہوتا ہے۔ اور اطمینان کے لئے "علمِ عینی" ضروری ہے۔ اس لئے جو مصداق "نفسِ مطمئنہ" ہے اُسے عینی علم ہونا لازم ہے۔

المختصر یہ کہ ہم نے تصریحات مندرجہ بالا سے یہ بات ثابت کی کہ موت کے مرض کا علاج بھی ہے اور اس کے معالج بھی اس دُنیا میں موجود ہیں جیسا کہ ہر مرض کا علاج موجود ہے اس لئے علاجِ موت کی آج بھی ضرورت ہے اور علاج بغیر معالج کے ہونا محال ہے۔ اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کوئی نہ کوئی ایسی ہستی اس صفحۂ ہستی پر موجود ہے جو موت کا علاج جانتی ہے اور کر سکتی ہے اور وہ ہستی جس کا علم "وہبی" ہو، جو وارثِ علومِ انبیاء اور حاملِ علمِ رسولؐ ہو۔

نوٹ:۔ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ تحریر ہذا کے تین ہفتے بعد ہماری رائے "رائے بالثبوت" ہو چکی ہے اور بالکل ثقلین کی ہدایت کے مطابق مُردہ زندہ ہو گیا ہے اور یہ خبر مع حوالہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو روزنامہ جنگ کراچی جلد ۳۹ نمبرہ ۹ جمعہ ۲۳ صفر المظفر ۷ مارچ ۱۹۷۵ء آخری صفحہ۔

ایک دن میں ۲۵ بار موت

حیفہ ۶ مارچ (اے پ۔ اف پ) ایک اسرائیل باشندہ اسپتال میں ایک دن میں ۲۵ بار "موت" ہونے کے بعد آخر کار زندہ ہو کر گھر چلا گیا۔ اسپتال کے ذرائع نے بتایا ہے کہ اس شخص کو حرکتِ قلب بند ہونے کے بعد اسپتال میں داخل کیا گیا۔ اور ڈاکٹروں نے دل کی مالش کر کے اور بجلی کے جھٹکے لگا کر اس کے دل کی

حرکت بحال کر دی۔ لیکن ایک گھنٹے بعد اس کے دل کی حرکت پھر بند ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے حرکت پھر بحال کی اور اسے خصوصی نگرانی میں رکھ دیا۔ جہاں ۲۴ گھنٹے کے دوران ۲۵ مرتبہ اس کی حرکت قلب بند ہوئی اور ہر بار ڈاکٹروں نے اس کی حرکت بحال کر دی اس طرح یہ شخص تندرست ہو کر گھر چلا گیا۔

ہمارے اس بیان سے یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ ہم "کل نفس ذائقۃ الموت" کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے نکتہ نگاہ سے موت کے بعد ہی صحیح زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بحث محض اس سطح پر رکھی جائے کہ ہر زہر کا تریاق موجود ہے باقی ہر شے فانی ہے چونکہ ہر نفس کو موت ہے اس لئے موت خود بھی بالآخر موت کی آغوش میں سو جائیگی۔ افسوس ہے کہ موت کے معانی سے بہت کم لوگ واقف ہیں یاد رہے کہ موت معدوم ہو جانے کا نام نہیں ہے اور قارئین نے اگر ہمارے اس مضمون میں کوئی دلچسپی کا اظہار کیا تو ہم "موت و حیات" کا مفہوم "ثقلین" کی ہدایات کی روشنی میں انشاء اللہ ایک دوسری کتاب میں الگ شائع کریں گے۔

باقی صدیوں پرانی ایک بات یاد آگئی کہ کوئی "آب حیات" نام کا پانی ہے جس کو اگر کوئی پی لے تو اس کو موت نہیں آئے گی۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ کوئی چشمہ ہے۔ ابھی تک یہ چشمہ منظر عام پر نہیں آسکا۔ اس لئے منکرین اسلام اسے "مفروضہ" ہی کہیں گے۔ پھر بھی کم از کم اس "مفروضہ" میں ایک بہت بڑی حقیقت پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ "آب" اور اس آب سے علاوہ دیگر فوائد کے "بجلی" بنائی گئی ہے اور یہ تصور اس لحاظ سے معقول ہے کہ اس سے موت کا علاج ہو سکتا ہے پانی اور حیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ ثقل اول کتاب اللہ کی سورہ الانبیاء میں ارشاد ہے: "اور ہم ہی نے ہر جاندار چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا وہ یہ نہیں مانیں گے؟"

حالیہ تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ابتدائے زندگی کرۂ آب سے ہوئی۔ تمام جانداروں کے جسموں میں نمکین خون کے پائے جانے کو اس نظریہ کی اساس ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر جاندار کے وجود میں سوڈیم۔ پوٹاشیم اور کیلشیم

اسی تناسب سے پائے جاتے ہیں جس طرح یہ کیمیائی اجزا سمندر کے پانی میں ملتے ہیں۔

جانداروں کے اجسام کا تجزیہ کرنے پر یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ صاحب جان میں پانی کا عنصر ساٹھ فیصد سے ستر فیصد تک پایا جاتا ہے اور اس کے بغیر جینا مشکل ہے جو قرآنی نقطۂ نظر کے مطابق اس بات کی دلیل ٹھہری کہ زندگی کی ابتدا آب سے ہوئی۔ لیکن سائنس کو یہ بات اب معلوم ہوئی ہے جسے قرآن کئی سو سال پہلے بیان کر چکا ہے۔

قائد ثقل دوم سرکار ولایت مآب علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ایک خطبے میں تخلیق کائنات کے ضمن میں اس مفہوم کو تفصیل سے ارشاد فرمایا۔

("حمد باری تعالیٰ کے بعد فرمایا) پھر خدائے بزرگ و برتر نے زمین و آسمان کے درمیان۔ اور جو (فضا) و اطراف میں اور گوشوں میں شگاف اور آسمان سے ملی ہوئی ہوا پیدا کی۔ اس جو (فضا) میں متلاطم پانی جاری کیا جس کی موجیں بڑھ بڑھ کر بلند ہو رہی تھیں اس پانی کو باد تند کی پیٹھ پر سوار کیا۔ جو ہر چیز کو متزلزل کئے دیتی تھی۔ ہوا کو حکم دیا کہ وہ پانی کو گرنے سے روکے اور اُسے پانی کے زور پر مسلّط کر دیا۔ اور اسی ہوا سے پانی کی حدبندی کر دی۔ ہوا کا دامن دُور تک پھیلا تھا اور پانی اس کے اوپر اُچھل رہا تھا۔ پھر خدا نے ایک ایسی ہوا چلائی جو خشک تھی اور اسے پانی کے ساتھ ساتھ کر دیا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ خدا نے ہوا کو حکم دیا کہ اس پانی کو حرکت دیتی رہے۔ اور موجوں کو اُبھار کر اُوپر کی طرف پھینک دیا۔ ہوا نے اس پانی کو اس طرح متھا جیسے مشک میں دودھ متھا جاتا ہے اور فضا میں بڑی تیزی سے دوڑ گئی۔ یہ پانی کے نچلے حصّہ کو اُوپر کی طرف پلٹانے لگی اور ساکن کو متحرک سے ملانے لگی۔ یہاں تک کہ پانی کی چوٹی بلند ہوگئی۔ اور تہ بہ تہ پانی پر جھین اٹھ آیا۔ پھر اس پانی کو شگاف دی ہوئی اور کشادہ فضا میں بلند کیا۔ جس سے سات آسمان بنائے۔ آسمان زیریں کو ایک جمی ہوئی اور رکی ہوئی موج قرار دیا۔ اور آسمان بالا کو ایک محفوظ چھت اور بنائے مرفوع بنا دیا۔ آسمان کو بغیر کسی ستون کے روکے اور بغیر میخ کے اپنی جگہ پر قائم رکھا۔ پھر خدائے بزرگ و برتر نے اس آسمان کو چمکتے ہوئے ستاروں اور دمکتے ہوئے تاروں

سے مزین کیا، اور اس میں چراغ نور افشاں یعنی خورشید و ماہ درخشاں کو رواں دواں کیا۔ یہ ساری چیزیں گھومتے ہوئے آسمان، رواں دواں چھت اور لوح متحرک میں تھیں۔ پھر خدا نے بلند آسمانوں کے بیچ میں شگاف دیا اور ان خلاؤں کو فرشتوں کی مختلف قسموں سے پُر کر دیا۔"

مولائے کائنات کا یہ خطبہ نہ معلوم کتنے رموز و اسرار اپنے اندر پنہاں کئے ہوئے ہے۔ ان کی کھوج لگانا عوام الناس کے فہم و فراست و تحقیق پر منحصر ہے۔ ہم تو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس خطبے میں مولا علیؑ کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تخلیقِ کائنات کے عینی شاہد بلکہ شہید ہیں کہ تخلیقِ کائنات کا نظارہ بچشمِ خود فرما رہے تھے۔

یہاں ذہنِ انسانی یہ سوال کر سکتا ہے کہ ثقلِ اوّل (قرآن مجید) سے تو اس بات کو ثابت کر دیا کہ مُردہ زندہ بھی ہو سکتا ہے لیکن ثقلِ دوم (عترتِ اہلبیتؑ) کے بارے میں کوئی ایسی مثال پیش نہ کی گئی جس سے دونوں کا باہمی ساتھی ہونا ثابت ہو یعنی یہ کہ "ثقلِ ثانی" نے عملی طور پر مُردہ زندہ کیا یا نہیں تو جواب اس کا یہ ہے کہ ہم نے اشارتاً پچھلے صفحات میں یہ عرض کیا تھا کہ مُردہ زندہ کر لینے سے سورج کو مغرب سے نکالنا مشکل تر امر ہے اور اس بارے میں طلوعِ شمس منجانب مغرب کا واقعہ بیان کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان ہستیوں کی شان کے سامنے یہ کرامت کوئی اتنی بڑی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہم ایک مثال بیان کر کے اس باب کو پورا کر دیں گے۔

آج بھی دُنیا میں "نُصیری" نامی ایک فرقہ ہے جس کا یہ باطل و فاسد عقیدہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام (نعوذ باللہ، نقلِ کفر، کفر نباشد) "خدا" ہیں۔ ان کے عقیدے کی وجہ تسمیہ محض حضرت علی علیہ السلام کا مُردہ کو زندہ کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بزرگانِ اسلام کے کئی ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں ایسی کرامت کا ذکر ہے۔

شیرِ قالین یا شیرِ حقیقی

اب ہم بے جان کے زندگی پانے کے سلسلے میں اس سے بھی کہیں زیادہ عجیب واقعہ درج کر کے قارئین

کو دعوتِ غور دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ جامی اپنی کتاب "شواہد النبوت" میں نقل دوم کے دسویں ہادی جناب امام علی نقی ؑ کا ایک معجزہ یوں تحریر کرتے ہیں کہ ایک دن متوکل (عباسی خلیفہ) کے پاس ایک ہندوستانی شعبدہ باز آیا۔ اس نے اپنے جادو کے بہت حیرت انگیز کرتب دکھلائے۔ متوکل نے اس سے کہا کہ میرے دربار میں ایک نہایت شریف شخص آنے والا ہے۔ اگر تو اس کو شرمندہ کردے تو تجھے ایک ہزار اشرفی انعام دوں گا۔ وہ ہندی شعبدہ باز اس بات پر آمادہ ہوگیا اور اس نے کہا کہ اے بادشاہ! جب وہ شخص آئے تو تم اس کے کھانے کا اہتمام کرنا اور مجھے اس کے پہلو میں بٹھا دینا۔ میں وہ کرتب دکھاؤں گا کہ وہ سخت شرمندہ ہوگا۔ یہ سن کر متوکل کی باچھیں کھل گئیں۔ چنانچہ جب حضرت امام علی نقی علیہ السلام تشریف لائے تو ان کو کھانا پیش کیا گیا۔ سب کھانے پر بیٹھے اور وہ ہندی جادوگر بھی۔ چنانچہ کھانا شروع ہوا۔ تو اس نامراد شعبدہ باز نے اپنی عاقبت خراب کرنے کا حیلہ پیدا کیا۔ کہ جو کھانا امامؑ پکڑنا چاہتے اس چیز کو جادو سے غائب کردیتا اور لوگ ہنس دیتے۔ مولانا جامی کہتے ہیں کہ جادوگر کی اس حرکت پر امامؑ غضبناک ہوئے اور دربار میں سامنے دیوار پر لٹکے ہوئے قالین پر بنے ہوئے شیر کو حکم دیا کہ اس بدبخت کو صالم نگل جا۔ کلامِ امامؑ کے الفاظ مکمل ہوتے ہی ہندی شعبدہ باز شیرِ قالین کا لقمۂ تر بن گیا۔ چنانچہ امامؑ نے شیر کو حکم صادر فرمایا کہ اپنی اصلی جگہ پر چلا جائے۔ لہٰذا وہ پھر قالین میں اپنی پہلی حالت پر آگیا۔ متوکل اس پر سخت نادم ہوا۔ کہتے ہیں کہ اسنے خدمتِ امامؑ میں عرض کی۔ اس ہندی شعبدہ باز کو دوبارہ زندہ فرمادیں۔ لیکن آپؑ نے جواب دیا کہ اگر عصائے موسیٰ نے ساحری کے سانپ اگل دیئے ہوتے تو یہ شیر بھی اُسے اگل دیتا۔ یہ فرمانے کے بعد آپ دربار میں لوگوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہوگئے۔

اس واقعہ سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ "علم وہبی" رکھنے والی ہستی نہ صرف مُردوں کو دوبارہ زندگی بخشنے پر قدرت رکھتی ہے بلکہ ایک عام تصویر کو بھی زندگی کا حقیقی رُوپ عطا کرنے پر عادی ہوتی ہے۔

لہذا خدشۂ طوالت کی خاطر ہم صرف اتنی ہی تشریح و توضیح پر اکتفا کرتے ہیں اور ناظرین کو دوبارہ تمسک بالثقلین کی واضح ہدایت یاد کراتے ہیں کہ یہ ہی راہِ نجات ہے۔

بحمد اللہ تعالیٰ ہمارا پہلا باب علم الطب والجراحی و حفظانِ صحت ختم ہوا۔ اس پر ہم اپنے ربِ عظیم کا شکر کرتے ہیں۔

اب تک جو کچھ ہم لکھ چکے ہیں اس کا خلاصہ کلام یہ ہے:۔

۱۔ کامرانی کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ جو جناب نوحؑ، جناب ابراہیمؑ، جناب موسیٰؑ اور سرکار سرورِ دوعالمؐ کو دکھایا گیا۔ اور اسی پر گامزن رہنے میں سعادتِ دُنیا و آخرت ہے اور اختلاف کی صورت میں گمراہی۔

۲۔ اسی راستہ کا نام "دین" ہے۔ جو دُنیا سے کوئی الگ شے نہیں بلکہ دُنیا اسی کا ایک شعبہ ہے۔

۳۔ دین کی روح علم ہے اور حقیقی علم منجانب الٰہی ہوتا ہے۔

۴۔ ایک علم وہبی ہوتا ہے دوسرا اکتسابی۔ جس کا علم وہبی ہو ہادیٔ برحق ہونے کا حق دار وہی ہے۔

۵۔ اب ہدایت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہوگی جو صاحبِ علم کلی ہو اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے۔

۶۔ صاحبِ علم وہبی اور علیم کامل رسولؐ کی واضح ہدایت حدیثِ ثقلین پر دُنیا نے توجہ نہ دی جس کی وجہ سے اہلِ اسلام زوال پذیر ہوئے اور فرقہ بازی پیدا ہوئی۔

۷۔ آپؐ نے ثقلین سے تمسک کا حکم دیا۔ اسی کو علاجِ گمراہی قرار دیا۔ لیکن اُمت اس حکم سے غافل ہوگئی۔

۸۔ ثقلِ اوّل کتاب اللہ قرآن مجید ہے یہ اکیلی کتاب کافی نہیں ہے جب تک ثقل دوم کی ہدایت کے مطابق نہ پڑھی جائے۔

۹۔ ثقل دوم عترت اہلِ بیتؑ ہیں جن سے مراد حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت

امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ اور پھر باقی آئمہ اہلبیتؑ۔ نیز یہ کہ ثقل اوّل اور ثقل دوم (جو کہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے) ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتے ہیں۔ دونوں کی حقانیت کا ثبوت "علم" ہے۔

۱۰۔ "ثقلین" نے علم الطب والجراحی وحفظانِ صحت کے ہر باب پر مکمل روشنی ڈالی ہے۔ اور لاتعداد حقائق موجودہ سائنس سے ابھی تک اوجھل ہیں جبکہ اہلبیتؑ کے ارشادات سے ہمیں عمدہ قوانین تحفظ صحت، التشریح الابدان اور تشخیص کاملہ کے علاوہ علاج موت کی جانب بھی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

فصلِ دوم

اقتصادیات و معاشیات

جناب اقبالؒ نے فرمایا ؎

ہست دینِ مصطفیٰؐ دینِ حیات
شرحِ اُو تفسیرِ آئینِ حیات

لیکن مسلمانوں ہی میں سے ایک مذہب دشمن طبقہ غیر مسلموں کی مادّی ترقّی سے مرعوب ہو کر اسلام کو (معاذ اللہ) ایک فرسودہ چیز سمجھنے لگا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ حقیقی اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت عام نہ ہو سکی اور خود غرض عناصر نے اپنے اغراضِ فاسدہ کے لیے اسلام کی محرّف و متغیّر شکلیں پیش کیں جنھیں سائنسی علوم اور غیر مسلموں کی مادّی ترقیوں سے مرعوب و متاثر اذہان قبول نہیں کرتے لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر ثقلین کی روشنی میں اس سعادت کی جانب قدم بڑھائے جاتے تو اہلِ اسلام کو موجودہ حالت سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ اور ساری دُنیا یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی کہ دینِ مصطفیٰؐ ہی صحیح دینِ حیات ہے۔ اس کی شرح ہی آئینِ حیات ہے۔ یہ شرف صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ بنی نوعِ انسان کا یہ پیدائشی حق تسلیم کرتا ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد بھوک و ننگ سے محفوظ رہے اور رہائش و علاج اس کے فطری حقوق ہیں۔ ہم نے اسی کتاب کی فصل سیاسیات میں اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کا یہ فرض ہے کہ وہ رعایا کی معاشی مشکلات کو حل کرے۔ حکومت اس خدائی قانون کی پابند ہے کہ غذائی صورتِ حال پر قابو پانے کے علاوہ وہ عوام کی صحت و روزگار پر بھی نظر رکھے اور اس کے معاشی توازن کو

برقرار رکھے۔

علم اقتصادیات یا معاشیات اس علم کو کہتے ہیں جس میں انسان کے ان طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو زندگی کے روزمرّہ کے معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ علم اس امر کی تحقیق کرتا ہے کہ انسان اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرے اور اسے انسانی فلاح وبہبود کے لئے کیسے خرچ کرے۔ لیکن علم معاشیات کی آج تک کئی الگ الگ تعریفات کی جاچکی ہیں۔ یعنی علمائے معاشیات اس علم کی ایک تعریف تک پر بھی متفق نہ ہو سکے۔

معاشیات کی تعریف روبنس کے نقطۂ نظر سے معاشیات وہ علم ہے جس میں انسان کے اس طرز عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو اغراض (ENDS) اور ان کو پورا کرنے کے قلیل وسائل سے متعلق ہے۔ ان وسائل کا متبادل استعمال کیا جاسکتا ہے۔

روبنس کا دعویٰ ہے کہ اس نے جو تعریف کی ہے وہ پچھلی تمام تعریفوں سے بہتر ہے۔ اس تعریف کے اہم اجزاء یہ ہیں

(ل) اغراض (ENDS) جس سے مراد انسانی ضروریات ہیں جو لامحدود ہیں۔

(ب) وسائل (MEANS) جن سے مطلب وہ ذرائع ہیں جو ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں جو محدود ہیں۔

(ج) قلت (SCARCITY) جس سے مراد وسائل کی کمی ہے۔

(د) متبادل استعمال (ALTERNATIVE USES) جس سے مطلب یہ ہے کہ قلیل وسائل کو دوبارہ استعمال میں لانا۔

لیکن اگر روبنس کی اس تعریف کو بغور دیکھا جائے تو یہ تصوّر بڑا مجرد معلوم ہوتا ہے۔ درحقیقت روبنس نے علم معاشیات کو "نظریہ قدر" میں تبدیل کرکے رکھدیا ہے حالانکہ علم معاشیات اس نظریہ کے علاوہ بھی کچھ مسائل پر بحث کرتا ہے۔ مزید یہ کہ معاشیات کو اس تعریف میں انسانی خوشحالی سے بےتعلق کرکے رکھ دیا گیا ہے۔ اسی لئے اب

اس مسئلہ پر اتفاق کیا جاتا ہے کہ معاشیات محض ایک علم ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ حیثیت کا حامل ہے۔ یہ وہ علم ہے جو انسانی زندگی کی گوناگونی کے درمیان سے ابھرتا ہے جو صرف باضابطہ غور و فکر کی ہی دعوت نہیں دیتا بلکہ انسانی ہمدردی، تخیل اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عام فہمی کی آن بان کو برقرار رکھنے کی غیر معمولی دعوت بھی دیتا ہے۔

معاشیات کی نوعیت

جس طرح معاشیات کی تعریفات مختلف ہیں اسی طرح اس کی نوعیت کے بارے میں کئی نقاط نظر پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً کینس نے لکھا ہے کہ "معاشیات کا زاویۂ نظر تصفیہ شدہ نتائج کا کوئی ایسا مجموعہ پیش نہیں کرتا جسے فوری طور پر پالیسی پر منطبق کرنے کے لئے اختیار کیا جاسکے۔ یہ تو ایک نظریہ سے کہیں زیادہ ایک طریق کار ہے ذہن کا ایک اسلوب ہے سوچنے کی ایک تکنیک ہے جو اس کی اہمیت رکھنے والے کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد دیتی ہے۔" لیکن کینس کے اس بیان سے معاشیات کی عملی افادیت کسی حد تک کم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ مفکرین معاشیات کی رائے میں یہ علم اُجالا بھی کرتا ہے اور پھل بھی دیتا ہے۔ بس اس بحث کو یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ معاشیات کے اصول نہ تو محض نظریات ہیں اور نہ ہی محض عقائد۔ یہ درست ہے کہ معاشیات ذہن کو فکر کی تکنیک سے مسلح کرتی ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ معاشیات کو عملی زندگی سے خارج کر دیا جائے یا یہ کہا جائے کہ معاشیات کی وسعت نہایت محدود ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی ایسی بات سے اتفاق نہ کرے گا۔

ابھی تک ماہرین کا اس بات پر فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ آیا معاشیات سائنس کا درجہ رکھتی ہے یا فن کا۔ تاہم اس وقت لوگ معاشیات کو سائنس اور آرٹ دونوں فہرستوں میں مقام دیتے ہیں۔ چنانچہ روبنس کے مطابق معاشی قوانین دوسرے تمام سائنسی علوم کے قضایہ کے ساتھ ہر طرح کی برابری رکھتے ہیں۔ چنانچہ عام ماہرین سائنس قوانین اخذ کرنے کے لئے دو طریقے اختیار کرتے ہیں۔ استخراجی طریقہ (DEDUCTIVE

(METHOD) اور استقرائی طریقہ (INDUCTIVE METHOD)۔ استخراجی طریقے سے جانی پہچانی ہدایتوں سے نتائج برآمد کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ انسان فانی ہے لہٰذا اس عام صداقت کا اطلاق کسی خاص شخص پر کرتے ہیں اور ہم اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ بھی فانی ہے۔ اس کے برخلاف استقرائی طریقہ میں ہر بات کا الگ الگ تجزیہ کرتے ہیں اور اس کے بعد ان باتوں میں آپس کے علّتی تعلق کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی جزئیات سے کلّیات اخذ کرتے ہیں۔ حکما کے نزدیک ان دونوں طریقوں میں خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی۔

معاشیات کے اسلوب

موجودہ دَور میں نہایت وسیع مفہوم کے تحت معاشیات اس معاشی ہیئت کا مطالعہ ہے۔ جس کے ماتحت وہ کر لوگ کام کرتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں۔ معاشی ہیئت یا اقتصادی نظام سے مراد وہ مرتب ادارات ہیں جن کے ذریعے انسانی اور قدرتی وسائل کو کام میں لاکر اشیاء و خدمات تیار کی جاتی ہیں۔ اس نظام کی کارگزاری کا مطالعہ کرنے کے لئے علم معاشیات میں دو نمایاں اسلوب (APPROACHES) ہیں۔ جزئی معاشیات (MICRO ECONOMICS) اور کلّی معاشیات MACRO ECONOMICS معاشی ہیئت پر اس حیثیت سے نگاہ ڈالی جا سکتی ہے کہ وہ ایک "کل" ہے اور اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے نیز اس حیثیت میں بھی اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ لاتعداد اکائیوں پر مشتمل ہے جن میں ہر ایک اہم ہے۔ مثلاً صرفی اکائیاں جو افراد اور خاندانوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پیداکار اکائیاں جو فرم۔ کھیت۔ معدنی اداروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ انفرادی عاملین پیدائش مثلاً محنت کار۔ زمیندار، سرمایہ دار وغیرہ، انفرادی صنعتیں یعنی لوہا و فولاد کی صنعت، سوت کی صنعت وغیرہ۔

جب ہم معیشت کے کسی ایک مسائل کا تجزیہ کرنے بیٹھتے ہیں تو ان تمام مسائل پر ہماری نگاہ ہوتی ہے اس مطالعہ کو اصطلاح میں MACRO ECONOMICS یعنی کلّی معاشیات کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم جزوی اکائیوں پر غور کرتے

ہیں تو وہ MICRO ECONOMICS کہلاتا ہے۔ یہ دونوں اسالیب ایک دوسرے کے اٹوٹ رشتے میں منسلک ہیں کہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

معاشی ادارے | معاشیات کے کچھ سسٹم ہیں مثلاً سرمایہ داری CAPITALISM اشتراکیت (COMMONISM) سوشلزم۔

اس وقت دُنیا کے بیشتر ممالک میں سرمایہ دارانہ سسٹم رائج ہے لیکن دورِ حاضر میں کئی نقائص کی بنا پر ماہرین اس نظام کو پسندیدگی سے نہیں دیکھتے بلکہ لوگوں کا زیادہ رُجحان سوشلزم کی جانب ہے اس لئے ہم اس سسٹم پر کچھ بات چیت کریں گے۔

سوشلزم | سوشلزم میں تمام ذرائع پیداواری پر حکومت کا قبضہ ہوتا ہے اور حکومت عوام کی طرف سے اجتماعی نوعیت سے ان کی نگرانی کر کے انہیں خود استعمال کرتی ہے۔ سوشلزم میں نہ کوئی زمیندار ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی کارخانہ دار نہ کوئی مالکِ مکان ہوتا ہے نہ کوئی سیٹھ۔ ہر قسم کا کاروبار حکومت خود کرتی ہے اور اس کا سارا منافع بھی حکومت ہی کے خزانے میں جمع ہوتا ہے ہر شخص حکومت کا ملازم ہوتا ہے۔ چنانچہ مسٹر اور مسز دیب نے سوشلزم کے تحت صنعت کی تعریف یوں کی ہے۔

"وہ صنعت جسے سماجی ملکیت میں لے لیا گیا ہو ایسی صنعت ہوتی ہے جس میں تمام آلاتِ پیداوار پر کسی سرکاری ادارے کا قبضہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی صنعت اس غرض سے نہیں چلائی جاتی کہ اس کی پیداوار کی فروخت سے منافع حاصل کیا جائے۔ بلکہ اس کا مقصد ان لوگوں کی براہِ راست خدمت انجام دینا ہوتا ہے جو اس ادارے یا انجمن کی نمائندگی کرتے ہیں۔

سوشلزم کی خصوصیات | سوشلزم کی مندرجہ ذیل خصوصیات کا عموماً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ تمام ذرائع پیداوار، اراضی، کارخانے وغیرہ حکومت کی ملکیت ہوتے ہیں۔

۲۔ اشیائے صرف کی حد تک نجی ملکیت کی اجازت ہے۔
۳۔ چونکہ تمام افراد حکومت کے ملازم ہوتے ہیں لہٰذا تحفظ کا زیادہ احساس رہتا ہے۔
۴۔ چونکہ تمام منافع حکومت کے خزانے میں داخل ہوتا ہے لہٰذا سماجی تحفظ پر فراخدلی سے دولت خرچ کی جاسکتی ہے۔
۵۔ تقسیم دولت کسی حد تک مناسب ہوتی ہے۔
۶۔ عوام کو بڑھتے ہوئے معیار زندگی سے متمتع ہونے کا موقع ملتا ہے۔
۷۔ وسائل کی تقسیم ایک مرکزی ادارہ کرتا ہے لہٰذا صارفین کی پسند و ناپسند سے یہ باتیں طے نہیں ہوتیں۔
۸۔ عوام کو لگان، کرایہ، سود وغیرہ کی کمائی حاصل نہیں ہوتی۔
۹۔ اگرچہ سوشلزم میں دولت کی تقسیم مساوی نہیں ہوتی لیکن کم سے کم ہر ایک کے لئے مساوی مواقع ضرور موجود رہتے ہیں۔

سوشلزم کی مبیّنہ خوبیاں سوشلزم میں بظاہر چمک دمک کی کئی باتیں نظر آتی ہیں۔ سوشلزم دراصل سرمایہ دارانہ نظام کی لعنتوں کے خلاف ایک انتقامی چیز ہے۔ اسلئے سوشلزم سرمایہ دارانہ رجحان کو ختم کرتا ہے بے روزگاری کو دور کرتا ہے۔ سوشلسٹ حکومت کا فرض ہے کہ سماج کے وسائل کو، سماجی تحفظ وبہبود کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر خرچ کرسکتی ہے۔ صارفین کی ناواجبی وغیر عاقلانہ خواہشات سوشلزم میں اعلیٰ اقدار کی بنیادوں پر جانچی پرکھی جاتی ہیں۔ سوشلسٹ سماج میں ملک کی ترقی اور خوشحالی کی بنیادیں استوار کی جاسکتی ہیں۔ ہر قسم کی تعلیم وتربیت پر کثیر رقم صرف کی جاسکتی ہے۔ حفظان صحت کی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سماج کے مادّی وسائل کا بہتر سے بہتر استعمال کرکے ان سے بہترین استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

سوشلزم کے نقائص لوگ عام طور پر سوشلزم کے یہ نقائص بیان کرتے ہیں۔ سوشلزم کے دعوے بہت بلند وبانگ ہیں لیکن

دراصل ان خوبصورت دعووں کے پس پشت سرمایہ داری سے نفرت، تعصب اور انتقام کے سوا کوئی تعمیری لائحہ عمل نہیں ہے۔ اگر سرمایہ داری کو ختم کرنے کی کوئی سکیم ہے بھی تو صرف یہ کہ پورے سماج کو ایک بہت بڑا زندان بنادیا جائے جس میں ہر قیدی کو روٹی کپڑا اور مکان مل جائے۔ اگر سرمایہ داری سے نجات حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ذہنی فکری وجسمانی آزادیوں سے محروم کرکے غلام بنادیا جائے، کہ شکنجوں کے ذریعے سے اُس سے کام لیا جائے اور تشدد کے خوف سے سخت مجبور قیدیوں کی طرح سپاہیوں کے اشاروں پر کام کرے تو نہ تو یہ نجات ہے نہ آزادی ہے اور نہ ہی اصلاح بلکہ سچ پوچھیے تو آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی مثال بالکل صادق آتی ہے یعنی ایک مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے اُس سے بڑی مصیبت کا شکار ہو جاتا ہے۔

تنقید کرنے والے کہتے ہیں کہ سوشلزم کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں انسان سے اس کی ہر طرح کی ملکیت (ظاہری باطنی) کا حق چھین کر اس سے کام کرنے کا داعیہ لے لیا جاتا ہے اور فطری طور پر انسان کے سامنے یہ سوال آجاتا ہے کہ وہ جد وجہد کرے تو کس بات کے لئے؟ کیا صرف بینی انعام اُس کے لئے کشش رکھے گا جو اپنے خاندان کے لئے ایک چھوٹا سا پُرسکون گھر رکھنے کا خواہشمند ہے۔

نقادوں کے نزدیک سوشلزم کی دوسری خرابی یہ ہے کہ اس میں دراصل "صرف" کو "پیداوار" سے مطابق کیا جاتا ہے یعنی صارفین کو اس بات کی آزادی نہیں کہ وہ جو چیز چاہیں خریدیں اور جس مقدار میں چاہیں خریدیں بلکہ حکومت خاص منصوبہ بندی کرتی ہے جس کی غرض وغایت سوشلزم میں ہوتی ہے کہ جو کچھ پیداوار حاصل ہوا ہے صارفین میں بہتر طور پر تقسیم کیا جائے۔ یہ غرض وغایت نہیں ہوتی کہ جو ادر جتنی صارفین کی اصل ضرورت ہے اسے پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔

نقادوں کے نزدیک سوشلزم کی تیسری برائی یہ ہے کہ ہر فرد کو حکومت اپنا مکمل طور سے غلام بنالیتی ہے اس کو بالکل بھیڑ بکری کی طرح حکومت کی

سنگینوں کے اشاروں پر چلنا اور کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ ہر قسم کی آزادی سے محروم ہو جاتا ہے حکومت کی کسی سختی پر کوئی احتجاج نہیں کر سکتا حکومت کی کسی غلط پالیسی پر تنقید نہیں کر سکتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ حکومت کی مرضی کے خلاف کوئی بھی کام نہیں کر سکتا یعنی اسے ایک زرخرید غلام یا قیدی کی مانند رہنا پڑتا ہے یعنی اس کی زندگی ایک پنجرے میں قید ہو جانے والے پرندے کی سی ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبیعت میں بزدلی، خوشامد، غیر مشروط وفاداری، اندھی فرمانبرداری اور غلامانہ ذہنیت کی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بھلا روٹی کپڑا مکان وغیرہ کس کام کے؟ اقبال نے خوب کہا ہے ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

نقاد کہتے ہیں کہ سوشلزم میں جو کچھ "اچھائیاں" ہیں وہ محض خیالی ہیں در اصل بنی نوع انسان کو ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جس میں نہ تو فرد اجتماعی مفاد کو اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھائے اور نہ ہی اجتماعی مفاد کو ایسی حیثیت دی جائے کہ فرد اس کے نیچے پس کر رہ جائے یعنی ایسا نظام جس میں فرد اور سماج میں ایک حسین توازن برقرار رکھا جائے اور انسان ذہنی، فکری اور جسمانی آزادی سے محروم ہوئے بغیر خوش حالی کی دولتوں سے مالا مال ہو سکے۔ پس ایسا نظام صرف اسلام ہے۔

مذہب اور معاشیات کا تعلق

ہم نے آغاز بیان میں یہ عرض کی ہے کہ اسلام کے قانون کی ابتداہی اقتصادیات و معاشیات سے ہوتی ہے کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک جو تمام جہانوں کی پرورش کا ذمہ دار ہے سب تعریف کے لائق ہے۔ لہٰذا مذہب اور اقتصادیات کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ دین اسلام ایسا ہے کہ جو مادی زندگی میں شیریں ترین مسرتوں اور بعد از موت ابدی راحتوں کا راستہ ہے۔

جس طرح ہم نے اُوپر بیان کیا کہ علم معاشیات اُن امُور پر بحث کرتا ہے جن کا تعلق بشری حاجات سے ہوتا ہے۔ یہ بحث ضروریات کے حسنات سے کی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر ہم اقتصادی حسنات کو سمجھنا چاہیں تو لازماً ہمیں انکے اخلاقی حسنات پر نظر رکھنا ہوگی۔ لیکن عام معاشیات اور اسلامی معاشیات میں یہ سب سے بڑا فرق ہے کہ عام علم معاشیات محض اقتصادی حسنات پر بحث کرتا ہے لیکن اسلامی معاشیات میں اس کا رابطہ جو اخلاقی حسنات سے قائم ہوتا ہے وہ بھی مدّنظر رکھا جاتا ہے مثلاً روٹی کپڑا مکان معاشی حسنات ہیں۔ ان سے مختلف مقاصدِ زندگی پورے ہوتے ہیں مثلاً زندگی کی بقاء قیام۔ اطمینان وسلامتی وغیرہ۔ جس قدر یہ مقاصد اہم ہوں گے اسی قدر ان حسنات کی قیمت زیادہ ہوگی۔ لہٰذا اقتصادیات کے مطالعہ کے لئے ایک ایسے دین کی ضرورت ہے جو اقتصادی اخلاقیات سے مالا مال ہو۔ اور ایسے مذاہب جو اقتصادی اخلاقیات کے شعبہ میں شکست خوردہ ذہنیت کے حامل ہیں وہ لائقِ اتباع نہیں ہیں۔ چونکہ یہ مذاہب اس دور کے معاشی تقاضوں پر پورے نہ اتر پائے لہٰذا لوگوں نے مادہ پرستی اور دہریت کو اپنا نجات دہندہ تسلیم کر لیا حالانکہ اگر مذہب سے برگشتہ انسان اسلام کے در پر آجائے تو اس کو اطمینان وسلامتی مل جائے، بشرطیکہ وہ دینِ اسلام کے "ثقلین" سے تمسّک کو اپنا علاج تسلیم کر لے۔

اسلامی معاشیات

انسان کے ساتھ ولادت سے وفات تک کوئی نہ کوئی حاجت دامن گیر رہتی ہے۔ ان حاجات میں سب سے زیادہ اہم خوراک، لباس اور رہائش کے حوائج ہیں۔ اور ان حاجات کے سلسلے میں خود پروردگار نے اس کائنات میں وسائل مہیا کئے ہیں۔ دینِ اسلام میں انسان کو ان سے مستفید ہونے کا مساوی حق بخشا ہے۔ اس نصب العین کے لئے اسلام نے بڑے عالمگیر نوعیت کے قوانین وضع کئے ہیں۔ جن کی وضاحت آگے آرہی ہے فی الحال ہم اسلام کا تعلیم کردہ نظام پرورش فطری حیثیت سے

دیکھتے ہیں۔ نقل اوّل میں ارشادِ خداوندی ہے۔

فطری نظام

" اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (قدرتِ خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور تمہارے نفوس میں بھی ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ تمہاری روزی اور جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے "۔

(سورہ ذاریات آیات ۲۰، ۲۱، ۲۲)

منقولہ آیات کی رُو سے قدرت کا یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ زمین اور انسانی اجسام میں قدرتِ خدا کی نشانیاں ہیں اور اللہ نے رزق کا خود ذمہ لیا ہے۔ پس اگر ہم خود اپنے جسمانی نظام ہی پر غور کریں تو فطرت کا پورا معاشی نظام سامنے آجاتا ہے۔ ذرا اندازہ تو کیجئے کہ اندرونِ جسم ربُّ العالمین نے رزق کی کیسی متوازن تقسیم کا نظام رائج کر رکھا ہے اگر اس میں قطرہ بھر بھی خلل آجائے تو پورے جسم میں فساد برپا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ خالقِ کائنات کی طرف سے نوعِ انسانی کے لئے تقسیم روزی کا مبنی بر عدل طریقہ مشاہداتی نمونہ ہے۔

ذرا سوچئے کہ معدہ غذا کو تحلیل کرکے اس سے جوہر حیات کشید کرتا ہے۔ پھر اسے جگر کے حوالے کر دیتا ہے جگر اسے دل کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ دل اس امانت کو جسم کی رگ رگ میں حسبِ ضرورت پہنچا دیتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی حصّہ کو ضرورت سے زیادہ یا کم دے دیا جائے۔ بلکہ بغیر کسی رو رعایت و تاخیر کے باقاعدگی سے ہر مقام کو اس کا حصّہ خود بخود مل جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ دل و جگر جو خون کے بنانے اور تقسیم کرنے والے ہیں وہ اس امانت میں ایک قطرہ کی بھی خیانت کریں۔ بلکہ اپنی ضرورت سے وافر پورے کا پورا ماہر کارکنِ جسم کو اس کی ضرورت کے مطابق تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خیانت اسی وقت پیدا ہوگی جب ضرورت ادھوری رہیگی اور ضرورت اس وقت ادھوری ہوگی جب تقسیم غیر عادلانہ ہوگی۔ پس اگر عادلانہ نظامِ معیشت رائج ہو جائے تو بدعنوانیاں اور بداعمالیاں از خود ختم ہو جائیں۔

وہی عادلانہ فطری نظام اسلام رائج کرنا چاہتا ہے کہ ہر فرد کو اس کا حصّہ اس کی ضرورت کے مطابق ملے اور معاشرہ میں بداعمالی کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ یہ نظام اللہ نے اپنے مقرّر فرمائے ہوئے نمائندوں کے ذریعے سے بنی نوع انسان کو دیا ہے۔ دراصل اسلام کو معاشیات کی موجودہ تعریف ہی سے اختلاف ہے کہ اغراض (ENDS) لامحدود ہیں اور وسائل (MEANS) قلیل ہیں۔ حالانکہ نظام ربوبیت کا اصول یہ ہے کہ وسائل قبل از اغراض موجود ہوتے ہیں۔ دیکھئے ذرا غور کیجئے عورت کے جسم میں اللہ تعالیٰ نے دودھ کے دو چشمے جاری کئے ہیں۔ لڑکی جونہی بالغ ہوئی اب خبر نہیں وہ کب بیاہی جائے اور ماں بنے لیکن اس بچہ کے رزق کا وسیلہ قبل از پیدائش موجود ہے۔ اسی طرح ہر خطہ ارضی پر جملہ ذی حیات کی تخلیق اس وقت تک نہیں فرمائی جب تک اس کی تمام ضروریاتِ زندگی کا انتظام مکمل نہ کر لیا معلوم ہوا کہ اسلامی فطری علم معاشیات کا اصول یہ ہے کہ وسائل کو اغراض سے پہلے مہیا کرتا ہے۔

اب پھر غور فرمایئے کہ جب تک بچّے کی پرورش کا مرحلہ پیش نہیں آتا اس وقت تک عورت کے دودھ کے چشمے خشک رہتے ہیں اگر عورت کنواری رہے یا بے اولاد ہو تو یہ چشمے نہیں پھوٹتے البتہ بوقت ضرورت ان میں دودھ جاری ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ فطرت کو اسراف پسند نہیں ہے۔ بلکہ کفایت شعاری کی حامی ہے بے محل کام مستحسن نہیں ہیں۔ جب بچہ پیدا ہونے کو ہوتا ہے تو دودھ اُترنا شروع ہو جاتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس کی مقدار میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اور اس سارے عمل کی نگرانی براہِ راست خود خدا کی جانب سے ہوتی ہے۔ عورت کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ نہ اس کا کوئی ذاتی تصرّف ہوتا ہے اور نہ ہی دخل بس خدا کا بنایا ہوا (خود کار) نظام جاری رہتا ہے۔ اب بچّے کی رضاعت پر غور کیجئے بچہ کے دودھ پینے سے ماں کی خوراک میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ جو غذا پہلے ماں کے جسم کے لئے کافی ہوتی تھی اب اُس میں سے کچھ حصّے کا دُودھ بن جاتا ہے اس لئے

اس دوران ماں کی خوراک غذائیت میں اضافہ کرنے کے لئے مقوی اشیاء دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح قانون ربوبیت نباتات وحیوانات کے رزق کی تقسیم کا ہے۔ پودے کی جڑیں بطن زمین سے غذا لے کر فطری عمل کے مطابق جوہر کشید کرکے پودے کی نشوونما کا اہتمام کرتی ہیں۔ جڑیں خوراک تنے کو منتقل کرتی ہیں۔ وہ پھر آگے چھوٹے تنوں اور شاخوں وغیرہ کے حوالے کر دیتا ہے پس معلوم ہوا کہ فطری معاشی نظام میں ہر فرد کا برابر کا حصہ ہے اور تقسیم رزق عادلانہ طریقہ پر رائج ہے۔ چونکہ اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے لہذا اس کا معاشی نظام بھی فطری ہے۔

کماؤ اور بانٹو فطرت کے عین مطابق اسلامی معاشیات کی اساس اس پر ہے کہ حاصل کرو اور تقسیم کر دو یعنی (EARN AND DISTRIBUTE) کماؤ اور بانٹو۔ چنانچہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہر صاحب نصاب پر واجب ہے۔ خمس کو فرض قرار دے دیا گیا ہے۔ وراثت کو تقسیم کرنے کا حکم موجود ہے۔ سود کی قطعی حرمت اسلامی شریعت کا امتیاز ہے۔ یہ اسلام کے وہ معاشی اصول ہیں کہ سرمایہ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے اور دولت محدود ہاتھوں میں جمع نہیں ہونے پاتی۔ بے روزگاری کا مسئلہ پیچیدہ نہیں بنتا۔

معاشی خوشحالی اور مدنی طمانیت سے ہی انسان روحانیت کو اسی عالم میں فروغ دے سکتا ہے۔ پس انسانی زندگی کے اقتصادی پہلو اور روحانی پہلو کا متوازن ارتقاء اسلام ہے۔ نقل اوّل میں عموماً جہاں اقامہ صلوٰۃ کا ذکر ہے وہیں ایتاء الزکوٰۃ کا بیان ہے یعنی اسلام جہاں نماز سے روحانی سربلندی چاہتا ہے وہاں انسان کو معاشی طور پر اتنا ہی اونچا دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ مالی استطاعت سے تین مالی عبادات بجا لا سکے۔ خمس۔ زکوٰۃ اور حج۔

اسلام کی خواہش ہے کہ انسان اپنی ضروریات زندگی کا خود کفیل ہو اور وہ تقدس کی آڑ لے کر، تساہل کا شکار بن کر معاشرے پر بوجھ نہ بنے۔ وہ کسب معاش

کرے اور اپنے اہل و عیال کے نان و نفقہ کا بندوبست کرے۔ یہ ہی امتیاز ہے جو اسلام کو باقی تمام مذاہب سے الگ کرتا ہے جبکہ دیگر مذاہب محض روحانی فلاح کا پرچار کرتے ہیں۔ اسی لئے اسلام میں رہبانیت اور ترکِ دُنیا کی تعلیم نہیں دی گئی۔

افادہ UTILITY

اسلام کی تعلیم ہے کہ خدا نے کسی شے کو عبث پیدا نہیں کیا۔ ہر چیز میں انسان کا کوئی نہ کوئی مفاد پوشیدہ ہے۔ لہٰذا بنی نوعِ انسان کو اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا ہے" اور ان نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہماری اپنی جد و جہد ہے۔ لہٰذا سورہ نجم میں ارشاد ہے کہ "انسان کے فائدے کے لئے بس وہی کچھ ہے جو وہ اپنی کوشش سے حاصل کرے۔"

اسلام نے جسمانی جد و جہد کے ساتھ ساتھ ذہنی جد و جہد کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ عبادت کے ساتھ ساتھ اشیاء کے فوائد کو معلوم کرنے کے لئے ہمیں کائنات کا ریسرچ اسکالر بننے کی ترغیب دی۔ ارشاد ہے کہ "جو لوگ اُٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی مخلوق میں غور و فکر کرتے ہیں (اور جب غرضِ تخلیق جان لیتے ہیں تو بے اختیار کہہ دیتے ہیں) پالنے والے! تو نے ان چیزوں کو بے کار پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے بس ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچالے۔" پس اسلام نہیں چاہتا کہ انسان نکما اور نکھٹو ہو جائے اور کسبِ معاش سے کنارہ کش ہو بیٹھے۔ پس اسلام غور و فکر اور تجربات و مشاہدات کرنے کی تعلیم دیتا ہے ان سے منع نہیں کرتا۔

ربّ العزّت نے اس ذہنی جد و جہد میں "ذکر" ضروری قرار دیا ہے تاکہ انسان غور و تحقیق میں صانعِ حکیم سے غافل نہ ہو جائے۔ اللہ کو ہر وقت یاد رکھے۔ اسلام چاہتا ہے کہ علمی انکشافات کو تعمیری کاموں میں لایا جائے۔ تخریبی حربوں میں صرف کر کے انسانوں کو جہنم کا ایندھن نہ بنایا جائے کلام باری تعالیٰ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ علیم مطلق

ہے لسے معلوم تھا کہ ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ دُنیا مادّی علوم و فنون کے نشے میں انکارِ خدا کی مرتکب ہوگی اور اپنی علمی ایجادات کو تباہی کی راہ میں استعمال کر کے بنی نوعِ انسان کے لئے مشکلات پیدا کرے گی اور اس زمین کو جہنّم کا نمونہ بنانے کی کوشش کرے گی۔

دولت WEALTH

اِسلام جو ثقلین کا ضابطۂ حیات ہے جس طرح روحانیت کے لئے جامع ہے اسی طرح مادّیت کے واسطے مکمّل ہے چنانچہ حقیقی اِسلام مذہب و اقتصادیات کو حیرت انگیز طریق سے مربُوط کرتا ہے۔ دولت جسے ترکِ دُنیا پر عقیدہ رکھنے والوں نے تقدّس کی دشمن اور روحانیت کی راہ میں رکاوٹ جانا قرآن مجید نے اسے ۲۵ مرتبہ "فضل" ۳۱ مرتبہ "خیر" ۱۲ مرتبہ "حسنہ" اور ۱۲ مرتبہ "رحمت" کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِسلام دُنیا سے استفادہ کرنے کی عام دعوت دیتا ہے۔ ثقلِ اوّل میں مسلمانوں کے لئے دُعا تجویز کی گئی ہے کہ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ‎﴿٢٠١﴾‏ (البقرآیت ۲۰۰ پ ۲ ع ۹) یعنی "اے ہمارے پالنے والے ہمیں دُنیا میں نعمت دے اور آخرت میں ثواب دے اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اِسلام کی تعلیم میں دُنیا و آخرت ہر دو کی نعمتیں اہمیّت رکھتی ہیں۔ دُوسرے الفاظ میں یہ کہ اسلام اس مادّی دُنیا کی معاشیات پر بھی بحث کرتا ہے اور اس کے بعد لیدی زندگی کی اقتصادیات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

کسبِ معاش

چنانچہ حضرت رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ "اللہ کے ذکر و عبادت کے بعد کسبِ معاش کا درجہ ہے"۔ نیز حضورؐ نے حکم دیا ہے کہ "تمہیں نمازِ صبح کے بعد اس وقت تک نہیں سونا چاہیئے اور نہ آرام کرنا چاہیئے جب تک دیانتداری سے تم اپنی روزی نہ کما لو"۔ آنحضرتؐ نے یہاں تک ارشاد کیا کہ روزی کمانا گناہوں کا کفّارہ ہے۔ ثقلِ دوم کے پانچویں ہادی باقر العلوم حضرت امام محمد بن علی الباقر علیہ السّلام نے سرکارِ رسالت مآبؐ کی حدیث بیان کی ہے کہ عبادت کے ستّر حصے ہیں ان سب میں افضل حلال روزی

طلب کرنا ہے۔ معصوم نے یہ بھی فرمایا کہ حلال روزی طلب کرنا جہاد ہے اور افضل الاعمال ہے کہ حلال روزی کمائی جائے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سرکارِ کائناتؐ اپنے اصحاب کے مجمع میں تشریف فرما تھے آپ کے صحابہ کی نظر ایک نوجوان پر پڑی جو نوجوان، توانا، تندرست اور قوی الجثہ تھا۔ اور صبح سویرے طلبِ معاش میں گھر سے نکلا تھا۔ صحابہ نے کہا کہ "کاش! اسکی توانائی اور جوانی راہِ خدا میں صرف ہوتی تو کتنا اچھا تھا"۔ پس حضورؐ نے ارشاد فرمایا "ایسا مت کہو۔ کیونکہ اگر یہ اپنے نفس کے لئے جد و جہد کرتا ہے تو یہ بہتر ہے تاکہ یہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے محفوظ رہے اور لوگوں سے مستغنی ہو جائے تو دراصل یہ راہِ خدا ہی میں سرگرم عمل ہے۔ اگر وہ ضعیف العمر ماں باپ یا کمزور ننھے بچوں کے لئے کوشش کر رہا ہے تاکہ انہیں لوگوں سے بے نیاز کر دے اور امداد پہنچائے تو بھی خدا ہی کی راہ میں مصروف عمل ہے ہاں لیکن اگر یہ ذاتی غرور و گھمنڈ کے لئے جد و جہد کر رہا ہے تو وہ شیطان کی راہ پر ہے"۔

اس ارشاد سے صاف ظاہر ہے کہ کسبِ معاش اور طلبِ رزق حلال اسلام میں عبادت ہے مگر ایسی جد و جہد میں ذاتی نخوت کا عنصر ہو تو وہ شیطان کی راہ ہے۔ لہٰذا اسلامی معاشیات کا یہ اصول ہوا کہ کسبِ معاش اپنی اور اپنے زیرِ کفالت افراد کی ضروریات کے لئے از حد ضروری ہے لیکن اگر اس جد و جہد میں انسان اپنے ذاتی اغراض محض غرور و گھمنڈ کی خاطر پیشِ نظر رکھتا ہے تو اس عمل کا تعلق اسلامی معاشیات سے نہیں بلکہ شیطانی معاشیات سے ہوگا اور ایسے معاشیات کی اسلام مذمت کرتا ہے۔

ترکِ دُنیا کی ممانعت

سرکارِ رسالت مآبؐ نے یہ اعلانیہ تعلیم فرمائی ہے کہ "تم میں سے وہ شخص قابلِ تعریف نہیں جو دُنیا کو آخرت کے لئے چھوڑ بیٹھے اور وہ جو آخرت کو دُنیا کے لئے ترک کر دے بلکہ اچھا وہ شخص ہے جو دُنیا و آخرت دونوں میں حصّہ لے"۔

نقل دوم کے چھٹے ہادی حضرت امام جعفر صادقؑ سے کچھ لوگوں نے عرض

کیا کہ ہماری لبستی میں ایک ایسا آدمی ہے جو صبح وشام تسبیح وتقدیس میں مصروف رہتا ہے۔ امامؑ نے فرمایا پھر وہ اپنی روزی کس وقت کماتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ وہ روزی نہیں کماتا۔ لوگ اس کی روزی کے کفیل ہیں۔ صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ وہ لوگ اس شخص سے زیادہ ثواب کے مستحق ہیں۔ جو روزی میں اس کی کفالت کرتے ہیں۔ اسی طرح ثقل اوّل نے یہ تعلیم دی ہے کہ "اور جو کچھ تجھے اللہ نے دیا ہے اُس میں آخرت کی جستجو کر۔ دُنیا میں سے اپنے حصّے کو بھی نہ بھول۔"

(القصص ۷۷، پ ۲۰)

قائد ثقل دوم حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے ایک آدمی کو دُنیا کی مذمت کرتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اُسے نصیحت فرمائی "دُنیا سچائی کا گھر ہے۔ اس شخص کے لئے جو اس کے ساتھ سچائی سے معاملہ کرے۔ دُنیا امن وعافیت کا مقام ہے اس کے لئے جو اسے سمجھ گیا ہو۔ دُنیا دولت وثروت کا ٹھکانہ ہے اسکے لئے جو اس سے سامان سفر لے۔ دُنیا نصیحت کی جگہ ہے اس شخص کے لئے جو اس سے نصیحت حاصل کرے دُنیا دوستانِ خدا کی مسجد ہے۔ ملائکہ کا مُصلّیٰ اور وحی کی منزل ہے۔ دُنیا اولیاء اللہ کی تجارت گاہ ہے جس میں وہ رحمت کماتے اور جنّت کا نفع اُٹھاتے ہیں۔" ان سب مثالوں سے یہ بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلام میں دین و دُنیا کے مابین علیحدگی نہیں ہے۔ اگر صرف دُنیا کو دین کے مقابلے میں اختیار کر لیا جائے تو وہ مذموم ہے اور اگر دُنیا سے علیحدہ رہ کر صرف دین کو تھام لیا جائے تو مستحسن نہیں ہے۔ پس اسلام میں "دین و دُنیا" میں مکمل ربط ہے۔ اور اسلامی معاشیات میں دونوں پہلوؤں کی تعلیم موجود ہے۔

ثقلین کی ہدایات

اسلام کی یہ تعلیمات نظریاتی یا اعتقادی نہیں ہیں بلکہ اس کا ثقل اوّل قانونِ صامت ہے ثقل دوم نے اس قانون کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ چنانچہ ہادیانِ حقیقی اپنی معاش کے خود کفیل تھے اور کبھی دوسروں پر بار نہ ہوئے۔

خود شہنشاہِ کون و مکاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا آغاز تجارت سے ہوا۔ اپنے سرمایہ سے نہیں بلکہ دوسروں کی دولت سے۔ آپؐ نے اس قدر دیانتداری سے تجارت فرمائی کہ سارے زمانہ سے صادق اور امین کہلوایا۔

قائدِ ثقل دوم، مشکل کشائے عالم، سید الاولیاء، امیر المومنین علیٰ مرتضےٰ خود کسبِ معاش فرماتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں مزدوری کرکے روزی حلال کماتے اور ان سے سرمایہ کھینچ کر اپنی قوم میں منتقل فرماتے۔ کبھی کھیتوں میں پانی دیتے اور کبھی مٹی گارے کا کام کرتے۔ حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ اکثر دوپہر کے وقت اپنے کسب معاش کی طرف نکلتے تھے کیونکہ آپ چاہتے تھے کہ مالِ حلال کی طلب میں خود زحمت و مشقت اٹھائیں۔ اس طرح آپؑ نے روزی کے لئے جفاکشی کی تعلیم دی۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام بھی کسبِ معاش فرماتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ محمد بن منکدر جو ترکِ دنیا کے موید تھے ان کا بیان ہے کہ

"میں نے امام محمد باقرؑ کو دیکھا۔ میں نے چاہا کہ امامؑ کو کچھ نصیحت کروں مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرتؑ نے خود میری ہدایت فرمائی۔"

لوگوں نے دریافت کیا کہ واقعہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: "میں سخت گرمی کی شدت میں اپنی کسی ضرورت سے مدینہ کے بعض اطراف میں نکلا۔ راستے میں امام محمد باقرؑ سے ملاقات ہوئی۔ حضرتؑ ذرا تنومند اور جسیم تھے اور اس وقت دو خادموں کے سہارے جا رہے تھے میں نے اپنے دل میں کہا اللہ اکبر ایک اتنا بڑا بزرگ مرتبہ شخص جو بزرگانِ قریش میں سے ہے اس وقت ایسی حالت میں طلبِ دنیا میں مصروف ہے۔ خیر میں اس کو نصیحت کروں گا۔ خیر میں حضرتؑ کے قریب ہوا اور سلام کیا۔ حضرتؑ نے جوابِ سلام دیا۔ اس حالت میں کہ سانس آپ کی پھولی ہوئی تھی اور پسینہ ٹپک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ خدا آپؑ کے امور کی اصلاح کرے۔ آپؑ ایک بزرگ مرتبہ آدمی ہیں۔ بزرگانِ قریش میں سے ہیں۔ آپؑ ایسی حالت میں دنیا طلبی میں مصروف

ہیں؟ غور تو فرمائیے کہ اگر ایسی حالت میں آپؑ کو پیغامِ موت آجائے تو پھر کیا ہوگا؟۔
حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔

"اگر مجھے اس حالت میں موت آجائے تو کیا حرج ہے؟ اس لئے کہ اس صورت میں وہ موت مجھے آئے گی جو اللہ کی اطاعت میں مصروفیت کے عالم میں ہے۔ جس کے ذریعے میں اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو دوسروں سے بے نیاز کرنا چاہتا ہوں۔ بے شک میں اس وقت ڈرتا جب میں اللہ کی نافرمانیوں میں سے کسی نافرمانی میں مصروف ہوتا۔"

میں نے کہا "آپ نے سچ فرمایا۔ میں نے تو چاہا تھا کہ آپ کو نصیحت کروں گا حقیقتاً آپؑ ہی نے مجھے ہدایت فرما کر ممنونِ منت فرمایا۔" (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کا نظریہ اسلامی تعلیم پر قائم نہیں ہے)

سرکار امام جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام کے بارے میں تحریر ہے کہ "ایک شدید گرمی کے دن مدینہ کی گلیوں میں گھومتے ہوئے عبدالاعلیٰ مولائے آلِ سام نے دیکھا۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے عرض کی کہ میری جان آپ پر فدا بارگاہ خداوندی میں قرب و منزلت اور قرابتِ رسولِ مقبولؐ کے باوجود آپ اس قدر گرمی و حدتِ آفتاب میں اتنی زحمت و مشقت کیوں اٹھا رہے ہیں؟" حضرت نے ارشاد فرمایا:
"میں تحصیلِ معاش کے لئے نکلا ہوں اس غرض کے لئے کہ کسی کا محتاج نہ ہوں۔"

اسی طرح ابو عمر شیبانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو دیکھا کہ حضرتؑ کے ہاتھ میں ایک بیلچہ ہے اور ایک موٹا لباس پہنے ہوئے اپنے ایک باغ میں سرگرم کار ہیں اور پسینہ ٹپک رہا ہے میں نے گزارش کی کہ "یہ خدمت میرے سپرد فرما دیں کہ میں اسے انجام دوں۔" حضرتؑ نے ارشاد فرمایا: "مجھے یہ پسند ہے کہ انسان دھوپ کی ایذا کو برداشت کرے اور کسبِ معاش کرے۔"

فضل ابن حرہ سے روایت ہے کہ ہم امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے جب کہ آپؑ ایک باغ میں مصروفِ کار تھے۔ ہم نے عرض کی کہ "ہمیں اجازت دیجئے

کہ ہم اس کام کو کریں یا خادموں کو حکم فرمائیے" اس پر حضرت نے فرمایا:
"مجھے اسی حالت میں رہنے دو۔ اسلئے کہ میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی نظر مجھ پر اس حالت میں پڑے کہ میں اپنے ہاتھ سے کام کر رہا ہوں اور اپنے نفس کو ایذا پہنچا کر کسبِ حلال میں مصروف ہوں"۔

طلب (DEMAND)

مندرجہ بالا امثال سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اسلام میں معاشی جدوجہد کس قدر ضروری اور لازمی ہے۔ اب ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ "اسلامی معاشرہ کے فرد کی طلب (DEMAND) کیا ہے"۔ چنانچہ ثقل دوم کے قائد باب مدینۃ العلم والحکمۃ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "مردِ مسلم رب العالمین سے کیا طلب کرتا ہے؟ یہ کہ یا تو اللہ کی طرف سے اسے بلاوا آئے چونکہ اللہ کے پاس نعمتیں ہیں وہ اس کے لئے بہتر ہیں۔ اور دنیا میں رہنے کی صورت میں وہ اللہ سے طلب کرتا ہے کہ اللہ کی طرف سے اسے اس طرح روزی ملے کہ وہ مال دار بھی ہو اور صاحبِ اولاد بھی ہو۔ پھر اس کا دین اور عزتِ نفس دونوں برقرار رہیں"۔

حضرت امیر المومنین کے ایک ہی جملہ میں طلب کا تجزیہ (ANALYSIS OF DEMAND) ہوجاتا ہے۔ اگر اس عبارت کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معاشیات کا قانونِ افادہ (LAW OF UTILITY) قانونِ بدل (LAW OF SUBSTITUTION) خطوطِ عدم ترجیح (INDIFFERENCE CURVES) توازنِ صارف (CONSUMERS EQULIBRIUM) طلب کی لچک (ELASTICITY OF DEMAND) اور توفیرِ صارف (CONSUMER'S SURPLUS) وغیرہ تمام موضوعات کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

مادّی و روحانی حیات

لادینیت اور اسلام کا سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ لادینیت صرف مادّی حیاتِ انسانیہ پر بحث کرتی ہے لیکن اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ بنی نوعِ انسان کے دو جنبے ہیں۔ ایک مادّی اور دوسرا معنوی یا روحانی۔ اس کا مادّی جنبہ موت پر ختم ہوجائے گا۔ لیکن اس کا معنوی جنبہ ہمیشہ

باقی رہے گا اور موت کے بعد ایک اور زندگی کے ایک نئے دائرے میں داخل ہو جائے گا
لہٰذا اسلام دونوں جنبوں کی حفاظت کرتا ہے۔ جس طرح مادّی جنبہ جسمانی تربیت و پرورش
اور رُشد ہدایت کے لئے مخصوص جد و جہد کا محتاج ہے اسی طرح رُوحانی جنبہ کو درجہ کمال
پر پہنچانے کے لئے پاکیزہ افکار، اخلاقیات اور معقول اعتقادات کی خصوصی ضرورت ہے۔
اسلام کے علاوہ دیگر ادیان عالم نے مادّی جنبہ کو نظر انداز کر دیا اور ترکِ دُنیا
کی نامعقول تعلیم پر اپنے مذاہب کی بُنیاد رکھی۔ مثال کے طور پر عیسائیت نے رہبانیت
کی تعلیم دی۔ چنانچہ بائبل میں کئی جگہ اس نظریہ کا پرچار ہے۔ مثلاً یسوع نے کہا "اگر
کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی
جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔" (لوقا باب ۱۴ آیت ۲۵، ۲۶)
اس کے برعکس دوسرے گروہ نے کلّی طور پر رُوحانیت کو پسِ پُشت ڈال دیا ہے۔
یہ محض مادّیت کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ اور معنویات سے متعلقہ تمام چیزوں سے قطعاً
لاتعلق ہے۔ ان دونوں متضاد نظریات نے انسانی زندگی کے سفینے کو منجدھار میں لا کھڑا
کیا ہے اور غرقابی کا خدشہ سروں پر منڈلا رہا ہے۔ پہلا گروہ بخیالِ خود تقویت روح اور
تہذیبِ نفس میں اس قدر مستغرق ہو چکا ہے کہ وہ مادّی زندگی کی ضروریات و لوازمات
کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے اور دُوسرا گروہ مادّیت کے سیلاب میں بہ رہا ہے اور
روحانیت کو اپنی ہوس رانیوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا چکا ہے جس سے
انسانیت روحانی سعادتوں سے محروم ہو چکی ہے۔ اس دوسرے گروہ کا انسانی زندگی
کا یہ نیا مادّی تصوّر ترکِ دُنیا کے پُرانے تصوّر سے بھی زیادہ خطرناک اور ضرر رساں ہے۔
اس گروہ کی جد و جہد محض مادّی خمیر کو وسعت دینا اور اسے انسانی قلوب کی گہرائیوں
میں پہنچانا ہے۔ یہ فانی جسم مادّی ضروریات (ENDS) کو روحانیت کی قیمت
(VALUE) پر مہیّا کرنا چاہتا ہے۔ وہ روح جو اَبدی ہے اور اس ارضی زندگی کے
ختم ہونے پر بھی باقی رہے گی۔ حالانکہ اس گروہ نے بھی مجبوراً روح کی ہستی کو تسلیم
کیا ہے اور اسے ہوائی طاقت (ETHEREAL ENERGY) کا نام دیا ہے۔

تفریقِ مذہب

چونکہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں یہ قوت نہ تھی کہ اس مادیت کا مقابلہ کر سکتے لہٰذا دُنیا کو روحانیت سے بیگانگی پیدا ہونے لگی اور نئے نئے اقتصادی نظریات ظہور میں آئے۔ موجودہ اقتصادی خلفشار کو دُور کرنے کے لئے مختلف اقتصادی معالجات کی آزمائش کی گئی اور ہر نظریہ ناکام ثابت ہوا حتیٰ کہ کمیونزم جو اقتصادی مساوات کا دعویدار ہے وہ بھی اس سلسلے میں ناکامیاب ہوگیا۔ بلکہ پیدا شدہ موجودہ مشکلات اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ عالمگیر انتشار صرف انہیں غلط نظریات کی بدولت وجود میں آیا ہے۔ اگر سرمایہ داری وحشیانہ نظام ہے تو اشتراکیت اور اشتمالیت بھی اچھے نظام ثابت نہیں ہو پائے۔ اگر CAPITALISM ایک مکمل غارت گری ہے تو ان نئے معاشی نظاموں میں بھی کوئی اصلاحی جدّت موجود نہیں ہے۔ بقول ماہرین ان کا اصل مقصد اصلاح نہیں ہے بلکہ صرف سرمایہ داری نظام سے نفرت ہے لیکن ان میں بھی زید کو لوٹ کر بکر کا تھیلا بھرا جاتا ہے بلکہ ان نظاموں میں سرمایہ صرف حکمران طبقے کی اجارہ داری میں آجاتا ہے۔

اصل اسلامی نظام

افسوس یہ ہے کہ عام مولویوں نے بھی ثقلین کا بتایا ہوا صحیح اسلامی نظام اقتصادیات منظر عام پر لانے کی جدوجہد نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہ رونا روتے ہیں کہ کچھ لوگ غیر اسلامی نظاموں پر "اسلامی" لیبل چسپاں کر کے نہ صرف اُن کے گُن گا رہے ہیں بلکہ اُن کو "اسلامی" ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

حقیقتاً اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ملّتِ اسلامیہ چونکہ "تمسک بالثقلین" کی اہمیت کو نظر انداز کرتی رہی ہے لہٰذا ان کو ایسا نظام ملنا دشوار ہے جو حالاتِ حاضرہ کے چیلنج کا مُقابلہ کر سکے۔ اس لئے آج یہ روش عام ہے کہ جب بھی کوئی نیا نظام بنتا ہے تو دُنیائے اسلام بغیر سوچے سمجھے اس کو اسلام کی نقل قرار دے دیتی ہیں اور خود فریبی کا شکار ہو جاتی ہے حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ غیر اسلامی یعنی مادّی نظام فی الحقیقت اسلامی نظام سے بہت ہی پست اور متضاد ہے۔

چونکہ بانیٔ اسلام کی ہدایت کے مطابق علوم اسلامیہ کے ماخذ ثقلین ہی ہیں لہٰذا تمام وہ نظریات جو ان سے ہٹ کر کسی قسم کے ذریعے سے حاصل کئے جائیں گے ناقص و نامکمل ہوں گے۔ پس اسلام کی صداقت کا دعویٰ اسی صورت میں ثابت ہو سکتا ہے جب کہ اس کے تعلیمات اصل ماخذوں سے حاصل کر کے دُنیا کے سامنے پیش کئے جائیں۔

انسانی زندگی میں خوشگوار فضا اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب خالص اسلامی سیاسی و معاشی نظام رائج ہو جائے۔ یہی حقیقی نظام انسانیت کو وہ اطمینان دے سکتا ہے جس کی وہ متلاشی ہے اور ادھر اُدھر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ جب اسلامی اقتصادی و سیاسی نظام طلوع کرے گا تو انسانیت کے تمام امراض کا علاج ہو جائے گا۔ اسے ہر مشکل سے آزادی حاصل ہو جائے گی۔

ایک پنتھ دو کاج

جن لوگوں نے توفیقِ الٰہی سے دینِ اسلام کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ یہی دین ایک ایسا ضابطہ ہے جو مادّی و روحانی دونوں حالتوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ یہی وہ دین ہے کہ تقاضائے دورِ حاضرہ کے مطابق مذہبِ اعتدال ہے جس میں افراط و تفریط نہیں ہے۔ نہ ہی اس میں ترکِ دُنیا کا تصور ہے۔ اور نہ ہی دُنیا پرستی کا خیال۔ یہی مذہب ایک مکمل لائحہ عمل ہے۔ اس میں ریاست کا صحیح تصوّر موجود ہے۔ اور یہی سوسائٹی کی درست تشکیل کی ضمانت دیتا ہے۔ بالکل عادلانہ اصول کے مطابق روحانی زندگی کی طوالت کے تحت اسلامی معیشت میں روحانیت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن مادّی زندگی کی کوتاہی کے باوجود مادّی فلاح و بہبود کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس کا مقصد انسانیت کے لئے شایانِ شان زندگی کا حصول ہے۔

اسلام کا نظریہ ہے کہ یہ تمام عالم اور جو کچھ اس میں موجود ہے یہ ابدی راحتوں کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا ہر شئے کا انسانی حیات سے ربط و رشتہ ہے۔ دیگر مذاہب مثلاً عیسائیت، بدھ مت و ہندو دھرم کے برعکس اسلام کو حیاتِ ارضی کے تمام پہلوؤں

کا اس قدر احساس ہے کہ وہ مادّی زندگی کی طہارت وفلاح اور اس کے احترام کے لئے جامع قوانین مہیا کرتا ہے اور انسانیت میں شریفانہ وباعظمت زندگی کی روح پھونکتا ہے اور جہاں کہیں بھی اسلام میں دُنیا کی مذمت وارد ہوتی ہے وہاں کلام میں مرکب توصیفی "الحیٰوۃ الدُّنیا" وارد ہوا ہے جس کے مطابق دُنیا کے معنیٰ اُس پست دُنیا یا گھٹیا زندگی کے ہیں جو خود غرضی پر مبنی ہو۔ جسے اسلام کی مخالفت کر کے حاصل کیا جائے اور جسے آخرت پر فوقیت دی جائے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی اساس عدل پر ہے وہ مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا پس چونکہ وہ گھٹیا و پست زندگی اسلام کے معیار پر پوری نہیں اُترتی لہٰذا اسے مذموم قرار دیا گیا ہے اور اسلام کی خواہش یہ ہے کہ ہر فرد کی حیات بلند، ارفع و اعلیٰ ہو۔ اسی لئے اسلام نے "حیٰوۃ الدُّنیا" جو مرکب اضافی ہے اس کی قدح نہیں کی۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ اس طرح زندگی بسر کرو کہ زندگی پست نہ ہو بلکہ وہ عین دین بن کر جنتی معاشرے کا باعث ہو جائے یہی حیات آخرت کی کھیتی بن جائے۔ جیسا کہ فرمان سرکار مُصطفیٰ ہے کہ "دُنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔ اس دُنیا میں جدوجہد (ACTIVITIES) اس طرح ہو کہ یہاں بھی اغراض (ENDS) کے وسائل (MEANS) بآسانی حاصل ہو جائیں۔ خوشحالی ہو اور آخرت کی حقیقی حیات کی ابدی راحتوں کے حصول کی راہ بھی ہموار ہو جائے۔ یعنی اسلام کا معاشی اصول یہ ہے کہ اس ارضِ فانی میں اس طرح سرگرمِ عمل رہو کہ یہ دُنیا تجارت گاہِ آخرت ہو جائے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام یعنی ایک پنتھ دو کاج۔

چنانچہ ثقلِ دوم کے دوسرے ہادی سبطِ اکبرِ رسولؐ، حضرت امام حسن علیہ السلام اس جدوجہد کو انتہائی حکیمانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں: "اپنی دُنیا میں اس طرح سرگرمِ عمل رہو گویا کہ تم ہمیشہ اس میں زندگی بسر کرو گے اور آخرت کے لئے اس طرح عمل کرو گے گویا تم کل ہی مر جاؤ گے"۔

افراطِ زر و غلط تقسیمِ دولت | موجودہ زمانے کا سب سے بڑا معاشی مسئلہ "دولت

کی غلط تقسیم ہے۔ اور اس وقت ساری دُنیا افراطِ زر کا شکار ہے۔ مادّہ پرست لوگ اس عالمی مُشکل کا کوئی حل تلاش نہیں کر سکے۔ اشتراکیت، اشتمالیت اور فسطائیت اس پیچیدہ سوال کو حل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ لیکن اس مسئلے کا جواب بھی اسلام کے پاس ہی ہے۔ اِسلام اس مرض کا واحد علاج صرف ایک نکتہ میں بیان کر دیتا ہے۔ کہ جو کچھ بھی ہے خدا کا ہے کیونکہ اقتدار اعلیٰ اس کا ہے چنانچہ حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ فرماتا ہے۔ "تمام مال میرا ہے۔ مال و دولت رکھنے والے میرے امانت دار ہیں اور فقراء و مساکین میرے واجب النفقہ عیال ہیں پس میرے امینوں کو چاہیئے کہ میری دولت سے میرے عیال کی امداد کریں"۔

عاملینِ پیدائش مال کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ملکیت کیوں قرار دیا۔ اسکی توضیح معاشیات کی روشنی میں مطالعہ فرمایئے۔ غیر اسلامی علم اقتصادیات میں ذرائع آمدنی چار ہیں۔

(۱) زمین LAND ۲۔ سرمایہ CAPITAL ۳۔ مزدوری LABOUR (۴) تنظیم ORGANIZATION یا ENTERPRIZES۔ اکنامکس کی اصطلاح میں ان کو PRODUCTION FACTORS یا عاملینِ پیدائش کہا جاتا ہے۔ اور معاشیات میں ان سب کا ایک دوسرے سے قوی اتصال ہے۔ چونکہ ان پر مفصل بحث مقصود نہیں ہے ہمیں تو صرف یہ کہنا ہے کہ انہیں عاملین کی کش مکش نے مزدور اور سرمایہ دار کا سوال پیدا کر کے دُنیا کو ایک مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اور اس عذاب کا سبب یہ ہے کہ ماہرین غیر اِسلامی معاشیات نے روحانی پہلو کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے چنانچہ اِسلامی اقتصادیات میں ذرائع پیداوار تین ہیں۔

(۱) اللہ (۲) سوسائٹی معاشرہ (۳) فرد کاسب

اللہ آمدنی کا مرکزی ذریعہ اللہ ہے جس کا حق سب دوسرے ذرائع پیدائش پر فائق ہے۔ کیونکہ وہ آمدنی کے زیادہ سے زیادہ ذرائع مہیا کرتا ہے۔ روٹی کا مسئلہ بین الاقوامی نزاع کا باعث ہے۔ اس پر غور کریں۔ روٹی سے قبل

آٹا، چکی اور گندم ہے۔ گندم کے پیدا کرنے کے لئے کاشتکار کی قوت، اس کا وقت و مہارت درکار ہے۔ زمین کی صلاحیتیں اور بیج ہے۔ اس بیج کے بارآور کرنے کے لئے پانی کی ضرورت ہے۔ پانی کے لئے بارش کی احتیاج ہے۔ بارش کے عوامل سورج کی حرارت، سمندر کا پانی، بخارات، بادل اور ہوائیں ہیں۔ گندم کے خوشے کو پکانے کیلئے سورج کی گرمی درکار ہے۔ گندم کی مٹھاس کے لئے چاند کی روشن کرنوں کی ضرورت ہے۔ المختصر جب اللہ کا سارا کارخانہ حرکت میں آتا ہے تو انسان کو روٹی کی شکل دیکھنا نصیب ہوتی ہے۔ فرد کا سب تو محض اپنا وقت، اپنی قوت اور اپنی مہارت صرف کرتا ہے۔ یہ بھی اللہ کی عطا ہے کہ زندگی کی مہلت دی ہے۔ اسی مہلت کو وقت کہا جاتا ہے۔ قوت اسی کی عطا کردہ ہے اور مہارت کے آلات دل و دماغ و اعضاء سب اُسی نے دیئے ہیں۔ زمین کی صلاحیت اسی کی قدرت پر موقوف ہے۔ اسی سوال کو خدا تعالیٰ نے ان الفاظ میں دہراتا ہے۔ "اے بنی نوعِ انسان! تم ہی بتاؤ کہ درحقیقت تم زراعت کرتے ہو یا ہم زراعت کرتے ہیں؟

ایک کارخانہ دار صنّاع کو اس پر ناز ہے کہ وہ صنعتی پیداوار میں بہت بڑا حصّہ لے رہا ہے۔ حالانکہ ایک کارخانے کو چلانے کے لئے کئی ہزار کیوبک فٹ ہوا کی ضرورت ہے۔ اور وہ ہوا اللہ ہی تو مہیا کرتا ہے۔ اگر وہ ہوا کو روک لے تو پھر یہ کارخانہ دار کیسے فیکٹری چلا سکتا ہے۔ اور مزدور وہاں کام کر کے کیسے اپنی مزدوری کما سکتے ہیں اور پھر اشتراکی نظریہ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

پس چونکہ آمدنی کا حقیقی ذریعہ اور سب سے بڑا وسیلہ "ربّ العالمین" ہے۔ اس لئے تمام مال اُسی کا ہے اور اس کی صحیح عادلانہ تقسیم کے لئے دولت مند اسکے امین ہیں۔

سوسائٹی

آمدنی کا دوسرا ذریعہ سوسائٹی ہے جو اس معاشی نظام میں منڈی MARKET اور طلب DEMAND مہیا کرتی ہے۔ اگر معاشرہ اجناس پیداوار کو نہ لے اور ان کے لئے منڈی مہیا نہ کرے تو پیداوار

بے کار ہے اور پیدا کرنے والے کے کسی کام میں نہیں آسکتی۔

فردِ کاسب | آمدنی کا تیسرا اور آخری ذریعہ فردِ کاسب ہے جو پیداوار میں قوت طاقت اور مہارت سے کام لیتا ہے۔

پس اسلامی معاشیات کے اُصول کے مُطابق دولت کو تین حِصّوں میں تقسیم ہونا چاہیئے۔

اللہ - معاشرہ (SOCIETY) - فردِ کاسب

چُنانچہ اِسلام میں اللہ کے حِصّے کو "خمس"، سوسائٹی کے حِصّے کو زکوٰۃ اور فردِ کاسب کے حِصّے کو "نفقہ" کہا جاتا ہے۔

تقسیمِ دولت کے لیے کتنے ہی نظامِ زر بنا لیے جائیں جب تک اسلامی نظامِ زر کو عمل میں نہیں لایا جائے تقسیمِ دولت میں توازن پیدا نہ ہوسکے گا اور افراط و تفریط میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

مادّی علمِ معاشیات کی تاریخ زیادہ پُرانی نہیں ہے۔ اور اس کے موجدوں کے قول کے مطابق اس علم کو اختراع کرنے کا مقصد دولت کی غلط تقسیم کا اِنسداد تھا لیکن جُوں جُوں معاشیات میں ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ توں توں یہ بحران بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس غلط تقسیم سے اِنسانیت میں متحارب طبقات قائم ہو گئے ہیں جو عالمگیر نزاع و خلفشار کا باعث ہیں۔ لیکن اِسلام نے آج سے صدیوں پہلے دولت کو مساویانہ اور عادلانہ طور سے تقسیم کرکے اس بحران کا علاج کر دیا تھا۔ یعنی خود بانیٔ اِسلام غایتِ کائنات حضرت محمد مُصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنے عہدِ مُبارک میں یہ اہم کام سرانجام دیا۔

سوسائٹی کے حصّے کی غیر مُساویانہ تقسیم | سرکارِ ختمی مرتبتؐ کی وفات کے بعد اور حضرت علیؑ کے عہدِ حکومت سے پہلے ملکی فتوحات سے مسلمانوں میں افراطِ زر آگئی اور ان کے درمیان تقسیمِ دولت میں توازن قائم نہ رہا مُسلمانوں میں بھی طبقات قائم ہوگئے۔

اور لوگ دولت کی طبقاتی تقسیم کے عادی ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی مساویانہ تقسیمِ دولت لوگوں کو ناگوار گزری۔

جیسا کہ ہم نے فصل سیاسیات وقضایا میں تحریر کیا ہے کہ "حضرت عمر کے طریقہ تقسیم اموال سے حضرت علیؑ کو اختلاف تھا۔ حضرت عمر کا یہ خیال تھا اور اسی پر آپ نے عمل بھی کیا کہ وہ مسلمان (جو حالتِ کفر میں) رسول اللہ سے جنگ کر چکے تھے ان کو تقسیم اموال میں وہ حصہ نہ ملنا چاہیئے جو رسول اللہ کے ہمراہ شریک جہاد رہنے والوں کو ملے۔ اس لئے حضرت عمر نے امتیاز پیدا کیا۔ مجاہدین بدر کو عراق وشام میں لڑنے والوں پر فضیلت دی۔ اس صورت سے مسلمانوں میں طبقات ومراتب رونما ہوئے۔ ایک گروہ کو بہت زیادہ ملتا تھا دوسرے کو اس سے کم حتیٰ کہ عوام الناس کو بہت قلیل تقسیم مال کا یہ طریقہ مسلمانوں میں بہت بڑے امتیاز کا سبب ہوا اور عرب معاشرہ طبقات میں بٹ گیا۔ اگرچہ قانون شریعت اسلامیہ کی رو سے سب برابر تھے اور طبقات وامتیازات کا اسلامی نظام میں وجود نہ تھا لیکن اس طریق نے عربوں کو استقراطی (ARISTOCRAT) طبقہ، متوسط طبقہ اور شعبۂ عامہ میں تقسیم کر دیا۔" (تاریخ الحسین نقد وتحلیل ص۱۲۶-۱۲۷ طبع بیروت)

حضرت عثمان کے زمانے میں یہ طبقات وامتیازات انتہا کو پہنچ چکے تھے کہ کروڑپتی لوگوں کا ایک مستقل گروہ بن گیا تھا۔ دولت کے اس عدم توازن، سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی کے ناقابلِ تردید ثبوت تاریخ میں موجود ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

چند لوگوں کی سرمایہ داری

(۱) حضرت زید بن ثابت انصاری کا جب انتقال ہوا تو ان کے پاس اسقدر سونے کی اینٹیں تھیں کہ ان کے وارثوں میں کلہاڑیوں سے توڑ کر تقسیم کی گئیں جو انہوں نے جاگیر چھوڑی وہ الگ تھی اور نقد ایک لاکھ سونے کی اشرفیاں تھیں۔

(الفاروق (علامہ شبلی نعمانی) جلد ۲ ص۲۸)

(۲) حضرت عثمان بن عفان کے بارے میں مسعودی لکھتے ہیں کہ ان کے یوم وفات پر ان کے پاس ڈیڑھ لاکھ اشرفی، دس لاکھ درہم نیز وادیٔ القریٰ اور حنین میں انکی ڈیڑھ لاکھ سالانہ کی آمدنی کی جاگیریں تھیں۔ اس کے علاوہ آپنے بیشمار گھوڑے اور اونٹ چھوڑے۔ (مروج الذہب الجز الثانی ص۲۲۲)

اسی دولت مندی کی وجہ سے وہ "غنی" مشہور ہوئے۔

(۳) حضرت زبیر بن عوام کے متعلق لکھا ہے کہ ایک عالیشان محل بصرہ میں ایسا مضبوط بنایا تھا جو مورخ مسعودی کے زمانے ۳۳۲ھ میں موجود تھا۔ اور اس میں تاجر اور دولتمند لوگ ٹھہرتے تھے۔ ایسے ہی محل انہوں نے کوفہ و اسکندریہ میں بنائے تھے۔ اپنی وفات پر انہوں نے پچاس ہزار دینار، ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ چھوڑے...... (مروج الذہب الجز الثانی ص۲۲۲)

اور الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب جلد ۱ ص۲۰۰ پر مرقوم ہے کہ حضرت زبیر کے ایک ہزار غلام تھے جو انہیں خراج دیتے تھے۔

(۴) حضرت عبدالرحمن بن عوف کی بابت تحریر ہے کہ انہوں نے اپنی وفات پر ایک ہزار اونٹ، دس ہزار بکریاں اور ایک سو گھوڑے چھوڑے تھے جب مرنے لگے تو بہت روتے تھے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو بتلایا۔ مصعب بن عمیر مجھ سے بہتر تھے۔ ان کا انتقال زمانۂ رسولؐ میں ہوا تھا اور اتنا بھی نہ چھوڑا کہ ایک کفن کے لئے کافی ہوتا۔ حمزہ بن عبدالمطلب مجھ سے بہتر تھے انہوں نے اتنا بھی نہ چھوڑا کہ کفن تو ہو جاتا۔ (الاستیعاب جلد ۲ ص۴۰۳)

مرتے وقت ان کی چار بیویوں میں سے ہر ایک کو ۸۴ ہزار دینار ملے تھے۔

یہ مثالیں کافی ہیں کہ طبقاتی تقسیم کی وجہ سے اس معاشی انقلاب میں لوگوں میں دولت جمع کرنے کا جذبہ بڑھ گیا تھا اور وہ اس قدر حریص ہو گئے تھے کہ جنگ جمل اور جنگِ صفین کے مال کو مالِ غنیمت قرار نہ دینے پر حضرت علی کے خلاف ہو گئے تھے۔

حضرت امیر المومنینؑ نے جب یہ طبقاتی فرق مٹا کر عین سنّت رسولؐ کیمطابق دولت کی تقسیم مساوی شروع کی تو اس کا شدید ردّ عمل ہوا جو فصل سیاسیات و قضایا میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے لیکن حضرت نے اس احتجاج بے اصول کی کوئی پرواہ نہ کی۔ چنانچہ آپؑ نے فرمایا "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں جن لوگوں پر حاکم ہوں کچھ افراد کی مدد سے ان کے خلاف ظلم کو بڑھاؤں (اور طبقاتی تقسیم کر کے نظام مصطفویؐ کی مخالفت کروں) واللہ جب تک زمانے کی کہانی چل رہی ہے اور ایک ستارہ دوسرے ستارے کی طرف کھنچ رہا ہے میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ اگر یہ میرا ذاتی مال بھی ہوتا تب بھی میں اُسے لوگوں میں برابر تقسیم کرتا۔ جبکہ یہ میرا مال نہیں۔ بلکہ اللہ کا مال ہے"۔ پھر فرمایا "آگاہ ہو جاؤ کسی غیر مستحق کو مال عطا کرنا فضول خرچی ہے (یعنی اسراف ہے)۔ یہ اسراف ایسی شے ہے کہ جو مسرف کو دنیا میں بلند اور آخرت میں پست کر دیتی ہے۔ ایسا شخص (وقتی طور پر) لوگوں میں صاحب قدر ہو جاتا ہے لیکن اللہ کی نظر میں ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ جو شخص اپنا مال بے جا صرف کرتا ہے اور غیر مستحق کو دے دیتا ہے اُسے اللہ تعالیٰ ان کی سپاسگذاری سے محروم کر دیتا ہے اور لوگوں کی دوستی اس کے لئے نہیں بلکہ غیر کے لئے ہو جاتی ہے۔ پھر اگر (بدقسمتی سے) کہیں وہ شخص بدحال ہو جائے اور ان لوگوں کی مدد و دستگیری کا محتاج ہو جائے تو وہ لوگ بدترین اور زیادہ ملامت اور سرزنش کرنے والے ساتھی ثابت ہوں گے"۔

حضرت علیؑ کے کلام میں ایسے معاشی نکات ہیں کہ ان کی توضیح میں معاشیات کی کتابیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ حضرت امیر المومنینؑ نے مسند اقتدار پر آتے ہی تمام ناجائز جاگیروں کو واپس لے لیا۔ اور ان کے بارے میں وضاحت فرمائی کہ "خدا کی قسم! اگر میں یہ دیکھتا کہ ان زمینوں اور جاگیروں کی آمدنی سے عورتوں کی شادیاں کی گئی ہیں، لونڈیوں کو خرید گیا ہے تو بھی بلا شبہ میں ان کو واپس لے لیتا۔ کیونکہ عدل و انصاف کے بارے میں بڑی وُسعت ہے اور جو شخص عدل کے بارے میں تنگ دل ہوتا ہے تو پھر ظلم و جور کا معاملہ تو اُسے زیادہ تنگ دل بنا دے گا"۔

لیکن افسوس ہے کہ سرمایہ دارانہ رُجحان رکھنے والے مسلمانوں نے حضرت علیؑ کے نافذ کردہ معاشی نظام کو سنگین نقصان پہنچانے کی کوشش کی لیکن پھر بھی یہ نظام الٰہی کسی اعجاز سے کم نہیں ہے۔ آپ کے دورِ حکومت میں بغاوتوں کے باوجود معاشی استحکام ہونا اُسی نظام کا نتیجہ تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ کے دورِ حکومت میں کبھی قلتِ اناج پیدا نہیں ہوئی۔ اور معاشی بُرائیاں، ذخیرہ اندوزی (HOARDINGS)، اجارہ داری (MONOPOLY)، سمگلنگ اور چوربازاری وغیرہ کہیں موجود نہ تھیں۔

مشکل کُشائے عالم اور معاشی مشکلات کا واحد حل

حضرت امیرالمومنین علیؑ قائدِ ثقل دوم ہیں۔ خلیفۂ برحق اور وارثِ علمِ وہبی ہونے کی حیثیت سے آپؑ ہر مُشکل کو آسان کر دیتے ہیں۔ مادّی دُنیا نے مالی بحران سے تنگ آکر کئی نظریات قائم کئے اور بے شمار کُتب تحریر کر دیں لیکن ابھی تک اس کا کوئی سدِّباب نہ کر سکے بلکہ جوں جوں انہوں نے اس بارے میں کوششیں تیز کیں پیچیدگیاں اور مشکلات تیز رفتاری سے بڑھنے لگیں۔ لیکن حضرت امیرؑ نے اس ساری بحث کو صرف ایک فقرے میں حل کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کے بعد کسی معاشی جرح کی ضرورت نہیں رہتی۔ حضرتؑ ارشاد فرماتے ہیں۔

"اے آدمؑ کے بیٹے! جو تم نے اپنی ضروریاتِ زندگی سے زیادہ کمایا ہے۔ اس میں تم اپنے غیر کے مفاد کے لئے خزانچی ہو۔"

اس ارشاد میں حضرتؑ کا خطاب تمام بنی نوعِ انسان سے ہے۔ حضرت مُشکل کُشا کا یہ ایک فقرہ دُنیا کی ساری معاشی مُشکلات کا مداوا ہے۔ اس فقرہ سے حضرت کا علم و عرفان معلوم ہوتا ہے کہ آپ جانتے تھے اس ارضِ خداوندی پر دولت کی غلط تقسیم عالمگیر مشکل بن جائے گی اور تمام بنی آدمؑ اس کا شکار ہو جائیں گے لہٰذا صرف مسلمانوں سے نہیں بلکہ پوری انسانیت سے خطاب فرمایا ہے اور ایک فقرے میں سارے علمِ معاشیات کو یوں سمیٹ کر رکھ دیا ہے کہ جیسے کوزہ میں سمندر۔

اور یہ اعجاز نقطہ بائے بسم اللہ ہی سے ممکن تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے آدمی!
جو کچھ تیری ضرورت سے فاضل ہے اس پر تیرا حق نہیں ہے بلکہ تو اس پر امین ہے "
یعنی تجھے اپنی فاضل دولت بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود میں صرف کرنی چاہیئے واضح
ہو کہ جب اسلامی معاشرہ کا صارف دولت خرچ کرے گا تو حدود عدل میں رہے گا۔
یعنی نہ تو بخل سے کام لے گا اور نہ ہی بے جا اسراف کرے گا۔ دولت میں سے اپنی
ضروریات معتدلہ کا حصّہ وضع کر کے باقی تمام مال قوم و ملّت کی رفاہ میں لگا دیگا۔
غور فرمایئے۔ حضرت نے "خزانچی" سے تشبیہ دے کر جامعیت کا کیسا حسن عبارت
پیدا کیا ہے۔ خزانچی کے لئے لازم ہوتا ہے کہ دیانتدار ہو اور دولت کو صرف ایسے
مطالبات زر پر خرچ کرنے کے لئے خزانے سے باہر آنے دے جو جائز و مباح
ہوں۔ لہٰذا ہر فرد کی فاضل آمدنی عام مفاد، سوسائٹی کے ضرورت مندوں کی ضروریات
کو پورا کرنے، تعلیم، زراعت، صنعت و حرفت اور ملکی تجارت وغیرہ کے نشو و
ارتقاء کے لئے خرچ ہوگی۔ اور ایسی صورت میں مزدوروں، سرمایہ لگانے والوں
کسانوں، زمینداروں، غریب لوگوں، طالب علموں اور ہر طبقے کے لوگوں کے معاشی
مسائل حل ہو جائیں گے۔ پھر اشتراکی تشدد اور سوشلزم کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔
چونکہ فرمان رسولؐ کے مطابق "ثقلین" میں جدائی و اختلاف نہیں ہے لہٰذا جس
طرح قرآن ناطق (حضرت علیؑ) نے اس معاشی مشکل کا حل ایک ہی جملہ میں بیان
کر دیا اسی طرح قرآن صامت نے اس مرض کا علاج بایں الفاظ بیان کر دیا ہے۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۞

(سورہ بقرہ آیت ۲۱۹)

یعنی (اے رسولؐ) "یہ لوگ آپؐ سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم کیا خرچ
کریں؟ آپؐ فرما دیجئے کہ جو ضرورت سے زائد ہے۔ خدا اپنے احکام تم سے
صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔"

پس ثقلین کی ہدایات سے ثابت ہوا کہ اسلامی معاشی نظام کے تحت

کسی فرد کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ تمام فاضل دولت (WEALTH)
معاشرہ کے ان لوگوں کا حق ہے جو اس سے محروم ہیں۔ اور یہی اسلام کا معاشی نظام
ہے جس سے بہتر کوئی نظام نہیں ہے۔ اسی نظام سے روٹی۔ کپڑا اور مکان سے
محرومی کا علاج ممکن ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کا معاشی نظام

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ دورِ حاضر میں
معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت
کے پاٹوں کی چکی میں پس رہا ہے۔ سرمایہ داری کے استحصال سے چھٹکارا پانے
کے لئے اشتراکیت کا سہارا تلاش کیا گیا ہے۔ لیکن عملاً دونوں ایک ہی تھیلی کے
چٹے بٹے ہیں اور کسی کے پاس کوئی تعمیری پروگرام نہیں ہے۔ در اصل اشتراکیت
کا آغاز حضرت مسیحؑ سے ۴۰۰ سال قبل یونانی نظامِ معیشت وحکومت کے خلاف
افلاطون نے کیا۔ پھر تیسری صدی عیسوی میں قباد کے دورِ حکومت میں مزدک نامی
ایک شخص نے دولت اور عورت کو مشترکہ سرمایہ قرار دے کر اشتراکیت کی تبلیغ کی
لیکن یہ تحریک کچھ ہی عرصے بعد اپنی موت خود ہی مر گئی۔ مزدکی اشتراکیت عورت کو
مشترکہ سرمایہ قرار دے کر شرم وحیا ختم کر کے انسانوں کو چوپاؤں کی مانند بناتی ہے۔
پھر یہ تحریک انیسویں صدی میں جاگی اور ۱۸۴۷ء میں ایک جرمنی یہودی کارل مارکس
نے نظریۂ اقتصاد کے عنوان سے کچھ ضابطے مرتب کئے اور انہیں دنیا کی
معاشی ومعاشرتی خرابیوں کا واحد حل بتایا۔ اس زمانے میں روس پر سرمایہ داری
نے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ امیر طبقہ دولت کی فراوانی سے لدا ہوا تھا اور
اس کے برعکس محنت کش عوام کوڑی کوڑی کے محتاج تھے چنانچہ بھوک و ننگ
سے تنگ آ کر لوگوں میں سرمایہ داروں کے خلاف جذبات اٹھ کھڑے ہوئے اور
اس طرح اشتراکیت کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔ چنانچہ مارکس کی موت کے بعد ۱۹۱۷ء
میں لینن نے اسے عملی طور پر نافذ کرنے کی سعی کی۔ دولت کی مساوی تقسیم کا خوشنما
نعرہ بہت مقبول ہوا۔ اور بالآخر اس تحریک کو کامیابی ہو گئی۔

اشتراکی نظام ہو یا سرمایہ داری دونوں کا ماحصل صرف مادّی اقتصادی نشوونما ہے دونوں نے دین کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا اور اخلاقی اقدار کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ نظام سرمایہ داری میں معاشی آزادی اور ذاتی ملکیت کا حق ہوتا ہے مگر معاشی تحفظ کی ضمانت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اشتراکیت میں ذاتی ملکیت نہیں ہوتی مگر معاشی تحفّظ کا دعویٰ کیا جاتا ہے (حالانکہ عملاً کچھ بھی نہیں ہوتا کیونکہ ہر چیز پر حکومت کے افراد قابض ہو جاتے ہیں اور عوام کا معاشی تحفّظ بالکل ایک قیدی جیسا ہوتا ہے)۔

اسلامی معیشت کا نظریہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ ہم نے اس سے قبل تحریر کیا ہے کہ اسلام کا نظریۂ اقتصادیات فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ اور تمام معاشی امراض کا واحد علاج ہے۔ یہ نظام نہ کسی تجربہ کا محتاج ہے اور نہ کسی ماہر معاشیات انسان کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے بلکہ پروردگار عالمین کا عطا فرمایا ہوا ہے۔ اس نظام میں طبقات کی کوئی گنجائش نہیں ہے لہٰذا اس کی اساس نہ تو شخصی مفاد پر ہے اور نہ ہی جماعتی مفاد پر بلکہ مفادِ عامہ پر ہے، کیونکہ اللہ کی ربوبیّت سب کے لئے ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ہر شے کا مالک اللہ ہے اس لئے بنیادی طور پر اللہ کے مال پر اس کی ساری مخلوق کا حق ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وہی وہ ذات ہے جس نے زمین کی ساری چیزوں کو تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے"۔ البتہ جو فرد کاسب طریقِ اعتدال سے ان اموال میں سے کم و بیش حاصل کر لیتا ہے خواہ محنت و مشقت سے یا کاروبار سے یا بلا محنت، وصیّت و میراث وغیرہ سے وہ اسی سے مختص ہو جاتا ہے لیکن اس میں بھی اس کی ذاتی ضروریات سے فاضل کی حیثیت ایک امانت کی سی ہوتی ہے اور اس کا رشتہ باہمی اخوت و مساوات سے قائم رہتا ہے۔

اسلام سرمائے کی اجارہ داری کا حامی نہیں ہے اور نہ ہی وہ فرد کو اس قدر قلاّش کر دینا چاہتا ہے کہ اس کی ذاتی ضروریات جتنا حق ملکیت بھی چھین لے۔ بلکہ افراط و تفریط سے ہٹ کر عادلانہ نظام معیشت قائم کرتا ہے۔ اسلام یہ نہیں

چاہتا کہ مذہبی و اخلاقی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ رجحان کی حوصلہ افزائی کی جائے لیکن اسکے بر عکس اسلام کی یہ بھی تعلیم نہیں ہے کہ اشتراکیت کی طرح انسان کی جائز ملکیت (جو لامحالہ اس کی ضروریات میں سے ہے) کو سلب کر کے اس کی تمام محنت کو صرف روٹی کپڑے کے عوض میں چھین لے اور یہ چھینا ہوا مال ایک مخصوص طبقہ (برسر اقتدار جماعت) کے حوالے کر دے کہ وہ اپنے من پسند طریقوں سے اُسے خرچ یا جمع کرے۔ اسلام نہ تو سرمایہ داری کی حمایت کرتا ہے کہ غیر عادلانہ طبقاتی نظام ظہور میں آئے اور نہ ہی غیر فطری مساوات کی، ہمت افزائی کرتا ہے کہ حکومت تمام پیداواری وسائل کو اپنی تحویل میں لے کر قومی ملکیت قرار دے لے۔ اس جبری مساوات سے کارکردگی کا جذبہ مجروح ہو جاتا ہے۔ سعی و طلب کا ولولہ سرد پڑ جاتا ہے اسی لئے اسلام نے اس قسم کی غیر فطری مساوات کی بجائے ذرائع معیشت میں مساوات قائم کی ہے۔ اور ہر شخص کے لئے یکساں مواقع فراہم کئے ہیں تاکہ ہر فرد اپنی جدوجہد اور استعداد کار سے معیشت کا سروسامان کر سکے۔ اپنی محنت (LABOUR) کے مطابق ثمرہ و نتیجہ حاصل کر سکے۔ چنانچہ نقل اوّل میں ارشاد ہوتا ہے کہ "لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ انسان کو اپنی محنت ہی کا ثمرہ ملتا ہے"۔

انفرادی ملکیت

اس نظام کے ماتحت یہ امر ناگزیر ہے کہ معیشت کے اعتبار سے افراد میں تفاوت بھی رہے کیونکہ تمام افراد میں استعداد و صلاحیت یکساں نہیں۔ لہٰذا خارجی مساوات کو بروئے کار لانے کی بجائے اسلام نے امیر غریب کا فرق مٹانے کی طرف توجہ دی ہے۔ انفرادی حقوق ملکیت کے ساتھ متمول طبقہ پر ایسے مالی فرائض عائد کر دیئے ہیں جن کی پابندی کے بعد نہ تو معاشرہ غیر متوازن ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی شخص اپنی ضروریات زندگی سے محروم رہتا ہے۔

اسلام نے معاشی آزادی کے ساتھ انفرادی ملکیت کا حق فطری تقاضوں کے تحت دیا ہے۔ انفرادی ملکیت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسانی فطرت میں سمو دیا

گیا ہے۔ اور اسلام تمام شعبوں میں فطرت کا ہمنوا ہے۔ اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے انفرادی ملکیت کا جواز ایک مسلّم حقیقت ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے جسم کی سلطنت کا مالک ہے۔ اس کے فطری رشتے اس کی ملکیت کی دلیل ہیں کہ یہ میری ماں ہے اس کا دودھ میری ملکیت ہے۔ یہ میرا باپ ہے۔ اس کے مال پر میرا تصرّف ہے۔ اور قرآن مجید میں متعدد موقعوں پر حقِ ملکیت کی وضاحت کی گئی ہے اور دوسروں کے مال پر تصرف بے جا کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے کہ "آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ اور نہ حاکموں کو بطور رشوت دو۔ تاکہ لوگوں کے مال میں سے جو کچھ ہاتھ لگے خرد برد کرنے لگ جاؤ۔ حالانکہ تم جانتے ہو۔"

اسلام نے نہ صرف شخصی ملکیت کا حق دیا ہے بلکہ اس حق کے تحفّظ و احترام پر بھی زور دیا ہے۔ چنانچہ غصب و خیانت اور چوری، ڈکیتی پر تہدید و سزا اسی حقِ ملکیت کے تحفظ و احترام کی بنا پر تجویز کی ہے۔ کیونکہ اسلام کا عدل پسند مزاج یہ گوارہ نہیں کرتا کہ کسی کے مال کو خرد برد کیا جائے یا مالک کی رضامندی کے بغیر اس میں تصرّف کیا جائے۔ چنانچہ حدیثِ رسول مقبولؐ ہے کہ "کسی شخص کا مال اس کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں ہے۔" اسلام اگرچہ شخصی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے مگر وسائل معیشت پر ایسے قیود عائد کر دیتا ہے کہ سرمایہ داری کا انسداد بھی ہو جائے اور اس سے پیدا شدہ مفاسد کا تدارک بھی ہوتا جائے۔ چنانچہ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تفریق کر کے دولت کو ذاتی ضروریات کی حدود سے آگے نہیں جانے دیتا۔ اسی لئے اسلام سودی معاملات کو حرام قرار دیتا ہے۔ جوا۔ لاٹری، سٹّہ (SPECTULATION) اور ایسے تمام ذرائع جن سے بلا محنت و بغیر معاوضہ دولت اکھٹی کی جاتی ہے اسلامی نقطۂ نگاہ سے مذموم ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اسلام اُن چیزوں سے اکتسابِ زر کی بھی ممانعت کرتا ہے جن کا مقصد لہو و لعب ہو۔ چنانچہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ "جب اللہ کسی چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کے معاوضہ میں

حاصل ہونے والا مال بھی حرام ہے۔" یہاں تک کہ ان چیزوں کے خام مال (RAW MATERIAL) کی خرید و فروخت پر بھی پابندی عائد ہے۔ بلکہ اس قسم کے کاروبار کے لئے جگہ کرایہ پر دینا بھی منع ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ سے جب یہ پوچھا گیا کہ "اگر کوئی شخص اپنا مکان کرائے پر دے اور کرایہ دار وہاں شراب کا کاروبار کرے تو شریعت کیا کہتی ہے؟" حضرت امامؑ نے فرمایا کہ اس طرح جو رقم کرایہ حاصل ہو وہ حرام ہے۔ اسی طرح نفع اندوزی جس سے سرمایہ جمع ہوتا ہے۔ اس کے غلط طریقوں سے منع کیا ہے۔ مثلاً فرمایا "ناپ تول میں کمی نہ کرو۔" "ویل للمطففین" ملاوٹ و آمیزش کی ممانعت۔ اسی طرح اسلام میں نفع کی غرض سے ضروریات زندگی کا ذخیرہ کرنے والا ملعون ہے۔

اکثر معاشی پریشانیاں مصارف کو اعتدال پر نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اس امر کا خیال رکھا جائے کہ خرچ آمدنی کے مطابق ہو تو معاشی الجھنوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے اسی متوازن طرزِ عمل پر زور دیا ہے کہ ضرورت کے موقع پر نہ کنجوسی سے کام لیا جائے اور نہ ضرورت سے زیادہ اور بے جا صرف کیا جائے چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

" وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں۔ بلکہ درمیانی راہِ اعتدال پر چلتے ہیں۔"

نیز فرمایا" خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔" (ضرورت سے زائد صرف کرنے کو اسراف کہا جاتا ہے)۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔

"غریبوں کا حق دو۔ نیز مسکین و مسافر کے حقوق ادا کرو اور دولت کو بے موقع ضائع نہ کرو۔" اس حکم سے صاف ظاہر ہے کہ اگر دولت مستحقین کی اعانت کے علاوہ محض نمائش یا غیر ضروری تعیش پر صرف ہوگی تو ضیاع مال (اسراف) ہے۔ اور اسراف کرنے والوں کو خدا نے شیطان کا بھائی کہا ہے۔ بے موقع و بلا ضرورت خراجات کو مذموم قرار دینے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ آس پاس کے لوگوں میں

احساس محرومی نہ پیدا ہو اور دوسرا یہ کہ دولت عزیزوں اور معاشرے کے پسماندہ افراد کے کام آئے۔ چنانچہ اسلامی معیشت سرمایہ کو گردش (CIRCULATION) میں رکھتی ہے۔ اسلام اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ دولت کا اکتناز کیا جائے اور سونے چاندی سے تجوریاں بھری جائیں۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے کہ "وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو" اسی اکتناز دولت کے سدِباب کے لئے اسلام نے سونے چاندی کے برتنوں اور مردوں کے لئے سونے کا استعمال ناجائز قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے بھی سرمایہ منجمد ہو جاتا ہے اور معیشت کے غیر متوازن ہونے کا سبب پیدا ہوتا ہے۔ پس اسلام یہ چاہتا ہے کہ دولت چلتی پھرتی رہے صاحب مال بھی خوش حال رہے اور معاشرے میں بے روزگاری پھیلنے کے امکان کو گردش زر کے ذریعے سے روکا جائے۔

اسلامی معاشیات میں محنت کش طبقے کے مفادات کا مکمل تحفظ کیا گیا ہے کہ اس کی محنت کا اتنا معاوضہ ادا کیا جائے کہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی میں خود کفیل ہو سکے اور معاوضہ کی ادائگی میں سستی نہ کی جائے بلکہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اُجرت دی جائے۔

اسی طرح اسلامی معیشت میں ناکارہ اور لاچار افراد کی ضروریاتِ زندگی کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور صاحبانِ استطاعت کے مال میں ان کا حصّہ قرار دیا ہے حتیٰ کہ جو افراد رسولؐ سے نسبی اتصال کے باعث عام صدقات نہیں لے سکتے ان کے مفادات کی بھی حفاظت کی گئی ہے۔ اور خمس میں ان کا حصّہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ ان مالی واجبات کے بعد بھی اگر کوئی مستحق رہ جائے تو اسلام نے وصیّت کی ہدایت کی ہے کہ مرنے سے قبل اپنے والدین، قرابت داروں اور امورِ خیر کے لئے ایک حصّہ مخصوص کیا جائے اور یہ حصّہ ترکہ کی ایک تہائی تک ہو سکتا ہے۔ اور وارثوں کی مرضی ہو تو اس سے زیادہ بھی۔ اس وصیّت کے علاوہ شریعت

اسلامیہ نے قانونِ وراثت کا نفاذ کیا ہے تاکہ دولت ایک ہاتھ سے نکل کر متعدد ہاتھوں میں چلی جائے اور گردش کرتی رہے۔

یہی حکومتِ الٰہیہ کا اقتصادی نظام ہے کہ نہ سرمایہ داری کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے کہ سرمایہ سمٹ کر ایک جگہ منجمد ہو جائے اور نہ محنت کش عوام کی حق تلفی کی گنجائش ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سماجی و اخلاقی ذمہ داریوں کو بھی پوری اہمیت دی گئی ہے یہی وہ حکیمانہ نظام ہے جو دینوی بہبود کے ساتھ اُخروی فلاح کا بھی ضامن ہے۔ اسی سے معاشی خرابیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے اور اس نظام کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے نظام کی طرف جھکنے کی قطعاً ضرورت نہیں رہ جاتی جبکہ دولت کی عادلانہ تقسیم کے تمام ضابطے اس کے اندر موجود ہیں۔

دَورِ امیر المومنینؑ اب اسی نظام کی روشنی میں دیکھئے کہ حضرت علی علیہ السلام کا دَورِ حکومت ایسے نظام کے نفاذ کے لئے بظاہر سازگار نہ تھا کیونکہ سابقہ ملکی فتوحات اور خزانے کے عطیات نے مسلمانوں میں محبّتِ سرمایہ داری کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی لیکن پھر بھی حضرت علیؑ نے شدید مخالفت کو خاطر میں لائے بغیر حقیقی نظامِ الٰہی کو جاری فرمایا۔ چنانچہ زمامِ حکومت سنبھالتے ہی آپؑ نے سرمایہ داروں سے تمام فاضل دولت واپس لینے کی ابتدا کر دی۔ جاگیریں ضبط کر لینے کا حکم صادر فرمادیا۔ حضرت عثمان کے ہاں سے تلواریں، زرہیں اور صدقات کا مال اپنی تحویل میں لے کر بیت المال میں جمع کر لیا۔ بنی اُمیّہ اور دوسرے سرمایہ داروں میں کھلبلی مچ گئی۔ ولید بن عقبہ جیسے لوگوں نے حضرتؑ کو بیعت کا یقین دلایا بشرطیکہ آپ اس کارروائی کو روک لیں۔ مگر آپؑ نے اعلان فرمایا۔

" کیا میں اس مال کو جو تم لوگوں نے ہتھیا لیا ہے چھوڑ دوں؟ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں اللہ کے اُس حق سے دستبردار ہو جاؤں جو تمہارے اور تمہارے علاوہ دوسرے لوگوں کے ذمّے ہے "!

لیکن فدک حضرت عثمان نے مروان کو دے دیا تھا (فتح الباری جلد ۳ ص۱۴۱، روضۃ المناظر ص۲۰۹ مطبوعہ برحاشیہ مروج الذہب) اگر حضرت علیؑ اسے واپس لینے کی کوشش کرتے تو ایک اور زبردست فساد برپا ہوتا۔ نیز بغاوتوں اور جنگوں نے حالات کو ایسا سازگار نہیں ہونے دیا کہ حضرت علیؑ فدک واپس لیتے۔

امیر المومنینؑ نمائندہ حکومتِ الہٰیہ تھے۔ لہٰذا خدا نے ان پر یہ فرض عاید کر دیا تھا کہ اپنے آپ کو نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تاکہ مفلوک الحال افراد میں اپنے افلاس کی وجہ سے احساسِ کمتری پیدا نہ ہو اور نادار لوگ غمگین نہ ہوں چنانچہ آپؑ نے صحیح نظامِ معیشت کو چلانا ضروری سمجھا کہ حاکم و محکوم میں اقتصادی مساوات قائم ہو۔ لہٰذا حضرتؑ کی اپنی بود و باش و بسر اوقات کا طرزِ عمل اسی نہج پر رہا جیسا کہ رعیت کے ایک عام فرد کا ہوتا ہے۔ چنانچہ جناب امیر علیہ السلام خود فرماتے ہیں کہ "کیا میں شکم سیر ہو کر پڑا رہوں؟ جبکہ میرے اردگرد بھوکے پیٹ اور پیاسے جگر تڑپتے ہوں!"

جناب امیر المومنینؑ نظامِ معیشت کو عدل کی بنیادوں پر استوار کر کے طبقاتی تفریق کی راہ روکنا چاہتے تھے تاکہ معاشی اعتبار سے توازنِ عدل کارفرما ہو اور معاشرہ غربت و امارت کے لحاظ سے دو طبقوں میں اس طرح نہ بٹ جائے کہ ایک طرف ملکی سرمایہ دونوں ہاتھوں سے لٹایا جا رہا ہو اور دوسری طرف جناب ابوذرؓ جیسے جلیل المرتبت صحابیٔ رسولؐ صحرائے ربذہ میں دوا و غذا کے بغیر بے کسی کے عالم میں دم توڑ رہے ہوں۔ چنانچہ حضرتؑ نے فرمایا۔

"خداوند عالم نے دولت مندوں کے مال میں فقیروں کی روزی کا حصہ رکھا ہے۔ اگر کوئی فقیر بھوکا رہتا ہے تو صرف اسلئے رہتا ہے کہ دولت مند نے دولت کو سمیٹ لیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ دولتمند سے اس کا مواخذہ کرنے والا ہے۔"

لہٰذا حضرتؑ اس ناہموار معیشت کی بجائے خالص اسلامی نظامِ معیشت قائم کرنے کے داعی تھے کہ ہر فرد کے ضروریات پورے ہوں۔ اور کوئی بھی شخص خواہ

وہ کسی گوشہ میں مقیم ہو لوازم حیات سے محروم نہ ہونے پائے۔ پیداواری وسائل اور اقتصادیات کے جملہ شعبوں میں تمام افراد کے حقوق مساوی ہوں۔ اور سب کو کسبِ معاش کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ یہی عادلانہ نظریہ ہے کہ جو نفاذ پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن خارجی مساوات کا اس عادلانہ نظریۂ مساوات سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ اسلام کے مالی فرائض، زکوٰۃ، خمس، حج وغیرہ سے ظاہر ہے۔ کیونکہ ایسی مساوات سے اجتماعی زندگی کو کسی مضبوط بنیاد پر استوار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے

"انسانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ان میں تفاوت رہے کیونکہ اگر سب برابر ہو جائیں تو ہلاک ہو جائیں"۔

اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ تمام انسان معاشی اعتبار سے ایک سطح پر ہونگے تو کوئی ایک دوسرے کا محتاج نہ ہوگا اور وہ مثال صادق آئے گی کہ "میں بھی رانی تو بھی رانی کون بھرے گا پانی" جس کے نتیجے میں باہمی روابط کمزور اور معاشی و معاشرتی تعلقات مضمحل ہو جائیں گے اور آخر کار مدنیت و اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جائے گا جس سے سراسر تباہی و ہلاکت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ تفاوت بالکل فطری ہے۔ اگر انسان خود اپنے جسم پر ہی نظر ڈالے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اعضائے جسمانی میں تفاوت پایا جاتا ہے لیکن نظام ربوبیت کے لحاظ سے ہر ایک کو حسبِ ضرورت رزق ملتا ہے۔

عہدِ حضرت امیر المومنین ؑ کے معاشی نظام پر نظر کی جائے تو یہ چیز بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کاروباری آزادی کے ساتھ پیداواری وسائل عوام کی ملکیت تھے اور ہر شخص معیشت کے مختلف ذرائع تجارت و دستکاری وغیرہ کے اختیار کرنے میں آزاد تھا۔ اور ایک بہترین اقتصادی نظام کی بنیادی خوبی یہی ہے کہ ایک طرف مکمل معاشی آزادی ہو اور دوسری طرف مکمل معاشی تحفظ ہو تاکہ ہر شخص اپنی محنت اور کارکردگی کے نتیجے سے مطمئن ہو کر جد و جہد میں لگا رہے۔ حضرت علیؑ یہ گوارہ

نہ کرتے تھے کہ کوئی شخص کاروکسب اور معاشی تگ و دو چھوڑ کر معاشرہ پر بوجھ بن جائے اور اپنی کمائی کے بجائے دوسروں کا دستِ نگر ہو۔ البتہ جو شخص اپنی ضروریات فراہم کرنے سے عاجز ہوتا تھا یا ضروریات کے مقابلے میں اس کی آمدنی قلیل ہوتی تھی تو بیت المال سے اس کی اعانت کی جاتی تھی۔

حضرت علیؑ زراعت و تجارت کو معاشی فارغ البالی کا سرچشمہ سمجھتے تھے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

"جسے زمین اور آبیاری کے لئے پانی میسّر ہو اور وہ پھر بھی نادار رہے تو اللہ اُسے دُور ہی رکھے۔" نیز فرمایا "تجارت کرو اس لئے کہ تجارت ہی وہ سرمایہ ہے جو تمہیں لوگوں کے مال و دولت سے مستغنی کردے گا۔" حضرت امیر علیہ السلام زراعت و تجارت کی حوصلہ افزائی کے لئے خود بھی کھیتی باڑی اور کاروبار میں عملاً حصّہ لیتے تھے چنانچہ بے آباد زمینوں کو خود آباد کرتے اور چشمے اپنے ہاتھوں سے کھود کر باغوں کی آبیاری کرتے۔ ایک مرتبہ ایک تہبند فروخت کے لئے پیش کیا اور فرمایا کہ "یہ تہبند میں نے پانچ درہم میں خریدا تھا اگر کوئی ایک درہم زیادہ دے تو اس کے ہاتھ بیچ دوں گا۔" فرصت کے اوقات میں شاگرد حضرت میثم تمارؒ کی دکان پر آبیٹھتے اور کھجوریں بیچنے میں ذرا بھی سبکی محسوس نہ کرتے تھے۔ اسکے ساتھ ہی بازار کے حالات کا جائزہ بھی لیتے رہتے اور کاروباری سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ تاکہ بلا وجہ قیمتوں میں اضافہ نہ ہو۔ ناپ تول دُرست رہیں اور ناجائز منافع خوری کا رُجحان پیدا نہ ہونے پائے۔

حضرت علیؑ ذخیرہ اندوزی اور مصنوعی قلّت و گرانی پیدا کرنے کو معاشرتی جرائم سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان حرکات کے مرتکبین کو حضرتؑ مناسب سزا دیا کرتے تھے۔ آپ اسراف و تبذیر کی روک تھام فرماتے تھے تاکہ معاشی نظام میں توازن قائم رہے کیونکہ جب انسان میانہ روی کو چھوڑ کر ضرورت سے زیادہ خرچ کر دیتا ہے تو اس کے نتیجے میں محتاج و دست نگر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اسلامی معاشی نظام کے مطابق

اسراف کی مذمت وارد ہوئی ہے اور رسومات قبیحہ کے مطابق سودی قرضے لے کر یا کوئی جائداد فروخت کر کے شادی بیاہ یا دیگر تقریبات پر فضول اخراجات کرنا غیر مستحسن ہے۔ اسی طرح ضرورت سے زیادہ خریداری معاشی برائی ہے کہ اس سے طلب بڑھ جاتی ہے اور رسد میں کمی آجاتی ہے۔ گرانی پیدا ہوتی ہے جس سے افراط زر کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا اقتصادی تباہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔

المختصر حضرت امیرالمومنینؑ نے اپنے دور حکومت میں اللہ کے پسندیدہ خالص اسلامی نظام معاشیات کا نفاذ فرمایا اور اس نظام سے بہتر کوئی دوسرا نظام ایسا نہیں ہے جو میانہ روی کے ساتھ تمام اقتصادی مشکلات کا علاج ثابت ہو سکے۔

اشتراکیت خدا کی دشمن ہے لینن کے قول کے مطابق اشتراکیت کا مقصد صرف سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت اور خدا و مذہب سے دشمنی ہے۔ جیسا کہ اس نے کہا۔

"تمام متبعین اشتراکیت کا اولین فریضہ صرف سرمایہ داری کا قلع قمع نہیں بلکہ انسانی قلوب سے اللہ کے عقیدے کو محو کرنا اور آسمانی انوار کو بجھانا ہے"۔ دیکھیے اقوال لینن بحوالہ مقالہ "اشتراکیت اور سرمایہ داری" شائع شدہ در ماہنامہ "محنت کش" کراچی مئی ۱۹۷۰ء، شمارہ ۱۱

لینن جیسے کافروں کے ان مذموم ارادوں کی پیشین گوئی قرآن مجید میں پہلے ہی کر دی گئی تھی۔ جیسا کہ قرآن کریم سورہ صف ۲۸ آیت ۸ میں مضارع کے صیغوں میں جو صرف حال ہی پر نہیں بلکہ مستقبل (آئندہ زمانے) پر بھی حاوی ہیں ارشاد الٰہی ہوتا ہے کہ" وہ لوگ ارادہ کریں گے کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں" اس ارشاد میں اشتراکیت کے ناپاک و احمقانہ ارادوں کی خبر دیتے ہوئے پھر اللہ نے فرمایا ہے کہ" اللہ اپنے نور (تعلیمات قرآن و اہلبیتؑ) کو پورا کرنے والا ہے۔ اگرچہ کفار (لینن پرستوں) کو برا ہی لگے"۔" نور بجھانے" کے جو لفظ نزول قرآن سے سینکڑوں

برس بعد لینن استعمال کرنے والا تھا انہی لفظوں کو بیان کر کے لینن کے ناپاک ارادوں کی قرآن نے سینکڑوں برس پہلے اطلاع دی تھی۔ جو خدا کے وجود کی واضح دلیل ہے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ کافروں کے لیے اقوال کو "پھونکوں" کے لفظ سے ظاہر فرمادیا تعلیمات قرآن مجید اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کی پاکیزہ صداقت کی بھی دلیل ہے۔

لیکن اسلام وہ نظام پیش کرتا ہے کہ سرمایہ داری کے مفاسد بھی ختم ہوجاتے ہیں اور اللہ کا عقیدہ بھی مستحکم ہوتا ہے۔ آسمانی وارضی انوار کی برکتیں پھیلتی ہیں۔

آبادی POPULATION

عام معاشی نظریات جب اقتصادی معاملات کی پیچیدگیوں کو حل کرنے سے عاجز رہے تو انھوں نے تنگ آکر موت کو آواز دینا شروع کردیا ہے۔ لہٰذا خلافِ فطرت بالکل اس محاورے کے مطابق کہ "ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا" انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کی سکیم جاری کر دی ہے کہ "افزائش آبادی کی روک تھام کی جائے تاکہ معیشت کا توازن بحال رہے"! لیکن باوجود کروڑوں نفوس کے قتل عمد کے کوئی حوصلہ افزا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ بلکہ مصائب میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس اسکیم کی مثال بالکل ویسی ہی ہے کہ ایک مریض کا کسی ڈاکٹر سے تنازعہ ہوگیا۔ اس نے اس ڈاکٹر کی دشمنی وحسد میں چاہا کہ اس ڈاکٹر کا کاروبار ٹھنڈا ہوجائے چنانچہ کسی دوست سے اس کا تذکرہ کیا اور اپنے ارادہ کو ظاہر کرتے ہوئے اس سے مشورہ طلب کیا۔ اس نے رائے دی کہ رات کے وقت جاکر محلہ کے سارے نلکے بند کر دیئے جائیں تاکہ نہ کیچڑ ہوگا، نہ مچھر پیدا ہوں گے تو نہ ملیریا پھیلے گا اور نہ کوئی بیمار ہوگا۔ اور جب کوئی بیمار نہ ہوگا تو پھر اس ڈاکٹر کی آمدنی خود بخود ختم ہوجائے۔ لہٰذا وہ صاحب بھی اس تجویز پر بہت خوش ہوئے اور اس پر عمل کرنے کو آمادہ ہوگئے۔ اسی طرح خاندانی منصوبہ بندی ہے کہ نہ ہی افراد ہوں گے اور نہ ہی معاشی ضروریات وجود میں آکر اقتصادی بحران کا سبب بنیں گی۔ اور یہ ایک ہارے ہوئے جواری کا آخری داؤ ہے کہ ملت کو بلاوجہ موت کے منہ میں دھکیل دیا جائے۔

اس امر کے برعکس اسلامی تعلیم معاشیات پیغام حیات دیتی ہے۔ اسلام مُردنی سے زندگی کی جانب کھینچتا ہے۔ اس کی معاشیات میں آبادی کی کوئی حد بندی نہیں ہے۔ لہٰذا آبادی کی حد سے گزرنے (OVER POPULATION) کی چیخ و پکار اسلامی نہیں ہے۔ بلکہ اسلام ایسے اصول روشناس کراتا ہے کہ آبادی کی شرح کتنی ہی کیوں نہ ہو معاشرہ میں ہر فرد کو اس کی ضروریات مہیا ہوں گی[۱] اسی لئے شریعت اسلامیہ میں نسل کشی گناہان کبیرہ میں شامل ہے اور اس کی سزا بھاری جرمانہ ہے۔

پس وہ خطوط جو اسلامی معاشیات نے کھینچے ہیں اگر آج کا بھٹکا ہوا انسان ان کی حد بندیوں میں آجائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عالمی اقتصادی مسائل بطریق احسن حل ہو سکتے ہیں اور عالمگیر معیشت میں توازن قائم ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل کہ ہم اگلے باب کا آغاز کریں۔ اس موضوع سخن کے بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ تمسک بالثقلین سے محرومی کے باعث دنیا میں حقیقی اسلام کی تعلیمات عام نہ ہو سکیں۔

۲۔ اسلامی معاشرہ کا فرد اپنی بنیادی ضروریات کا فطری حقدار ہے۔

۳۔ معاشیات یا اقتصادیات اس علم کو کہتے ہیں جس میں ان طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو زندگی کے روزمرّہ کے معاملات سے تعلق رکھتے کہ انسان آمدنی کس طرح حاصل کرے اور کیسے خرچ کرے۔

۴۔ موجودہ معاشیات کی بے شمار تعریفات ہیں جو سب کی سب ناقص اور نامکمل ہیں۔ ابھی تک علم معاشیات کی نوعیت کے بارے میں اتفاق نہیں ہو سکا ہے کہ اُسے سائنس کا درجہ حاصل ہے یا آرٹ کا۔

۵۔ سوشلزم کے دعوے بلند ہیں لیکن اس میں انتقام کے سوا کوئی تعمیری لائحہ عمل نہیں ہے۔

---

[۱] کیونکہ ضرورت طلب سے پیشتر موجود ہوتی ہے۔

۶۔ سوشلزم ایک قید خانہ ہے جس کے قیدی کو جائے رہائش اور روٹی کپڑا مہیا ہو جاتا ہے۔

۷۔ سوشلزم کا خدا اور مذہب سے تعلق نہیں ہے حالانکہ معاشیات اور مذہب آپس میں مربوط ہیں۔

۸۔ اسلامی معاشی قوانین عالمگیر نوعیت کے ہیں اور فطرت کے عین مطابق ہیں۔

۹۔ اسلامی معاشیات کی اساس یہ ہے کہ "کماؤ اور تقسیم کردو"!

۱۰۔ اسلامی معاشیات میں "افادہ" کو خاص اہمیت ہے کہ ہر شے سے انسانیت کے لئے فائدہ حاصل کیا جائے۔

۱۱۔ اسلامی نظریہ کے مطابق حلال دولت مستحسن اور خیر ہے اور اسلام کسب معاش کی تلقین کرتا ہے۔

۱۲۔ اسلام نے ترک دُنیا کو معیوب قرار دیا ہے اور اکابرین اسلام اپنی روزی خود کماتے تھے اور یہی تعلیم دیتے تھے۔

۱۳۔ اسلامی معاشیات میں طلب کا مفہوم اور توضیحات بہت جامع ہیں۔

۱۴۔ اسلامی معاشیات حیات ارضی اور حیات حقیقی دونوں کے معاملات میں رہنمائی کرتی ہے۔

۱۵۔ دیگر مذاہب درپیش مسائل کے حل کرنے میں قاصر رہے لہٰذا مذہب سے لاتعلقی کا نظریہ قائم ہو گیا ہے۔

۱۶۔ ملت اسلامیہ نے ثقلین سے تمسک کے واضح حکم کو نظر انداز کر دیا لہٰذا عام مسلمان بھی حقیقی اسلامی نظام کو دُنیا کے چیلنج کے سامنے پیش نہ کر سکے۔

۱۷۔ اسلامی معاشی نظام مادی و روحانی دونوں حالتوں میں رہبری کرتا ہے۔

۱۸۔ افراط زر وقت حاضرہ کا سب سے اہم مسئلہ ہے جسے صرف اسلامی نظام ہی حل کر سکتا ہے۔

۱۹۔ عام معاشیات میں ذرائع عاملین پیدائش چار ہیں۔ زمین، سرمایہ، محنت اور نظام۔

لیکن اسلامی معاشیات میں ذرائع پیداوار تین ہیں۔ اللہ۔ معاشرہ۔ فرد کا کسب۔

۲۰۔ موجودہ علم معاشیات طبقاتی تقسیم زر کا بجائے خود سبب ہے۔

۲۱۔ بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دولت کو عادلانہ اور مساویانہ تقسیم کر کے اس بحران کا علاج فرما دیا تھا۔ مگر آپؐ کے بعد کی حکومتوں کے دور میں مسلمانوں میں طبقاتی تقسیم پیدا ہوگئی۔

۲۲۔ حضرت علیؑ نے اپنے دور میں یہ فرق دور فرما کر دوبارہ نظام مصطفویؐ نافذ فرمایا۔ جو خالص اسلامی نظام معاشیات واقتصادیات تھا۔

۲۳۔ قرآن ناطق نے سارا علم معاشیات ایک فقرے میں بیان کر دیا اور تمام معاشی مشکلات کا واحد حل دے دیا کہ "اے آدمؑ کے بیٹے۔ جو تم نے اپنی ضروریات زندگی سے زیادہ کمایا تو اس پر غیر کے مفاد کے لئے خزانچی ہے۔"

۲۴۔ اسلام نے جائز حد تک ذاتی ملکیت کا حق فطرت کے مطابق دیا ہے۔

۲۵۔ خاندانی منصوبہ بندی معاشی مشکل کا حل نہیں ہے بلکہ انسانوں کے بنائے ہوئے معاشی نظاموں کی ناکامی کی واضح دلیل ہے اور گویا "ہارے ہوئے جواری کا آخری داؤ ہے۔"

۲۶۔ اسلام افزائش آبادی کی شرح پر پابندی لگائے بغیر معاشرہ کے ہر فرد کو اس کی ضروریات مہیا کرتا ہے۔

۲۷۔ نسل کشی اسلامی اقتصادیات میں جرم ہے۔

۲۸۔ ثقلین کی تعلیم کے عین مطابق حاصل ہونے والا اسلامی معاشی نظام ہی دنیا کے جملہ مسائل کا واحد حل ہے۔

نوٹ: اسلامی معاشی نظام میں زر مبادلہ کا مسئلہ وجود نہیں رکھتا کیونکہ مستحکم معیشت کی وجہ سے دنیا میں اسلام کا سکہ چلے گا۔

———:(※):———

فصل سوئم

علم سیاسیات و قضایا

اقوام عالم کے عروج وزوال کے تذکرے اور ان کے اسباب وعلل آئندہ نسلوں کے لئے عبرت ہوا کرتے ہیں۔ لائق ستائش ہیں وہ جماعتیں جن کو خداوند کریم نے دوسروں کے حالات سے سبق سیکھنے کی توفیق عطا کی ہے۔ مسلمانوں نے ہر طرح کے دور دیکھے۔ کبھی اسلام کا شہنشاہ اوّل پیوند لگے لباس میں، پیٹ پر پتھر باندھے نظر آیا اور کبھی دمشق میں رومن تہذیب کی ملوکیت دیکھی۔ مسلمانوں نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑائے۔ اور مشرق و مغرب تک فتوحات پر فتوحات حاصل کرتے رہے۔ اگر فاتح ہوئے تو مفتوح بھی ہوئے اور جب تنزل شروع ہوا تو ایسا کہ نہ صرف حکومت ہاتھ سے گئی بلکہ زوال بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا کہ آج ہم اقوام عالم میں پسماندہ ہیں۔ اخلاقی پستی کا یہ عالم ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں تک میں ملاوٹ کی جاتی ہے۔ بے پردگی، عیش پرستی، دھوکہ بازی، بد دیانتی، رشوت، جوا، شراب نوشی، بدکرداری غرضیکہ تمام برائیاں زوروں پر ہیں۔ لیکن ان حوادث کے باوجود ہم نے اپنی کسمپرسی کا علاج تلاش نہ کیا۔ بڑی کوشش کے بعد یہ نسخہ ہاتھ آیا کہ ان مسائل کا حل "اسلامی نظام" ہے۔ لیکن پھر یہ سوال درپیش آیا کہ اس نسخۂ مرکبہ کے مفردات کیا ہیں؟ بڑے بڑے حکماء نے تجزیہ کیا لیکن اس مرض کا علاج نہ کر سکے۔ اس لئے کہ جن کو حکیم سمجھا گیا وہ از خود حکیم ہی نہ تھے۔ مستند حکیم

کے پاس ہر مرض کی دوا ہوتی ہے اور جو حکیم ہی نہیں اُسے کیا معلوم کہ مرض کیا ہے؟ اور اس کی دوا کونسی ہے؟ پس غلط معالجوں سے علاج کرواتے رہے لہٰذا بجائے افاقہ کے مرض میں اضافہ ہوتا رہا۔ رہی سہی صحت بھی جاتی رہی۔ اور اب وہ وقت ہے کہ قبر کے دہانے پر کھڑے ہلاکت کے منتظر ہیں۔ لیکن حیران کن امر یہ ہے کہ اب اس ناگفتہ بہ حالت میں بھی تشخیص کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا جارہا۔ علاج مرض تو بعید کی بات ہے اگر عقلِ سلیم رکھتے ہوئے ایک غیر جانبدار شخص محض اپنی صحت کی خاطر تھوڑا سا غور کرے کہ "آخر اس بیماری کا سبب کیا ہے؟" اس کے لئے یہ وجہ تلاش کرلینا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ چنانچہ آئیے اور خلوص نیت سے اس جان لیوا مرض کے اسباب دریافت کریں پھر ان کا موزوں علاج تلاش کریں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ انسانی معاشرت پر "حکومت" اور "اکثریت" بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر حکومت عادل و علیم ہوگی تو عوام ہر ناگہانی اور ہنگامی صورتحال کا مقابلہ کرسکیں گے۔ معاشرت و اخلاق و تہذیب و امن و سکون ہر نہج پر متوازن ہونگے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم "حکومت" اور "رعایا" دونوں پر کچھ ابتدائی گفتگو کریں۔ کیونکہ ان دونوں طبقوں کے امور پر بحث ہی "علم سیاسیات" کہلاتی ہے۔

علمِ سیاسیات

دورِ حاضرہ میں "سیاست" (POLITICS) کو سوشل سائنس کہا جاتا ہے "علمِ شہریت" (CIVICS) کا سیاست سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ علم سیاسیات کا تعلق امورِ سلطنت سے ہوتا ہے۔ وہ ریاست کی نوعیت، فطرت، اس کی وضع، شکل، نشوونما اور ترقی و زوال وغیرہ کے امور سے متعلقہ مسائل پر بحث کرتا ہے۔ نیز علم سیاست میں افراد قوم کے ریاست سے تعلقات بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح علم شہریت میں شہری کے فرائض و حقوق پر بحث کی جاتی ہے۔ یہ چیز دونوں علوم میں مشترک ہے لیکن باوجود اس ہم آہنگی کے شہریت اور سیاست میں کچھ فرق ہے کہ سیاست زیادہ تر امورِ ریاست سے متعلق ہے اور شہریت عموماً معاشرتی پہلوؤں پر بحث کرتی ہے۔ سیاست کلیاتی نظریات پر روشنی

ڈالتی ہے جبکہ شہریت صرف اُن کے عملی تجربوں کو موضوعِ بحث بناتی ہے۔ اسی طرح سیاست میں قومی و ملی اُمور کو زیادہ اہمیت حاصل ہے جبکہ شہریت انفرادی حیثیت میں معاشرہ کا جائزہ لیتی ہے۔ لیکن دورِ جدید میں انفرادی مسائل بھی سیاست ہی کا حصّہ کہلاتے ہیں۔ اور ادھر اجتماعی و ریاستی مسائل شہریت کے علم میں قابلِ جرح بیان ہیں۔ نتیجتہً آج کل یہ دونوں علوم اس طرح مل چکے ہیں کہ سیاست و شہریت کو الگ کرنا مشکل ہوگیا ہے۔

ریاست علم سیاسیات کا مرکزِ بحث "ریاست" ہے چنانچہ اس کی تعریف یوں بیان کی جاتی ہے کہ "ریاست کسی علاقے میں رہائش پذیر افراد کی ایسی ایسوسی ایشن کو کہتے ہیں جو اپنے پر کسی اقتدار کے تحت ایک منظم حکومت رکھتی ہو"۔ چنانچہ وڈرو ولسن کے مطابق "A STATE IS A PEOPLE ORGANISED FOR LAW WITHIN A DEFINITE TERRITORY"۔ یعنی ریاست ایک مخصوص خطہ پر آباد قوم ہے جو قانون کی اطاعت کے لئے منظم ہو۔ اور اس کا یہ مطلب ہوا کہ ریاست کے لئے آبادی و علاقہ مخصوصہ کا ہونا ضروری ہے اور وہاں کے لوگوں میں قانون کے ماننے کا شعور بھی لازم ہے۔ اور ORGANISED FOR LAW کے معنی ہیں کہ وہاں کوئی SOVEREIGNTY یعنی اقتدارِ اعلیٰ کی حامل قوت موجود ہو کیونکہ یہی طاقت قانون بنانے کی اور اس کے نفاذ کی ذمہ دار ہو سکتی ہے اور اسی SUPREME POWER کو حکومت (GOVERNMENT) کی ضرورت لاحق ہوگی تاکہ اقتدارِ اعلیٰ کی حاکمیت قائم ہو۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ موجودہ زمانے کی سیاست کے مطابق ریاست چار عناصر کا مجموعہ ہے جنہیں CONSTITUENT ELEMENTS OF STATE کہا جاتا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) عوام: یہ بہت ضروری جزو ہے کہ بغیر عوام کے ریاست قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ عوام ہی محکوم ہوتے ہیں اور ان پر ہی افراد حاکم ہوتے ہیں۔

(۲) علاقہ:۔ ریاست کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس جغرافیائی حدود پر مشتمل خطّہ ہو۔ خواہ اس کی وسعت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

(۳) گورنمنٹ:۔ ریاست کے لئے ضروری ہے کہ وہاں گورنمنٹ بھی ہو کیونکہ حکومت ہی ایسی ایجنسی ہے جو ریاست کے متعلقہ اُمور کی ذمّہ دار ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی مشینری ہے کہ اس کے بغیر ریاست کا کوئی کاروبار آگے نہیں بڑھ سکتا یہی نظم و ضبط کی ذمّہ دار ہوتی ہے اور قانون کے نفاذ و تحفظ اسکے بنیادی فرائض ہیں۔ اندرونی، بیرونی جھگڑوں کو سلجھانا۔ قوم کی ترقی کے لئے لائحہ عمل مرتب کرنا اور اس کو عملی جامہ پہنانا اس کے ذمّہ ہے اور عوام کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اطاعت و پیروی کریں۔

(۴) اقتدارِ اعلیٰ:۔ چوتھی اور انتہائی ضروری چیز "اقتدارِ اعلیٰ" ہے۔ یہ عنصر ریاست کی روح ہے کیونکہ اس کی موت و حیات اسی میں ہے۔ ریاست کی آزادی و غلامی کا انحصار اسی پر ہے۔

انہی چار عناصر مذکورہ پر ہماری آئندہ بحث کا انحصار ہے۔ اور چونکہ اوّل الذکر دو عناصر کی تشریح مزید فی الحال ہمارے مقصد کے لئے کوئی اہم افادیت نہیں رکھتی اس لئے ہم موخرالذکر دونوں عناصر (ELEMENTS) پر روشنی ڈالنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

حکومت

علم سیاست میں حکومت کے کئی اقسام ہیں جن میں زیادہ مشہور مندرجہ ذیل ہیں۔

(i) بادشاہت یا ملوکیت	MONARCHY
(ii) عضوضیت	TYRANNY
(iii) اشرافیت	ARISTOCRACY
(iv) جمہوریت	DEMOCRACY
(v) معاشریت	POLITY
(vi) عددیت (چندسری حکومت)	OLIGARCHY

لیکن موجودہ زمانے میں حکومت کی یہ تقسیم غیر معتبر ہے چنانچہ اس وقت حکومت کو صرف دو درجوں میں بانٹ دیا گیا۔ آمریت (ڈکٹیٹر شپ DESPOTISM، جمہوریت DEMOCRACY۔

آمریت ایک آدمی کی حکومت کو آمریت کہتے ہیں۔ آمر حاکم مطلق العنان ہوتا ہے۔ اور اپنی جماعت کے بل بوتے پر عوام پر حکومت کرتا ہے۔ اس حکومت کو تحکمانہ حکومت کہا جاتا ہے کیونکہ سارا اختیار آمر کے پاس ہوتا ہے۔ اور اس کی زبان ہی ریاست کا قانون ہوتی ہے۔ عوام کے لئے بلا چون چرا اطاعت کرنا ضروری ہوتا ہے اور ایک آمر حکومت کے شہری کالائحہ عمل "ماٹو" یہ ہوتا ہے۔ "TO BELIEVE ,TO OBEY ,TO FIGHT" یعنی یقین کرنا۔ تابعداری کرنا اور لڑنا۔ لہٰذا ایک پارٹی کی حکومت پوری طرح مسلّط ہو جاتی ہے اور آمر اور اس کی جماعت از خود حسب مرضی قوانین مرتب کر کے نافذ کر دیتے ہیں۔ اس طرز حکومت میں حزب اختلاف کا وجود برداشت نہیں کیا جاتا۔ اور عوام کو حکومت کے خلاف زبان کھولنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اس حکومت میں عدلیہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ اور مکمل اختیارات ڈکٹیٹر سے منسلک ہوتے ہیں۔

جمہوریت ابراہیم لنکن نے جمہوریت کی یہ تعریف کی ہے۔
"GOVERNMENT OF THE PEOPLE, BY THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE." یعنی عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے حکومت، عوام کے لئے حکومت۔ نیز پروفیسر سیلی نے اسے یوں بیان کیا ہے۔
"ایسی حکومت جس میں ہر فرد کا حصّہ ہو۔ یعنی ہر ایک شریک ہو۔"
"A GOVERNMENT IN WHICH EVERYONE HAS A SHARE" ۔ جمہوری طرز حکومت کے پھر کئی اقسام ہیں۔ سربراہ مملکت کی نوعیت کے لحاظ سے جمہوری نظام حکومت مندرجہ ذیل اقسام سے رائج کیا جاتا ہے۔ (۱) آئینی بادشاہت CONSTITUTIONAL MONARCHY

(۲) جمہوری REPUBLIC۔ اگر سربراہِ مملکت موروثی طریق پر ہو مگر نظامِ حکومت جمہوری ہو تو اسے آئینی بادشاہت کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ برطانیہ اور اگر سربراہِ مملکت کو بذریعہ رائے عامہ چُنا گیا ہو تو وہ جمہوری ہوگا جیسے پاکستان و ہندوستان وغیرہ۔ مرکز و متحدہ ریاستوں یا ملحقہ صوبوں کے تعلقات کے لحاظ سے بھی جمہوری نظام کی دو شکلیں ہیں۔ UNITARY (متحدہ) اور FEDERAL (وفاقی)۔ اگر آئین میں مرکز اور صوبوں میں اقتدار کی تقسیم ہو تو ایسا نظام وفاقی ہوگا جیسا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہے۔ اور اگر اقتدار مکمل طور پر مرکز کے پاس ہوگا تو ایسا نظام UNITARY کہلائے گا مثلاً انگلستان۔ مزید براں قانون سازی اور عاملہ کے تعلقات کی بنیاد پر جمہوری نظام کو دو شکلوں میں تقسیم کیا گیا۔ (۱) صدارتی (PRESIDENTIAL) (۲) کابینہ وزارت (CABINET)۔ اگر مجلسِ عمل قانون سازی کی ذمّہ دار ہے تو وہ CABINET کہلائے گی اور اگر مجلسِ عمل قانون سازی کی ذمّہ دار نہیں تو وہ صدارتی نظام ہوگا۔

اسی طرح جمہوریت کو واسطے کے لحاظ سے دو قسموں میں بانٹا جاتا ہے براہِ راست جمہوریت DIRECT DEMOCRACY اور INDIRECT DEMOCRACY (بالواسطہ جمہوریت) اوّل الذکر سے مراد یہ ہے کہ جس میں تمام اہلِ وطن حکومت کے معاملات میں شریک ہوں اور اس قسم کی جمہوریت بہت چھوٹی ریاستوں کے لئے موزوں سمجھی جاتی ہے۔ اس کے برعکس بالواسطہ جمہوریت اُسے کہتے ہیں کہ جس میں عوام اپنے آزاد خیالات کا اظہار اپنے منتخب نمائندگان کے ذریعے سے کریں۔ اسی جمہوریت کو نمائندہ جمہوریت REPRESENTATIVE DEMOCRACY بھی کہا جاتا ہے اور آج کے زمانے میں اسی جمہوریت کو سب سے اچھا سمجھا جا رہا ہے۔

باوجودیکہ علم سیاسیات کے ماہرین جمہوری نظامِ حکومت کی قسم -REPRESENTATIVE DEMOCRACY- کو بہترین قرار دیتے ہیں لیکن وہ اس

نظام کی خرابیوں کے بھی قائل ہیں۔ وہ ماہرین جہاں اس نظام کی خوبیاں بیان کرتے ہیں وہاں اس طرز حکومت کی برائیاں بھی تحریر کرتے ہیں۔

جمہوریت کی خرابیاں DEMERITS OF DEMOCRACY

ماہرین علم سیاست کے مطابق جمہوریت کی چند خرابیاں حسب ذیل ہیں۔

(۱) جمہوری نظام اچھی حکومت کی ضمانت نہیں دیتا کیونکہ یہ QUANTITY (تعداد یا مقدار) کو QUALITY (اہلیت۔ خوبی یا معیار) پر اہمیت و ترجیح دیتا ہے۔ اس نظام حکومت کی اساس رائے دہندگان پر ہوتی ہے۔ اور رائے دہندگان سب کے سب تعلیم یافتہ نہیں ہوتے پس یہ غیر تعلیمیافتہ، جاہل اور نا اہل لوگوں کی حکومت کہلاتی ہے۔ نزاکتِ زمانہ کے پیشِ نظر حکومت کو درپیش مسائل جبکہ بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں اور ہر کس و ناکس میں اتنی صلاحیت و قابلیت نہیں ہوتی کہ ان کو حل کر سکے۔ اس لئے ایسی حکومت اطمینان بخش نہیں ہے۔

(۲) جمہوری نظام حکومت میں کسی مطلوبہ حصول کا امکان معتبر نہیں ہے کیونکہ ہم "حرّیت" اور "مساوات" دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر یہ حرّیت دے گی تو مساوات قائم نہ رہ سکے گی اور اگر مساوات کی قوت استعمال کی جائے گی تو حرّیت جاتی رہے گی یعنی یہ کہ مساوات کی بنیاد پر ہر ایک کو آزاد رائے دینے کا حق ہوگا لیکن جس گروہ کے زیادہ ووٹ ہونگے اس کی بات تسلیم ہوگی اور مخالفین کی بات رد ہو جائے گی۔ لہٰذا مساوات قائم نہ رہ سکے گی کہ جس کا تقاضا یہ ہے کہ سب کی بات مانی جائے۔ اب "جمہوریت" یا تو "حرّیت" کو بچائے گی یا "مساوات" کو۔

(۳) جمہوریت کی بنیاد اس خوش فہمی پر ہے کہ ریاست کے تمام افراد مساوی سیاسی اختیار کے حامل ہوں گے لیکن یہ غلط ہے۔ افراد کبھی برابر نہیں ہوتے پس جمہوریت غیر مساوی افراد کو مساوی اختیار دینا چاہتی ہے جو غلط اور ناقابل عمل ہے۔

(۴) جمہوریت آزادی رائے کو تحفظ نہیں دیتی۔ کیونکہ آجکل نمائندہ جمہوریت کو سب سے زیادہ بہتر تصور کیا جاتا ہے اور عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف ملکوں میں نمائندگان عوامی خواہشات کا بہت کم احترام کرتے ہیں۔ عوامی رائے کے لحاظ کا دعویٰ صرف ووٹ حاصل کرنے کا حربہ ہے جبکہ حکومت کے ایوانوں میں نمائندگان کی اپنی ذاتی رائے ہوتی ہے۔ اور عوامی خواہشات کو بہت ہی کم ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

(۵) جمہوریت ترقی و عروج کے لئے ناموافق طرزِ حکومت ہے کیونکہ یہ جہلا کی حکومت ہو سکتی ہے۔ اس کے منتخب کرنے والے عوام میں مختلف نظریات کے حامل طبقے (مثلاً قدامت پسند، رجعت پسند، اوہام پرست، تنگ نظر، عجلت پسند مخالف، متعصب وغیرہ) ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس طرح اختلافِ رائے جدت و ترقی میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

(۶) معاشی و اقتصادی لحاظ سے بھی یہ طرزِ حکومت نقصان دہ اور اسراف کا باعث ہے کہ آئے دن انتخابات منعقد کر کے قومی دولت کو بلاوجہ ضائع کیا جائے۔

(۷) جمہوری حکومت اس وجہ سے بھی ناقابلِ عمل ہے کہ یہ رائے کی محتاج ہوتی ہے اور بوقتِ ضرورت کوئی مناسب کارروائی نہیں کر سکتی۔ جبکہ بعض مسائل فی الفور حل طلب ہوتے ہیں۔ لیکن اُسے اُن اہم مسائل کو التوا میں ڈال کر رائے کا انتظار و اہتمام کرنا پڑتا ہے جس کی صورت میں سنگین نقصان ہو جانے کے قوی امکانات موجود ہیں۔

(۸) جمہوری نظامِ حکومت میں کسی لائحہ عمل (پالیسی) کو جاری رکھنا محفوظ نہیں ہے کیونکہ اس نظام میں حکومت بار بار بدلتی رہتی ہے۔ اور اسکے ساتھ ساتھ پالیسی بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

(۹) جمہوری نظام قوم میں تفریق کی بنیاد رکھتا ہے اور لوگوں کو مختلف الرائے گروہوں اور سیاسی جماعتوں میں تقسیم کر دیتا ہے جس سے ملک میں ہنگامی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے اور سیاسی کشمکش فساد کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس سے ملک کا مستقبل

خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔
(۱۰) جمہوری حکومت کسی بھی طبقہ کو مطمئن نہیں کر سکتی اور حکومت خود بھی مضبوط نہیں ہوتی کیونکہ اس کا مستقبل ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔

متذکرہ بالا نقائص اور ایسی بے شمار خرابیوں کے باوجود دُنیائے سیاست نے اس نظام سے بہتر کوئی نظام حکومت تسلیم نہیں کیا۔ ہم نے سارے نظامات حکومت موضوع بحث نہیں بنائے کیونکہ زمانہ حاضرہ میں اُن سب کو خود ہی ٹھکرا کر اپنی نجات اس جمہوری طرز حکومت کو سمجھ لیا گیا ہے۔ اور وہ بھی صرف ایک صورت یعنی نمائندہ جمہوریت REPRESENTATIVE DEMOCRACY کو۔ البتہ سیاست دان اس اُمید پر اس نظام کو فائدہ مند سمجھ لینے پر مجبور ہیں کہ اگر عوام میں شعور و تعلیم ہو تو پھر یہ نظام حکومت باقی تمام نظاموں سے بہتر ہے لیکن تاریخ انسان گواہ ہے کہ ایسا وقت کبھی نہ آیا جب سب انسان ایک طرح کے ہوں اس لئے اس اُمید کے سہارے رہنا محض خیالی پلاؤ پکانا ہوگا۔ یہ امر محال ہے کہ تمام مختلف المزاج مختلف الآراء، اور مختلف الخصائل لوگ ایک ہی طرح کے یا مساوی ہو جائیں کہ تمام کے تمام تعلیم یافتہ ہو جائیں۔ یہ بھی نہایت مشکل ہے لہٰذا اس اَمر کو بیان کرنے میں ہمیں کوتامل نہیں کہ جمہوری نظام حکومت ایک عمدہ ترین نظام قطعاً نہیں ہے۔

تاسفِ خاص سخت افسوس کا مقام ہے کہ اکثر اہل اسلام بھی اس بات کے قائل ہیں کہ یہی نظام حکومت بہترین ہے اور عالمگیر حیثیت رکھتا ہے اور اس پر مزید گرہ یہ لگاتے ہیں کہ اسلام نے بھی اسی نظام حکومت کی تعلیم دی۔ اس سے آگے یہ کہ وہ دعویٰ فرماتے ہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی نظام حکومت اپنایا اور پھر اُن کے بعد "خلفاء" نے بھی اسی نظام کو تقویت پہنچائی۔ اس موقف کی تائید میں متعدد کتب تحریر کر دی گئیں اور تاریخ کا حلیہ بگاڑ کر اپنی بات کی صحت ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کی تاویلیں پیش کی گئیں۔ مگر افسوس یہ ساری محنت جمہوریت کے لئے تو تقویت کا باعث بن گئی لیکن "دین"

کے لئے سخت مضرت رساں ثابت ہوئی۔ پس ہم ان جمہوریت نواز لوگوں سے کہتے ہیں کہ اے برادران عالی قدر! ایک جانب تو آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے دوسری جانب اس ضابطہ میں ناقص نظام سلطنت کا پیوند لگائے ہیں آخر یہ ذو رُخی کیوں ہے؟۔ ایک عام ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اگر دین منجانب اللہ ہے اور اس کی ساری شریعت الہام و وحی سے ہے تو پھر اس کا تعلیم کردہ نظام حکومت ہر قسم کی خرابیوں سے مُبرا و منزہ ہونا چاہیئے۔ اور اس میں تمام سیاسی مسائل کا حل موجود ہونا چاہیئے۔ اسے عملاً شارع علیہ السلام کو نافذ کرکے ثابت کرنا چاہیئے کہ یہ وہ نظام سلطنت ہے جو ہر حال میں ہر جگہ ہر وقت قابلِ عمل ہے۔

اگر یہ کہہ دیا جائے کہ "اللہ نے یہی جمہوری نظام دیا ہے اور اسی پر رسولؐ نے نے عمل کرکے اسے نافذ العمل قرار دیا ہے" تو اسے کوئی بھی صاحب عقل تسلیم نہیں کرے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دین اسلام مکمل ہو جانے کے بعد اسلام کے تمام قوانین قیامت تک کے لئے اٹل ہیں۔ جن میں کسی قسم کے تغیر و تبدل، ترمیم و اضافہ کرنے یا کسی قانون دین پر نکتہ چینی کرنے کی اجازت نہیں ہے اور بندوں کو اس قسم کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین میں کوئی ترمیم، اضافہ یا تبدیلی کر سکیں۔ کیونکہ ایسا کرنا خدا سے مقابلہ ہے جو اسلام سے خارج کردے گا۔ نیز یہ کہ خدا کے بنائے ہوئے کسی قانون میں کوئی خرابی ممکن نہیں پس چونکہ جمہوری نظام حکومت میں بہت سی خرابیاں ہیں اس لئے وہ خدا کا عطا کردہ نظام نہیں ہو سکتا۔ اور جب یہ نظام خداوندی نہیں تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو کیونکر اپنا سکتے تھے۔ یہاں طرفداری یا من مانی کا لحاظ نہ کیجئے کیونکہ اگر آپ جمہوری نظام کو وحی کا نظام مان لیتے ہیں تو پورا دین خطرہ میں پڑ جاتا ہے کیونکہ جب اس قدر اہم شعبہ ناقص مانا جائے تو باقی دین کی صحت کا کیا اعتبار؟۔ اب یہ آپ کے ذہن دطلوب پر منحصر ہے یا "تحفظ دین" کر لیجئے یا "دفاعِ جمہوریت"۔

اسلامی نظامِ حکومت

جدید نظریہ کے اعتبار سے جمہوری نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں۔ اور چونکہ یہ ناقص اور ناقابلِ عمل طریقۂ نگہبانی برامورِ سلطنت ہے اسلئے یہ الہامی یا اسلامی نہیں ہو سکتا۔ تو پھر آخر اسلامی نظامِ حکومت کیا ہے؟

اسلامی نظامِ حکومت اور جمہوریت میں زمین و آسمان کا فرق ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ جیساکہ جمہوریت کی تعریف اوپر تحریر کی گئی "عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام پر حکومت GOVERNMENT OF THE PEOPLE, BY THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE لیکن بعض اوقات "جمہوریت" میں ووٹوں کے زور سے خود غرض افراد بھی برسرِ اقتدار آسکتے ہیں اور پھر وہ حکومت کو اپنی ملکیت ہی بنا لیتے ہیں اور پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ "GOVERNMENT OF ONE PARTY, FOR ONE PARTY, BY ONE PARTY" یعنی اُسی ایک جماعت کی حکومت، اُسی جماعت کے لئے، اُسی جماعت کے ذریعے۔ جبکہ رسولِ خدا کے طریقے کے مطابق اسلامی طرزِ حکومت (یعنی خلافت یا امامت) کی تعریف یہ ہے کہ GOVERNMENT OF GOD, BY THE REPRESENTATIVES OF GOD, FOR GOD. یعنی اللہ کی حکومت، اللہ کے نمائندوں کے ذریعے سے، اللہ ہی کے لئے۔

یہ ایک متعینہ اصول ہے کہ کسی نظام یا نظریہ کو پرکھنے کے لئے عموماً دو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اوّل اس کی تعلیمات کو عقل کی روشنی میں جانچتے ہیں اور دوسرے اس تعلیم کو پیش کرنے والی ہستی کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں کہ وہ کس کردار و اہمیت کا مالک ہے۔ اگر ہم نے اسلام کو ایک حقیقی نظام مانا ہے تو اس کو سمجھنے کے لئے سیرت پیغمبرِ اسلام علیہ و آلہٖ صلوٰۃ و سلام کا مطالعہ کیا۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت ہم نے جمہوریت کے نظریہ کی جانچ پڑتال کی ہے۔ اس کے معلنین ہی کی آراء پر ہم نے اس نظام کو ناقص ہونے کی وجہ سے غیر اسلامی پایا۔ اب اسی طرح ہم

اسلامی نظامِ حکومت کو کسوٹی عقل پر لائیں گے۔ اور اس کو پیش کرنے والی ہستی سے تعارف کریں گے۔

ہم اسلام کو کامل ترین دین اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ اور پیغمبرؐ اسلام کی نبوت میں حکومت بھی شامل تھی۔ حکومت ایک ایسا رُکن ہے جس پر رعایا کے اخلاق، معاشرت اور ثقافت، تہذیب و تمدن اور عروج و زوال کا دارومدار ہوتا ہے۔ اگر "دین" اس اہم ترین رُکنِ حیات کی طرف سے چشم پوشی کرے تو اس کا "دعویٰ اکمال" معاذ اللہ باطل ٹھہرے گا اسلئے ضروری ہے کہ دین میں اس شعبہ سے متعلقہ تمام امور کی مناسب و قابلِ عمل ہدایات موجود ہوں۔ چنانچہ دینِ اسلام میں نظامِ حکومت یہ ہے کہ "اقتدارِ اعلیٰ خدا کا۔ "SOVEREIGNTY OF GOD" حکومت خدا کے نمائندے کی "GOD'S AGENT IS RULER"[1] یعنی بالکل جمہوری نظریہ کے خلاف کہ عوام کو کوئی اختیار نہیں کہ وہ اپنی منشا کے مطابق حکومت بنائیں۔ کیونکہ اُن میں مرکزیت و اتحاد نہیں ہے زمین خدا نے پیدا کی اسلئے خالق کا حق ہے کہ مخلوق پر حکومت کرے کیونکہ ساری مخلوق کی ربوبیت کی ذمہ داری اسنے اپنے ذمہ لے رکھی ہے جسے وہ چاہے اپنا خلیفہ بنا کر نگرانی کے لئے مقرر کر دے۔ خدا کا انتخاب مخلوق سے یقیناً بہتر ہوگا۔ اس ہی تھیوری پر اسلام کے سارے نظام کی اساس رکھی گئی ہے چنانچہ جب

---

[1] سیاست میں THE THEORY OF DIVINE بھی اس سے ملتی جلتی ہے جسے سولھویں اور سترھویں صدی میں آزمایا گیا لیکن اس میں اقتدار تو خدا کا مانا گیا مگر حاکم کو خدا کا نمائندہ کہا گیا یعنی جو بھی بادشاہ ہوگا۔ وہ اللہ کا ایجنٹ ہوگا حالانکہ اسلامی تھیوری میں اللہ کے نمائندے کو حاکم بنایا گیا ہے۔ اسی لئے بادشاہ "ظلِ سبحانی" کہلاتے تھے گو نصف تھیوری پر عمل کرتے تھے لیکن وہ دور تاریخ کا بہترین زمانہ مانا جاتا تھا۔

بھی کوئی شخص حلقہ بگوشِ اسلام ہوتا ہے تو اُسے قرآن پاک پر بھی ایمان لانا ضروری ہوتا ہے جس میں اللہ کو " الملک " یعنی بادشاہ اور " مالک الملک " کہا گیا ہے اسکے اقتدارِ اعلیٰ کو لفظ " مقتدر " سے واضح کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہر مُسلم کو اس بات پر ایمان رکھنا پڑے گا کہ تمام کائنات کی سلطنت کا مالک، مقتدرِ اکبر اور مالک العالمین (تمام جہانوں کا بادشاہ) صرف اللہ ہے۔ جس کے رسُول ہونے کی حیثیت سے حضرت محمد مصطفےٰ خدا کے سب سے بڑے نمائندے ہیں۔

اسی نظریہ کی روشنی میں اب ہم نقلِ اوّل کی جانب رجوع کرتے ہیں علم سیاست اسلامی کی تعلیم کیا ہے اس میں وہ وجوہات بھی بیان کریں گے کہ خدا نے جمہور کو یہ حق کیوں نہیں دیا کہ وہ خود اپنی نمائندہ حکومت قائم کریں نیز ہم ان شرائط کی بھی نشاندہی کریں گے جو خدا کے کسی نمائندہ حاکم کے لئے ضروری ہیں۔

چونکہ قرآن حکیم کے مطابق آسمانوں کے ساتھ ساتھ اس زمین کی سلطنت کا مالک بھی اللہ ہی ہے اس لئے زمین پر اپنی پسند کے احکام نافذ کرنے کے لئے حاکم مقرر کرنا اللہ ہی کا حق ہے اور جس کو اللہ مقرر کرے اس کو منصوص من اللہ کہتے ہیں منصوص کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو خود نامزد کر کے اس کی نامزدگی کا اعلان بذریعہ رسُولؐ کرے۔ چونکہ عوام زمین کے یا زمین کی سلطنت کے مالک نہیں ہیں بلکہ مالکِ زمین کے بندے ہیں اسلئے انہیں اس پر حاکم مقرر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے ایسے منصوص من اللہ حاکم کو بعد از رسُولؐ دینی اصطلاح میں " خلیفہ " یا " امام " یا " اولی الامر " کہا جاتا ہے لہٰذا آئندہ ہم یہی الفاظ استعمال کر کے اپنا مدعا پیش کریں گے۔

انسانی تاریخِ ارضی کی ابتدا ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی زمین پر تشریف آوری سے شروع ہوتی ہے چنانچہ حضرت آدمؑ سے قبل یہ زمین موجود تھی مگر اس پر کوئی انسانی آبادی نہ تھی۔ اس لئے یہ جاننا پڑتا ہے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے اب اللہ نے آدمؑ کو کیوں خلق فرمایا؟۔

خلقتِ آدمؑ کی وجہ حضرت آدم علیہ السلام کو خلق کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اللہ نے زمین پر ایک خلیفہ بنانا چاہا یعنی یہ کہ اللہ نے اپنی حکومت کا پہلا نمائندہ اپنی ریاست پر بھیجا کہ وہ اُمورِ حکومت کی نگہبانی کرے چنانچہ حضرت آدمؑ کا یہ قصہ اللہ تعالیٰ بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتا ہے نقل اوّل کے پارہ ۱ کے تیسرے رکوع کو ملاحظہ کیجئے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۔۔۔ تا ۔۔۔ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۝

سورہ البقرہ آیت ۳۰ تا ۳۳

ترجمہ: "جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں تو فرشتے بولے۔ کیا تو زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے اور خونریزیاں کرے۔ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تقدیس کرتے ہیں خدا نے فرمایا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے اور آدمؑ کو تمام نام سکھا دیئے (پھر کچھ خاص چیزوں یا افراد کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا)۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ان کے نام بتلاؤ۔ فرشتے بولے تیری ذات پاک ہے جو تو نے ہمیں سکھا دیا ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے تحقیق تو ہی جاننے والا اور مصلحت کو پہچاننے والا ہے۔ جب آدمؑ کو حکم دیا اے آدمؑ ان کے نام بتلا دو۔ پھر جب آدمؑ نے فرشتوں کو ان کے نام بتلا دیئے تو خدا نے فرشتوں سے فرمایا کہ ہم نہ کہتے تھے کہ آسمانوں اور زمینوں کی تمام مخفی چیزیں ہم کو معلوم ہیں اور جو کچھ تم اب ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم ہم سے چھپاتے تھے وہ ہم کو سب معلوم ہے"!

مندرجہ بالا حوالۂ قرآن سے یہ نتائج برآمد ہوئے کہ

۱۔ حکومت کے لئے منشائے قدرت یہی تھا کہ وہ اپنے ہی مقرر کردہ نمائندے (خلیفہ) کے ذریعے حکومت کو قائم کرے اور مقصدِ تخلیقِ آدمؑ اسی ربّانی حکومت کو چلانا ہی تھا۔

۲۔ حضرت آدمؑ کو خلق کرنے کی وجہ یہی تھی کہ اللہ اپنی ارضی ریاست پر اپنا ہی

ایجنٹ مقرر کر دے۔

۳۔ حضرت آدمؑ کی خلقتِ جسمانی سے پہلے ہی فرشتوں میں ان کی خلافت کا اعلان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جسے اللہ خلیفہ بنانا چاہتا ہے اسکی خلقتِ جسمانی بعد میں ہوتی ہے اور اس کی خلافت کا اعلان ملائکہ میں پہلے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کی خلقتِ جسمانی سے پہلے خلافت مقدر کی جا چکی ہو وہ اس دنیا میں پیدا ہونے کے بعد کبھی بُت پرستی نہیں کر سکتا جیسا کہ حضرت آدمؑ نے کبھی بُت پرستی نہیں کی اور اللہ نے داؤدؑ کو خلیفہ بنایا۔ انہوں نے بھی کبھی بُت پرستی نہیں کی تھی اور حضرت ہارونؑ کو خلیفہ بنایا۔ انہوں نے بھی کبھی بُت پرستی نہیں کی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ سُنّتِ الٰہیہ کے مطابق اور آیۂ استخلاف کے مُطابق کوئی ایسا شخص خلیفہ نہیں بن سکتا جو کبھی بھی بُت پرست رہا ہو کیونکہ آیۂ استخلاف میں بھی اللہ نے واضح طور سے فرمایا ہے کہ خلیفہ آئندہ بھی اُسی طرح بنائے گا جس طرح پہلوں کو بنایا)۔

۴۔ فرشتوں کا کوئی قول و فعل اپنے اختیار سے نہیں ہوتا بلکہ منشا امرالٰہی کے مُطابق ہوتا ہے لہٰذا یہ بات فرشتوں سے خود اللہ نے کہلوائی کہ "کیا تو اس کو بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور سفّاک ہو گا؟" یہ سوال ملائکہ سے کروانے کا اور اُسے قرآن پاک میں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ مُفسد اور ناحق خونریزی کرنے والا سفّاک و ظالم شخص منصبِ خلافت پر فائز نہیں ہو سکتا۔

۵۔ ملائکہ نے اپنی عبادات کا جو حوالہ دیا تو اللہ نے اُن عبادات کو معیارِ خلافت قرار دینے کی بجائے علم کو معیارِ خلافت قرار دیا۔

۶۔ خدا نے آدمؑ کو جمہوری طریقے سے خلیفہ نہ بنایا۔

۷۔ دونوں فریقوں کا علم میں امتحان لیا۔ اور کامیاب ہونے والے کو خلیفہ قرار دیا۔ اور لاجواب رہ جانے والوں میں سے کسی کو خلافت نہیں دی جس سے ثابت ہوا کہ مسائل میں لاجواب رہ جانے والا اور کسی دوسرے سے جواب پوچھنے کا محتاج ہو جانیوالا شخص ہرگز حقدارِ خلافت نہیں ہو سکتا جسے مجبوراً یہ کہنا پڑے کہ اگر مجھے جواب بتانے والا

شخص نہ ہوتا تو میں ہلاک ہوجاتا۔

۸۔ فرشتوں نے آدمؑ کو سجدہ کر کے اطاعتِ آدمؑ تسلیم کی جس سے ثابت ہوا کہ اللہ کے مقرر کردہ خلیفے کی اطاعت ملائکہ بھی کرتے ہیں۔

۹۔ حضرتِ آدمؑ نے وہ نام کسی مکتب میں نہیں پڑھے تھے بلکہ ان کا علم آدمؑ کو وہبی طور سے ملا تھا جس سے ثابت ہوا کہ خلیفہ وہ ہوتا ہے جسے وہبی علم حاصل ہو اور اُسے دوسروں سے مسائل پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے۔

۱۰۔ اللہ سب سے زیادہ علم رکھتا ہے بلکہ ہر علم کا مالک ہے ہر چیز کے نفع و نقصان کو جانتا ہے اسلئے لوگوں کے مقرر کردہ حاکموں سے خدا کا مقرر کیا ہوا حاکم ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ اور منجانب اللہ تقرر میں کسی غلطی کا یا غلط شخص کے منتخب ہوجانے کا کوئی خطرہ نہیں۔ جبکہ جمہوریت میں یہ خطرہ موجود ہے۔

نتائج بالا سے یہ معلوم ہوا کہ خلیفہ کا انتخاب اللہ خود کرتا ہے اور چونکہ انسان میں علم کی کمی ہے۔ وہ اللہ کی مصلحتوں سے ناواقف ہے اسلئے اسے اختیار نہیں کہ اپنی کم علمی پر انحصار کر کے علیم مطلق کا نائب خود بنائے جبکہ خود اُس کی ذات بھی بغیر امتحان کے یہ ڈیوٹی کسی کو نہیں سونپتی۔ اس لئے محض کثرتِ رائے سے یا محض اجماع کے طریقے پر منتخب ہونے والے لوگ کبھی بھی خدا کے نمائندے ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ اور نہ ایسی حکومت کا "اسلامی نظامِ حکومت" سے کسی قسم کا واسطہ ہے پس اسلامی حکومت وہی قرار پائے گی جس کا حاکم منجانب خداوند تعالیٰ مقرر کیا ہوا ہوگا کہ اقتدارِ اعلیٰ اسی ذاتِ عالی صفات کا ہے۔ لہٰذا کسی بھی حاکم کے خدائی نمائندہ ہونے کی اوّلین شرط یہ ہے کہ اُسے وقت کا سب سے زیادہ عالم ہونا از حد لازم ہے اگر وہ ایسی صفتِ علیم سے متصف نہیں تو وہ حقیقی نمائندۂ خدا نہیں۔ ایسے نائبِ خدا کے لئے مخلوق کی رائے کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا ہے کیونکہ اس کا تعلق براہ راست خدا سے ہوتا ہے۔ اور خدا کا علم چونکہ کامل و اکمل ہے لہٰذا وہ جسے بھی اس منصب کا اہل قرار دے کر متعین فرمائے گا۔ اس کے اقوال و افعال کی صحت و پاکیزگی کا خود ذمہ دار ہوگا۔ پس نہ تو عوام کو

خلیفہ مقرر کرنے کا حق حاصل ہے اور نہ ہی عوام کی رائے منصب خلافت کا کوئی واسطہ ہے۔ اسلئے خدا کی نمائندہ اسلامی حکومت کی بنیاد نہ تو الیکشن ہے اور نہ عوامی سلیکشن (SELECTION)۔ اس کی بنیاد خدا کی جانب سے تقرر و نامزدگی ہے۔

۲۔ **اللہ کا مقرر کردہ نائب حکومت ظالم نہیں ہوگا** سورۃ البقرہ کے چودھویں

رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جب ابراہیمؑ کو ان کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ ان باتوں میں پورے اترے اللہ نے راضی ہوکر فرمایا ہم تم کو لوگوں کا پیشوا (امام) بنانے والے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے عرض کی اور میری اولاد میں سے ؟ حکم ہوا (ہاں مگر) میرا عہد ظالمین کو نہیں پہنچے گا۔"

اس بیان قدرت سے مندرجہ ذیل امور اخذ ہوتے ہیں۔

(ا) حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کی گئی (امتحان)۔

(ب) حضرت ابراہیمؑ امتحان میں پورے اترے۔

(ج) لہذا از امتحان خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنا نمائندہ "امام" تعین کیا۔

(د) حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لئے بھی اس منصب اعلیٰ کی درخواست کی۔

(ہ) خدا نے اس درخواست خلیل کو منظور فرمایا لیکن ذریت خلیل سے صرف ایسے افراد کو یہ منصب دینے کا عہد فرمایا جنھوں نے کبھی کوئی ظلم نہ کیا ہو۔

جبکہ قرآن پاک سے یہ بات ثابت ہے کہ ہر گناہ ظلم ہے بلکہ حضرت آدمؑ کے واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ترک اولیٰ بھی ظلم ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا تھا (اے آدمؑ و حواؑ) تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے۔ تاہم باوجود ترک اولیٰ کے حضرت آدمؑ کو نبوت و خلافت کے عہدے دے دیئے گئے۔ لیکن منصب امامت کے لئے فرمایا کہ کسی قسم کا ظلم کرنے والے کو خواہ وہ ترک اولیٰ ہی کیوں نہ ہو عہدہ امامت نہیں مل سکتا جس سے ثابت ہوا کہ خلافت سے امامت کا مقام بلند ہے لہٰذا ایسا شخص جس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ گناہوں ہی میں گذرا ہو بلکہ

شرک و بت پرستی اور نبوتِ محمدیہ میں شک کرنے کا مرتکب ہوا ہو وہ امام نہیں ہو سکتا۔
ایک شرطِ خلافت عادل ہونا بھی ہے کیونکہ بے انصاف اور غلط فیصلے کرنے والا شخص اللہ کا نمائندہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پس جو شخص عادل بھی ہو اور گناہوں سے پاک بھی ہو اُسے دینی اصطلاح میں معصوم کہتے ہیں۔ پس منصبِ نیابتِ الہیٰ کے لئے عصمت نہایت ہی اہم شرط ہے۔ لہٰذا جو معصوم نہ ہو وہ نیابتِ الہیٰ کے ہرگز لائق نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر خدا کسی غیر معصوم اور غیر عادل شخص کو اپنا نائب و نمائندہ مقرر کر دے تو اس بات کا شدید امکان رہے گا کہ وہ گنہگار اور بے انصاف شخص ظلم کا مرتکب ہو کر اپنے غلط فیصلوں اور غلطیوں سے عوام الناس کے لئے مُضر ثابت ہو۔ اور جس طرح کا معاشرہ خدا کو پسند ہے وہ قائم نہ ہو۔ اس لئے پروردگار عالمین کے لئے ضروری تھا کہ وہ معصوم و بے عیب اور عادل افراد ہی کو اپنے نمائندے اور نائب مقرر فرمائے۔ جو اس کے احکام و فرامین کو بندوں تک کسی کمی بیشی کے بغیر پہنچائیں اور اسکے پسندیدہ دستورِ حیات پر تہذیب و تمدن کی بنیادیں استوار کریں تاکہ لوگوں کو فلاح و بہبود حاصل ہو۔ اور ذلت و زوال سے محفوظ رہیں۔ اگر اللہ کا نائب و خلیفہ معصوم نہ ہو تو اس سے خطا و غلطی کا امکان ہر وقت ممکن ہو گا۔ لیکن خلیفہ نمائندۂ خدا ہوتا ہے۔ چونکہ خود خدا عادل مطلق ہے اس لئے اگر اس کا نائب ظالم و بے انصاف ہو گا تو یہ اللہ کی شانِ کبریائی کے خلاف امر ہو گا کہ خود پاک و عادل ہوتے ہوئے ایک ظالم و بے انصاف شخص کو اپنا نائب بنائے۔ نیز ایسی صورت میں دو بہت بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی۔
اوّل یہ کہ غیر معصوم (خاطی و گنہگار) انسان کے کسی بھی قول یا فعل پر شبہ کیا جانا ممکن ہو گا۔ کہ ہو سکتا ہے اُس میں اُس نے سہواً یا قصداً غلطی یا کمی بیشی کر دی ہو۔ اور حکم خدا یا دستور کی یہ دفعہ ایسی نہ ہو یا ویسی نہ ہو۔ ایسے خلیفہ پر مکمل اعتماد نہیں ہو سکتا۔ دوم یہ کہ گنہگار شخص کے افعال بھی معرضِ بحث میں آجائیں گے۔ یعنی اگر نعوذ نائب خدا و رسولؐ خاطی و گنہگار ہوتا تو عوام الناس کو جب وہ خطاؤں اور گناہوں سے دور رہنے کی تعلیم دیتا تو لوگ خود اس پر انگلیاں اٹھاتے کہ پہلے اپنے اعمال کی اصلاح کیجئے۔ پس ایسے

نائب کو کوئی واجب الاطاعت حاکم تسلیم ہی نہ کرتا اور ایسی صورت میں انتخاب خدا پر بھی اعتراض وارد ہو جاتا۔ اسی لئے یہ نہایت اہم شرط باندھ کر رب العزت نے اپنے نمائندے کی حیثیت کی ضمانت دے دی کہ میرا نائب وہی ہوگا جو بنفس نفیس میرے دستور کو من و عن بیان کرے اور میرے منشا کے مطابق اس کو نافذ کرے۔ پس ایسی شکل کی اسلامی حکومت ہی وہ نتائج برآمد کر سکتی ہے جنہیں مالکِ اقتدارِ اعلیٰ چاہتا ہے اور پسند فرماتا ہے۔

۳۔ اللہ کا نمائندہ عالم ہونے کے ساتھ شجاع بھی ہوتا ہے

عام حالات میں یہ دیکھا گیا ہے کہ "علم و شجاعت" دونوں صفات لوگوں میں ایک ساتھ نہیں ملتیں یعنی یہ دونوں صفات کسی آدمی میں شاذ و نادر ہی جمع ہوتی ہیں۔ بالعموم اگر کوئی عالم ہوگا تو وہ شجاع نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی بہادر ہوگا تو وہ علم کے میدان میں کوئی اہم مقام نہ رکھتا ہوگا۔ لیکن خدا نے اپنے نمائندوں میں دونوں صفات کا یکجا موجود ہونا لازم قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقر پ۲ میں حضرت طالوت علیہ السلام کو بادشاہ مقرر کرنے کی وجہ اللہ نے بزبان نبی سموئیلؑ یوں بیان فرمائی کہ "اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے تم پر اُسے مصطفےٰ (برگزیدہ یا منتخب) فرمایا اس لئے کہ اُسے کشائش علمی و جسمانی میں تم سے زیادہ کیا۔ اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی گنجائش والا اور سب کے حال سے واقف ہے۔"

اس واقعہ کا پس منظر یوں ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل پر حضرت طالوتؑ کو بادشاہ مقرر فرمایا۔ عوام الناس نے کہا کہ طالوت ہمارا بادشاہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ طالوتؑ سے زیادہ اس بادشاہت کے ہم حق دار ہیں اور اس کے پاس تو مال و دولت کی کمی ہے۔ چنانچہ اس جمہوری اظہار ناپسندیدگی کی مخالفت قدرت نے مندرجہ بالا بیان کے ذریعے فرمائی جس سے حسب ذیل تصریحات ملتی ہیں۔

(۱) امیر و دولت مند ہونا اسلامی حاکمیت کی اہلیت کا معیار نہیں ہے۔

(ب) علمی وجسمانی لحاظ سے افضل ہونا اِسلامی حاکمیت کی اہلیت کا معیار ہے۔
(ج) اسلامی حاکم کا تقرر خدا کا کام ہے جسے وہ چاہے یہ منصب عطا کرے۔ اور عوام کو اس میں رائے دینے کا کوئی حق و اختیار نہیں ہے۔
(د) اور اس تقرری کی ذمہ داری جو خدا نے خود لے لی اور عوام کو اس سے لاتعلق کردیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کا عالم ہے اور لوگ ایسے نہیں ہیں۔ پس حضرت طالوتؑ کے تقرر میں جمہوریت کو کوئی جگہ نہیں دی گئی اور اجماع و شوریٰ دونوں کو رَد کر دیا گیا۔ بلکہ وہی موقف برقرار رہا کہ یہ عہدہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے جسے وہ چاہے سونپ دے اور اللہ عادل ہے لہٰذا عدل قائم رکھتا ہے۔ اس کا نمائندہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ شجاع بھی ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ خدا کی حکومت کا ایجنٹ وہی ہو سکتا ہے جو اپنے وقت کا سب سے بڑا عالم اور سب سے بڑا شجاع ہو۔ جہالت اور بزدلی دونوں مذموم ہیں اور جو شخص اِن صفاتِ مذمومہ سے متصف ہو وہ اسلامی حکومت کا سربراہ نہیں ہو سکتا۔ اور حاکم کے شجاع و عالم ہونے کی شرط کو تو آج کی سیاست بھی تسلیم کرتی ہے۔

مندرجہ بالا عبارات سے یہ اُصول ثابت ہوگیا کہ اسلامی سیاست میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ ربُّ العالمین کا ہے اور حکومت اسکے مقرر کردہ نمائندے کی جسے اصطلاحِ اسلام میں خلیفہ، امام، ولی، امیر وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اِسلام کی سیاست میں جمہوریت نامی کوئی چیز موجود نہیں ہے بلکہ یہ مالکِ اقتدارِ اعلےٰ کا اختیار ہے کہ وہ حسبِ منشائے خود کسی معصوم و عادل و عالم و شجاع ہستی کو اپنی طرف سے بطورِ حاکم متعین فرمائے۔

چونکہ اِسلام ایک عالمگیر (یونیورسل) ضابطہ ہے اسلئے اس کے اُصول قیم ہیں۔ ان میں کسی بھی صورت سے تغیر و تبدل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس کے قوانین جس طرح سے تقریباً چودہ سو سال قبل صحیح اور واجب التسلیم تھے اُسی طرح آج بھی ہیں۔ کسی بھی بُنیاد پر اُن میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ خدا کا مکمل کیا ہوا دین کسی اصلاح کا یا اِصلاح کیلئے لوگوں کا محتاج نہیں ہے اگر احکام دین میں ترمیم کا حق تسلیم کرلیا جائے تو سارا دین ہی

مشتبہ ہو جائے گا۔ اور پھر اس کی دستوری کتاب، شارع اور خود خدا بھی معاذ اللہ مشکوک ہو جائیں گے۔ اور یہ صورت کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

پس اسلام کا یہ افتخار ہے کہ اس کے قوانین کسی ترمیم یا اضافے کے محتاج نہیں ہیں یہ چیز اسلام کو الہامی مذہب ثابت کرتی ہے اور اگر کوئی شخص اسلام میں کسی خامی کا نظریہ رکھے تو وہ اور اس کا نظریہ دونوں نامعقول ہیں۔ دُنیا کے بنائے ہوئے دساتیر و قوانین، وقت، موقع اور زمانے کے لحاظ سے ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں جیسے آج کی سب سے بہتر جمہوری "جمہوریت" کی تعریفات ہر زمانے میں تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ اور ہم نے اُن تعریفوں میں سے جدید ترین (MOST RECENT) تعریف لکھی ہے۔ ہو سکتا ہے وقت گزرنے پر اس میں کسی قطع و برید کی ضرورت پیش آجائے۔ چونکہ یہ انسانوں کے مرتبہ اصول و قوانین ایسے ہی ہوتے ہیں لہٰذا ان میں اختلاف و تفریقات اور ترامیم و اضافے ہو جانا ناگزیر ہیں۔ آپ نے اوپر دیکھا کہ آج لوگوں کے بہترین نظامِ حکومت "جمہوریت" کو کئی اقسام میں تقسیم کر دیا گیا اور پھر آج کی جمہوریت پسند دُنیا ان سب شکلوں میں سے صرف "نمائندہ جمہوریت" کو بہتر سمجھتی ہے لیکن اسلام کے اُصول ایسے جچے تُلے ہیں کہ ان سے بہتر کبھی ممکن نہیں۔ اسلام نے جو بھی قانون نافذ کیا ہے۔ اس میں ماضی، حال مستقبل کی تمام ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے اسلئے اس کے احکام مختصر، جامع اور باعث فلاحِ عظیم و وسیع ہیں۔ اسلامی نظریہ حکومت ہی کو لے لیجئے کہ ایک ہی اصول قائم ہے اقتدارِ اعلیٰ (سپریم پاور) اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور اسلامی حکومت اسی مالک کے ایجنٹ کی ہے اس تعریف میں ایک حرف کا بھی ردّ و بدل نہیں کیا گیا۔ حضرت محمد مصطفےٰؐ سے لے کر تا وقتِ قیامت یہی اُصول ہے زمانہ کتنا ہی بدلتا رہے۔ عوام کتنے ہی تبدیل ہوتے رہیں۔ موقع و محل کا اختلاف ہوتا رہے لیکن اسلام کا ہر قانون اٹل ہے اور جیسا عہدِ رسالتؐ میں واجب العمل اور فلاحی تھا ویسا ہی آج بھی واجب ہے اس خاصیت تامّہ کی بنا پر جو نظریہ اسلام نے حکومت کا بتایا ہے وہ ایک ہی ہے نہ ایک سے زیادہ ہے اور نہ ہی اس کی

کوئی نئی تقسیم ہوتی ہے یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ یہ دین الہامی ہونے کے ساتھ ساتھ بالکل فطری اور بالکل مکمل ہے اور اس کی حیثیت عالمگیر ہے اس دین کے قوانین ٹھوس بنیادوں پر اور تمام تقاضوں کو جانتے اور مدنظر رکھتے ہوئے علیم مطلق نے خود تعلیم فرمائے ہیں اسی لئے اسلام کا دعویٰ ہے کہ انسان اس سنّتِ الٰہی میں ذرا برابر بھی تبدیلی نہیں پا سکے گا۔ اللہ نے حضرت آدمؑ کو اپنا نائب (خلیفہ) بنا کر جس سنّت کی ابتدا فرمائی تھی وہی سنّت (طریقہ) قیامت تک کے لئے قائم ہے۔ قابلِ غور مقام ہے کہ جمہوری طریقے سے کبھی کوئی نبی یا پیغمبر نہیں بنا اور نہ ہی عوام کو یہ حق دیا گیا کہ وہ کسی کو نبی یا پیغمبر بنا سکیں۔ لیکن اگر کچھ لوگ از خود بن گئے تو انھوں نے خدا پر جھوٹ باندھکر جھوٹا دعویٰ کیا کہ (معاذ اللہ) ان کو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ پس اللہ نے جھوٹوں پر لعنت کی ہے۔ مگر اُن جھوٹوں میں سے بھی کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ وہ جمہوریت سے بنا ہوا نبی یا پیغمبر ہے اس بات کو وہ جھوٹے دعویدار بھی جانتے تھے کہ جمہوری طریقوں سے یعنی لوگوں کے ووٹوں سے کسی کو نبوّت و پیغمبری نہیں مل سکتی پس اُسی طرح عہدہ نیابتِ خدا و رسولؐ بھی نہیں مل سکتا۔ اور چونکہ مقررہ اہلیت کے معیار پر وہ جھوٹے دعویدار پورے نہ اُترے لہٰذا اپنے دعوے کو سچّا ثابت کرنے سے قاصر رہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ نظامِ حکومت اسلامی یہی ہے کہ اِنتظامِ حکومت اللہ کا مقرر کردہ سنبھالے۔ اسی میں سعادت ہے۔

جمہوریت کی خرابیوں اور اسلامی نظامِ حکومت کی خوبیوں کا تقابل

اب ہم جمہوری نظام کی خرابیوں اور اسلامی نظام کی خوبیوں کا تقابل کرتے ہیں۔

جمہوریت	اسلامی نظامِ حکومت
۱۔ جمہوری نظامِ حکومت اچھی حکومت کی ضمانت نہیں دیتا کیونکہ یہ خوبیوں کے	۱۔ اسلام عمدہ حکومت کی ضمانت دیتا ہے کیونکہ یہ خوبی کو تعداد و مقدار پر فضیلت

مقابلے میں تعداد و مقدار کو فوقیت دیتا ہے (جو نظام گارنٹی نہ دے نا قابلِ اعتماد ہے)

دیتا ہے (اسلامی نظام یہ گارنٹی دیتا ہے لہٰذا یہ قابلِ اعتماد ہے)

۲۔ اس نظام حکومت کی بنیاد رائے عامہ ہوتی ہے۔ عوام میں اچھے اور برے جاہل اور تعلیم یافتہ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں جو غلط آدمی کو بھی منتخب کر سکتے ہیں بلکہ عموماً کرتے رہتے ہیں۔

۲۔ اس نظام کی اساس خدا کے فیصلے پر ہوتی ہے اور اللہ کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے۔ وہ غلط آدمی کو منتخب نہیں کر سکتا۔

۳۔ موقع محل کے لحاظ سے حکومت کو بعض پیچیدہ مسائل درپیش ہوتے ہیں اور ہر کس و ناکس میں اتنی قابلیت نہیں ہوتی کہ ان کو حل کر سکے اسلئے ایسا نظام لائق اعتماد نہیں جس میں ہر کس و ناکس منتخب ہو سکے۔

۳۔ اسلامی نظام میں حکومت کی باگ ڈور منجانب خدا اس ہستی کو ملتی ہے جو علیم و شجاع ہونے کے ساتھ ساتھ معصوم بھی ہو اسلئے ایسا فرمانروا تمام پیچیدہ مسائل اپنے علم کی روشنی میں حل کرنے کی قابلیت رکھتا ہے اور بڑی شجاعت سے تمام مسائل کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہے چونکہ اسکے اقوال و افعال عصمت پر مبنی ہوتے ہیں لہٰذا ہر سو مکمل اعتماد بحال رہتا ہے۔

۴۔ اس نظام میں مساوات اور حریت دونوں کو بیک وقت تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔

۴۔ اسلامی نظام حکومت میں عوام کا دخل نہیں ہے بلکہ سب اختیارات خدا کو حاصل ہیں اور عوام کو خلیفۃ اللہ پر مکمل ایمان لانا ضروری ہے تو سب کی رائے ایک ہوگی اور یہ اتحاد، مساوات و محبت دونوں کی حفاظت کرے گا۔

۵۔ جمہوریت کی بنیاد اس پر ہے کہ ریاست

۵۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ تمام قوت و اقتدار کا

کا ہر فرد سیاسی طاقت کا حامل ہو لیکن یہ نظریہ عملاً غلط ہو جاتا ہے کیونکہ سب افراد کبھی برابر نہیں ہوتے اور نہ ہی سب کو سیاسی طاقت حاصل ہوتی ہے بلکہ طاقت صرف حکمران جماعت ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

مالک اللہ ہے اور ہر فرد کا فرض ہے کہ اللہ کے مقرر کردہ نائب کی اطاعت کرے اور اس اطاعت میں سب عوام برابر ہیں۔

۶ — جمہوریت آزادی رائے کو تحفظ نہیں دیتی جیسا کہ آجکل نمائندہ جمہوریت کو سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے لیکن مشاہدے کے مطابق نمائندگان ایوانِ حکومت میں عوامی آراء کی بجائے اپنی ذاتی رائیں پیش کرتے ہیں۔

۶۔ اسلامی نظامِ حکومت میں کوئی رائے خلافِ منشاء ایزدی نہیں ہوتی۔ لہٰذا جو بھی رائے مطابق مرضئ خدا ہو گی وہ سب افراد کی متفقہ رائے ہو گی خواہ اُن کا تعلق حکومت سے ہو یا عوام سے۔

۷ — جمہوری حکومت بسا اوقات ترقی و عروج قوم کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔

۷۔ اسلامی نظریہ حکومت کے نتیجے میں یقیناً فلاح و عروج ہیں اور اگر طرزِ حکومت اسلامی ہو گی تو خود بخود ترقی و خوشحالی اُس کے نتائج محصولہ ہوں گے۔

۸ — اس نظام میں قومی سرمایہ "انتخابات" کے لئے فضول خرچ ہوتا ہے۔

۸۔ انتخابات پر ہونے والی فضول خرچی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

۹ — جمہوری حکومتوں میں بعض اُمور انتظار رائے کی خاطر مقررہ اوقات پر سرانجام نہیں پاتے جس سے بعض اوقات شدید نقصانات ہونے کا خدشہ ہے بلکہ شاہد ہے کہ اس طرح کے نقصانات ہوتے رہتے ہیں۔

۹۔ اسلامی نظامِ حکومت میں حاکم پر مکمل اعتماد ہوتا ہے کیونکہ وہ معصوم اور عالم ہوتا ہے لہٰذا وہ ہر وقت فیصلہ صادر کرنے کا مجاز ہوتا ہے جو کسی بھی جہت سے ضرر رساں نہیں ہو سکتا۔

۱۰ — اختلافِ آراء سے حکومت کی بار بار تبدیلی کی وجہ سے اس نظامِ حکومت میں کوئی پالیسی

۱۰۔ اسلامی قوانین اٹل ہیں۔ ان سے بہتر کوئی حکمت عملی نہیں ہے۔

حکمت عملی مستحکم نہیں ہوتی۔

۱۱۔ جمہوری نظام میں لوگ تفرق و تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۱۲۔ جمہوری حکومت کسی بھی طبقہ کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کا اپنا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔

۱۱۔ اسلامی نظام ساری قوم کو متحد کرتا ہے جسکے نتیجے میں سب کا نظریہ ایک ہوتا ہے۔

۱۲۔ اسلامی نظام ہر فرد کو اطمینان کی ضمانت دیتا ہے کیونکہ اس کی حکومت مستحکم ہوتی ہے دوٹوں سے تبدیل نہیں ہوتی۔

مندرجہ بالا تقابل سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ جمہوریت کے نقائص کا علاج اسلامی نظام میں موجود ہے اسلئے یہ نظام جمہوری نظام سے بہتر ہے اور اس سے بہتر کوئی نظام موجود نہیں کیونکہ اس کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے اور اس کے قوانین وحی کی تعلیم کے عین مطابق مرتب ہوئے ہیں۔

اسلامی نظام حکومت کے بارے میں کوئی اعتراض وارد کر سکتا ہے تو یہی کہ اس میں فرد کو حق رائے دہی سے محروم کر دیا گیا ہے لہٰذا اس اعتراض کا ازالہ کرنے کے لئے ہمارا جواب یہ ہے کہ کسی شخص یا جماعت کو کسی امر میں رائے طلب کرنے کی ضرورت تب پیش آتی ہے جب حسب ذیل صورتیں واقع ہوں۔

(۱) جس امر کے متعلق وہ شخص یا جماعت خود کسی صحیح فیصلے پر نہ پہنچ سکے کہ اسکے کرنے سے فائدہ پہنچے گا یا نقصان۔

(۲) جب رائے لینے والے کو خود پر یہ اعتماد نہ ہو کہ اس کا فیصلہ درست ہوگا یا نہیں۔

(۳) جب دوسروں کی تنقید کا خوف ہو۔

مگر یہ سب امور ایک ہی وجہ سے ممکن ہیں کہ رائے طلب کرنے والے میں علم کی کمی ہو اگر وہ عالم ہوگا تو اپنے علم کی بنیاد پر ایسا فیصلہ کریگا جو ہر صورت میں فائدہ مند ہو۔ جب وہ کسی امر میں اس طرح کا فیصلہ کریگا تو وہ فیصلہ مبنی بر علم ہوگا لہٰذا اسے خود پر اعتماد ہوگا کہ اس کا فیصلہ درست ہے اس لئے اسے کسی تنقید وغیرہ کا خوف نہ ہوگا۔ پس خدا علیم مطلق ہے اس کا کوئی حکم یا فیصلہ حکمت و مصلحت سے خالی

نہیں لیکن اِنسان میں قلت علم ہے۔ اس لئے خدائے علیم وحکیم علم قلیل رکھنے والوں یا جاہلوں کا ہرگز محتاج نہیں ہوسکتا کیونکہ جو کسی کا محتاج ہو وہ خدا نہیں۔

انداز فکر اور طبیعت کے اختلاف کی وجہ سے انسانوں کے نظریات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے سب کی رائے ایک نہیں ہوسکتی بلکہ دُنیا میں کبھی ایسا وقت نہیں آیا کہ سب لوگوں کی ایک رائے ہوگئی ہو۔ اس تفریق واختلاف سے دفاع کی خاطر اللہ نے انسان پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی کہ جمہوری طریقے سے حاکم مقرر کریں کیونکہ وہ حاکم بنانے کے اہل ہی نہیں ہیں، اور قدرت استطاعت سے زیادہ کسی پر بوجھ نہیں ڈالتی۔ لہٰذا انسانوں کو اختلاف سے بچانے کی غرض سے اور اتحاد و مرکزیت کے قیام کی ضرورت کے تحت اللہ نے حکومت میں جمہوریت کو داخل نہیں کیا۔ اس لئے اس نظریہ کا پرچار کرنا کہ اللہ یا رسولؐ نے جمہوری نظام حکومت کی تعلیم دی ہے خدا اور رسولؐ پر بہتان ہے کیونکہ کوئی ناقص نظام اللہ اور رسولؐ کا پسندیدہ نہیں ہوسکتا جبکہ جمہوری نظام کے نقائص خود اس کے حامیوں نے تسلیم کرکے خود بیان کردیئے ہیں۔

حکومتِ الٰہیہ کا تاجدار

۔ اللہ کے مقرر کردہ حاکموں میں سب سے بڑے حاکم اور حکومتِ الٰہیہ کے تاجدار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ہیں اور یہ امر اب محتاج دلیل نہیں رہا کہ پیغمبر آخرالزماں کی نبوت میں ہی حکومت شامل تھی۔ لہٰذا حکومت دین کے دائرے سے باہر کی چیز نہیں تعلیمات دین "امور سلطنت" پر بھی حاوی ہیں۔ مشیت ایزدی یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کی مرکزیت قائم رہے اور اسی وجہ سے عوام کو جمہوری حق استعمال کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اسی مرکزیت کی خاطر رسولؐ نے بڑے بڑے مصائب برداشت کئے۔ دُنیا میں آپؐ نے حکومت الٰہیہ عملاً قائم کرکے دکھائی جس میں مرکزیت کو قائم کرنے کی تعلیم دی۔ واضح ہو کہ مرکزیت اسی صورت میں کام کرسکتی ہے جبکہ حاکم مرکز ایک ہی اعلیٰ دماغ شخص ہو۔ دو حکمران مرکزیت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔

اسی لئے جمہوریت کو رسول خدا نے کبھی اختیار نہیں کیا کیونکہ اس میں تمام محکموں کے الگ الگ حاکم ہوتے ہیں۔ وزرا اپنے اپنے محکمے کی الگ الگ نگرانی کرتے ہیں لیکن مساوی درجہ کے دو حاکموں میں کسی نہ کسی مقام پر اختلاف کا اندیشہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ ان اختلافات کے ظاہر ہونے پر مرکزیت کمزور ہوگی۔ اسی وجہ سے جمہوری حکومت بھی مجبور ہے کہ اُن وزرا پر ایک پریمیئر یعنی وزیرِ اعظم ضرور ہو جو اُن کے اختلافات کی روک تھام کر کے مرکزیت کو قائم رکھ سکے۔ لیکن وزیرِ اعظم کا اس مقصد میں کامیاب ہونا کبھی یقینی امر نہیں۔ ناکام رہنا بھی ممکن ہے جیسا کہ مشاہدہ گواہ ہے لیکن اسلامی سلطنت میں وزرا کے محکموں کا چکر نہیں ہے۔ ایک ہی حاکم اعلیٰ ہوتا ہے جو مرکزیت کی حفاظت کرتا ہے اور یہ مرکزیت وہی ہے جس کا ذکر ہم نے آیتِ عنوان میں کیا ہے چنانچہ آپ نے ثقل اوّل کی روشنی میں دیکھا کہ حکومتِ الٰہیہ کے لئے محض ایک ہی حاکم منتخب کیا جاتا رہا اور رعایا کو بے چون و چرا اطاعت ہی کی تعلیم دی گئی۔ ایسے ہی احکام کا اعادہ ثقل اوّل میں کئی جگہ کیا گیا۔ مثلاً سورۃ الاحزاب پ۲۲ ع ۵ میں ہے " اور نہ تو کسی مومن کے لئے جائز ہے اور نہ ہی مومنہ کے لئے کہ خدا اور رسولؐ جب کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو پھر اُن کو اپنے اُس امر کا کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو خدا اور اس کے رسولؐ کی حکم عدولی کرے پس وہ تو کھلم کھلا گمراہ ہو گیا۔" اسی طرح سورۃ النساء پ۵ ع ۹ میں ہے کہ " آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے جھگڑوں میں آپؐ کو حاکم نہ بنائیں اور جو فیصلہ آپؐ کر دیں اُس کے بارے میں اپنے دلوں میں تنگی محسوس کئے بغیر اسے پوری طرح تسلیم نہ کر لیں اس وقت تک یہ ہرگز ایمان والے نہیں ہوں گے۔" چنانچہ اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام و ایمان کی سب سے بڑی شرط ہی یہ ہے کہ خدا و رسولؐ کی اطاعت بلا حیل و حجت کی جائے۔ اور رسولِ خدا جو کہ نمائندۂ خدا ہیں کی اطاعت اصل میں اللہ ہی کی اطاعت ہے (ثبوت کے لئے پارہ ۵ سورۃ النساء آیت ۸۰ ملاحظہ فرمائیں) اللہ نے ایمان کی شرطِ مزید یہ بیان فرمائی ہے کہ رسولؐ کی اطاعت پر دل تنگ نہ ہوں بلکہ حضورؐ کے فیصلے کو بخوشی دل سے مان

لیا جائے۔ ایمان کے لئے ایسی اطاعت مطلوب ہے۔ اس کے بعد اس اطاعت کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کو اس وقت تک جاری کیا جب تک حکومت الٰہیہ کا وجود ہے۔ چنانچہ فرمایا "اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور صاحبان امر کی"۔ (سورۃ النساء پ۵ ع ۸) قابل غور امر ہے کہ کسی بھی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ آپؐ کا انتخاب امت کے اجماع یا شوریٰ وغیرہ سے ہوا ہو۔ اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپؐ کا نظام حکومت جمہوری نہیں تھا۔

جہاد آنحضرتؐ کے نظام میں استبداد و امپیریل ازم اور جارحانہ فتوحات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ اسلام سب سے پہلے امن کا پیغام دیتا ہے۔ سلامتی کا ضامن ہوتا ہے اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے مقابلے میں لائی جانے والی تمام قوتوں کی نفی کرتا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کبھی بھی یہ منشا نہ ہوا کہ مسلمان لوگ غیر مسلم ریاستوں پر جارحانہ حملے کر کے فتوحات حاصل کریں اور جارحانہ فتوحات سے مال غنیمت حاصل کر کے اپنے خزانے پُر کریں۔ اور پھر اہل اسلام میں بھی سرمایہ دارانہ اور نوآبادیاتی روش جنم لے جو عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ آپؐ کی تعلیم اور آپؐ کی سیرت کے مطابق منشائے رسولؐ یہ تھا کہ ملک فتح کرنے کی بجائے دنیا کے انسانوں کے دلوں کو فتح کیا جائے یعنی ملکی فتوحات کی بجائے دلوں پر اسلام کی حکومت ہو، ہر قوم اپنی جگہ خوش رہے لیکن وہ اسلام کے پرچم تلے جمع ہو کر مرکز کو تسلیم کرے۔ یہی اسلامی قانون ہے جیسا کہ ثقل اوّل میں ارشاد ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (سورۃ البقرہ پ۳ ع ۳۳) یعنی دین میں جبر و اکراہ نہیں ہے۔ ہدایت اور گمراہی کا امتیاز واضح ہو گیا ہے"۔ اس آیت میں اصول تبلیغ و اشاعت اسلام کی تعلیم ہے کہ "جبر و تشدد" سے اشاعت دین نہیں ہوا کرتی بلکہ اپنے دین کو اخلاق حسنہ سے غیروں پر ظاہر کرو کہ وہ خود دیکھ لیں اور قائل ہو جائیں۔ ایسی صورت میں وہ خلوص دل سے ایمان لائیں گے۔ چنانچہ اس اصول کو حضورؐ نے عملی طور پر نافذ کیا۔ قرآن مجید کی بعض آیات میں انتقام (REVENGE) کی اجازت تو دی گئی ہے لیکن جارحیت (OFFENCE)

کی کسی بھی جگہ اجازت نہیں دی۔ چنانچہ مولوی شبلی نعمانی تحریر کرتے ہیں "اسلام کا اصلی مقصد تبلیغ و دعوت ہے اب اگر کوئی قوم اس دعوت کی سدّ راہ نہ ہو تو اسلام کو نہ تو اس سے جنگ ہے نہ اسکے رعایا بنانے کی ضرورت ہے صرف معاہدہ صلح کافی ہے جس کی بہت سی مثالیں اسلام میں موجود ہیں لیکن جب کوئی قوم خود اسلام کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اس کو مٹا دینا چاہے تو اسلام کو مدافعت کے لئے تلوار ہاتھ میں لینا پڑتی ہے اور اس کو اپنے زیر اثر رکھنا پڑتا ہے۔ خیبر اس قاعدہ کے موافق اسلام کا پہلا مفتوحہ ملک تھا (سیرۃ النبیؐ حصہ اوّل)۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اسلام فوج کشی اور فتوحات سے توسیع مملکت کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ محض مدافعت (DEFENCE) کے لئے جنگ و قتال کو جائز قرار دیتا ہے۔ قانون الٰہیہ کے مطابق جہاد ہر صحت مند تندرست مردِ مسلم پر فرض ہے۔ جب ضرورتِ جنگ پیدا ہوتی تھی تو حضورؐ منادی کروا دیتے اور نماز جامعہ کے بعد جہاد کا حکم فرما دیتے تھے۔ جہاد کے بعد مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اس میں ان لوگوں کا حصہ بھی ہوا کرتا تھا جو کسی شرعی عذر کی بنا پر اس سعادت سے محروم رہ جاتے تھے۔ لیکن جو میدانِ جہاد میں جانے سے جان بوجھ کر پہلو تہی کرتے یا میدانِ جہاد سے فرار ہو جاتے تھے وہ لوگ خدا اور رسولؐ کے نافرمان اور بزدل سمجھے جاتے تھے اور ان کی نافرمانی اور بزدلی کی مذمت کی جاتی تھی۔ چونکہ اسلام "امن عالم" کا علمبردار ہے اسلئے استبدادی ضرریات کی نفی کی گئی اور جہاد ہر مسلمان کا فریضۂ مذہبی بنایا۔ لیکن حضور کا مقصد ملک جیتنا نہیں بلکہ ذہنوں اور دلوں کو جیت کر اسلام پھیلانا تھا۔

فتوحات ملکی فتوحات امپریل ازم کی ضرورت ہے۔ حرص ملک گیری اور توسیع پسندی کے لئے اسلام کے دستور امن میں کوئی جگہ نہیں۔

اسلام کسی حالت میں یہ اجازت نہیں دیتا کہ بلا وجہ کسی ہمسایہ ملک پر جارحیت کی جائے۔ لہٰذا ملکی فتوحات اسلام کی نگاہ میں کوئی مقام نہیں رکھتیں۔ اسلامی نظریہ مملکت کا مقصد داخلی و خارجی دونوں اطوار پر مکمل سکون و امن ہے اسے ہوس ملک گیری

سے کوئی واسطہ نہیں۔ سارا قرآن مجید پڑھ لیجئے کسی جگہ یہ لکھا نظر نہ آئے گا کہ غیر مسلموں پر چڑھائی کر دو جبکہ وہ کوئی مخاصمت پیدا نہ کریں۔ کفار مکہ کی مثال دے کر یہ سمجھا دیا ہے کہ اگر کوئی بھی قوم تمہیں بلاوجہ تنگ کرے تو اس سے لڑو۔ یہ اجازت محض دفاع یا انتقام کے لئے ہے۔ کمزور ہمسایوں پر محض ان کی کمزوری کی وجہ سے حملہ کرنے کی ترغیب حکومتِ الہیہ میں شامل نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنا عدل و انصاف کے منافی ہے۔ جارحانہ فتوحات کا پہلا اور لازمی نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے کہ لوگوں میں سرمایہ دارانہ عیوب پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ آنحضرتؐ کو آئندہ کے حالات کا علم تھا۔ لہٰذا فرمایا کرتے تھے "میں جس چیز سے ڈرتا ہوں وہ یہ ہے کہ تمہارے اوپر دُنیوی دولت و وجاہت کے دروازے کھل جائیں گے۔" (صحیح بخاری کتاب الجنائز جلد ۱)۔

ممکن ہے کہ اب یہاں کچھ لوگ اعتراض کریں کہ "فتوحات کا تاریک پہلو تو بیان کر دیا گیا لیکن اِنکے اس روشن پہلو سے پہلو تہی کی گئی ہے کہ فتوحات سے نظریات کو فروغ ملتا ہے ہر ایک کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ فاتح قوم بن کر رہے اس کا مذہب پھیلتا رہے اور اسلام کا بھی یہ منشا ہے کہ وہ عالمگیر مذہب ہو۔ دُنیا کے کونے کونے میں اسلام رائج ہو لیکن ایسا بغیر فتوحات کے کس طرح ممکن ہے؟"

ہم صحیح اور سچی فتوحات کے محاسن کے قائل ہیں۔ غیر جارحانہ طریقے سے حاصل کی ہوئی ہتھیاروں والی فتح بھی مستحسن ہے۔ لیکن ہتھیاروں کے زور سے حاصل ہونے والی فتح دائمی نہیں ہوا کرتی قوموں میں نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ اگر آج ہماری تلوار تیز ہے تو کل کسی اور کی ہو سکتی ہے بے شک اسلام کو دُنیا کے ہر گوشے میں پہنچنا چاہیئے مگر محبت و اخلاق کے وسیلے سے نہ کہ زبردستی اسلحہ و فوج کے ذریعہ سے۔ تاریخ آپ کے پاس موجود ہے مطالعہ کر کے فیصلہ فرما لیجئے کہ تلوار کی فتح دائمی ثابت ہوتی ہے یا دلوں کی۔ چنانچہ نقلی اوّل قلبی فتوحات کا طریقہ اس طرح سکھاتا ہے " اور (اے رسولؐ) لوگوں کو اپنے خدا کی راہ کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعے بلائیے اور اُن سے نہایت حسین طریقے سے مناظرہ کیجئے۔ آپؐ کا پروردگار ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو اس کے

راستے سے بھٹک گئے ہیں اور اُن سے بھی اچھی طرح واقف ہے جو ہدایت یافتہ ہیں۔" (سورۂ نحل پ ۱۴ ع ۱۴)) اس طریقہ فتوحات کو پڑھنے اور رسولؐ خدا کے طرزِ عمل کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر اُمّتِ اسلامیہ من حیث القوم ان قواعد وضوابط پر عمل کرے تو ساری دُنیا پر سلطنتِ اسلام قائم ہو سکتی ہے اور مسلمانوں میں کبھی بھی سرمایہ دارانہ وحریصانہ رُجحانات پیدا نہیں ہو سکتے۔

سرکارِ رسالتؐ نے بالکل اسی مقررہ اصُول پر عمل فرمایا۔ دوسرے ممالک میں ایسے سفارتی وفود بھیجے جن کے اراکین بالعموم آپؐ کے ایسے تربیت یافتہ شاگرد ہوتے تھے جن کے قول وعمل سے متاثر ہو کر لوگ اسلامی طرزِ عمل کے گرویدہ ہو جاتے تھے پھر ذرا سی عمدہ بحث ان کو صراطِ مستقیم پر لے آتی تھی۔ اُن سفارتی جماعتوں کو خاص طور پر یہ حکم ہوتا تھا کہ لڑنا نہیں۔ عہدِ رسالت کے بعد اگر مسلمان جنگ وقتال کی بجائے یہی طریقہ اپناتے رہتے تو آج تک اسلام دیگر اقوام عالم کے دلوں کو کبھی کا مسخر کر چکا ہوتا۔ پھر سب ممالک میں اسلام پھیل جاتا اور ہر جگہ حکومتِ الٰہیہ کا پرچم لہراتا۔ اسلام پھیلانے کا یہی طریقۂ کار حضورؐ نے تعلیم فرمایا اور اسی پر خود عمل کر کے اس کی صحت ثابت کی۔ اگر مسلمان اس اصُول پر عمل کرتے رہتے تو دُنیا میں کون غیر مُسلم رہ جاتا؟

محکمہ خزانہ دولت کی ذخیرہ اندوزی اور سرمایہ داری رسُولؐ خدا کا مطمح نظر ہرگز نہ تھا کیونکہ اسلام کا منشاء دولت وجواہر سمیٹنا نہیں ہے۔ نقل اوّل میں متعدد جگہ دولت جمع کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔ اِسی لئے تاجدارِ حکومتِ الٰہیہ حضرت محمّد مصطفےٰؐ نے اپنے عہدِ حکومت ورسالت میں کوئی خزانہ (یعنی بیت المال) قائم نہیں فرمایا جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا مقدس مشن یہ نہیں تھا کہ کمزور حکومتوں پر فوج کشی کر کے مال وزر جمع کیا جائے۔ حضورؐ حاصل ہونے والے تمام مال واسباب کو لوگوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ مال بچا کر رکھتے ہی نہ تھے تو بیت المال (مال خانے یا خزانے) کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔ چنانچہ مولوی شبلی نعمانی "الفاروق" میں تحریر کرتے ہیں کہ "آنحضرت کے زمانے میں سب سے آخیر جو رقم موصول ہوئی وہ بحرین کا خراج تھا جس کی

تعداد آٹھ لاکھ درہم تھی لیکن آنحضرتؐ نے یہ کُل رقم ایک ہی جلسہ میں تقسیم کر دی"۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ حضور کے دورِ حکومت میں "بیت المال" نام کی کوئی شے سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ از رُوئے عقل یہ بات تو درُست نہیں کہ خُدا تو ذخیرہ اندوزی و جمع دولت کی مذمت کرے لیکن اس کا مقرر کردہ نمائندہ اس کے حکم کے خلاف مال و متاع سمیٹ کر ایک جگہ اکٹھا کرے۔ خزانہ بنا لے۔ تاریخ کے مطابق یہ خزانہ ہی تو حکومتوں کی عیاشی کا سبب بنتا رہا ہے اسی سے امپریل ازم کی راہ ہموار ہو رہی ہے۔ اسی لئے رسُولِ خدا کے نظامِ حکومت میں خزانے کا نام و نشان تک نہیں ملتا اور خود حضورؐ نے بیت المال کا قیام نہ فرما کر ملّتِ اسلامیہ کو ذخیرہ اندوزی اور سرمایہ داری کی قباحتوں سے نجات کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔

عَدلیہ اور انتظامیہ

انسانی زندگی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا اسلام کی ستیا نہیں ہے۔ اِسلام ایک مسلسل و متحد حیات کی ضمانت دیتا ہے اُسے کسی حالت میں ظلم و ناانصافی گوارہ نہیں ہے اسی کے تحت اسلامی حکومت پر عدل و قضا کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ چونکہ اسلام از خود مذہبِ عدل ہے اس لئے اِسلام عدلیہ و انتظامیہ کو الگ الگ قرار نہیں دیتا۔ اس لئے عدلیہ کو انتظامیہ سے جُدا کرنا اسلامی نظام میں ممکن نہیں ہے۔ ان دونوں میں تفریق اسی صورت میں ہوتی ہے جب حکومت کے متعلق یہ خدشہ ہو کہ وہ عدل قائم نہ رکھ سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ رسُول مقبولؐ کے دور میں عدلیہ و انتظامیہ دونوں ایک تھے کیونکہ اسلامی حکومت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ ستم گر سے ستم رسیدہ کا حق حاصل کرنے کے لئے حکم انصاف صادر کرے اور ظلم و ستم کا خاتمہ کر کے پوری ملّت کو حق و انصاف کے دائرے میں رکھے۔

اِسلامی دستورِ حکومَت

اسلامی حکومت کے دستور کا اندازہ ایک جملہ میں یوں کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ڈیوٹی یہ ہے کہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی حامی ہوتی ہے۔ راستی و درستی ہی

اسلامی سیاست کی اساس ہے چنانچہ اسلامی حکومت کے دستور کی وضاحت ہم نقل دوم کے قائد حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ایک خط سے پیش کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے گورنر حضرت مالک بن الحارث اشتر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام تحریر فرمایا تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ ہے وہ وصیت جس کا حکم دیا ہے اللہ کے بندے علیؑ امیرالمومنین نے مالک بن الحارث اشتر کو جب اُسے مصر کا گورنر بنایا تاکہ اس ملک کا خراج جمع کرے اس کے دشمنوں سے جہاد کرے اس کے باشندوں کی فلاح وبہبود کا خیال رکھے اور اس کی زمین کو آباد کرے مالک کو حکم دیا ہے تقوائے الٰہی کا۔ اطاعتِ خداوندی کو مقدم رکھنے کا۔ اور کتاب اللہ (قرآن) کے مقرر کئے ہوئے فرائض وسنن کا۔ اسلئے کہ آدمی کی سعادت اِن ہی کی پیروی سے وابستہ ہے اور ان سے انکار کرنے اور انہیں گنوا دینے میں سراسر بدبختی ہے۔

اور حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت میں اپنے دل سے اپنے ہاتھ سے اپنی زبان سے سرگرم عمل رہے کیونکہ خدائے بزرگ وبرتر نے ذمہ لے لیا ہے کہ جو کوئی اس کی نصرت وتائید میں کھڑا ہوگا نصرت وتائید الٰہی اُسے حاصل رہے گی۔

اور حکم دیا ہے کہ خواہشات کے مواقع پر اپنے نفس کو توڑے۔ سرکشی کے وقت اُسے روکے کیونکہ نفسِ امارہ بُرائی کی طرف لے جاتا ہے۔ اِلّا یہ کہ خدا کا رحم شامل حال ہوجائے۔ اس کے بعد اے مالک سُن! میں تمہیں ایسے ملک میں بھیج رہا ہوں جس پر تم سے پہلے بھی حکومتیں گزر چکی ہیں۔ عادل بھی اور ظالم بھی۔ لوگ تمہاری حکومت کو بھی اُسی نظر سے دیکھیں گے جس نظر سے تم اگلے حکمرانوں کی حکومتوں کو دیکھتے رہے ہو۔ اور تمہارے بارے میں لوگ وہی کہیں گے جو تم ان حاکموں کے حق کے بارے میں کہا کرتے تھے

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ نیک آدمی اس آواز سے پہچانا جاتا ہے جو خدا اپنے بندوں کی زبان پر اس کے لئے جاری کر دیتا ہے۔ لہٰذا تمہارا دل پسند ذخیرہ عمل صالح ہو۔ یہ ذخیرہ اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنی خواہشوں پر قابو ہو۔ جو چیز حلال نہیں ہے اس کے لئے تمہارا دل کتنا ہی مچلے اپنے آپ کو اس سے دور رکھنا۔ اور یہ بھی جان لو کہ مباحات

مکروہات میں نفس کی مخالفت کرنا ہی انصاف کرنا ہے۔

اپنے دل میں رعایا کے لئے رحم، محبت، لطف پیدا کرنا۔ خبردار! رعایا کے حق میں پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جانا کہ اُسے لقمہ بنا لینے ہی میں تمہیں اپنی کامیابی دکھائی دے۔ رعایا میں دو قسم کے لوگ ہوں گے۔ تمہارے دینی بھائی یا مخلوقِ خدا ہونے کے لحاظ سے تمہارے جیسے انسان۔ لوگوں سے غلطیاں تو ہوا ہی کرتی ہیں۔ جان بوجھ کر یا بھول چوک سے۔ ٹھوکریں کھاتے ہی رہتے ہیں۔ تم اپنے عفو و کرم کا دامن خطاکاروں کے لئے اس طرح پھیلا دینا جس طرح تمہاری آرزو ہے کہ خدا تمہاری خطاؤں کے لئے اپنا دامنِ عفو و کرم پھیلا دے۔

کبھی مت بھولنا کہ تم رعایا کے افسر ہو۔ خلیفہ تمہارا افسر ہے اور خدا خلیفہ کے اُوپر حاکم ہے۔ خلیفہ نے تمہیں گورنر بنایا ہے اور مصر کی ترقی و اصلاح تمہیں سونپ دی ہے۔ خدا سے لڑائی مول نہ لینا۔ کیونکہ آدمی کے لئے خدا سے کوئی بچاؤ نہیں۔ خدا کے عفو و رحمت سے تم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ عفو پر کبھی نادم نہ ہونا۔ سزا دینے پر کبھی شیخی نہ بگھیرنا۔ غصہ آتے ہی دوڑ نہ پڑنا۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو غصے سے بچنا اور غصے کو پی جانا۔

خبردار! رعایا سے کبھی نہ کہنا کہ میں تمہارا حاکم بنا دیا گیا ہوں۔ اب میں ہی سب کچھ ہوں۔ سب کو میری متابعت کرنا چاہیئے۔ اس ذہنیت سے دل میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ دین میں کمزوری آتی ہے اور بربادی کے لئے بلاوا آتا ہے اور اگر حکومت کی وجہ سے غرور پیدا ہونے لگے تو سب سے بڑے بادشاہ خدا کی طرف دیکھنا۔ جو تمہارے اُوپر ہے اور تم پر وہ قدرت رکھتا ہے جو تم خود بھی اپنے آپ پر نہیں رکھتے۔ ایسا کرو گے تو نفس کی طغیانی کم ہوگی۔ حدت گھٹ جائے گی۔ بھٹکی ہوئی روح لوٹ آئے گی۔

خبردار! خدا کے ساتھ اس کی عظمت میں بازی نہ لگانا۔ اس کے جبروت میں تشبیہ اختیار نہ کرنا کیونکہ خدا جباروں کو ذلیل کر ڈالتا ہے۔ اور مغروروں کو نیچا دکھاتا ہے۔ اپنی ذات کے معاملے میں، اپنے خاص عزیزوں کے معاملے میں جنہیں تم اپنی رعایا

ہیں سے چاہتے ہو. خدا سے بھی انصاف کرنا۔ اور خدا کے بندوں سے بھی انصاف کرنا۔ یہ نہ کروگے تو ظلم کرنے لگوگے۔

یاد رکھو! جو کوئی خدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے تو خدا خود اپنے بندوں کی طرف سے ظالم کا حریف بن جاتا ہے اور خدا جس کا حریف بن جائے۔ اس کی حجّت باطل ہو جاتی ہے۔ وہ خدا سے لڑائی ٹھان لینے کا مجرم ہوتا ہے یہاں تک کہ باز آجائے۔ اور توبہ کرلے۔ خدا کی نعمت کو اس سے بڑھ کر بدلنے والی اور خدا کی عقوبت کو اس سے زیادہ بلانے والی کوئی چیز نہیں کہ آدمی ظلم کو اختیار کرے۔ یاد رہے کہ خدا مظلوموں کی سنتا اور ظالموں کی تاک میں رہتا ہے۔ تمہیں سب سے زیادہ پسندوہ راہ ہونا چاہیئے جو حق کے لحاظ سے سب سے زیادہ درمیانی، انصاف کی رُو سے سب سے زیادہ عام اور رعایا کو سب سے زیادہ رضامند کرنے والی ہو۔ یہ بھی یاد رکھو کہ عوام کی ناراضگی خواص کی رضامندی کو بہالے جاتی ہے اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے ہوتے ہوئے گوارہ کرلی جاتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھو! خوشحالی میں جو لوگ حاکم کے لئے سب سے بڑا بوجھ، سب سے کم کارآمد، انصاف سے کھُنسانے والے، مانگنے میں اصرار کرنے والے، بخشش و عطا کے موقع پر کم سے کم شکرگزار ہونے والے، انعام و اکرام سے محرومی پر عُذر نہ سُننے والے اور زمانے کی کروٹوں کے مقابلے میں سب سے کم ثابت قدم رہنے والے ہیں وہ "خواص" ہی ہوتے ہیں۔ دین کا اصلی ستون، مسلمانوں کی اصل جمعیّت، دشمن کے مقابلے میں اصلی طاقت اُمّت کے عوام ہیں۔ لہٰذا عوام ہی کا تمہیں زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔

تمہاری مجلس میں سب سے زیادہ دور، تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ مکروہ وہ شخص ہونا چاہیئے جو لوگوں کے عیب ڈھونڈا کرتا ہے۔ لوگوں میں عیب تو ہوتے ہی ہیں یہ حاکم کا کام ہے کہ اُن کے عیب ڈھکے۔ خبردار! پوشیدہ عیبوں کی کرید نہ کرنا۔ تمہارا منصب بس یہ ہے کہ جو عیب چھپے ہوئے ہیں ان کا فیصلہ خدا پر چھوڑ دو۔ حتی المقدور لوگوں کے ڈھکے کو ڈھکا ہی رہنے دینا۔ ایسا کروگے تو خدا بھی تمہارے عیب ڈھکے رہنے دیگا جو

تم رعایا سے چھپانا چاہتے ہو۔

وہ تمام اسباب دُور کر دینا جو لوگوں میں بغض وکینہ پیدا کرتے ہیں۔ عداوت و غیبت کی ہر رسّی کاٹ دینا۔ ہوشیار! چغل خوروں کی بات ماننے میں جلدی نہ کرنا کیونکہ چغل خور دغاباز ہوتا ہے۔ اگرچہ خیر خواہ کا روپ دھار کر سامنے آتا ہے۔ اپنے مشورے میں بخیل کو شریک نہ کرنا۔ کیونکہ وہ تمہیں احسان کرنے سے روکے گا۔ اور فقر سے ڈرائے گا۔ بزدل کو بھی صلاح میں شریک نہ کرنا کیونکہ وہ مہمات میں تمہاری ہمت کمزور کر دے گا حریص کو بھی شریک نہ کرنا کیونکہ وہ ظلم کی راہ سے دولت سمیٹنے کی ترغیب دے گا۔ یاد رکھو! بخل، بُزدلی اور حرص اگرچہ الگ الگ خصلتیں ہیں مگر ان کی بنیاد خدا سے بدگمانی پہ ہے۔

بدترین وزیر وہ ہے جو شریروں کی طرفداری کرے۔ اور گناہوں میں ان کا ساتھی ہو۔ ایسے آدمی کو اپنا وزیر نہ بنانا کیونکہ اس قسم کے لوگ گنہگاروں کے مددگار اور ظالموں کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ان کی جگہ تمہیں ایسے آدمی مل جائیں گے جو عقل و تدبیر میں ان کے برابر ہوں گے۔ مگر ان کی طرح گناہوں سے لدے ہوئے نہ ہوں گے۔ نہ کسی ظالم کی اس کے ظلم میں امداد کی ہوگی۔ نہ کسی گنہگار کا اس کے گناہ میں ساتھ دیا ہوگا۔ ایسے لوگ تمہیں کم تکلیف دیں گے۔ تمہارے بہترین مددگار ثابت ہوں گے۔ تم سے پوری ہمدردی رکھیں گے۔ اور غیر سے اپنے سب رشتے کاٹ لیں گے۔ ایسے ہی لوگوں کو اپنی نجی صحبتوں اور عام درباروں میں اپنا مصاحب بنانا۔ پھر یہ خیال رہے کہ خاص الخاص لوگوں میں بھی تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ مقبول وہی لوگ ہوں جو زیادہ سے زیادہ کڑوی بات تم سے کہہ سکتے ہوں ان کاموں میں تمہارا ساتھ دینے سے انکار کر سکتے ہوں جو خدا اپنے بندوں کیلئے ناپسند فرما چکا ہے۔ اہل تقویٰ و صدق کو اپنا مصاحب بنانا انہیں ایسی تربیت دینا کہ تمہاری جھوٹی تعریف کبھی نہ کریں کیونکہ تعریف کی بھرمار سے آدمی میں غرور پیدا ہوتا ہے۔

اور تمہارے سامنے نیکوکار اور خطاکار برابر نہ ہوں۔ (کیونکہ) ایسا کرنے سے نیکوں کی ہمت پست ہو جائے گی۔ اور خطاکار اور بھی شوخ ہو جائیں گے۔ ہر آدمی کو وہ جگہ دینا جس کا وہ اپنے عمل کے لحاظ سے مستحق ہے اور تمہیں جاننا چاہیئے کہ رعایا میں

اپنے حاکم کے ساتھ حُسنِ ظن اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ حاکم رعایا پر رحم و کرم کی بارش کرتا رہے۔ اس کی تکلیفیں دُور کرے اور کوئی ایسا مطالبہ نہ کرے جو رعایا کے بس سے باہر ہو۔ یہ اُصول تمہارے لیئے کافی ہے اس اُصول سے رعایا کا حُسنِ ظن تمہیں بہت سی مشکلوں سے بچا دے گا۔ خود تمہارے حُسنِ ظن کے سب سے زیادہ مستحق وہ ہوں گے جو تمہارے اِمتحان میں سب سے اچھے اُتریں۔ اسی طرح تمہارے سوءِظن کے بھی سب سے زیادہ مستحق وہی ہوں جو آزمائش میں سب سے بُرے نکلیں۔

کسی اچھے دستور کو نہ توڑنا۔ جو اس اُمت کے اگلے لوگ جاری کر گئے۔ اور جس سے لوگوں میں اتحّاد پیدا ہوتا ہے۔ رعایا کی بھلائی ہوتی ہے۔ توڑو گے تو اچھے دستور کا ثواب پہلے لوگوں کے لیئے باقی رہے گا۔ اور عذاب تمہارے حصے میں آئے گا کہ بھلی راہ تم نے مٹا دی۔ اس بارے میں اہلِ علم و عرفان سے مشورہ[1] کرتے رہنا کہ تعمیر و اصلاح کے وسائل کیا ہیں اور ان میں کس طرح استحکام دوام بخشا جائے۔

اور دیکھو! رعایا میں کئی طبقے ہوتے ہیں۔ یہ طبقے ایک دوسرے سے وابستہ رہتے ہیں اور آپس میں کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتے۔ چُنانچہ ایک طبقہ وہ ہے جسے خدا کی فوج کہنا چاہیئے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو عوام و خاص کا تحریری کام کرتے ہیں پھر انصاف کرنے والے قاضی ہیں امن و انتظام کے عامل ہیں۔ ذمّی اور مسلم۔ اہلِ جزیہ و اہلِ خراج ہیں پھر سوداگر اور اہل حرفہ ہیں غربا و مسکین کا نچلا طبقہ بھی ہے خدا نے ان میں ہر طبقے کا حصّہ مقرر کرکے اپنی کتاب (قانون) میں یا اپنے آخری نبی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سُنّت میں اسے ضروری ٹھہرا دیا ہے اور اس کی پابندی اور بجا آوری لازمی کر دی ہے۔

فوج اللہ کے حکم سے رعایا کا قلعہ ہے۔ حاکم کی زینت ہے۔ دین کی قوّت ہے۔ امن ہے۔ رعایا کا قیام فوج ہی سے ہے۔ لیکن فوج کا قیام خراج سے ہے

---

[1] یہ کہ یہ مشورہ تقرر کے لیئے نہیں۔

جو خدا اس کے لئے نکالتا ہے۔ خراج ہی سے سپاہی جہاد میں تقویت پاتے اور اپنی حالت درست کرتے ہیں۔

پھر ان دونوں طبقوں، فوجیوں اور اہل خراج کی بقا کے لیے تیسرا طبقہ ضروری ہے یعنی قضاۃ، عمال، کتاب کا طبقہ کہ یہی لوگ ہر قسم کی مالی معاملات انجام دیتے ہیں اور ان چاروں طبقوں کی بقا کے لئے تاجر اور اہل حرفت ضروری ہیں کہ بازار لگاتے اور سب کی ضرورتیں مہیا کرتے ہیں

آخر میں ادنیٰ طبقہ آتا ہے اور اس طبقہ کی امداد و اعانت از بس ضروری ہے خدا کے یہاں سب کی گنجائش ہے اور حاکم پر سب کو حق قائم ہے۔ حاکم جتنی بھی بھلائی کر سکتا ہے کرتا ہے مگر اس بارے میں اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتا۔ جب تک توفیق الہیٰ کی دعا کے ساتھ عزم مصمم بھی نہ رکھے کہ حق ہی کا ساتھ دیگا۔ حق ہی پر ثابت قدم رہے گا۔ چاہے حق آسان ہو یا مشکل۔

دیکھو! اپنی فوج کے معاملے میں ہوشیاری سے کام لینا۔ ان ہی لوگوں کو افسر بنانا جو تمہارے خیال میں اللہ کے رسولؐ اور تمہارے امامؑ کے سب سے زیادہ خیر خواہ ہوں۔ صاف دل ہوں۔ ہوش مند ہوں۔ جلد غصے میں نہ آجاتے ہوں۔ عذر معذرت قبول کر لیتے ہوں۔ کمزوروں پر ترس کھاتے ہوں۔ زبردستوں پر سخت ہوں۔ نہ سختی ان کو جوش میں لے آتی ہو اور نہ کمزوری ان کو بٹھا دیتی ہو۔ فوج کے لئے ان کو منتخب کرنا جن کا حسب نسب اور خاندان اچھا ہے۔ جن کا ماضی بے داغ ہے جو ہمت و شجاعت جود و سخا سے آراستہ ہیں۔ شرافت و نیکی ایسے ہی لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ ان فوجیوں کے معاملات میں ایسی ہی فکر کرنا جیسی فکر والدین کو اولاد کی ہوتی ہے ان کی تقویت اور درستی حال کے لئے جو بھی بن پڑے کرتے رہنا اور جو کچھ کرنا اُسے بہت نہ سمجھنا۔ اپنے کم سے کم احسان کو بھی نہ بھولنا کیونکہ اس سے انکی خیر خواہی بڑھیگی اور حسن ظن پیدا ہوگا۔ ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت سے بھی بے پرواہی اس بھروسے پر نہ کرنا کہ بڑی ضرورتوں کا خیال کر لیے ہو کیونکہ تمہاری معمولی رعایت بھی ان کے لئے نعمت

ہوگی۔ اور بڑی ضرورتوں میں تو وہ سراسر تمہارے لطف وکرم کے ہمیشہ محتاج رہیں گے۔

وہی فوجی سردار تمہارے سب سے زیادہ مقرب ہوں جو فوجیوں کی سب سے زیادہ مدد کرتے ہوں۔ اپنے ہاتھ کی دولت سے سپاہیوں کو ان کی ضرورتوں اور بال بچوں کی فکروں سے آزاد کرتے ہیں تاکہ پوری فوج ایک دل ہو جائے اور اس کے سامنے بس ایک ہی خیال ہے۔ دشمن سے جنگ۔ فوج کے سرداروں پر تمہاری توجہ فوج کے دلوں کو تمہاری طرف متوجہ کرے گی۔

حاکم کے آنکھ کی ٹھنڈک کس چیز میں ہونا چاہیئے؟ اس میں کہ خود انصاف قائم کرے اور رعایا اس سے محبت ظاہر کرتی ہے رعایا کی محبت ظاہر نہیں ہوتی جب تک اس کے دل سلیم نہ ہوں اور رعایا کی خیرخواہی صحیح نہیں ہوتی جب تک اُسے حاکم سے سچی محبت نہ ہو۔ وہ حکومت کو بوجھ اور اس کے زوال میں دیر کو وبال نہ سمجھتی ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ رعایا کی امیدوں کے لئے میدان کشادہ رکھنا۔ اس کی دلجوئی برابر کرتے رہنا۔ اس کے بہادری کے کارنامے سراہتے رہنا۔ اچھے کاموں کی تعریف سے بہادروں کا جوش بڑھتا ہے اور پیچھے رہ جانے والوں کی ہمتیں بلند ہوتی ہیں۔ ہر آدمی کے کارنامے کا اعتراف کرنا ایک کا کارنامہ دوسرے کی طرف منسوب نہ کرنا۔ انعام دینے میں کبھی کوتاہی نہ کرنا۔ خاندانی ہونے کی وجہ سے کسی کے معمولی کام کو بڑھا چڑھا نہ دینا اسی طرح ادنی خاندان ہونے کی وجہ سے کسی کے بڑے کارنامے کی بے قدری نہ کرنے لگنا۔

مشتبہ معاملات پیش آئیں اور تمہاری بصیرت وعلم کام نہ دے تو انہیں اللہ کی طرف اور اللہ کے رسول ؐ کی طرف لوٹانا کیونکہ خدا مسلمانوں کی ہدایت کے لئے فرما چکا ہے "اے وہ جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اولی الامر کی لیکن تم میں کسی بات پر اختلاف ہو جائے تو اس بات کو اللہ اور رسول ؐ کے پاس لوٹاؤ۔" اللہ کی طرف معاملہ لوٹانا یہ ہے کہ کتاب محکم اور بعض صریح کی طرف لوٹایا جائے اور رسول ؐ کی طرف لوٹانا یہ ہے کہ جامع سنت نبویؐ کو لیا جائے جس میں اختلاف نہ ہو۔

پھر ملک میں انصاف کرنے کے لئے ایسے لوگوں کا انتخاب کرنا جو تمہاری نظر میں

سب سے افضل ہوں۔ ہجوم معاملات سے تنگدل نہ ہوتے ہوں۔ اپنی غلطی پر اڑے رہنا ہی ٹھیک نہ سمجھتے ہوں اور حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد باطل سے چمٹے نہ رہتے ہوں۔ طمع کرنے والے نہ ہوں۔ اپنے فیصلوں پر غور کرنے کے عادی ہوں۔ فیصلے کے وقت شکوک و شبہات پر رُکنے والے ہوں۔ صرف دلائل کو اہمیت دیتے ہوں، مدعی اور مدعا علیہ سے بحث میں اکتا نہ جاتے ہوں واقعات کی تہ تک پہنچنے سے جی نہ چُراتے ہوں۔ اور حقیقت کھل جانے پر اپنے فیصلے میں بے باک و بے لاگ ہوں یہ ایسے لوگ ہوں جنہیں نہ تعریف بے خود کر دیتی ہو اور نہ چاپلوسی مائل کر سکتی ہو مگر ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔

تمہارا فرض ہے کہ اپنے قاضیوں (ججوں) کے فیصلوں کی جانچ کرتے رہو۔ کھلے دل سے انہیں معاوضہ دو۔ تاکہ ان کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں اور کسی کے سامنے انہیں ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ اپنے دربار میں انہیں ایسا درجہ دو کہ تمہارے کسی مصاحب کو اور درباری کو ان پر دباؤ ڈالنے یا انہیں نقصان پہنچانے کی ہمت نہ ہو سکے۔ قاضیوں کو ہر طرح کے خوف سے بالکل آزاد ہونا چاہیئے۔ اس بارے میں پوری توجہ سے کام لینا کیونکہ دین اشرار کے ہاتھ میں پڑ گیا تھا جو اپنی خواہشوں پر چلتے اور دین کے نام پر دُنیا کمایا کرتے تھے۔

عمال حکومت کے معاملات پر بھی تمہیں نظر رکھنا ہوگی۔ جسے مقرر کرنا۔ امتحان لیکر مقرر کرنا۔ رو رعایت سے یا صلاح و مشورہ کے بغیر کسی کو عہدہ نہ دینا کیونکہ ایسا کرنے سے ظلم و خیانت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اچھے گھرانوں[1] اور سابق میں اسلام کی خدمت گزاروں میں تجربہ کار اور باحیا لوگوں کو ہی منتخب کرنا کہ انکے اخلاق اچھے ہوتے ہیں۔ اپنی آبرو کا خیال رکھتے ہیں۔ طمع کی طرف کم جھکتے ہیں اور انجام پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔

عہدہ داروں کو اچھی تنخواہیں دینا۔ اس سے یہ لوگ اپنی حالت درست کر سکیں گے۔ اور حکومت کے اس مال سے بے نیاز رہیں گے جو ان کے ہاتھوں میں ہوگا۔ اگر

لہ یہاں اچھے گھرانوں سے مراد نیک کردار والے گھرانے ہیں مال دار گھرانے مراد نہیں۔

تم رعایا سے چھپانا چاہتے ہو۔

وہ تمام اسباب دُور کر دینا جو لوگوں میں بغض و کینہ پیدا کرتے ہیں۔ عداوت و غیبت کی ہر رسّی کاٹ دینا۔ ہوشیار! چغل خوروں کی بات ماننے میں جلدی نہ کرنا کیونکہ چغل خور دغاباز ہوتا ہے۔ اگرچہ خیر خواہ کا رُوپ دھار کر سامنے آتا ہے۔ اپنے مشورے میں بخیل کو شریک نہ کرنا۔ کیونکہ وہ تمہیں احسان کرنے سے روکے گا۔ اور فقر سے ڈرائے گا۔ بزدل کو بھی صلاح میں شریک نہ کرنا کیونکہ وہ مہمات میں تمہاری ہمت کمزور کر دے گا حریص کو بھی شریک نہ کرنا کیونکہ وہ ظلم کی راہ سے دولت سمیٹنے کی ترغیب دے گا۔ یاد رکھو! بخل، بُزدلی اور حرص اگرچہ الگ الگ خصلتیں ہیں مگر ان کی بُنیاد خدا سے بدگمانی پر ہے۔

بدترین وزیر وہ ہے جو شریروں کی طرفداری کرے۔ اور گناہوں میں ان کا ساتھی ہو۔ ایسے آدمی کو اپنا وزیر نہ بنانا کیونکہ اس قسم کے لوگ گنہگاروں کے مددگار اور ظالموں کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ان کی جگہ تمہیں ایسے آدمی مل جائیں گے جو عقل و تدبیر میں ان کے برابر ہوں گے۔ مگر ان کی طرح گناہوں سے لدے ہوئے نہ ہوں گے۔ نہ کسی ظالم کی اس کے ظلم میں امداد کی ہو گی۔ نہ کسی گنہگار کا اس کے گناہ میں ساتھ دیا ہو گا۔ ایسے لوگ تمہیں کم تکلیف دیں گے۔ تمہارے بہترین مددگار ثابت ہوں گے۔ تم سے پوری ہمدردی رکھیں گے۔ اور غیر سے اپنے سب رشتے کاٹ لیں گے۔ ایسے ہی لوگوں کو اپنی نجی صحبتوں اور عام درباروں میں اپنا مصاحب بنانا۔ پھر یہ خیال ہے کہ خاص الخاص لوگوں میں بھی تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ مقبول وہی لوگ ہوں جو زیادہ سے زیادہ کڑوی بات تم سے کہہ سکتے ہوں ان کاموں میں تمہارا ساتھ دینے سے انکار کر سکتے ہوں جو خدا اپنے بندوں کیلئے ناپسند فرما چکا ہے۔ اہل تقویٰ و صدق کو اپنا مصاحب بنانا انہیں ایسی تربیت دینا کہ تمہاری جھوٹی تعریف کبھی نہ کریں کیونکہ تعریف کی بھرمار سے آدمی میں غرور پیدا ہوتا ہے۔

اور تمہارے سامنے نیکوکار اور خطاکار برابر نہ ہوں۔ (کیونکہ) ایسا کرنے سے نیکوں کی ہمت پست ہو جائے گی۔ اور خطاکار اور بھی شوخ ہو جائیں گے۔ ہر آدمی کو وہ جگہ دینا جس کا وہ اپنے عمل کے لحاظ سے مستحق ہے اور تمہیں جاننا چاہیئے کہ رعایا میں

اپنے حاکم کے ساتھ حُسنِ ظن اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ حاکم رعایا پر رحم وکرم کی بارش کرتا رہے۔ اس کی تکلیفیں دُور کرے اور کوئی ایسا مطالبہ نہ کرے جو رعایا کے بس سے باہر ہو۔ یہ اُصول تمہارے لئے کافی ہے اس اُصول سے رعایا کا حُسنِ ظن تمہیں بہت سی مشکلوں سے بچا دے گا۔ خود تمہارے حُسنِ ظن کے سب سے زیادہ مستحق وہ ہوں گے جو تمہارے امتحان میں سب سے اچھے اُتریں۔ اسی طرح تمہارے سوء ظن کے بھی سب سے زیادہ مستحق وہی ہوں جو آزمائش میں سب سے بُرے نکلیں۔

کسی اچھے دستور کو نہ توڑنا جو اس اُمّت کے اگلے لوگ جاری کر گئے۔ اور جس سے لوگوں میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ رعایا کی بھلائی ہوتی ہے۔ توڑ دو گے تو اچھے دستوروں کا ثواب پہلے لوگوں کے لئے باقی رہے گا۔ اور عذاب تمہارے حصے میں آئے گا کہ بھلی راہ تم نے مٹا دی۔ اس بارے میں اہلِ علم و عرفان سے مشورہ[1] کرتے رہنا کہ تعمیر و اصلاح کے وسائل کیا ہیں اور ان میں کس طرح استحکام دوام بخشا جائے۔

اور دیکھو! رعایا میں کئی طبقے ہوتے ہیں۔ یہ طبقے ایک دوسرے سے وابستہ رہتے ہیں اور آپس میں کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ایک طبقہ وہ ہے جسے خدا کی فوج کہنا چاہیئے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو عوام و خاص کا تحریری کام کرتے ہیں پھر انصاف کرنے والے قاضی ہیں امن و انتظام کے عامل ہیں۔ ذمّی اور مسلم۔ اہلِ جزیہ و اہلِ خراج ہیں پھر سوداگر اور اہلِ حرفہ ہیں غربا و مسکین کا نچلا طبقہ بھی ہے خدا نے حق میں ہر طبقے کا حصّہ مقرر کر کے اپنی کتاب (قانون) میں یا اپنے آخری نبی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سُنّت میں اسے ضروری ٹھہرا دیا ہے اور اس کی پابندی اور بجا آوری ہمارے ذمّہ لازمی کر دی ہے۔

خدا کی فوج اللہ کے حکم سے رعایا کا قلعہ ہے۔ حاکم کی زینت ہے۔ دین کی قوت ہے۔ امن کی ضمانت ہے۔ رعایا کا قیام فوج ہی سے ہے۔ لیکن فوج کا قیام خراج سے ہے

---

[1] خیال رہے کہ یہ مشورہ تقرر کے لئے نہیں۔

جو خدا اس کے لئے نکالتا ہے۔ خراج ہی سے سپاہی جہاد میں تقویت پاتے اور اپنی حالت درست کرتے ہیں۔

پھر ان دونوں طبقوں، فوجیوں اور اہل خراج کی بقا کے لئے تیسرا طبقہ ضروری ہے یعنی قضاۃ، عمال، کتاب کا طبقہ کہ یہی لوگ ہر قسم کی مالی معاملت انجام دیتے ہیں اور ان چاروں طبقوں کی بقا کے لئے تاجر اور اہل حرفت ضروری ہیں کہ بازار لگاتے اور سب کی ضرورتیں مہیا کرتے ہیں

آخر میں ادنیٰ طبقہ آتا ہے اور اس طبقہ کی امداد و اعانت از بس ضروری ہے خدا کے یہاں سب کی گنجائش ہے اور حاکم پر سب کو حق قائم ہے۔ حاکم جتنی بھی بھلائی کر سکتا ہے کرتا ہے مگر اس بارے میں اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتا۔ جب تک توفیق الٰہی کی دعا کے ساتھ عزم مصمم بھی نہ رکھے کہ حق ہی کا ساتھ دیگا۔ حق ہی پر ثابت قدم رہے گا۔ چاہے حق آسان ہو یا مشکل۔

دیکھو! اپنی فوج کے معاملے میں ہوشیاری سے کام لینا۔ ان ہی لوگوں کو افسر بنانا جو تمہارے خیال میں اللہ کے رسول ؐ اور تمہارے امام ؑ کے سب سے زیادہ خیر خواہ ہوں۔ صاف دل ہوں۔ ہوش مند ہوں۔ جلد غصے میں نہ آجاتے ہوں۔ عذر معذرت قبول کر لیتے ہوں۔ کمزوروں پر ترس کھاتے ہوں۔ زبردستوں پر سخت ہوں۔ نہ سختی ان کو جوش میں لے آتی ہو اور نہ کمزوری ان کو بٹھا دیتی ہو۔ فوج کے لئے ان کو منتخب کرنا جن کا حسب نسب اور خاندان اچھا ہے۔ جن کا ماضی بے داغ ہے جو ہمت و شجاعت جود و سخا سے آراستہ ہیں شرافت و نیکی ایسے ہی لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ ان فوجیوں کے معاملات میں ایسی ہی فکر کرنا جیسی فکر والدین کو اولاد کی ہوتی ہے ان کی تقویت اور درستی حال کے لئے جو بھی بن پڑے کرتے رہنا اور جو کچھ کرنا اسے بست نہ سمجھنا۔ اپنے کم سے کم احسان کو بھی نہ بھولنا کیونکہ اس سے انکی خیر خواہی بڑھیگی اور حسن ظن میں اضافہ ہوگا۔ ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت سے بھی بے پرواہی اس بھروسے پر نہ کرنا کہ بڑی ضرورتوں کا خیال کر رہے ہو۔ کیونکہ تمہاری معمولی رعایت بھی ان کے لئے نعمت

ہوگی۔ اور بڑی ضرورتوں میں تو وہ سراسر تمہارے لطف و کرم کے ہمیشہ محتاج رہیں گے۔

وہی فوجی سردار تمہارے سب سے زیادہ مقرب ہوں جو فوجیوں کی سب سے زیادہ مدد کرتے ہوں۔ اپنے ہاتھ کی دولت سے سپاہیوں کو ان کی ضرورتوں اور بال بچوں کی فکروں سے آزاد کرتے ہیں تاکہ پوری فوج ایک دل ہو جائے اور اس کے سامنے بس ایک ہی خیال رہے۔ دشمن سے جنگ۔ فوج کے سرداروں پر تمہاری توجہ، فوج کے دلوں کو تمہاری طرف متوجہ کرے گی۔

حاکم کے آنکھ کی ٹھنڈک کس چیز میں ہونا چاہیئے؟ اس میں کہ خود انصاف قائم کرے اور رعایا اس سے محبت ظاہر کرتی رہے۔ رعایا کی محبت ظاہر نہیں ہوتی جب تک اس کے دل سلیم نہ ہوں اور رعایا کی خیر خواہی صحیح نہیں ہوتی جب تک اُسے حاکم سے سچی محبت نہ ہو۔ وہ حکومت کو بوجھ اور اس کے زوال میں دیر کو دبال نہ سمجھتی ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ رعایا کی اُمیدوں کے لئے میدان کشادہ رکھنا۔ اس کی دلجوئی برابر کرتے رہنا۔ اس کے بہادری کے کارنامے سراہتے رہنا۔ اچھے کاموں کی تعریف سے بہادروں کا جوش بڑھتا ہے اور پیچھے رہ جانے والوں کی ہمتیں بلند ہوتی ہیں۔ ہر آدمی کے کارنامے کا اعتراف کرنا۔ ایک کا کارنامہ دوسرے کی طرف منسوب نہ کرنا۔ انعام دینے میں کبھی کوتاہی نہ کرنا۔ خاندانی ہونے کی وجہ سے کسی کے معمولی کام کو بڑھا چڑھا نہ دینا اسی طرح ادنیٰ خاندان ہونے کی وجہ سے کسی کے بڑے کارنامے کی بے قدری نہ کرنے لگنا۔

مشتبہ معاملات پیش آئیں اور تمہاری بصیرت و علم کام نہ دے تو انہیں اللہ کی طرف اور اللہ کے رسولؐ کی طرف لوٹانا کیونکہ خدا مسلمانوں کی ہدایت کے لئے فرما چکا ہے "اے وہ جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اولی الامر کی لیکن تم میں کسی بات پر اختلاف ہو جائے تو اس بات کو اللہ اور رسولؐ کے پاس لوٹاؤ" اللہ کی طرف معاملہ لوٹانا یہ ہے کہ کتاب محکم اور نص صریح کی طرف لوٹایا جائے اور رسولؐ کی طرف لوٹانا یہ ہے کہ جامع سنّت نبویؐ کو لیا جائے جس میں اختلاف نہ ہو۔

پھر ملک میں انصاف کرنے کے لئے ایسے لوگوں کا انتخاب کرنا جو تمہاری نظر میں

سب سے افضل ہوں۔ ہجوم معاملات سے تنگدل نہ ہوتے ہوں۔ اپنی غلطی پر اڑے رہنا ہی ٹھیک نہ سمجھتے ہوں اور حق کے ظاہر ہوجانے کے بعد باطل سے چمٹے نہ رہتے ہوں۔ طمع کرنے والے نہ ہوں۔ اپنے فیصلوں پر غور کرنے کے عادی ہوں۔ فیصلے کے وقت شکوک وشبہات پر رُکنے والے ہوں۔ صرف دلائل کو اہمیت دیتے ہوں۔ مدعی اور مدعا علیہ سے بحث میں اُکتا نہ جاتے ہوں واقعات کی تہ تک پہنچنے سے جی نہ چُراتے ہوں۔ اور حقیقت کھل جانے پر اپنے فیصلے میں بے باک وبے لاگ ہوں یہ ایسے لوگ ہوں جنہیں نہ تعریف بے خود کر دیتی ہو اور نہ چاپلوسی مائل کر سکتی ہو مگر ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔

تمہارا فرض ہے کہ اپنے قاضیوں (ججوں) کے فیصلوں کی جانچ کرتے رہو کھُلے دل سے انہیں معاوضہ دو۔ تاکہ ان کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں اور کسی کے سامنے انہیں ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ اپنے دربار میں انہیں ایسا درجہ دو کہ تمہارے کسی مصاحب کو اور درباری کو ان پر دباؤ ڈالنے یا انہیں نقصان پہنچانے کی ہمت نہ ہو سکے۔ قاضیوں کو ہر طرح کے خوف سے بالکل آزاد ہونا چاہیئے۔ اس بارے میں پوری توجہ سے کام لینا کیونکہ دین اشرار کے ہاتھ میں پڑ گیا تھا جو اپنی خواہشوں پر چلتے اور دین کے نام پر دنیا کمایا کرتے تھے۔

عمال حکومت کے معاملات پر بھی تمہیں نظر رکھنا ہوگی جسے مقرر کرنا۔ امتحان لیکر مقرر کرنا۔ رورعایت سے یا صلاح ومشورہ کے بغیر کسی کو عہدہ نہ دینا کیونکہ ایسا کرنے سے ظلم وخیانت کے دروازے کھُل جاتے ہیں۔ اچھے گھرانوں[1] اور سابق میں اسلام کی خدمت گزاروں میں تجربہ کار اور باحیا لوگوں کو ہی منتخب کرنا کہ انکے اخلاق اچھے ہوتے ہیں۔ اپنی آبرو کا خیال رکھتے ہیں۔ طمع کی طرف کم جھکتے ہیں اور انجام پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔

عہدہ داروں کو اچھی تنخواہیں دینا۔ اس سے یہ لوگ اپنی حالت درست کر سکیں گے۔ اور حکومت کے اس مال سے بے نیاز رہیں گے جو ان کے ہاتھوں میں ہوگا۔ اگر

---

[1] یہاں اچھے گھرانوں سے مراد نیک کردار والے گھرانے ہیں مال دار گھرانے مراد نہیں۔

اس پر بھی حکم عدولی کریں یا امانت میں خلل ڈالیں تو تمہارے پاس ان پر حجت ہو گی۔ مگر ضروری ہے کہ ان کے کاموں کی جانچ پڑتال کرتے رہنا۔ نیک لوگوں کو مخبر بنا کر ان پر چھوڑ دینا یہ اس لئے کہ جب انہیں معلوم ہو گا کہ خفیہ نگرانی بھی ہو رہی ہے تو امانت داری اور رعایا سے مہربانی میں اور چست ہو جائیں گے۔ پھر اگر ان میں سے کوئی شخص خیانت کی طرف ہاتھ بڑھائے اور تمہارے جاسوسوں سے تصدیق ہو جائے تو بس یہ شہادت کافی ہے تم بھی سزا کا ہاتھ بڑھانا جسمانی اذیت کے ساتھ خیانت کی رقم بھی اگلوا لینا۔ خائن کو ذلت کی جگہ کھڑا کرنا اور پوری طرح اُسے رُسوا کر ڈالنا۔

دیکھو! خراج (TAX) کے امر کی نگرانی میں کوتاہی نہ ہو۔ خراج کے ٹھیک رہنے ہی میں سب کی بھلائی و خوشحالی ہے۔ سب کی روزی کا مدار خراج پر ہے اور خراج کے تحصیلداروں پر ہے لیکن خراج سے زیادہ ملک کی آبادی پر توجہ رہنا چاہیئے۔ کیونکہ خراج بھی تو خوشحالی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ جو حاکم تعمیر کے بغیر خراج چاہتا ہے اس کی حکومت یقیناً چند روزہ ثابت ہو گی۔ اگر کاشت کار خراج کی زیادتی کی، کسی آسمانی آفت کی، آبپاشی میں خلل پڑ جانے کی، رطوبت میں قلت کی، سیلاب یا خشکی کے سبب تقاوی کے خراب ہو جانے کی شکایت کریں تو ان کی سُننا اور خراج کم کر دینا۔ کیونکہ کاشت کار ہی تمہارا اصل خزانہ ہیں، ان سے جو رعایت بھی کرو گے اس سے مُلک کی فلاح ہو گی حکومت کی رونق بڑھے گی۔ نیز تم رعایا سے مال کے خراج کے ساتھ تعریف کا خراج بھی وصول کرو گے۔ اس وقت ان میں عدل پھیلانے سے تمہیں اور زیادہ خوشی ہو گی مشکلات میں ان کی قوت پر تمہارا بھروسہ بڑھ جائے گا۔ اور جو راحت تم نے انہیں پہنچائی ہے اور جس انصاف کا انہیں خوگر بنا دیا ہے اس پر ان کی شکر گزاری تمہارے لئے خزانہ بن جائے گی۔ ممکن ہے مشکلات نازل ہوں اور اس وقت ان لوگوں پر بھروسہ کرنے میں مجبوری پیش آئے ایسی حالت میں وہ بخوشی تمہارا ہر مطالبہ قبول کر لیں گے۔ ملک کی آبادی، سرسبزی ہر بوجھ اُٹھا سکتی ہے۔ لہٰذا ان کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ ملک کی بربادی تو باشندوں کی غربت ہی سے ہوتی ہے اور باشندوں کی غربت کا سبب یہ ہوتا ہے کہ

حاکم دولت سمیٹنے پر کمر باندھ لیتے ہیں. کیونکہ انہیں اپنے تبادلے اور زوال کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور وہ عبرتوں سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے۔

اپنے منشیوں کے معاملے کو بھی اہمیت دینا۔ یہ منصب بہترین آدمیوں ہی کے سپرد کرنا۔ راز کی خط و کتابت پر انہی لوگوں کو مقرر کرنا جو اعلیٰ اخلاق کے مالک ہوں۔ جنہیں نہ اعزاز گستاخ بنا دے کہ بھری مجلس میں تم سے بدتمیزی کرنے لگیں یا معاہدوں میں تمہاری مصلحتوں اور فائدوں سے چوک جایا کریں۔ یا اگر کسی معاہدے سے تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے تو اس سے خلاصی کی صورت پیدا نہ کرسکیں۔ یہ لوگ ایسے ہونے چاہئیں کہ خود اپنی قدر جانتے ہوں کیونکہ جو شخص اپنی قدر نہیں جانتا وہ دوسروں کی قدر کیا جانے گا؟ ان لوگوں کا چناؤ محض اپنی فراست، میلانِ طبیعت یا حسنِ ظن کی بنا پر نہ کرنا کیونکہ لوگوں کا دستور ہے کہ تصنع اور ظاہر داری سے اپنے آپ کو حاکموں کی فراست کیمطابق بنا لیتے ہیں۔ مگر خیر خواہی اور امانت داری سے کورے ہوتے ہیں امتحان میں یہ بھی دیکھنا کہ اگلے حاکموں کے تحت انہوں نے کیا خدمات انجام دیں۔ عوام کو ان سے کتنا فائدہ پہنچا ہے اور امانت داری میں ان کا شہرہ کیسا ہے ان باتوں کا خیال رکھو گے تو بے شک یہ سمجھا جائے گا کہ تم اللہ کے اور اپنی رعایا کے خیر خواہ ہو۔ ہر محکمے کا ایک صدر مقرر کرنا جو محکمے کے تمام کاموں کو اپنے ہاتھ میں رکھے اور مشکلات سے بدحواس نہ ہو۔ یاد رکھو! تمہارے منشیوں میں جو عیب ہوگا اور تم اس سے چشم پوشی کروگے تو وہ عیب خود تمہارا سمجھا جائے گا۔

تاجروں اور اہلِ حرفت کا پورا خیال رکھنا۔ ان کا بھی جو مقیم ہیں اور ان کا بھی جو پھیری کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ ملک کی دولت بڑھاتے ہیں۔ دور دور سے سامان لاتے ہیں خشکیوں، تریوں، میدانوں، ریگستانوں، سمندروں، دریاؤں اور پہاڑوں کو پار کر کے ضروریاتِ زندگی مہیا کرتے ہیں۔ ایسی ایسی جگھوں سے مال ڈھولاتے ہیں جہاں اور لوگ نہیں پہنچ سکتے۔ بلکہ وہاں جانے کی ہمت بھی نہیں کرتے۔ تاجر اور اہلِ حرفت امن پسند لوگ ہوتے ہیں۔ ان سے شورش و بغاوت کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

اس پر بھی ضروری ہے کہ پایۂ تخت میں بھی اور اطرافِ ملک میں بھی ان پر نگاہ رکھی جائے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر تنگدل اور بڑے بخیل ہوتے ہیں اجارہ داری سے کام لیتے ہیں۔ اور لین دین میں کمیں ڈال کر لوٹ لینا چاہتے ہیں۔ اجارہ داری کی قطعی ممانعت کر دینا کیونکہ رسولؐ اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے لیکن ہاں خرید و فروخت خوش دلی سے ہو۔ وزن باٹ ٹھیک رہیں۔ نرخ مقرر ہوں۔ نہ بیچنے والا گھاٹے میں رہے نہ مول لینے والا مونڈا جائے اور ممانعت پر بھی اگر کوئی اجارہ داری کا مرتکب ہو تو اعتدال کے ساتھ اسے عبرت انگیز سزا دی جائے۔

پھر اللہ اللہ۔ ادنٰی طبقے کے معاملات ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں۔ فقیر، مسکین، محتاج، قلاش، اپاہج۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو ہاتھ پھیلاتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو ہاتھ نہیں پھیلاتے مگر خود صورتِ حال ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں جو فرض خدا نے تمہیں سونپا ہے اس پر نگاہ رکھنا۔ اسے تلف نہ ہونے دینا۔ اپنے بیت المال میں ایک حصّہ ان کے لئے خاص کر دینا اور اسلام کی جہاں جو صافی جائیداد موجود ہو اس کی آمدنی میں ان کا بھی حصّہ رکھنا۔ ان میں سے کون دور ہے کون نزدیک ہے یہ نہ دیکھنا۔ دور نزدیک سب کا حق برابر ہے اور ہر ایک کے حق کی ذمّہ داری تمہارے سر ڈال دی گئی ہے۔

دیکھو! دولت کا نشہ تمہیں ان بے چاروں سے غافل نہ کر دے۔ اگر تم نے اس بارے میں اہم واکثر کو پورا کر دیا تو بھی اس وجہ سے تمہاری معمولی غفلت بھی معاف نہ کی جائیگی۔ لہٰذا ان کے ساتھ تکبر سے پیش نہ آنا۔ اپنی توجہ سے انہیں محروم نہ کرنا۔ ان میں ایسے بھی ہونگے جو تمہارے پاس پہنچ نہیں سکتے۔ انہیں نگاہیں ٹھکراتی ہیں اور لوگ ان سے گھن کھاتے ہیں ان کی خبر گیری بھی تمہارا کام ہے ان کے لئے بھروسے کے آدمیوں کی خدمات خاص کر دینا۔ مگر یہ آدمی ایسے ہوں جو خوفِ خدا رکھتے ہوں۔ اور دل کے خاکسار ہوں۔ یہ لوگ ان بے کسوں کے معاملات تمہارے سامنے لایا کریں۔ اور تم وہ کرنا کہ قیامت کے سامنے تمہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ یاد رکھو! رعایا میں ان غربا سے زیادہ انصاف کا

مستحق کوئی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کا جو حق ہے پورا پورا ادا کرتے رہنا۔

اور یتیموں کے پالنے والوں کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ اور ان کا بھی جو بہت ضعیف ہو چکے ہیں جن کا کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔ جو بھیک تک مانگنے کے قابل نہیں رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں حاکموں پر بے شک گراں ہوتی ہیں لیکن یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ پورے کا پورا حق گراں ہی ہے۔ ہاں خدا حق کو کبھی ان کے لئے آسان کر دیتا ہے جو عاقبت کی طلب میں رہتے ہیں اور اس کے لئے مشکلات و مکروہات میں اپنے دل کو مضبوط بنا لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا یقین اس وعدۂ الٰہی پر پختہ ہے جو پروردگار اپنے نیک بندوں سے کر چکا ہے۔

اور تم اپنے وقت کا ایک حصّہ فریادیوں کے لئے خاص کر دینا۔ سب کام چھوڑ کر ان سے ملا کرنا۔ ایسے موقع پر تمہاری مجلس عام ہے کہ جس کا جی چاہے بے دھڑک چلا آئے۔ اس مجلس میں تم خدا کے لئے خاکسار بن جاؤ۔ فوجیوں، افسروں، چوبداروں (پولیس) سے مجلس کو بالکل خالی رکھنا۔ تاکہ آنے والے دل کھول کر اپنی بات کہہ سکیں۔ کیونکہ میں نے رسولؐ خدا کو بار بار کہتے سُنا ہے "اس اُمّت کی بھلائی نہیں ہوتی جس میں کمزوروں کو طاقتور سے پورا حق دلایا نہیں جاتا"۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس مجلس میں عوام ہی جمع ہوں گے۔ اب اگر بدتمیزی سے بات کریں یا اپنا مطلب صاف بیان نہ کر سکیں تو خفا نہ ہونا۔ برداشت کر لینا خبردار! جزو توبیخ نہ کرنا۔ تکبّر سے پیش نہ آنا۔ میری وصیّت پر عمل کرو گے تو خُدا تم پر اپنی رحمت کی چادریں پھیلا دے گا۔ اور اپنی فرمانبرداری کا ثواب تمہارے لئے اٹل کر دے گا۔ جس کو کچھ دینا اس طرح کہ وہ خوش ہو جائے اور نہ دے سکنا تو اپنا عذر صفائی سے بیان کر دینا۔

پھر ایسے معاملات بھی ہیں جنہیں خود اپنے ہاتھ ہی میں تمہیں رکھنا ہوگا۔ ایک معاملہ تو یہی ہے کہ عمّال حکومت کے ان مراسلوں کا جواب خود لکھا کرنا جو تمہارے منشی نہیں لکھ سکتے۔ ایک معاملہ یہ ہے کہ جس دن دولت آئے اُسی دن مستحقوں کو بانٹ دینا اس سے تمہارے درباریوں کو کوفت تو ضرور ہوگی کیونکہ ان کی مصلحتیں تقسیم میں تاخیر و تعویق چاہینگی۔

روز کا کام روز ختم کر دینا کیونکہ ہر دن کے لئے اسی کا کام بہت ہوتا ہے۔

اپنے وقت کا سب سے افضل حصّہ اپنے پروردگار کے لئے خاص کر دینا۔ اگرچہ سب وقت اللہ ہی کے ہیں بشرطیکہ نیک نیت ہو اور رعایا کو اس نیک نیتی سے سلامتی ملتی ہے۔ خدا کے لئے دین کو خالص کرنے میں سب سے زیادہ یہ خیال رہے کہ فرائض بغیر کسی کمی بیشی کے کما حقہ بجا لائے جائیں۔ یہ فرائض صرف خدا کے لئے خاص ہیں۔ اور ان میں کسی کا ساجھا نہیں۔ دن اور رات میں اپنا ایک وقت ضرور خدا کے لئے خاص کر دینا۔ اور جو عبادت بھی تقربِ الٰہی کے لئے انجام دینا اس طرح انجام دینا کہ ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہو۔ کسی طرح کا کوئی نقص اس میں نہ رہ جائے چاہے اس سے تمہارے جسم کو کتنی ہی تکلیف ہو۔

اور دیکھو جب نماز کی امامت کرنا تو ایسی نہیں کہ لوگ نماز ہی سے بیزار ہو جائیں اور ایسی بھی نہیں کہ نماز کا کوئی رُکن ضائع ہو جائے۔ یاد رکھو! نمازیوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ تندرست بھی، بیمار بھی اور ضرورت مند بھی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب خود مجھے یمن بھیجنے لگے تو میں نے عرض کیا تھا " یا رسول اللہ نماز کس طرح پڑھاؤں گا؟" جواب ملا "تیری نماز ویسی ہو جیسی سب سے کم طاقت نمازی کی ہو سکتی ہے اور تو مومنوں کے لئے رحیم ثابت ہونا"۔ یہ بھی ضروری ہے کہ رعایا سے تمہاری رُوپوشی کبھی لمبی نہ ہو۔ رعایا سے چھپنا حاکم کی تنگ نظری کا ثبوت ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حاکم رعایا کے حالات سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ جب حاکم رعایا سے ملنا جُلنا چھوڑ دیتا ہے تو رعایا بھی ان لوگوں سے ناواقف ہو جاتی ہے جو اس سے پردے میں ہو گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے لوگ ان کی نگاہ میں چھوٹے ہو جاتے ہیں اور چھوٹے لوگ بڑے بن جاتے ہیں۔ اچھائی بُرائی بن جاتی ہے۔ اور بُرائی اچھائی۔ حق اور باطل میں تمیز اُٹھ جاتی ہے اور یہ تو کھُلی بات ہے کہ حاکم بھی آدمی ہوتا ہے اور ان سب باتوں کو جان نہیں سکتا جو اس سے چھپا ڈالی جاتی ہے۔ حق کے سر پر سینگ نہیں ہوتے کہ دیکھتے ہی سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہہ دیا جائے۔ سوچو تو!

تم دو میں سے ایک قسم کے آدمی ہوگے یا تو حق کے مطابق خرچ کرنے میں سخی ہوگے ایسے ہو تو تمہیں چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟ حق کی طرف سے جو کچھ تمہارے ذمہ واجب ہو چکا ہے اسے ادا کروگے یا اور کوئی نیک کام کر گزروگے یا پھر تم بخل و منع کی آزمائش میں ڈالے گئے ہو تو اس صورت میں چھپنا غیر ضروری ہے کیونکہ اس قماش کے آدمی سے لوگ بڑی جلدی مایوس ہو کر خود ہی کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تم سے لوگوں کی زیادہ تر ضرورتیں ایسی ہونگی جن سے تم پر کوئی بوجھ نہ پڑیگا۔ وہ کسی ظلم کی شکایت لے کر آئیں گے یا کسی معاملہ میں انصاف کے طالب ہوں گے۔

تمہیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حاکم کے درباریوں اور مصاحبوں میں خود غرضی، تعلّی، زیادتی، بدمعاملگی ہوا کرتی ہے۔ ان کے شر سے مخلوق کو بچانے کی صورت یہی ہے کہ اُن کی بُرائیوں کے سرچشمے ہی بند کر دیئے جائیں۔

خبردار! کسی مصاحب یا رشتہ دار کو جاگیر نہ دینا۔ ایسا کروگے تو یہ لوگ رعایا پر ظلم کریں گے۔ خود فائدہ اُٹھائیں گے اور دُنیا و آخرت میں مخلوقِ خدا کی بدگوئی تمہارے سر پڑیگی۔

خواہ حق کسی کے خلاف پڑے اسے ضرور نافذ کرنا چاہیئے۔ چاہے تمہارا عزیز قریب ہو یا غیر۔ اس بارے میں تمہیں مضبوط اور ثوابِ خداوندی کا آرزومند رہنا ہوگا۔ حق کا وار خود تمہارے رشتہ داروں اور عزیز ترین مصاحبوں ہی پر کیوں نہ پڑے۔ تمہیں خوش دلی سے یہ گوارہ کرنا ہوگا۔ بے شک تم بھی آدمی ہو اور تمہیں اس سے کوفت ہو سکتی ہے لیکن تمہاری نگاہ ہمیشہ نتیجے پر رہنا چاہیئے۔ یقین کرو نتیجہ تمہارے حق میں اچھا ہی ہوگا۔ اگر رعایا کو تم پر کبھی ظلم کا شبہ ہو جائے تو بے دھڑک رعایا کے سامنے آجانا اور شبہ دُور کر دینا۔ اس سے تمہارے نفس کی ریاضت ہوگی۔ دل میں رعایا کے لئے نرمی پیدا ہوگی اور تمہارے عذر کا بھی اظہار ہو جائے گا۔ ساتھ ہی تمہاری یہ غرض بھی پوری ہو جائے گی کہ رعایا حق پر استوار ہے۔

اور دیکھو! جب دشمن ایسی صلح کی طرف بلائے جس میں خدا کی رضامندی ہو تو انکار نہ کرنا۔ کیونکہ صلح میں تمہاری فوج کے لئے آرام ہے۔ اور خود تمہارے لئے بھی فکروں

سے چھٹکارا اور امن کا سامان ہے۔ لیکن صلح کے بعد دشمن سے خوب چوکس، خوب ہوشیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ممکن ہے صلح کی راہ سے اس نے تقرب اسلئے حاصل کیا ہو کہ بے خبری میں تم پر ٹوٹ پڑے لہٰذا بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں حُسنِ ظن سے کام نہیں چل سکتا۔

اور جب دشمن سے معاہدہ کرنا یا اپنی زبان اسے دے دینا تو عہد کی پوری پابندی کرنا۔ زبان کا پورا پاس کرنا۔ عہد کو بچانے کے لئے جان تک کی بازی لگا دینا کیونکہ سب باتوں میں لوگوں کا اختلاف رہا ہے مگر اس بات پر سب متفق ہیں کہ آدمی کو اپنا عہد پورا کرنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ مشرکوں نے بھی عہد کی پابندی کو ضروری سمجھا۔ حالانکہ مسلمانوں سے بہت نیچے تھے۔ یا اس لئے کہ تجربوں نے انہیں بتا دیا تھا کہ عہد شکنی کا نتیجہ تباہ کن ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے عہد، وعدے، زبان کے خلاف کبھی نہ جانا۔ دشمن سے دغابازی نہ کرنا۔ کیونکہ یہ خدا سے سرکشی ہے۔ اور خدا سے سرکشی، بے وقوف سرکش ہی کیا کرتے ہیں۔ اور عہد کیا ہے؟ خدا کی طرف سے امن و امان کا اعلان ہے۔ جو اس نے اپنی رحمت سے بندوں میں عام کر دیا ہے۔ عہد خدا کا حرم ہے جس میں سب کو پناہ ملتی ہے اور جس کی طرف سبھی دوڑتے ہیں۔ خبردار! عہد و پیمان میں کوئی دھوکا، کوئی کھوٹ نہ رکھنا اور معاہدے کی عبارت ایسی نہ ہونے دینا جو گول مول، مبہم ہو، کئی کئی مطلب اس سے نکلتے ہوں۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو عہد دے چکنے کے بعد ایسی عبارت سے فائدہ نہ اٹھانا اور یہ بھی یاد رہے کہ معاہدہ ہو چکنے کے بعد اگر اس کی وجہ سے پریشانی لاحق ہو تو ناحق اُسے منسوخ نہ کر دینا۔ پریشانی جھیل لینا بدعہدی سے کہیں بہتر ہے۔ بدعہدی پر خدا تم سے جواب طلب کرے گا اور دُنیا و آخرت میں اس کے مواخذے سے کہیں مفر نہ ہوگا۔

خبردار! ناحق خون نہ بہانا۔ کیونکہ خوں ریزی سے بڑھ کر بدانجام، نعمت کا ڈھانے والا، مدت کو ختم کرنے والا کوئی کام نہیں۔ قیامت کے دن جب خدا کا دربارِ عدالت لگے گا تو سب سے پہلے خونِ ناحق ہی کے مقدمے پیش ہوں گے۔ اور خدا

فیصلہ کرے گا۔ یاد رکھو! خون ریزی سے حکومت طاقتور نہیں ہوتی بلکہ کمزور ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ تو کھلی بات ہے کہ قتل عمد میں تم نہ تو خدا کے سامنے کوئی عذر پیش کر سکتے ہو اور نہ میرے سامنے۔ لیکن اگر سزا دینے میں تمہارے کوڑے، تلوار یا ہاتھ سے نادانستہ اسراف ہو جائے تو حکومت کے غرّے میں مقتول کا خون بہا اس کے وارثوں کے حوالے کرنے سے باز نہ رہنا۔

خبردار! خود پسندی کے شکار نہ ہو جانا نفس کی جو بات پسند آئے اس پر بھروسہ نہ کرنا۔ خوشامد پسندی سے بچنا۔ کیونکہ شیطان کے لئے یہ زرین موقع ہوتا ہے کہ نیکوکاروں کی نیکیوں پر پانی پھیر دے۔

خبردار! رعایا پر کبھی احسان نہ جتانا۔ جو کچھ اس کے لئے کرنا۔ اُسے بڑھا چڑھا کر نہ دکھانا۔ اور وعدہ خلافی بھی کبھی نہ کرنا۔ احسان جتانے سے احسان مٹ جاتا ہے۔ بھلائی کو بڑھا کر دکھانے سے حق کی روشنی چلی جاتی ہے۔ اور وعدہ خلافی سے خدا بھی ناخوش ہوتا ہے اور حق کے بندے بھی۔ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے "خدا کو نہایت ناپسند ہے کہ ایسی بات کہو جو کرتے نہیں"۔ جلد بازی سے کام نہ لینا۔ ہر معاملے کو اس کے وقت پر ہاتھ میں لینا اور انجام کو پہنچا دینا۔ نہ وقت سے پہلے اس کے لئے جلدی کرنا نہ وقت آجانے پر تساہل برتنا۔ اگر معاملہ مشتبہ ہو تو اس پر اصرار نہ کرنا۔ روشن ہو تو اس میں کمزوری نہ دکھانا۔ پس ہر امر کو اسی کی جگہ پر رکھنا اور ہر عمل کو اس کے موقع پر۔ کسی چیز کو اپنے لئے خاص نہ کر لینا جس میں سب کا حق برابر ہو۔ اور نہ ایسی باتوں میں انجان بن جانا جو سب کی آنکھوں کے سامنے ہوں۔ خود غرضی سے کچھ حاصل کرو گے تو تمہارے ہاتھ سے چھن جائیگا اور دوسروں کو دے دیا جائے گا۔ جلد ہی تمہاری آنکھوں پر سے پردے اُٹھ جائینگے۔ اور مظلوم سے جو کچھ چھینے چکے ہو اس کی دادرسی ہو گی۔

دیکھو! اپنے غصّے کو، طیش کو، ہاتھ کو، زبان کو قابو میں رکھنا۔ سزا دینے کو ملتوی کر دینا۔ یہاں تک کہ غصّہ ٹھنڈا ہو جائے۔ اس وقت تمہیں اختیار ہو گا کہ جو مُنا سب سمجھو کرو۔ مگر اپنے آپ پر قابو نہ پا سکو گے جب تک اللہ کی طرف واپسی کا معاملہ

تمہارے خیالات پر غالب نہ آجائے۔ گزشتہ عادل حکومتوں، نیک دستوروں، ہمارے نبیؐ کے واقعات اور کتاب اللہ کے فرائض ہمیشہ یاد رکھنا تاکہ اپنی حکومت کے معاملات میں ہمارے عمل کی پیروی کر سکو۔

میں اللہ بزرگ و برتر سے اس کی رحمت کی وسعت اور قدرت عظیم کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ وہ مجھے اور تمہیں اس راہ کی ہر رغبت عطا فرمائے جس میں اسکی خوشنودی اور مخلوق کی بھلائی ہے۔ ساتھ ہی بندوں میں نیک نامی اور ملک میں خوبصورت اثر ہے اور یہ کہ اس کی نعمت ہم پر پوری ہو۔ عزت میں اضافہ ہو۔ اور یہ کہ میرا اور تمہارا خاتمہ سعادت و شہادت پر ہو۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ الطیبین الطاہرین وسلم تسلیماً کثیرا۔ والسلام"

اس دستاویز کے بعد یقیناً حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں جب نہ کالج تھے نہ یونیورسٹیاں نہ علم سیاسیات کی تدوین ہوئی تھی، نہ ہی عرب قوم کو طرز جہانبانی کا تجربہ تھا ان سب حقیقتوں کے باوجود باب مدینۃ العلم سرکار امیرالمومنین نے انتہائی مختصر مگر بلاغت سے پوری سیاسیات بیان فرما دیں۔ اور حکومت الٰہیہ کی خارجہ و داخلہ سیاسی پالیسی کے تمام اصول واضح فرما دیئے کہ کوئی گوشہ ایسا ممکن نظر نہیں آتا جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ اگر دنیا میں کوئی اس سے بہتر کسی کی بیان کردہ سیاست ہے تو اسے ظاہر کر دیجئے۔ بخدا یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

قائد ثقلین دوم، امام المتقین، خلیفۃ المسلمین، امیرالمومنین علی علیہ السلام کے اس بلیغ کلام کے بعد کیا کسی بھی شخص کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ سیاسیات کے موضوع پر کچھ مزید کہہ سکے۔ کیونکہ وہ جو بھی کہے گا اسی روشنی کا فیض ہوگا۔ لیکن ناصبیت کی ہٹ دھرمی کا کیا علاج؟ پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ علیؑ سیاست نہیں جانتے تھے۔ اُن لوگوں کو ہمارا جواب یہ ہے کہ وہ سیاست جو اصل میں مکاری ہے علیؑ نے اسے نہیں اپنایا۔ اسی لئے باغی حاکم شام کے بارے میں فرمایا تھا۔

"خدا کی قسم۔ معاویہ مجھ سے زیرک تر نہیں۔ لیکن وہ بے وفا اور خیانت کار و عاصی

اور نافرمان ہے۔ اور مکر و بے وفائی اگر مذموم نہ ہوتی تو میں زیرک ترین انسان ہوتا۔ لیکن جان لو ہر مکر و بے وفائی گناہ ہے۔ ہر گناہ نافرمانی ہے اور قیامت کے دن ہر عہد و پیمان شکن کے واسطے پرچم و نشان ہے جس سے وہ پہچانا جائے گا اور خدا کی قسم! میں کسی کے مکر سے غافل نہیں ہوں۔ اور نہ سختی و گرفتاری میں عاجز و ناتواں بن جاتا ہوں"۔

(نہج البلاغہ صفحہ ۵۹۶ ارشاد ۱۹۱ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

سیاستِ علویہ

پس مکاری کی سیاست سے امام المتقین علی علیہ السلام کا کوئی واسطہ نہیں لیکن سیاستِ حقیقیہ اور نظامِ حکومتِ الٰہیہ کا جو دستور اللہ و رسولؐ کے دین کے عین مطابق حضرت علیؑ نے بیان کیا ہے اس سے بہتر کوئی اور دستور ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اس کی روشنی میں آپؑ کا دورِ حکومت دیکھئے اور پھر کوئی رائے قائم کیجئے۔ اگر علیؑ نے اس دستور کے نفاذ میں کسی موقع پر بھی عدم توجہی کی ہو تو بے شک آپ یہ مان لیجئے کہ علی سیاست سے ناواقف تھے لیکن اگر ان کا دورِ حکومت دستورِ خداوندی کے عین مطابق نظر آئے تو حضرت علیؑ کے متعلق اتہام طرازی سے اجتناب کیجئے کیونکہ راستی و درستی سے بہتر کوئی سیاست نہیں ہے۔

یوں تو حضرت علیؑ کی تحریر کردہ وصیت کا ایک ایک لفظ اسلامی دستور کی ایک ایک دفعہ ہے اور اس کے تحت کئی ضمنی دفعات مرتب ہوتی ہیں لیکن ہم چیدہ چیدہ امور کی وضاحت حضرت امیر المومنینؑ کے عملی سیاسی کردار کی مشعلِ راہ مثالوں کی روشنی میں آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ چونکہ ہمارا مقصد پوری سیرتِ علیؑ تحریر کرنا نہیں ہے اس لئے اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے محض اپنے بیان کی تقویت کی خاطر یہ امثال تحریر کر رہے ہیں۔

وفاتِ رسولؐ کے بعد

حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰؑ پر مصائب کا بڑا دور اس وقت شروع ہوا جب سید الانبیاء، حبیبِ کبریا، تاجدارِ ختمِ نبوت، شہنشاہِ مدینہ، کالی کملی والے آقا، جانِ ایمان، روحِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات ہوئی۔ پیغمبرِ خدا

نے وفات سے ایک روز پہلے حضرت علیؑ کو وصیت فرمائی کہ "اے علیؑ! اب میرا وقت وفات قریب ہے۔ میری وفات کے بعد مجھے خود غسل دینا۔ مجھے کفن پہنانا، لحد میں خود اتارنا اور میرے جو لوگوں سے وعدے ہیں اُن کو تم پورا کرنا۔ میرے قرضے تم ادا کر دینا۔" پھر حضور سرورِ کونینؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اپنی انگشتری اُتار کر حضرت علیؑ کو پہنا دی اور اپنے مخصوص تبرکات (تلوار، ڈھال، زرہ اور دیگر متبرک اشیاء) حضرت علیؑ کو عطا فرما دیئے اور مدارج النبوۃ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے تحریر کیا ہے کہ رسولؐ خدا نے حضرت علیؑ کو یہ بھی وصیت فرمائی تھی کہ "اے علیؑ میرے بعد تجھے مکروہات پہنچیں گے (یعنی ناپسندیدہ باتوں کا سامنا ہوگا) تو دل تنگ نہ ہونا صبر کرنا اور جب تو دیکھے کہ لوگوں نے دُنیا اختیار کر لی ہے تو تُو آخرت ہی کو اختیار کرنا۔"

پس جب علیؑ کے آقا، زہراؑ کے بابا، حسنینؑ کے محبوب نانا محمد مصطفےٰؐ کی وفات ہوئی تو حضورؐ کا سرِ اقدس مولا علیؑ ہی کی گود میں تھا۔ علیؑ کو صدمۂ عظیم ہوا۔ دُنیا ہی بدل گئی۔ آنکھوں سے اشک ہائے غم جاری تھے۔ حسنینؑ رو رو کر ہائے نانا، ہائے نانا کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ زہراؑ پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ شہر مدینہ کے دروددیوار رو رہے تھے۔ خاندانِ رسولؐ میں کہرام مچا ہوا تھا۔

اُسی عالمِ درد و غم میں علیؑ نے دیکھا کہ رسولؐ خدا کی آنکھیں بند ہوتے ہی، دُنیا کا رنگ ہی اور ہو گیا۔ رسولِ خدا کا جنازہ پڑا تھا۔ ابھی غسل و کفن و دفن کی رسومات بھی نہ ہوئی تھیں کہ سقیفۂ بنی ساعدہ کو حصولِ اقتدار کے جھگڑے کا سیاسی اکھاڑہ بنا لیا گیا۔ لوگ جنازہ مصطفےٰؐ کو بے گور و کفن چھوڑ کر حصولِ اقتدار کی تقریروں میں منہمک و مشغول ہو گئے۔ حضورؐ کے کفن و دفن تک کا انتظار نہ کیا۔ خیر جانے والے جنازہ چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر علی جنازۂ رسولؐ چھوڑ کر تقریروں میں منہمک نہیں ہوئے بلکہ وصیتِ سیّد عالمینؐ کے مطابق حضورؐ کو غسل دیا۔ تجہیز و تکفین کے فرائض کو پورا کیا۔ اشکبار آنکھوں کے ساتھ، خود لحدِ پاک میں اُتارا۔ قبرِ حبیب کو خود ہموار کیا اور اُس پر پانی بھی خود چھڑکا۔ حضورؐ کی تمام آخری رسومات کو نہایت محبت اور درد و غم

تدار کے لئے حضورؐ کو بے گور و کفن چھوڑ کر کہیں نہیں گئے کیونکہ علیؑ جانتے
یا وفادار محبّ اپنے محبوب کا جنازہ چھوڑ کر نہیں جا سکتا، اپنی محبت
سی پر قربان نہیں کر سکتا۔ محبوب کے غمِ وفات میں ڈوبا ہوا انسان سیاسی
منہمک نہیں ہو سکتا۔ علیؑ یہ بھی جانتے تھے کہ جس کا دل محبّتِ رسولؐ سے
ز ایمان والا نہیں اور اُمّت پر تو نبیؐ اکرم کا یہاں تک حق رکھا گیا ہے کہ
نماز پڑھ رہا ہو اور حضورؐ اس کو بلائیں تو اُس شخص پر فرض ہے کہ وہ سرکار
بیک" کہے۔ مگر نفسِ امّارہ بڑی گمراہ کُن اور دشمنِ دین شے ہے وہ محبّت
حُبِّ ریاست کی طرف لگاتی ہے۔ مگر علیؑ کا نفس، نفسِ پاک تھا۔
ہلہ میں نفسِ رسولؐ قرار دیا گیا۔ علیؑ ان طاہرین میں سے تھے جن کی طہارت کاملہ
تِ تطہیر میں خدا نے خود کیا۔ حضرت علیؑ محمد مصطفےٰؐ کے نور کا ٹکڑا ہیں کہ
ے خود فرمایا تھا۔
علیٌّ مِنْ نورٍ واحدٍ" کہ میں اور علیؑ ایک ہی نور سے ہیں (تذکرۃ الخواص
ریاض النضرہ) پس علیؑ نے حُبِّ رسولؐ کی بجائے حُبِّ ریاست کو نہیں
و ار انسانوں کی سیاست کہتی ہے کہ برسرِ اقتدار آنے کا کوئی بھی موقع
نے دیا جائے۔ اور حصولِ اقتدار کے لئے کوئی بھی طریقہ نہ چھوڑا جائے
اخلاقی و دینی لحاظ سے کتنا ہی بھونڈا اور مذموم کیوں نہ ہو لیکن مولائے
مرتضیٰ علیہ السلام کی سیاست صرف محبّتِ خدا و رسولؐ تھی۔ سیاستِ علیؑ
و اتباعِ مصطفےٰؐ پر مبنی تھی۔ جس میں طمع و خود غرضی کا نام و نشان تک
رحمتِ الٰہی تھی اور علیؑ نے اُسی کو سعادتِ دنیا و آخرت جانا۔ نفسِ امّارہ
نہیں کی۔ اقتدار کی حرص نہیں کی۔ محبوبِ خدائے ذوالجلال کا مقدس جنازہ
گئے اور داغِ بے وفائی اور بدبختی سے پوری طرح محفوظ ہے۔ پیغمبرِ اعظمؐ
سا ہی پاک ہونا چاہیئے تھا۔ انہی بے نظیر خوبیوں کی وجہ سے رسولؐ خدا
کو اپنا وصی قرار دے کر وصیت فرمائی تھی کہ "اے علیؑ میرے بعد

تم پورے کرتا اور میرے قرضے بھی تم ادا کرنا"
حضرت علیؑ نے اپنے محبوب آقا سرکار محمدؐ عربی کی وصیت کے مطابق منادی کروادی کہ "جس کسی سے رسولؐ خدا نے کوئی وعدہ کیا ہو وہ میرے پاس آئے میں حضورؐ کے تمام وعدے پورے کروں گا۔ اور جس کسی کا کوئی قرضہ رسولِ خدا کے ذمہ ہو۔ وہ بھی میرے پاس آئے میں حضورؐ کے تمام قرضے ادا کروں گا" یہ اعلان بار بار ہوتا رہا۔ اور حضرت وصیؐ مصطفےٰ علیؑ مرتضےٰ حضورؐ کے وعدے بھی پورے کرتے رہے اور قرضے بھی ادا کرتے رہے۔

نہایت ہی قابلِ غور امر یہ ہے کہ وعدوں کو پورا کرنے اور قرضوں کو ادا کرنے کے لئے دعویداروں سے حضرت علیؑ کوئی ثبوت یا گواہی طلب نہیں فرماتے تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرکار مرتضےٰؑ کو رسولؐ خدا کے تمام وعدوں اور قرضوں کا پورا علم تھا۔ پس ہمیں یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت علیؑ کو اپنے خاص تبرکات سونپ کر حضرت رسولِؐ خدا نے دکھا دیا کہ علیؑ میرا وارث ہے نیز اپنے وعدوں کے ایفا کا حکم دے کر اور اپنے قرضوں کی ادائیگی کی وصیت فرما کر اس امر کو بالکل واضح کر دیا کہ صحیح معنوں میں وصی رسولؐ و جانشین مصطفےٰؐ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ ہی تھے اگر کوئی اور وصی بنایا ہوتا تو وصیت اُسے ہی فرماتے۔ علیؑ کو نہ فرماتے۔ لیکن رسولِ خدا کی متعدد احادیث میں حضرت علیؑ کے لئے لفظ "وصی" اور لفظ "خلیفہ" موجود ہیں۔ ثبوت کے لئے مندرجہ ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:۔

مسند امام احمد حنبل مطبوعہ مصر از جز الاول ص۳۳۱، کنز العمال مطبوعہ مصر جلد ۶ ص ۶۰۵، ۴۰۶، تاریخ حبیب السیر مطبوعہ بمبئی جلد اول الجز الثالث ص۱۰، تفسیر زیل البوالغرالبغوی مطبوعہ مصر (برحاشیہ تفسیر خازن) جلد ۳ ص۱۱۱، تاریخ المختصر فی ابو الفدا مطبوعہ مصر جلد اول ص۱۱۹

وہ تبوک پر جاتے ہوئے بھی رسولِؐ خدا نے مولا علیؑ کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ فرمایا تھا کہ "آپؑ کی منزلت مجھ سے وہی ہے جو ہارونؑ کی موسیٰؑ سے تھی۔

سوائے اس کے کہ میرے بعد نبی کوئی نہیں" اور قرآن مجید سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے پہلے خلیفہ حضرت ہارونؑ ہی تھے پس ارشاد رسولؐ کے مطابق حضرت علیؑ پہلے خلیفہ قرار پائے لیکن حضرت ہارونؑ کی وفات حضرت موسیٰؑ کی ظاہری زندگی ہی میں ہو گئی تھی۔ اس لئے یہ امکان تھا کہ لوگ حضرت علیؑ کی خلافت کو "وقتی" یا "عارضی" سمجھ لیں گے اس لئے رسولؐ خدا نے فرمایا "سوائے اس کے میرے بعد نبی کوئی نہیں" اور لفظ "بعدی" سے بالکل وضاحت فرما دی کہ علیؑ کی خلافت میرے بعد بھی برقرار رہے گی۔ اسلئے صرف نبوت کو مستثنیٰ فرمایا۔ خلافت کو نہیں پس رسولؐ خدا کے بعد کے دور کے لئے بھی تقرر علیؑ برقرار ثابت رہا۔ اب جو لوگ اطمینان چاہیں وہ مندرجہ ذیل کتب غیر شیعہ میں حدیث منزلت ہارونی میں تقرر علیؑ ملاحظہ فرمائیں۔

"صواعق محرقہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر ص۸۴، ازالۃ الخفا ولی اللہ محدث دہلوی (اردو ترجمہ) مطبوعہ سعیدی کراچی مقصد دوم ص۵۰۵، فیض الباری شرح صحیح بخاری مطبوعہ مجلس علمی سورت، باب مناقب علیؑ جلد ۴ ص۹۸، صحیح بخاری مترجم مطبوعہ سعیدی کراچی جلد دوم باب فضائل اصحاب النبی مناقب علیؑ حدیث نمبر ۹۰۳۔ صحیح مسلم مطبوعہ مصر جز ۷ باب من فضائل علیؑ مشکوٰۃ مترجم مطبوعہ سعیدی کراچی جلد ۳ باب مناقب علیؑ ص۲۵۸ حدیث نمبر ۵۸۲۶ متفق علیہ"

اور غدیر خم کے مقام پر اپنے عظیم الشان خطبے میں رسولؐ خدا نے حضرت علیؑ کو تمام کائنات کا مولیٰ قرار دیا۔ فرمایا "مَن کُنتُ مولاہُ فَھٰذا عَلِیٌ مَولاہُ" یعنی جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علیؑ مولا ہیں" (دیکھئے۔ مشکواۃ مترجم مطبوعہ سعیدی کراچی جلد ۳ باب مناقب علیؑ فصل ۲ ص۲۵۹ حدیث نمبر ۵۸۳۰، جامع ترمذی مطبوعہ نولکشور باب مناقب علیؑ ص۶۱۶۔ منہج الرسول الاصطلاح احادیث الرسول مولفہ علامہ اہل حدیث نواب صدیق حسن بھوپالی مطبوعہ شاہجہانی ص۱۳، سر العالمین امام غزالی مطبوعہ بمبئی مقالہ رابعہ ص۹۔

حضورؐ نے خطبۂ غدیر میں حضرت علیؑ سے حضرت امام مہدیؑ تک اپنے بارہ

اوصیاء بتلائے (قیامت تک کے لئے) اور حضرت علیؑ کو اپنا "وصی" اپنا "وارث" اور اپنا "خلیفہ" صاف لفظوں میں فرمایا۔ (دیکھئے قسطنطنیہ کے مفتیٔ اعظم اہلسنت محمد سلیمان حنفی کی کتاب ینابیع المودۃ مطبوعہ اسلامبول ص۱۱۵)

وفاتِ رسولؐ کا انکار

جب شہنشاہ کونین حضرت محمد مصطفٰےؐ کی وفات حسرت آیات سے مدینۃ النبی پر غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور ہر طرف محبانِ رسولؐ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں اس وقت لوگوں نے ایک عجیب وغریب چونکا دینے والا منظر دیکھا کہ ایک شخص رونے کی بجائے ننگی تلوار ہاتھ میں پکڑے ہوئے اعلان کر رہا ہے کہ "جو شخص یہ کہے گا کہ رسولِ خدا کی وفات ہو گئی ہے میں اس کے سر پر تلوار ماردوں گا (یعنی قتل کر دوں گا)" (تاریخ ابوالفداء جلد اوّل ص۱۵۱ اور البدایہ والنہایہ جلد ۵ ص۲۴۲) اس اعلان اور عجیب منظر نے غمزدہ افراد کی توجہ کو غم سے ہٹانے کا کام کیا۔ لوگ حیرت زدہ رہ گئے کہ یہ صاحب آخر رونے اور غم کرنے کی بجائے تلوار کیوں اٹھائے پھرتے ہیں؟ یہ وفات رسولؐ کا انکار کیوں کر رہے ہیں؟ لوگوں کو ذکرِ وفاتِ رسولؐ سے منع کیوں کر رہے ہیں؟ اور ذکرِ وفات کرنے والوں کے قتل پر کیوں آمادہ ہیں؟ جب مقصدِ اعلان پورا ہو گیا لوگ رونے کی بجائے سوچنے لگے غم سے توجہ ہٹی تو ایک دوسرے شخص نے تقریر شروع کر دی۔ لوگوں نے اُن کی تقریر پر سوچنا شروع کیا تو ایک تیسرے شخص نے آواز دی کہ "انصار سقیفہ میں جمع ہو کر حکومت کا فیصلہ کرنے لگے ہیں" پس لوگ سخت حیران ہو گئے۔ غم رسولؐ سے توجہ ہٹ گئی۔ تدبیر اعلانؔ، تقریرؔ اور پیغامؔ تینوں پر مبنی منصوبہ کامیاب ہو گیا اور لوگ سقیفہ کی طرف چل دیئے اور حضرت علیؑ نے یہ افسوسناک اور دردناک منظر دیکھا کہ جنازہ رسولؐ کی تدفین میں صرف ۹ آدمیوں نے شرکت کی۔ باقی سب سقیفہ چلے گئے۔ بہرحال یہ بات ظاہر ہو گئی کہ انکارِ وفات کرنے والے شخص کو حضورؐ کی وفات کا کوئی غم وصدمہ نہ تھا، کیونکہ وہ تو وفات ہی کا انکار کر رہے تھے اور آنسو بہانے کی بجائے تلوار دکھا کر قتل کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ غمِ وفات کہاں

تھا؟ بلکہ مقصدِ اعلان اصل میں "اقتدار" ہی تھا۔ وہ مقصد جو انھوں نے حاصل کرلیا۔ سقیفہ میں حضرت ابوبکر کو حکومت پر قابض کر دیا گیا۔ اور ان کی بیعت سب سے پہلے اُن ہی صاحب نے کی، جنھوں نے وفاتِ رسولؐ کا انکار کیا تھا۔

کیا وہ حکومت "جمہوری" تھی؟

سقیفہ میں جو حکومت بنائی گئی وہ "جمہوری" تبھی مانی جاسکتی تھی

جب تمام ملک میں انتخاب عام کرایا گیا ہوتا۔ لوگوں کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ سقیفہ میں جو تھوڑے سے لوگ (جن کی تعداد تک معلوم نہیں ہو سکی) موجود تھے انہیں بھی خود تدبیر سے اکٹھا کیا گیا تھا اور ان میں سے بھی انصار کو اُمیدوار کھڑا کرنے ہی سے منع کر دیا گیا اور یہ کہہ دیا گیا کہ "رسولؐ خدا قریش میں سے تھے اس لئے خلیفہ قریش ہی میں سے ہوگا" یعنی انصار کو اپنا اُمیدوار کھڑا کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اس طریقے پر بلا انتخاب کے، اور انصار کو اُمیدوار کھڑا کرنے سے محروم کر کے جو حکومت بنائی گئی اس میں جمہوریت کی کونسی بات ہے؟

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سقیفہ میں جمع ہونے والے تھوڑے سے لوگوں میں جو حکومت ملک میں رائے شماری کرائے بغیر بنائی گئی اس پر اب خواہ مخواہ "جمہوری" کا لیبل چسپاں کیا جا رہا ہے حالانکہ صواعق محرقہ ابن حجر مکی میں خود حضرت عمر کا یہ قول موجود ہے کہ "ابوبکر کی بیعت بے سوچے سمجھے ناگہانی طور سے واقع ہوگئی تھی۔ اللہ نے اس کے شر سے بچا لیا۔ اگر آئندہ کوئی اس طرح کرے تو اُسے قتل کر دینا" (صواعق محرقہ ص۳۶)

تین سوال

(۱) اگر حکومت سقیفہ آئینی اور جمہوری ہوتی تو حضرت عمر اُسے "ناگہانی" (فلتۃ) کیوں کہتے؟

(۲) اگر وہ جمہوری تھی تو اُس میں حضرت عمر شر کیوں محسوس کرتے تھے؟

(۳) اگر حکومت یا حاکم بنانے کا وہ طریقہ مبنی بر خیر تھا تو اس طریقے پر آئندہ عمل کرنے والے کے قتل کا حکم حضرت عمر نے کیوں دیا؟ اور اس کے لئے "شر" کا لفظ کیوں بولا؟

پس حضرت عمر ہی کے لفظوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابوبکر

کی حکومت "جمہوری" نہ تھی اور حضرت عمر نے اُس طریقے کو "شر" تسلیم کیا ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر کو اُسی طریقے سے حکومت پر قابض کرنے والے اور اُن کی سب سے پہلے بیعت کرنے والے خود حضرت عمر ہی تھے۔

خیر چھوڑیے، سقیفہ میں جو ہونا تھا ہو گیا مگر حضرت علیؑ نے یہ رقت انگیز منظر ضرور دیکھا کہ ایک طرف مختارِ کائنات کا جنازہ پڑا تھا۔ خاندانِ رسولؐ حضورؐ کی آخری رسوماتِ غم میں مصروف تھا۔ زہراؑ اور حسنینؑ رو رہے تھے اور دوسری جانب لوگ حکومت لینے دینے میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن رسولِ خداؐ کی وصیت تھی کہ "اے علیؑ جب تم دیکھو کہ لوگوں نے دنیا کو اختیار (پسند) کر لیا ہے تو تم آخرت ہی کو پسند کرنا"۔ اس لئے مولائے شیرِ خدا، تاجدارِ شجاعت، کرارِ غیر فرار، فاتحِ بدر و خیبر و خندق و حنین اور اُحد کے تمغہ یافتہ، صاحبِ ذوالفقار "جوان" ہوتے ہوئے بھی صبر کیا۔

حضرت علیؑ نے ذوالفقار کیوں نہ اٹھائی؟

بعض حضرات بالعموم یہ عذر پیش کرتے رہتے ہیں کہ "اگر حکومت کو علیؑ اپنا حق سمجھتے تھے تو انہوں نے شیرِ خدا ہونے کے باوجود اپنی شمشیرِ آبدار ذوالفقار کیوں نہ اٹھائی؟ اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے جنگ کیوں نہ کی؟"

مگر یہ عذر کرنے والے حضرات اُس وصیتِ رسولؐ کی جانب توجہ نہیں کرتے کہ جس میں رسولِ خداؐ نے حضرت علیؑ کو مکروہات کا سامنا ہو جانے پر صبر کرنے کی وصیت فرمائی تھی اور فرمایا تھا کہ "جب لوگ دنیا کو پسند کر لیں تو اے علیؑ تم آخرت کو پسند کرنا"۔

پس امام المتقین، مطیعِ رسولؐ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے ہمیشہ ہر چیز پر اطاعتِ خدا اور رسولؐ کو ترجیح دی اور وصیتِ رسولؐ پر عمل کیا۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ "رسولِ خداؐ نے حضرت علیؑ کو صبر کرنے کا حکم کیوں دیا؟" تو اس کی وجوہات یہ ہیں۔ (۱) یہ کہ حضرت رسولِ خدا علمِ وہبی سے اور وحیِ الٰہی سے، آنے والے تمام

واقعات کو پوری طرح جانتے تھے۔ آپؐ کو معلوم تھا کہ اگر علیؑ تلوار اٹھائیں گے تو مدینے میں سخت خونریزی اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو جائے گا۔ اور مدینہ حرم مصطفےٰؐ ہے اس میں جنگ و جدال، فساد و قتال اور خونریزی کرنا قطعاً حرام ہے۔ اگر علیؑ تلوار اٹھائیں گے تو شہر مدینہ کی حرمت برباد ہو جائے گی (۲) یہ کہ اگر مسلمانوں کے باہمی جدال و قتال اور خانہ جنگی سے ملکی امن تباہ ہوا تو مرکز اسلام (مدینہ) متزلزل ہو جائے گا اور پھر غیر مسلم حکومتوں کو (منافقین کی مدد کے ساتھ) مسلمانوں پر حملہ کرنے اور مدینہ منورہ پر قبضہ جما لینے کا موقع مل جائے گا (۳) یہ کہ رسولؐ خدا کو خوف تھا کہ اگر نومسلم لوگ، مسلمانوں کی خانہ جنگی اور علیؑ جیسی ہستی کے ہاتھوں مسلمانوں کی تباہی دیکھیں گے تو وہ لوگ کہیں اسلام چھوڑ کر مرتد نہ ہو جائیں (۴) یہ کہ اگر علیؑ، آپ کی وفات ہوتے ہی حکومت حاصل کرنے کے لئے لڑیں گے تو لوگ علیؑ کو (معاذ اللہ) خود غرض اور حریص حکومت سمجھیں گے۔ اور اُن کو ہرگز ہادیٔ برحق نہ مانیں گے۔ اس طرح مقصد حدیث ثقلین فوت ہو جائے گا۔ اور لوگ ہدایت سے محروم رہیں گے (۵) حضرت

لہ یہی وجہ ہے کہ آئندہ واقعات اور بغاوتوں پر مدبرانہ نظر رکھتے ہوئے حضرت علیؑ نے مدینہ منورہ کی حرمت کو بچانے کے لئے کوفے کو دارالحکومت قرار دیا۔ تبدیلی دارالحکومت کی دوسری وجہ کوفہ کا چھاؤنی ہونا تھا۔ اور مقصد یہ تھا کہ چھاؤنی پر پورا کنٹرول رہے۔ اور ایک مقصد تبلیغ اسلام تھا۔ چونکہ کوفہ کا محل وقوع ایسا تھا جہاں سے مختلف اطراف کو راستے جاتے تھے۔ اور ان ہی راستوں سے مختلف شہروں اور ملکوں سے لوگ بغرض تجارت کوفہ میں آتے تھے۔ اس لئے حضرت علیؑ نے چاہا کہ کوفے میں رہ کر ان لوگوں کو بھی پیغام ہدایت دیا جائے اور ایک وجہ یہ تھی کہ مدینہ کی نسبت کوفہ، شام اور دوسرے صوبوں سے قریب تھا جہاں بغاوت یا شورش ہونے کا امکان تھا۔ اس لئے جناب امیرؑ نے قریبی فاصلے پر رہ کر کنٹرول کرنا زیادہ آسان بنانے کے لئے کوفہ کو دارالحکومت قرار دیا۔

رسولِ خدا یہ بھی جانتے تھے کہ علیؑ کے ساتھی صرف چند اشخاص ہی ہوں گے۔ ایسی صورت میں اگر علی جنگ کریں گے تو ممکن ہے کہ حضرت علیؑ اور حسنینؑ اسی وقت شہید ہو جائیں اور سلسلۂ ہدایت و امامت منقطع ہو جائے جسے قائم رکھنا اور نسلِ رسولؐ کا باقی رہنا نہایت ضروری تھا۔ پس ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے سرکارِ دو عالمؐ نے حضرت علیؑ کو صبر کرنے کی ہدایت فرمائی تھی اور حضرت علیؑ نے حکمِ رسولؐ کو جان ایمان سمجھتے ہوئے صبر کیا۔ اور بالکل پُرامن رہتے ہوئے وقت گزارا۔ حضرت علیؑ کو فلاحِ اسلام ہی منظور تھی۔ حضرت علیؑ، دین کے مقابلے میں دُنیا کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ واقعۂ سقیفہ کے بعد ابوسفیان نے حضرت علیؑ کے پاس آکر یہ کہا تھا کہ "اگر آپ چاہیں تو میں مدینہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں" اُس وقت حضرت علیؑ نے ابوسفیان کو جو جواب دیا تھا وہ علیؑ کی سیاست پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا "تو کب سے اسلام کا خیر خواہ بن گیا؟ تو نے ہمیشہ اسلام کی بدخواہی کی ہے مجھے تیری ہمدردی اور نصیحت کی ضرورت نہیں"۔ سبحان اللہ یہ ہے علیؑ کی سیاست۔ دُنیا کے عام سیاستدان ایسے موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کیا کرتے ہیں مگر علیؑ ایسے نہیں تھے کیونکہ ان کا دامنِ عمل و سیاست خود غرضی اور ابن الوقتی سے قطعاً پاک تھا۔ علیؑ نے حرص و ہوسِ اقتدار کی بجائے وصیتِ رسولؐ پر عمل کرتے ہوئے صبر کیا اور اسلام کو بہت بڑی تباہی سے بچا کر اسلام اور اہلِ اسلام پر احسانِ عظیم فرمایا۔

لیکن کسی شخص کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت علیؑ نے زبان سے بھی اظہارِ حق نہیں فرمایا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے خوں ریزی و فساد و جنگ کی بجائے پُرامن احتجاج اور زبان سے اظہارِ حق ہی کا راستہ اختیار فرمایا۔ ثبوت ملاحظہ فرمائیے۔

علامہ اہلِ سُنّت ابن قتیبہ دینوری نے لکھا کہ "حضرت علیؑ کو حضرت ابوبکر کے پاس لایا گیا اور اس وقت علیؑ کہہ رہے تھے کہ میں اللہ کا بندہ اور رسولؐ خدا کا بھائی ہوں۔ پس حضرت علیؑ سے کہا گیا کہ حضرت ابوبکر کی بیعت کر و تو حضرت علیؑ نے فرمایا۔

"اس امر کا تم سے زیادہ حق دار میں ہوں۔ میں ہرگز تمہاری بیعت نہیں کروں گا۔ اور تم

لوگوں کے لئے بہت زیادہ مناسب یہ ہے کہ تم میری بیعت کرو۔ تم نے اس امر (حکومت) کو انصار سے لیا اور انصار کے اوپر نبی سے قرابت کو حجت (دلیل) لائے اور تم اس (امر حکومت) کو ہم اہل بیتؑ سے ناجائز طور سے چھین رہے ہو۔ کیا تم نے یہی گمان نہیں کیا تھا کہ تم انصار کی نسبت حکومت کے زیادہ حقدار اس لئے ہو کہ محمدؐ تم (قریش) میں سے تھے پس انھوں (انصار) نے تمہیں لگام عطا کر دی اور تمہاری حکومت کو مان لیا پس تو اب میں وہی حجت (دلیل) تم پر قائم کرتا ہوں کہ جو تم نے انصار پر قائم کی تھی وہ اس طرح کہ ہم زندگی اور موت (دونوں حالتوں) میں رسولؐ خدا کے زیادہ قریبی ہیں۔ پس (اس دلیل کے بعد) اگر تم ایمان رکھتے ہو تو ہمارے ساتھ انصاف کرو۔ ورنہ تم جان بوجھ کر ظلم کر رہے ہو، آگاہ ہو جاؤ"!

پس حضرت عمر نے حضرت علیؑ سے کہا" جب تک تم بیعت نہیں کرو گے تمہیں نہیں چھوڑا جائے گا"! تو حضرت علیؑ نے فرمایا" خوب دودھ دوہ لے تو اس میں حصہ دار ہے (یعنی شریک خلافت ہے) اس کے لئے آج (حکومت کو) مضبوط کر لے کیونکہ کل وہ اسے تیری طرف پھیر دے گا (یعنی حکومت تجھے دے جائے گا) پھر حضرت علیؑ نے فرمایا" خدا کی قسم اے عمر! میں تیرے قول کو ہرگز قبول نہیں کروں گا اور ہرگز اس (ابوبکر) کی بیعت نہیں کروں گا"!

حضرت علیؑ نے اس کے بعد ابوعبیدہ ابن جراح کے جواب میں فرمایا" اے گروہ مہاجرین! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو سلطنت عرب میں ہے اس کو حضرتؐ کے گھر سے باہر نہ نکالو۔ اور اپنے گھروں کی طرف نہ لے جاؤ۔ اور حضورؐ کے خاندان کا جو مقام لوگوں میں ہے اُسے اُس مقام سے اور اُس کے حق سے نہ ہٹاؤ۔ پس خدا کی قسم ہے اے گروہ مہاجرین! اس سلطنت کے سب سے زیادہ حقدار ہم ہیں۔ ہم اہلبیتؑ ہیں اور اس حکومت کے ہم تم سے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ ہم کتاب اللہ کے قاری، دین خدا میں فقیہہ، رسولؐ خدا کی سنتوں کے عالم، امر رعایا پر مطلع، اُن سے بُرے اُمور کو دفع کرنے والے اور ان کے درمیان مساوی تقسیم کرنے والے ہیں۔ خدا کی قسم۔ یہ تمام چیزیں ہم میں

موجود ہیں، پس تم اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو، ورنہ راہ خدا سے گمراہ ہو جاؤ گے اور حق سے دور ہونے میں بڑھتے ہی جاؤ گے۔"

پس بشیر بن سعد انصاری نے کہا "اے علیؑ اگر آپ کے اس کلام کو انصار نے ابوبکر کی بیعت سے پہلے سُن لیا ہوتا تو آپؑ کی مخالفت نہ کرتے (یعنی آپؑ ہی کی بیعت کرتے)" تو حضرت علیؑ نے فرمایا "تو کیا (تیرا مطلب یہ ہے کہ) میں حضورؐ کو آپؐ کے اہلبیتؑ (کی موجودگی) میں بے دفن چھوڑ دیتا؟ آپؐ کو دفن نہ کرتا؟ اور (حضورؐ کو بے گور و کفن چھوڑ کر) لوگوں سے حضورؐ کی سلطنت کا جھگڑا کرتا؟" (الامامۃ والسیاسۃ ص۱۲ اور تاریخ اعثم کوفی ص۵) علاوہ ازیں صحیح بخاری جلد ۳ ص۳۵ اور صحیح مسلم جلد ۲ ص۹۱ میں ہے کہ "حضرت علیؑ نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ "تم نے اس امر میں ہم پر استبداد کیا حالانکہ رسولؐ خدا سے ہماری قرابت کی وجہ سے ہم اپنا حق جانتے تھے" (زیادہ ثبوت کے لئے تاریخ الامم والملوک ابن جریر طبری مطبوعہ مصر جلد ۳ ص۲۰۲ بھی دیکھئے)۔

اجماع ثابت نہیں

حکومت سقیفہ کو برحق ثابت کرنے کے لئے لوگ "اجماع" کو دلیل بناتے ہیں اور اس طرح سے اُسے "جمہوری" بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اجماع نہیں تھا۔ کیونکہ اُس میں حضرت علیؑ اور دیگر بنی ہاشم اور کئی اصحاب شامل نہ تھے اور حقیقۃ الفقہ ص۱۱ میں فقہ حنفی کی کتاب شرح وقایہ اردو ص۴۲ سے منقول ہے کہ "ایک شخص کا مخالف ہونا بھی مانع انعقاد اجماع ہے"، یعنی اگر ایک شخص بھی مخالف ہو تو اجماع نہیں ہوا۔ مزید ثبوت کے لئے نور الانوار مطبوعہ یوسفی لکھنو ص۲۲۱، شرح مسلم نودی جلد ۱ ص۴ اور اسی شرح نودی کے ص۵۴ پر ہے کہ "اجماع بعد اختلاف کے اجماع نہیں رہتا" کتاب الایمان مؤلفہ ابن تیمیہ مطبوعہ مصر ص۵۱ میں ہے کہ "جس اجماع میں مومنین میں سے کوئی ایک شخص بھی مخالف نہ ہو تو وہ قطعاً حق ہے"۔ تو ثابت ہوا کہ اجماع وہی مانا جاسکتا ہے جس میں ایک شخص بھی مخالف نہ ہو۔ لیکن جب مخالف

موجود ہوں تو "اجماع" نہیں۔

قول ابن حزم | ابن حزم نے "المحلیٰ" سفر خامس وسابع، مسئلہ نسخ القرعہ ص۲۸۶ میں لکھا ہے کہ "ہر اُس اجماع پر اللہ کی لعنت ہے جس سے علیؑ ابن ابی طالب اور اُن کے ساتھ رہنے والے صحابی باہر ہوں" یعنی جس اجماع میں علیؑ اور ان کے ساتھی صحابہ شامل نہ ہوں وہ اجماع ملعون ومردود ہے۔

مُلّا معین لاہوری کا قول | اسی سلسلے میں دراسات اللبیت ص۲۴۹ میں شیخ محمد معین لاہوری کا فتویٰ ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں "لا اجماع بمخالفة اهل البیت" "یعنی اہل بیت کی مخالفت موجود ہو تو کوئی اجماع نہیں۔"

"اجماع" کا صحیح مفہوم | محلی ابن حزم مطبوعہ مصر جلد ۱ مسئلہ ۹۷ میں لکھا ہے کہ "والاجماع انما هو اجماع جمیع المؤمنین لا اجماع بعضهم ..... الخ" "یعنی "اجماع" صرف وہی ہے جو تمام مومنین کا اجماع ہو نہ کہ بعض کا اجماع"

امام احمد حنبل کا فتوےٰ | علامہ ابن القیم اعلام الموقعین جلد ۱ صفحہ ۱۱ میں لکھتے ہیں "عبداللہ بن احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (یعنی امام احمد بن حنبل) سے سُنا کہ کسی مسئلے میں اجماع کا جو بھی دعویٰ کیا جائے وہ جھوٹ ہے اور جو شخص "اجماع" کا دعوےٰ کرے وہ جھوٹا ہے"!

علّامہ وحید الزماں کا اجماع سے انکار | تسہیل القاری پارہ ۳ ص۸۴۲ میں علّامہ وحید الزماں نے وجودِ اجماع کا بھی انکار کیا ہے اور اس کے حجّت ہونے کا بھی۔

نواب صدیق حسن قنوجی بھوپالی کہتے ہیں | کہ جب فقط ایک مجتہد اہل اجماع کی مخالفت کر دے تو مذہب جمہور یہ ہے کہ وہ نہ تو اجماع ہوتا ہے اور نہ حجّت۔

مندرجہ بالا تمام حوالوں سے ثابت ہوا کہ جس میں مخالفت ہو وہ اجماع نہیں۔ اور حضرت علیؑ و دیگر بنی ہاشم کا اختلاف اور عدم شمولیت جلسۂ سقیفہ بالکل ظاہر ہیں جیسا کہ "الامامتہ والسیاستہ" کی عبارتیں پہلے اسی سلسلے میں پیش ہو چکیں۔ اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ بیعتِ ابوبکر کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے حضرت ابوبکر کی تادم وفات بیعت نہیں کی بلکہ مخالف ہی رہے ثبوت کے لئے دیکھئے۔

"استیعاب ابن عبدالبر ترجمہ سعد بن عبادہ۔ صواعق محرقہ ص۷ حیوٰۃ الحیوان دمیری جلد ۱ ص۱۸۸"

پس جب مخالفتِ حکومتِ سقیفہ ثابت ہے تو "اجماع" ثابت نہیں ہو سکتا اور نہ ہی جمہوریت کی دلیل بنتی ہے جبکہ محض بیعت کے لئے زبردستی کرنے کی روایات بھی ملتی ہیں بلکہ یہاں تک ثابت ہے کہ محض بیعت نہ کرنے پر سعد کے قتل کا فتویٰ بھی دے دیا گیا تھا (نہایہ ابن اثیر جلد ۳ ص۲۵۶ اور سیرۃ حلبیہ جلد ۳ ص۳۹) اور جناب فاطمۃ زہرا کے دروازے پر جا کر دھمکیاں دینا بھی ثابت ہے (دیکھئے الملل والنحل مصنفہ ابوالفتح عبدالکریم شہرستانی مطبوعہ بمبئی جلد ۱ ص۳۵۔ الامامتہ والسیاستہ ابن قتیبہ مطبوعہ مصر جلد ۱ ص۳۔ الاستیعاب فی معرفتہ الاصحاب علامہ ابن عبدالبر مطبوعہ حیدرآباد دکن جلد ۱ ص۳۴۵، منتخب کنزالعمال برحاشیہ مسند احمد حنبل مطبوعہ مصر جلد ۲ ص۱۷۴

پس ایسی متشددانہ کارروائیوں کو "جمہوریت" کہنا بڑی عجیب بات ہے۔

ایک شاندار نکتہ منہاج السنتہ ابن تیمیہ جلد ۳ ص۲۱۶ (بحوالہ فلک النجاۃ ص۲۱۹) سعد بن عبادہ کے ساتھ حباب بن منذر صحابی کا بیعت ابوبکر سے منکر ہونا لکھا ہے اور پھر سعدؓ کے حق میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اہلِ جنت میں سے ہیں"!

پس ہم کہتے ہیں کہ جب حضرت سعدؓ حضرت ابوبکر کے مخالف اور ان کی بیعت کے منکر ہو کر جنت میں جا سکتے ہیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ "خلافتِ سقیفہ"

کو تسلیم کرنا ضروری نہیں اور اس کے منکر کو جنت ملے گی۔

حضرت علیؑ پر بیعت کا الزام

"خلافت" سقیفہ کو برحق ثابت کرنے کے لئے کئی روایتیں بنائی گئیں جن میں سے بعض میں یہ بات بھی گھڑی گئی کہ حضرت علیؑ نے بھی بیعت کر لی تھی (نعوذ باللہ من ذالک) تو ہمارا جواب یہ ہے کہ الامامۃ والسیاسۃ کی عبارت سے اس کے بالکل خلاف ثابت ہو چکا ہے یعنی حضرت علیؑ نے خدا کی قسم کھا کر کہا تھا کہ "میں ہرگز بیعت نہیں کروں گا۔" اگر علیؑ اس بیعت کو جائز سمجھتے تو ہرگز خدا کی قسم نہ کھاتے۔ شیرِ خدا کی قسم یہ بات ثابت کرتی ہے کہ آپ اس بیعت کو قطعاً ناجائز سمجھتے تھے اور علیؑ کبھی قسم شکنی نہیں کر سکتے تھے۔

انکار سیرتِ شیخین

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر حضرت علیؑ حکومتِ سقیفہ یا اُس کے بعد کی حکومت کو برحق سمجھتے اور اُن دونوں کی سیرت کو اسلام کے عین مطابق اور سنّت اللہ وسنتِ رسولؐ کے موافق سمجھتے تو شوریٰ میں ان کی سیرت سے انکار نہ کرتے جس کا ذکر مع ثبوت ابھی پیش کیا جائے گا۔

حضرت زہراؑ کا غضب

اور جناب فاطمہ زہراؑ بھی ان دونوں سے ناراض ہی رہیں اور یہ وصیت فرما گئیں کہ وہ دونوں میرے جنازے پر بھی نہ آنے پائیں۔ ناراضگی اور ممانعتِ شرکتِ جنازہ کا ثبوت حسبِ ذیل کتابوں میں دیکھئے۔

"الزہرا عمر ابو النصر ص۸۹ تا ۹۲، الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ ص۱۵، تیسیر الباری ترجمہ صحیح بخاری مطبوعہ احمدی لاہور کتاب المغازی باب الخمس پ۱۲ ص۱۸، ۱۲ و پ۱۷ ص۲۱، ترجمہ صحیح مسلم مطبوعہ مکتبہ شعیب کراچی جلد پنجم کتاب الجہاد والسیر ص۱۵، رد یائے صادقہ، شمس العلماء نذیر احمد فصل ۱۴، استیعاب ابن عبد البر مطبوعہ بر حاشیہ اصابہ ابن حجر جلد ۲ ص۳۷۹، اشعۃ اللمعات شیخ عبد الحق محدث دہلوی مطبوعہ نولکشور

جلد ۳ ص۱۲ باب الفتنہ، براہین فاطمہ فارسی ترجمہ صواعق محرقہ ابن حجر مکی مطبوعہ نولکشور ص۱۲۔

حضرت زہرا کی فریاد

اور حضرت فاطمہ زہرا نے فرمایا کہ میں تمہارے لیے ہر نماز میں بددعا کروں گی (الامامۃ والسیاسۃ) اور یہ بھی فرمایا کہ "جب میں اپنے بابا سے ملاقات کروں گی تو تمہاری شکایت کرونگی (الزہرا عمر ابو النصر) اور زہرا نے یہ بھی فریاد کی تھی "اے بابا! اے اللہ کے رسول! آپ کی وفات کے بعد ان دونوں کے ہاتھوں مجھ پر کیا مصیبتیں پڑ گئیں" اور خاتون جنّت روتی ہی دنیا سے چلی گئیں۔ فرمایا کرتی تھیں کہ مجھ پر وہ مصیبتیں پڑیں کہ اگر وہ دنوں پر پڑ جاتیں تو وہ راتوں میں بدل جاتے۔"

پس اگر علیؑ و زہراؑ کی ناراضگی ہی سے "جمہوریت" مراد ہے تو وہ واقعی جمہوریت ہوگی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ حکومت سقیفہ ہرگز جمہوری نہ تھی اور جمہوریت کا تو وہاں نام و نشان تک نہ تھا۔ نہ کوئی اجماع ہوا اور نہ ہی انتخابات ہوئے۔ جمہوریت کہاں تھی؟

حضرت علیؑ کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی

حضرت علیؑ نے حضرت عمر سے فرمایا تھا کہ "خوب دوہ لے تیرا بھی اس میں حصّہ ہے آج تو اس کی حکومت مضبوط کر دے کل یہ تجھے دے دے گا۔" حضرت علیؑ ان کے پروگراموں کو اچھی طرح جانتے تھے پس حضرت علیؑ کی پیشین گوئی کے مطابق حاکم سقیفہ نے "جمہوریت" کے سراسر خلاف محض نامزدگی کے ذریعے حضرت عمر کو حکومت منتقل کر دی۔ تحریر نامزدگی حضرت عثمان سے لکھوائی تھی۔ اس طرح احسان سقیفہ اور دیگر احسانات کا بدلہ چکا دیا۔ حضرت عمر کا تقرر بھی انتخابات کے ذریعے نہیں ہوا۔ اور جب حضرت عمر کا آخری وقت آیا (فیروز ابو لولو نے ٹیکس کی وجہ سے خنجر مار دیا) تو جاتے ہوئے چھ رکنی مجلس شوریٰ بنا گئے۔ اصل میں وہ حضرت عثمان ہی کو مقرر کرنا چاہتے تھے کیونکہ انکی نامزدگی میں حضرت عثمان نے بڑا حصّہ لیا تھا اور حضرت ابوبکر آخری وقت بیماری کی وجہ سے

جب تحریر نامزدگی حضرت عمر لکھواتے لکھواتے بیہوش ہو گئے تو حضرت عثمان نے رازداں ہونے کی وجہ سے حضرت عمر کا نام خود لکھ دیا تھا۔ حضرت ابوبکر کو جب افاقہ ہوا تو پوچھا کیا لکھا حضرت عثمان نے بتایا کہ میں نے حضرت عمر کا نام لکھ دیا ہے تو حضرت ابوبکر بہت خوش ہوئے اور اس بات پر حضرت عمر کے دل میں بھی حضرت عثمان کے لئے جذبات تشکر و احسان مندی موجزن ہو گئے۔ اس لئے وہ حضرت عثمان ہی کو نامزد کرنا چاہتے تھے ورنہ حضرت علیؑ میں کوئی کمی نہ تھی۔ خود عمر اپنی حکومت کے دوران حضرت علیؑ سے مشکل مسائل پوچھنے کے محتاج رہے اور تسلیم کرتے رہے کہ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا"۔ حضرت عمر کا یہ قول کتاب " ذکرِ حسینؑ " از مولانا کوثر نیازی میں بھی موجود ہے تو آخر اب علیؑ میں کیا کمی تھی ؟ (معاذ اللہ)

پس صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ بات حضرت عمر کی پالیسی کے خلاف تھی کہ حضرت علیؑ کو حکومت ملے لیکن ان کو یہ خدشہ تھا کہیں لوگ اعتراض نہ کریں کہ علیؑ کو کیوں نظر انداز کیا گیا ؟" اس لئے انہوں نے حضرت عثمان کو براہ راست نامزد کرنے کی بجائے "شوریٰ" والی تدبیر کو بہتر سمجھا اور اُن میں حضرت علی کو اسی لئے شامل کیا کہ جب علیؑ (برائے نام) اس میں شامل ہو جائیں گے تو لوگ یہ سمجھ کر مطمئن ہو جائیں گے کہ علیؑ خود شوریٰ میں شامل تھے۔ پس " شوریٰ " کے چھ آدمی جو مقرر ہوئے انکے نام یہ ہیں :-

(۱) حضرت علیؑ (۲) حضرت عثمان (۳) حضرت عبدالرحمن بن عوف (۴) حضرت سعد بن ابی وقاص (۵) حضرت زبیر بن عوام (۶) حضرت طلحہ بن عبیداللہ

پھر حضرت عمر نے ابوطلحہ انصاری کو مجلس شوریٰ کے انتظام پر مقرر کیا اور ابوطلحہ کو ہدایت کی کہ "میرے انتقال کے بعد بی بی عائشہ کے حجرے میں ارکان شوریٰ کو جمع کرنا اور ان کو پابند کر دینا کہ وہ مقررہ وقت کے اندر فیصلہ کر لیں۔ اگر تمام ارکان باتفاق رائے ایک کو منتخب کر لیں تو بہتر۔ ورنہ پانچ ایک طرف ہوں اور ایک مخالف ہو تو اس کو قتل کر دینا اور اگر چار متفق ہوں اور دو مخالف تو ان دو کو قتل کر دینا"۔ ملاحظہ ہو تاریخ احمدی صفحہ ۱۲۸۔

(کیا محض ایسے اختلاف پر قتل کا حکم دینا "جمہوریت" ہے ؟)
پھر ہدایت کی کہ " اگر تین ایک طرف ہوں اور تین دوسری طرف تو میرے بیٹے عبداللہ کو ثالث ٹھہرانا وہ جس فریق کے حق میں رائے دے " خلیفہ " کا انتخاب اس فریق کی رائے کے مطابق کیا جائے "! (یعنی گویا صرف عبداللہ بن عمرؓ ہی کی رائے جمہور کی رائے قرار پا گئی! کیا اسے جمہوریت مانا جا سکتا ہے ؟) اور پھر عبداللہ کو ہدایت دی کہ اکثریت کا ساتھ دینا لیکن برابری کی صورت میں عبدالرحمٰن بن عوف والی پارٹی کا ساتھ دینا۔ (تاریخ طبری جلد ۳ ص ۲۶۵)

پس جب حضرت عمر کا انتقال ہو گیا تو حسب پروگرام حجرۂ حضرت عائشہ میں "شوریٰ" منعقد ہوا۔ طلحہ اور سعد نے اپنا حق رائے حضرت عثمان کو دے دیا۔ زبیر نے اپنی رائے حضرت علیؑ کو دے دی۔ پھر تین امیدوار رہ گئے۔ حضرت علیؑ حضرت عثمان اور عبدالرحمٰن بن عوف۔ پس عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت علیؑ اور حضرت عثمان سے کہا کہ مجھے ثالث مان لو۔ حضرت عثمان نے فوراً قبول کر لیا (کیونکہ اُن کو تو اپنے موافق پروگرام کا علم تھا ہی) لیکن حضرت علیؑ کو بھی علم وہی تھا اور آپؑ تو محض اتمام حجت کے لئے شریکِ شوریٰ ہوئے تھے کہ لوگ یہ بہانہ نہ بنائیں کہ " علیؑ جب گھر ہی میں بیٹھے رہیں اور فیصلے کے وقت آئیں ہی نہ۔ تو کسی کا کیا قصور ؟ " تو حضرت علیؑ نے شرط عائد کر دی کہ اگر تم عہد کرو کہ حق سے بے راہ نہیں ہو گے اور اس معاملہ میں عثمان سے اپنی رشتہ داری کا لحاظ نہ کرو گے تو منظور کروں گا۔ عبدالرحمٰن نے کہا ہاں ایسا ہی ہوگا۔ جب عبدالرحمٰن کو ثالثی کا اختیار مل گیا اس وقت حضرت علیؑ کے حامیوں نے کہا کہ اگر تم تفریق و انتشار سے بچنا چاہتے ہو تو حضرت علیؑ کو خلیفہ تسلیم کر لو۔ حضرت عمار یاسرؓ، حضرت مقدادؓ نے اس بات کی تائید کی۔ دوسری طرف حضرت عثمان کے حامیوں نے اُن کی حمایت میں شور مچایا۔ جلسہ میں ہنگامے کی سی صورت پیدا ہو گئی۔ تو عبدالرحمٰن نے کہا " اے لوگو! خاموش ہو جاؤ! " پھر حضرت علیؑ سے کہا " آپ یہ عہد کریں کہ اللہ کی کتاب، سنّتِ رسولؐ اور سیرتِ شیخین پر

عمل کریں گے۔" اب پھر حضرت علیؑ کی ثابت قدمی کا امتحان تھا۔ اگر ایک عام سیاستدان ہوتا تو ہوسِ اقتدار میں فوراً تسلیم کرلیتا۔ بعد میں کسی چیز پر عمل کرتا یا نہ کرتا۔ اُس وقت ابن الوقتوں کی طرح اپنا کام نکال لیتا۔ لیکن علیؑ اپنے ایمان پر پوری طرح ثابت قدم تھے۔ فخرِ سیاستِ الٰہیہ تھے۔ آپؑ نے اپنے ایمان کے عین مطابق فرمایا "سُنّتِ اللہ اور سُنّتِ رسولؐ پر عمل کروں گا۔ جہاں تک میرے علم و طاقت کی رسائی ہے" یعنی "سیرتِ شیخین" ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ (شرح فقہ اکبر ملا علی قاری) صاف ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ کی نظر میں "سیرتِ شیخین" پیروی کے قابل نہ تھی۔ اور سُنّتِ اللہ اور سُنّتِ رسولؐ سے مختلف چیز تھی ورنہ حضرت علیؑ ضرور تسلیم کر لیتے۔ پھر حکومت کیوں چھوڑتے؟۔ اور علاوہ ازیں اگر "سیرتِ شیخین" مطابق سُنّتِ رسولؐ اور سُنّتِ اللہ ہوتی تو عبدالرحمٰن کو اس کی علیحدہ شرط لگانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ کیونکہ پھر اس کی ضروریات سُنّتِ خدا اور سُنّتِ رسولؐ ہی میں آجاتیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت علیؑ ان دونوں کی حکومتوں اور سیرتوں کو سُنّتِ خدا اور رسولؐ کے خلاف سمجھتے تھے اسی لئے احتجاج کرتے رہتے تھے۔ اب اگر اس شرط کو مان لیتے تو وہ دونوں برحق ثابت ہوجاتے اور علیؑ کا برسوں کا احتجاج (معاذ اللہ) باطل ثابت ہوجاتا۔ پس علیؑ نے اس شرط کو ناحق سمجھ کر رد کر دیا۔

نہایت اہم اور قابلِ غور نکتہ

حضرت عمر نے تو یہ کہا تھا کہ ہمیں صرف "قرآن" کافی ہے۔ لیکن عبدالرحمٰن بن عوف کو صرف قرآن کافی نظر نہ آیا بلکہ قرآن و سُنّتِ رسولؐ دونوں بھی کافی معلوم نہ ہوئیں اور "سیرتِ شیخین" کی بھی ضرورت پڑ گئی۔ یعنی عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عمر کے اس دعوے کو کہ "صرف قرآن کافی ہے" بالکل مسترد کر دیا اور ثابت کر دیا کہ حضرت عمر کا دعویٰ درست نہیں تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عمر کا دعویٰ مسترد کر کے غلطی کی اور حضرت عمر کا دعویٰ درست تھا تو پھر حضرت عثمان نے کیوں نہ ٹوکا کہ "اے عبدالرحمٰن! تم تین چیزوں کی شرط کیوں

پیش کرتے ہو؟ کیونکہ صرف قرآن کافی ہے۔ اسی پر عمل کرنے کی شرط پیش کرو۔ اور اے عبدالرحمٰن تم تو حضرت عمر کے پیروکار ہو ان کے قول پر کیوں عمل نہیں کرتے؟ صرف قرآن پر اکتفا کیوں نہیں کرتے؟" لیکن ٹوکنے کی بجائے حضرت عثمان نے تو تینوں چیزوں پر عمل کا وعدہ کر لیا اور اس کا مطلب یہی ہوا کہ حضرت عثمان نے بھی حضرت عمر کا وہ قول غلط تسلیم کر لیا کہ "صرف قرآن کافی ہے" مگر تعجب تو یہ ہے کہ پھر حضرت عمر کی پیروی کی شرط بھی مان لی! اگر پیروی کرنا تھی تو صرف قرآن کو کافی کیوں نہ سمجھا؟ اور اگر "صرف کتابِ خدا کافی نہ سمجھتے تھے تو پھر حضرت عمر کی پیروی چہ معنی؟

پس ایسی بے سروپا باتیں نہ تو سنّتِ خدا ہیں اور نہ سنّتِ رسولؐ ہیں اور نہ ہی ان کو جمہوریت کہا جا سکتا ہے۔

المختصر ان حکومتوں کا کوئی ایک اصول و قاعدہ نہ تھا۔ قاعدۂ تشکیلِ حکومت سقیفہ بقول حضرت عمر "ناگہانی" تھا۔ قاعدۂ حکومت دوم "نامزدگی"، قاعدۂ حکومتِ سوم "شوریٰ"۔ یعنی جیسا موقع دیکھا اپنی سیاسی مصلحتوں کے مطابق خود ہی بنا کر چلا دیا۔ اور اپنا کام نکال لیا۔ بھلا ان قاعدوں میں جمہوریت کہاں ہے؟ کیا ان تینوں حکومتوں کے لئے کبھی عام انتخابات ہوئے تھے؟ جب نہیں ہوئے تو "جمہوریت" کا نام ان حکومتوں پر کیسے چسپاں ہو سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو وہ تینوں حکومتیں جمہوری تھیں اور نہ ہی "جمہوریت" چلانا رسولؐ کا مقصد تھا۔ ورنہ رسولِ خدا "خلافت" کو قریش میں منحصر قرار نہ دیتے۔ لیکن رسولِ خدا کی حدیثیں صحاحِ ستہ میں موجود ہیں کہ "خلفاء" قریش میں سے ہوں گے "امراء" قریش میں سے ہوں گے۔" ان ارشادات کے مطابق اسلام میں "جمہوریت" ہرگز نہیں ہے۔ اور حضورؐ کے بعد کی تینوں حکومتیں نہ منصوص تھیں نہ جمہوری نہ اجماعی جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ "اجماع" ہرگز نہیں ہوا۔

ان تینوں حکومتوں کی تشکیل سے جو نتائج نکلتے ہیں ان میں قابلِ غور امر یہ ہے

کہ حضرت عمر نے جن چھ آدمیوں کو مقرر کیا۔ غیر شیعہ حضرات کی "عشرۂ مبشرہ" کی روایات کے مطابق اُن سب کو "جنتی" کہا جاتا ہے۔ لیکن حضرت عمر نے کہا کہ "ان میں سے اگر ایک اختلاف کرے اسے قتل کر دینا اگر دو مخالفت کریں دو کو قتل کر دینا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر "عشرہ مبشرہ" والوں کا قتل بھی جائز سمجھتے تھے۔ پس ایسی سیاست کو "جمہوریت" کہنا کیونکر درست ہے ؟ اور شوریٰ میں تین دن تک حکومت کا فیصلہ نہیں ہوا تو گذارہ ہو گیا مگر وفاتِ رسولؐ کے دن اتنی گنجائش بھی نہ سمجھی کہ جنازۂ رسولؐ دفن ہو جائے اس کے بعد حکومت کا تصفیہ ہو جائے۔ عجیب سیاست تھی۔ شوریٰ کا اصل بھید اُس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے جو تاریخ طبری میں مرقوم ہے کہ جب پہلا دن گزر گیا اور کوئی فیصلہ نہ ہوا تو سعد بن ابی وقاص نے عبدالرحمٰن بن عوف سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم میں ضعف آگیا ہے۔ جو تمہاری رائے ہے سو کر ڈالو۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ عمر کیا چاہتے تھے"۔ پس صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت عمر نے جو چاہا تھا وہی عبدالرحمٰن بن عوف نے کیا۔ اور یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت عمر نے اپنی خواہش کے مطابق وہ ارکانِ شوریٰ مقرر کئے جن میں سے تین حضرت عثمان کے حامی جان بوجھ کر رکھے یعنی عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص دونوں حضرت عثمان کے رشتہ دار ہی تھے اور طلحہ بھی حامی تھے۔ تو حضرت عمر کے مقرر کردہ ارکان اور پروگرام کے مطابق یہ بات یقینی تھی کہ حضرت عثمان مقرر ہو جائیں گے اور حضرت علیؑ کو صرف نام اس لئے رکھا کہ لوگوں کے منہ بند ہو جائیں۔ کسی کو اعتراض کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ لیکن حضرت علیؑ نے وہاں بھی احتجاج و اظہارِ حق فرمایا۔ ارشاد فرمایا۔

"یہ پہلا دن نہیں ہے کہ تم نے ہمارے حق سے ہمیں ہٹانے کے لئے زیادتی کی اور ہمیں ہمارے حق سے علیحدہ کیا"۔

پس حضرت علیؑ نے صاف بتا دیا کہ شوریٰ میں بھی ہمارا حق دبایا گیا۔

حضرت عثمان ۷۰ برس کی عمر میں حکومت پر قابض ہوئے اور اُن کا دور بنی اُمیہ

کے لئے تو بہت ہی خوشحالی اور دولت مندی و نفع اندوزی کا دور تھا لیکن عوام الناس دکھی تھے کیونکہ بنی اُمیہ کو (جو حضرت عثمان کے اقربا تھے) اتنا نوازا گیا کہ ولید اور عبداللہ بن ابی سرح جیسے فاسق و فاجر اور شرابی گورنر بنا دیئے گئے جو شراب پی کر نماز پڑھانے لگے (استیعاب جلد ۲ صفحہ ۵۹۶، تاریخ خلفا سیوطی. بخاری پ ۱۵ ص ۴۳ مطبع احمدی لاہور) مروان جیسا راندۂ درگاہ رسولؐ جس پر (بقول حضرت عائشہ بھی) رسولؐ خدا نے لعنت کی تھی۔ حکومت کی مہر سپرد کر کے مختار عام بنا دیا گیا جس نے حضرت محمدؐ بن ابی بکرؓ کے قتل کا پروانہ لکھ کر مہر لگائی اور روانہ کر دیا۔ (خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا تجزیہ مرتبہ غلام علی ص ۴۵۳، البدایہ ابن کثیر جلد ۸، العبر فی خبر من غبر جزء اوّل ص ۳۲ مولفہ ذہبی۔ تاریخ خلفا سیوطی۔ تاریخ کامل ابن اثیر) اصحاب رسولؐ پر ستم ہوئے۔ ابوذر غفاریؓ کو زبدہ جلاوطن کیا گیا (صحیح بخاری پ ۶ ص ۱۲ مطبوعہ احمدی لاہور۔ اردو ترجمہ تمدن اسلام جرجی زیدان حصہ دوم ص ۱۵)

حضرت عمار بن یاسرؓ کو تختۂ مشق ستم بنایا گیا (تاریخ اعثم کوفی۔ تاریخ اسلام علامہ سیاسی ص ۲۶۴، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی پسلیاں توڑی گئیں (تاریخ اسلام جلد ۳ ص ۱۳۱)۔

ان تمام واقعات نے جب عوام کو دکھی کر دیا تو عوام ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ حضرت عثمان کو حکومت دینے والے عبدالرحمٰن بن عوف تک مخالف ہو گئے۔ (عقد الفرید ج ۳ ص ۷۹)

اور حضرت عائشہ تو پہلے ہی حضرت عثمان کے قتل کا حکم دیا کرتی تھیں۔ (شرح ابن ابی الحدید جلد ۲ ص ۴۴، تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۱۰۵)

پس ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے گھیراؤ کر لیا اور حضرت عثمان قتل ہو گئے۔ مگر عوام کے مطالبے کے باوجود مروان کو ان کے حوالے نہ کیا۔

الغرض غلط قیادت کی آزمائش و نتائج نے اب مسلمانوں کے احساسات کو جھنجوڑا اور یہ احساس اُبھرا کہ قیادت ایسے حاکم کے ہاتھوں ہونا چاہیئے جو عوامی فلاح و بہبود

اور اجتماعی مفاد پر نظر رکھنے چنانچہ اب نگاہیں حضرت علیؑ کی طرف اٹھیں۔ جمہور جاگا
اور ضمیر بیدار ہوئے۔ کردار علویؑ کی اعتدال پسندی اور اصول شناسی کی قدر
معلوم ہوئی چنانچہ باتفاق رائے یہ فیصلہ کیا گیا کہ جناب امیر علیہ السلام سے خلافت کی
درخواست کی جائے۔ ایک وفد حضرات زبیر و طلحہ کی قیادت میں آپ کی خدمت میں
پیش ہوا کہ بگڑی بنائیں۔ حضرتؑ نے یہ پیشکش قبول کرنے میں توقف فرمایا اور ارشاد کیا
کہ میں تمہارے معاملات میں دخل انداز ہونا نہیں چاہتا۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو
اور جسے تمہارا دل چاہے اپنا امیر مقرر کر لو۔ ان لوگوں نے عرض کی: "ہم آپؑ سے زیادہ
کسی کو خلافت کا حق دار نہیں سمجھتے نہ سابقہ خدمات کے لحاظ سے آپ سے کوئی مقدم
ہے اور نہ کوئی رسولؐ اللہ سے قرابت میں آپ سے قریب تر ہے" (تاریخ کامل جلد ۳
ص ۹۸) آپؑ نے پھر انکار کیا مگر وہ لوگ آمادگی پر اصرار کرتے رہے اور جب یہ دیکھا کہ حضرت
کسی طرح سے حکومتی اقتدار حاصل کرنے پر رضامند نہیں ہیں تو گڑگڑا کر کہنے لگے: "ہم
آپ کو اللہ کا واسطہ دیتے ہیں۔ آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہم کس عالم میں ہیں۔ کیا آپ کو اسلام
کی حالت اور ابھرتے ہوئے فتنے نظر نہیں آ رہے؟ کیا آپؑ اللہ سے نہیں ڈرتے"۔
(تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۹۹) (صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی حالت
بگڑ چکی تھی اور فتنے سر اٹھا چکے تھے) چنانچہ اب اسلامی سیاست کے حقیقی مدبر کے
لئے ضروری تھا کہ ادائے فرض سے پہلوتہی نہ کرے۔ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا: "مجھے
منظور ہے۔ مگر اس بات کو جان لو کہ یہ منظوری اس صورت میں ہے کہ میں تمہیں اُس
راہ پر چلاؤں گا جسے میں بہتر سمجھوں گا" (تاریخ کامل جلد ۳ ص ۲۲)

واضح رہے کہ اب کسی نے بھی سیرت شیخین کی پابندی کی شرط عائد نہیں کی اور
آپ کی متعینہ راہ کو بلا چوں و چرا تسلیم کر لیا۔ حضرت کی منظوری کے بعد عمومی بیعت کا
اہتمام کیا گیا۔ حضرت امیر بڑی سادگی سے ایک پرانا عمامہ سر پر رکھے۔ ایک ہاتھ میں جوتے
اٹھائے اور دوسرے ہاتھ میں کمان لئے مسجد میں تشریف لائے اور منبر کی طرف بڑھے عین
اُس مقام پر تشریف فرما ہوئے کہ جہاں سرور کائنات جلوہ افروز ہوا کرتے تھے اور شکر کیا

اُس پروردگار کا جس نے حق کو حق کی طرف لوٹایا۔ لوگ بیعت پر اس طرح ٹوٹے جس طرح پیاسے پانی کی طرف لپکتے ہیں۔ تمام موجود اہلِ بدر صحابہ نے آگے بڑھ کر دستِ بیعت بڑھائے کہ ہم آپؑ سے زیادہ کسی کو خلافت کا مستحق نہیں سمجھتے۔ ان بیعت کرنیوالوں میں مہاجرین و انصار کے علاوہ یمن، مصر، عراق وغیرہ کے باشندے بھی شامل تھے اور اس طرح متفقہ طور پر آپکی خلافت تسلیم کی گئی۔ تکمیلِ بیعت کے بعد خطیبِ انصار ثابت ابن قیس نے انصار کی ترجمانی ان الفاظ میں کی "خدا کی قسم اے امیرالمومنین! اگرچہ وہ لوگ (خلفائے ثلاثہ) حکومت میں آپؑ سے سابق تھے مگر دین میں آپؑ سے سبقت نہ لے جا سکے (اگر کل وہ آپؑ سے (حکومت میں) آگے بڑھ گئے تھے تو آج آپؑ بھی اُسی مقام پر آ گئے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے نہ آپ کا مرتبہ ڈھکا چھپا تھا نہ آپ کی منزلت انجانی تھی۔ وہ آپؑ کے محتاج تھے ان چیزوں میں جنھیں نہیں جانتے تھے۔ اور آپ اپنے علم کی بنا پر کسی کے محتاج نہیں رہے"۔ (صواعقِ محرقہ ص۱۱)

دَورِ حکومت

حضرت امیرالمومنینؑ کسی محلاتی سازش کے تحت برسرِ اقتدار نہ آئے۔ بلکہ ہر شخص کو اس کی رائے پر آزاد چھوڑ دیا۔ کسی دباؤ یا رغبت کے عنصر کو بروئے کار نہ لائے۔ بلکہ جس نے بیعت سے علیحدگی اختیار کرنا چاہی اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ سعد ابنِ ابی وقاص اور عبداللہ ابنِ عمر کو البتہ بیعت کے لئے کہا۔ سعد تو یہ کہہ کر دفع وقتی کر گئے کہ میں بھی دوسرے لوگوں کے بعد بیعت کر لوں گا، اور یقین دلایا کہ مخالفت نہ کروں گا۔ لیکن عبداللہ ابنِ عمر نے انکار کر دیا۔ چنانچہ جناب امیرؑ نے انہیں فرمایا کہ تم اس کی ضمانت دو کہ نقصِ امن پیدا نہ کرو گے مگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوئے۔ چنانچہ حضرت مالک اشتر طیش میں آئے۔ لیکن حضرت علیؑ نے اُن سے فرمایا۔ تم اس سے کوئی تعرض نہ کرو میں خود اس کا ضامن ہوتا ہوں۔ یہ بچپن میں بھی کج خلق تھا اور بڑا ہو کر بھی کج خلق ہی رہا۔ لہٰذا آپ کو کوئی ایسی مثال نہ ملے گی کہ جناب امیرؑ نے محض بیعت کی خاطر کسی کو بھی ہراساں کیا ہو۔ کچھ ایسے بھی افراد تھے جنھوں نے بیعت کرتے وقت بڑی سرگرمی و گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن جب ان کے مطالب پورے ہوتے

نظر نہ آئے تو انہوں نے بیعت توڑ دی اور اس بیعت شکنی کی وجہ بعد میں "جبر" گھڑ لی تاکہ بدنامی اور عہد شکنی کے دھبے سے محفوظ رہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ ان میں ایسے اشخاص ہیں جنہوں نے خود حضرت علیؑ کو مسندِ حکومت پر بٹھانے والے گروہ کی قیادت کی تھی آخر اس شخص کو جو حکومت لینے پر ہی راضی نہیں کیا ضرورت تھی کہ محض ایک دو اشخاص کو اپنی موافقت میں رائے دینے پر مجبور کرتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اشخاص نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کے اثر و رسوخ سے تقویت حاصل ہوتی تو پھر یہ معاملہ سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر جیسی شخصیتوں کے لئے بھی ہونا ضروری تھا۔ جو اُن سے کہیں زیادہ بااثر اور بارسوخ تھے پس صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک حیلہ تھا اور اپنی غلطی کے تحفّظ کا بہانہ تھا۔

جس طرح پیغمبر خواہ وہ ظاہری طور پر مسندِ حکومت پر ہو یا نہ ہو نمائندہ حکومتِ الٰہیہ ہوتا ہے اور اس طرح امام منصوص بھی خلیفہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جناب امیر المومنین کو خلافت حکومتِ الٰہیہ تو منجانب خدا حاصل تھی ہی۔ اب ظاہری اقتدار بڑے منصفانہ طریقے (جمہورانہ انداز) سے حاصل ہوگیا۔ اس لحاظ سے آپ ہر نظریے کے حامل افراد کے حاکم تھے اور ہر ایک پر آپؑ کی اطاعت واجب تھی۔ اس ظاہری اقتدار کے مل جانے پر نہ تو علیؑ کے مرتبے میں کوئی اضافہ ہوا اور نہ کوئی فضیلت ملی بلکہ امام احمد بن حنبل نے کیا خوب کہا ہے کہ "اے لوگو! تم علیؑ اور خلافت (خلافت اور علیؑ کو طول دے رہے ہو۔ خلافت نے علیؑ کے لئے کوئی زینت کا سامان نہیں کیا بلکہ علیؑ نے خلافت کو زینت بخشی ہے"۔

(تاریخ خطیب بغدادی جلد ۱ ص ۱۳۵)

قبل از اسلام ساری دنیا امپیریل ازم کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی چنانچہ اسلام نے شخصی حکومت کو ختم کرکے "حکومتِ الٰہیہ" کا پیغام دیا۔ اور اللہ تعالےٰ کے اقتدارِ اعلےٰ کی تعلیم فرمائی۔ پیغمبرِ اسلام سیّد المرسلین، رحمت للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا مقصدِ نبوّت حکومتِ الٰہیہ کی تشکیل بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے درسِ توحید دے کر تمام انسانوں کو ایک مرکزیت پر جمع ہونے کی دعوت دی تاکہ قانونِ خداوندی کا نفاذ ہو۔ خود برسرِ اقتدار آکر انہوں نے ہمیں اس خدائی حکومت

کی عملاً ابدی تعلیم دی۔ مگر افسوس کہ آنحضرتؐ نے جس نظام پر حکومت کی بنیاد رکھی تھی اُسے حضورؐ کے بعد ختم کر دیا گیا اور اللہ کی حاکمیت کی بجائے شہنشاہیت اور آمریت کو نئی شکل سے پھر سے جاری کر دیا گیا۔ حالانکہ آمریت، شخصی حکومت، ملوکیت اور جمہوریت وغیرہ کی اسلام میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کیونکہ حکومتِ الٰہیّہ کا معیار نہ ہی دنیوی مال و دولت ہے اور نہ ہی رائے عامہ بلکہ اسلامی حکومت کی بہترین صورت یہ ہے کہ سربراہ وہی ہو جسے خداوند تعالیٰ نے خود مقرر کیا ہو۔ اور اس کی اطلاع رسولِ خدا کے ذریعے ہوئی ہو۔ وہی نمائندہ الٰہی حاکمیت کی اساس پر حکومت کرے۔ اور اللہ کے احکام و قوانین کو نافذ کرے۔ محض کسی مسلمان کے برسرِ اقتدار آجانے کو اسلامی حکومت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ایسا کرنا اسلامی طرزِ حکومت سے بے خبری کی دلیل ہے لیکن اگر خدا کا ایسا نمائندہ حاضر و ظاہر نہ ہو تو ایسی صورت میں اُس کا مقرر کیا ہوا نائب ہو۔ اور اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو تو ایسا مومن متقی ہو جو علم و عمل میں سب سے زیادہ اعلےٰ ہو[۵]۔

حضرت امیر المومنینؑ کی حکومت صحیح معنوں میں اسلامی حکومت تھی اُن سے پہلے حکمرانوں کے ادوار کو اگر دورِ رسالت کے آئینے میں دیکھا جائے تو یہ فرق خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ ان حضرات کے زمانے دورِ رسولؐ سے بہت مختلف تھے لیکن کچھ لوگ ان حاکموں کی وکالت کرتے ہوئے بعض اوقات صفائی کے دلائل میں حیثیتِ رسولؐ کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ بلکہ نبوّت کی حیثیت کو محض ان حاکموں سے اپنی عقیدت کی بنا پر تبدیل کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر ان کی توضیح مان لی جائے تو پورا دین دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ مثلاً مولوی شبلی نعمانی یوں رقمطراز ہیں۔

"نبوّت کی حیثیت کی نسبت عموماً لوگ غلطی کرتے آئے ہیں اور اسلام کے زمانے میں بھی یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔ اکثروں کا خیال ہے کہ نبی کا ہر قول و فعل خدا کی طرف سے

---

[۵] خدا کا نمائندہ معصوم ہوگا اور علم وہبی کی بنیاد پر اپنے نائب کا تقرر کریگا۔ لہٰذا نائب اگر کسی کی نامزدگی کرے گا تو اُس کی بنیاد بھی علم پر ہوگی۔

سے ہوتا ہے بعضوں نے ذرا ہمت کی تو صرف معاشرت کی باتوں کو مستثنےٰ کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ نبی جو حکم منصب نبوّت کی حیثیت سے دیتا ہے وہ بے شبہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ باقی اُمور وقت اور ضرورت کے لحاظ سے ہوتے ہیں، تشریعی و مذہبی نہیں ہوتے۔ اس مسئلے کو جس قدر عمر نے صاف کر دیا کسی نے نہیں کیا۔ خراج کی تشخیص، جزیہ کا تعین اُم الولد کی خرید فروخت وغیرہ وغیرہ مسائل کے متعلق امام شافعی نے اپنی کتابوں میں بہت ادعا کے ساتھ احادیث سے استدلال کیا ہے جہاں حضرت عمر کا طریق عمل مختلف ہے بڑی دلیری سے ان پر قدح کی ہے۔ مگر امام شافعی نے یہ نکتہ نظر انداز کیا کہ یہ امور منصب نبوّت سے تعلق نہیں رکھتے۔"

اس کے بعد مولوی شبلی اس بات کی کچھ مثالیں تحریر کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے رسولؐ خدا کے احکام کے خلاف حسبِ ضرورت ردّ و بدل کیا اور پھر لکھتے ہیں کہ "ان تمام باتوں سے تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ حضرت عمر ان باتوں کو منصبِ نبوّت سے الگ سمجھتے تھے۔ ورنہ اگر باوجود اس امر کے علم کے کہ وہ باتیں منصبِ رسالت سے تعلق رکھتی تھیں ان میں دخل دیتے تو بزرگ ماننا تو درکنار ہم ان کو اسلام کے دائرے سے بھی باہر سمجھتے۔"

(الفاروق حصّہ دوم از مولوی شبلی نعمانی ص۴۹۹)

نکتہ | مولوی شبلی صاحب کے وضع کردہ کلیے کے مطابق اگر رسولؐ کی سیرت کو دو حصّوں میں تقسیم کر لیا جائے تو ایک حصّہ نبوی ہوگا اور دوسرا غیر نبوی۔

اب ایک ایسا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ جس حصّے میں آپ غیر نبوی مانیں گے۔ اسکے معنی انکارِ نبوت ہوں گے یا نہیں؟ یعنی مثلاً یہ کہ (معاذ اللہ) ایک بجے تو نبی ہوں اور دو بجے جب کھانا کھانے لگیں تو نبی نہ رہیں (نعوذ باللہ من ذالک)۔ ایسے عقیدے کو ایمان کیونکر کہا جائے گا؟ حالانکہ نبی کی نبوت کے انکار کا خیال تک بھی کفر ہے اس لئے دو حیثیتوں والا نظریہ قطعاً باطل ہے۔ اگر نبی کی حیثیت اس طرح کی ہوتی تو آپ کی مکمل اطاعت کا حکم نہ دیا جاتا۔ افہما۔ دوم یہ کہ قرآن مجید نے رسولِ خدا کے متعلق صاف

طور سے بتایا ہے کہ آپ کا ہر قول اور ہر فعل وحی کے مطابق ہے اسکے باوجود مولوی شبلی نعمانی نے حضورؐ کے ارشادات و افعال کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ اس سلسلے میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ کسی ارشاد یا فعل کے متعلق یہ کیونکر پہچانا جائے گا کہ یہ ارشاد یا فعل منصبِ نبوّت کی حیثیت سے ہے یا نہیں؟ آخر وہ کون کی کسوٹی ہے جس پر یہ پرکھا جائے گا؟

تیسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ جب رسولؐ خدا کے اقوال و افعال کی دو مختلف صُورتیں مانی جائیں تو قول و فعل کو قابلِ اعتماد کس طرح ثابت کیا جا سکے گا؟ کیونکہ ایسی حالت میں یہ امکان موجود رہے گا کہ منصبِ نبوت والے اقوال و افعال کو قسمِ مخالف کے سمجھ لیا جائے اور مخالف قسم کے افعال و اقوال کو منصبِ نبوّت والے سمجھ لیا جائے۔ پھر آخر ہدایت کس طرح حاصل ہوگی؟

پس مولوی شبلی نعمانی اپنے ایک ممدوح سے عقیدت کی بناء پر حد سے گزر گئے ہیں اور انھوں نے فی الحقیقت حیثیتِ رسولؐ پر حملہ کیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب میں فرماتا ہے کہ

"کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور رسولؐ کوئی فیصلہ کریں تو پھر اس مومن مرد یا عورت کو اپنے امر کا کوئی اختیار رہ جائے اور جو شخص خدا اور رسولؐ کی حکم عدولی کرے گا وہ گمراہ ترین ہوگا۔"

کاش مولوی شبلی نعمانی یہ غور کر لیتے کہ حضور کے ہر حکم کی اطاعت کا حکم اللہ نے قرآن میں دیا ہے بلکہ رسولؐ خدا کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اگر بعض امور کو دین سے غیر متعلق سمجھ لیا جائے تو تکمیلِ دین کے دعوے کا کیا بنے گا؟

سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مولوی شبلی نعمانی نے تو اپنے ایک ممدوح کی حمایت میں رسولؐ خدا کو بعض امور میں گویا دائرہ نبوّت سے ہی خارج سمجھ لیا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)۔

چنانچہ اس عبارت کو نقل کرنے کا ہمارا منشا یہ ہے کہ بعد از رسولؐ حکومتوں نے ایسے طریقے بھی اختیار کئے جن میں ان کا طرزِ عمل رسولؐ سے مختلف تھا، یہی وہ بنا تھی کہ حضرت علیؑ نے سیرتِ شیخین کو قبول نہ کیا۔ کیونکہ آپؑ کا عقیدہ یہ تھا کہ اُمت کو ایسا اختیار حاصل نہیں ہے کہ سنّتِ رسولؐ کے خلاف کوئی اَمر جاری کرے۔ لہٰذا جب آپؑ خود مسندِ حکومت پر آئے تو آپ نے حالات کی تبدیلی اور انسانی مزاج کی تغیر پذیری کے باوجود "حکومتِ الٰہیہ" کے تقاضوں کے مطابق حکومت کی تشکیل کی۔ اور رسولؐ اللہ کی سیرتِ طیبہ کی روشنی میں اپنی حکومت کی اساس رکھی۔ اگرچہ آپؑ کا دورِ حکومت بہت مختصر تھا اور وہ بھی شورشوں اور ہنگاموں کی آماجگاہ بن گیا تھا مگر اس تھوڑے عرصے میں بھی اسلامی حکومت کے خدوخال کو اس طرح نمایاں کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا کہ دوبارہ زمانۂ رسولؐ آنکھوں کے سامنے پھر گیا کیونکہ قدرت کے مقرر کردہ نمونہ تھے۔ لہٰذا جب دوسروں کی حکومت تھی نہایت صبر سے بالکل پُرامن رہ کر زندگی بسر کی یعنی کسی قسم کا نقضِ امن پیدا نہیں کیا۔ کوئی فساد برپا نہیں کیا اور اس طرزِ عمل سے لوگوں کو صبر و امن کی تعلیم دی۔ اسی طرح اگر آپ لوگوں کی درخواست کے باوجود برسرِ اقتدار آ کر زمامِ حکومت اپنے ہاتھوں میں نہ لیتے تو مسلمانوں پر حکومتِ الٰہیہ کا مفہوم کبھی روشن نہ ہوتا۔ چنانچہ آپکے مختصر دور میں بڑے مصائب پیش آئے لیکن واقعی آپؑ نے جس حسن و خوبی سے اسلامی اصول و آئین کے عین مطابق ان کا مقابلہ کیا وہ ساری دنیا کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ چونکہ آپؑ خلیفۂ برحق اور اُمت کے لئے خدا کے بنائے ہوئے اور رسولِ خدا کے بتائے ہوئے ہادی تھے لہٰذا آپنے سیاست کا کوئی ایسا گوشہ نہ چھوڑا جس پر خود عمل کر کے تعلیم نہ فرمادی ہو خواہ اس کا تعلق حالتِ اقتدار سے ہو یا اس کے برعکس۔

جنابِ امیر علیہ السلام نے اقتدار کو کوئی اہم شے نہ سمجھا۔ چنانچہ ایک موقع پر اپنے جوتے کے بارے میں ابنِ عباس سے پوچھا کہ اس کی قیمت کیا ہوگی؟ کہا کہ اس جوتے کی کچھ بھی قیمت نہیں۔ تو فرمایا۔ "خدا کی قسم اگر میرے پیشِ نظر حق کا قیام اور باطل

کا مانا نہ ہو تو تم لوگوں پر حکومت کرنے سے یہ جوتا مجھے کہیں زیادہ عزیز ہے۔" اس قول سے حضرت امیرؑ نے پوری سیاست الٰہیہ اور حکومت کی غرض وغایت بیان کر دی یعنی قیام حق اور استیصال باطل۔ چنانچہ آپؑ کی حکومت اسی بنیاد پر قائم رہی یعنی حق کی سربلندی اور باطل کی سرکوبی کی ذمہ دار تھی۔ آپؑ ہمیشہ اپنے موقف حقہ پر ڈٹے رہے۔ اسلامی تعلیمات سے ذہنوں میں انقلاب پیدا کیا۔ مخالف طوفان آئے مگر آپ مضبوط چٹان کی طرح ثابت قدم رہے۔ چونکہ اسلامی سیاست میں ہوسِ ملک گیری مذموم ہے لہٰذا آپ اس طرف متوجہ نہ ہوئے۔ مگر دلوں کی تسخیر اور ذہنوں کی تعمیر کشور کشائی سے کہیں بڑا کارنامہ ہے۔ دنیا میں کس قدر فاتح گزرے۔ سکندر اعظم، چنگیز خاں، ہلاکو خاں، ہٹلر وغیرہ لیکن ان فتوحات و وسعت سلطنت کے باوجود آج لوگوں کو اُن سے کوئی عقیدت نہیں۔ طاقت کے بل پر غلبہ پا لینا اور بات ہے اور اس غلبے کی زندگی بھی مختصر ہے لیکن علم و عمل خیر سے لوگوں کے دل جیتنا اور بات ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا لیکن ہم کہتے ہیں کہ نہیں۔ اسلام تلوار سے ہرگز نہیں پھیلا بلکہ مسلمانوں کی سلطنت کی حدود کو تلوار نے وسعت دی ہے۔ اسلام تو حضرات محمدؐ و آل محمدؐ کے علمی و عملی کارناموں کی بدولت زندہ رہا اور پھیلا۔ یہ کارنامے ایسے ہیں کہ جن کی وجہ سے آج بھی لوگ ان کا کلمہ پڑھتے ہیں ان پاک ہستیوں ہی کے سیاسی تدبر کی وجہ سے اسلام زندہ اور قائم رہا۔

حضرت امیرالمومنینؑ نے گوناگوں مشکلات کے باوجود معاشرے کی تطہیر کی۔ رفاہ عامہ کے کام انجام دیئے۔ رعایا کے لئے ہمیشہ کھلی کچہریاں لگائیں۔ ان کی شکایت رفع کیں۔ تعمیری عناصر کی حوصلہ افزائی فرمائی اور تخریبی طاقتوں کا زبردست مقابلہ کیا۔ حقوق و فرائض کی نگہبانی کی۔ اور عدل کو ہر جہت سے فروغ دیا۔ آپ کے پیش نظر ایک معیاری معاشرہ کا قیام تھا۔ جو ظلم وجور اور خیانت سے پاک ہو۔ عمال کی کڑی نگرانی کی۔ اور اکثر دبیشتر ان کو ہدایات جاری فرماتے رہے۔ ہم نے جو اسلامی منشور پچھلے صفحات میں "اسلامی دستور حکومت" کے تحت نقل کیا ہے اُسے بغور عمیق دیکھئے۔ وہ

افادیت کے لحاظ سے ہمہ گیر ہے کسی زمانے، طبقے یا ملک سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ آج بھی اس کی افادیت وہی ہے جو چودہ سو سال قبل تھی۔ ہر حکومت اُس سے فائدہ حاصل کر سکتی ہے۔ اب ذرا اُسی دستوری دستاویز کے مطابق سرکار ولایت مآب حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے عہد روشن پر ایک نظر ڈالیں۔

عمّالِ حکومت

تمدّن و معاشرت و تنظیم حکومت سے وابستہ ہوا کرتے ہیں حکومت کسی بھی طرز کی ہو۔ انسانی معاشرہ پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے اور عوام اپنے حکام کے اطوار سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر حاکم بلند کردار ہو تو محکوم میں حُسنِ عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر حاکم خود غرض، رشوت خور اور استحصال پسند (ناجائز حصول کو کہنے والا) ہوگا تو رعایا بھی اُسی ڈگر پر چل نکلے گی۔ حکومت کے انتظامی و اصلاحی امور کا نفاذ اُس کے حکام کے ذریعے سے عمل میں آتا ہے اور اُن حکام کا تقرر سربراہِ مملکت کی صوابدید پر ہوتا ہے۔ اسلئے عوامی فلاح و بہبود کا تقاضا یہ ہے کہ اُن پر عمّال (حاکم) مقرر کرتے وقت سربراہِ حکومت باریک بینی سے کام لے۔ اسلامی دستورِ حکومت میں کسی عامل کا معیارِ تقرر علم ضروری، تقویٰ اور صلاحیتِ کار کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے سب سے پہلے اس طرف توجہ فرمائی کہ کلیدی عہدوں پر صرف وہی لوگ فائز کئے جائیں۔ جن کی امانت، دیانت، نیکی اور راست روی پر مکمل اعتماد ہو۔ چنانچہ علامہ ابن عبد البر اپنی کتاب استیعاب فی معرفت الاصحاب جلد ۳ ص ۴۷ میں لکھتے ہیں کہ "حضرت علیؑ انہی لوگوں کو والی و حاکم مقرر کرتے تھے جو امین اور دیانت دار ہوتے تھے"۔ چنانچہ آپؑ نے خود ایک موقع پر فرمایا "عمّال کو عہدہ دینے میں کسی سفارش کو قبول نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ کیا وہ امین اور اس کام کے لئے موزوں ہے؟" چنانچہ اسی اصول پر آپؑ نے تمام تقررات فرمائے۔ آپؑ کے عمّال میں کچھ کا تعلق بنی ہاشم سے بھی تھا لیکن اُن کو یہ عہدے بنی ہاشم ہونے کی وجہ سے عطا نہ کئے گئے تھے۔ بلکہ خوبیوں اور صلاحیتوں (MERITS) کی بنیاد پر انہیں یہ ذمہ داریاں دی گئیں۔ یہی وجہ ہے

کہ مخالفین بھی اُن گورنروں یا افسروں کی انتظامی صلاحیتوں، اور ان کے تقویٰ و دیانت پر شک نہیں کر سکے۔ لیکن سابقہ حکومتوں نے عہدے دینے میں بنی ہاشم کو بالکل نظر انداز کیا حالانکہ ایسا کرنے کا کوئی جواز نہ تھا جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ سابقہ حکومتیں استحقاق، صلاحیت و دیانت کی بجائے اپنے خاص مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُنہی لوگوں کو عہدے دیتی تھیں جو برسرِ اقتدار گروہ کے مفاد کو اصول بنا کر تعاون کرنے والے ہوتے تھے اور ظاہر ہے کہ بنی ہاشم سے یہ اُمید اُن لوگوں کو نہ تھی۔ اسی وجہ سے بنی ہاشم کی تمام خوبیوں کو نظر انداز کر کے انہیں عہدوں سے محروم رکھا گیا۔

چونکہ عمال حکومت ملک میں تعمیری اور تخریبی دونوں قسم کی سرگرمیاں کر سکتے ہیں لہٰذا سربراہِ مملکت کا عمال کی حرکات و سکنات سے اچھی طرح باخبر ہونا نہایت ضروری ہے۔ امیرالمومنینؑ انسانی مزاج کی بے ثباتی کو خوب جانتے تھے۔ لہٰذا عمال پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ افسروں کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لیا کرتے تھے حتیٰ کہ ان کی رہائش اور خورد و نوش تک ملاحظہ فرماتے تھے۔ بیت المال کی جانچ پڑتال دقیق نگاہوں سے کرتے تھے۔ اور اگر کسی عامل کی شکایت سُنتے تو فوراً اللہ کی بارگاہ میں عرض کرتے۔

"اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نے انہیں تیری مخلوق پر ظلم کرنے اور تیرے حق کو نظر انداز کرنے کا حکم نہیں دیا۔" پھر اس عامل کا محاسبہ کر کے اس سے مواخذہ کرتے اور مناسب سزا دیتے۔

والیٔ بصرہ عثمان ابن حنیفؒ ایک دعوت میں شریک ہوئے۔ حضرتؑ کو معلوم ہوا انہیں لکھا "مجھے معلوم نہ تھا کہ تم ان لوگوں کی دعوت میں شریک ہو گے جن کے یہاں نادار فقیر ٹھکرائے گئے اور دولتمند مدعو کئے گئے ہوں۔ جو لقمے چباتے ہو انہیں دیکھ لیا کرو اور جس کے متعلق شبہ ہو اُسے تھوک دو (جائز ناجائز کی تمیز کر لیا کرو) جس کے پاک و پاکیزہ طریق سے حاصل ہونے کا یقین ہو اس میں سے کھاؤ۔ اے ابن حنیف! اللہ سے ڈرتے رہو اور اپنی روٹیوں پر قناعت کرو تاکہ

جہنم کی آگ سے چھٹکارا پاسکو "

اسی طرح جب ابن عباس کی شکایت بنی تمیم نے کی کہ ان کا رویہ سخت ہے تو انہیں تنبیہ فرمائی کہ "خدا تم پر رحم کرے۔ رعایا کے بارے میں تمہارے ہاتھ اور زبان سے جو اچھائی یا برائی ہونے والی ہو اس میں جلدبازی نہ کیا کرو (یعنی ہر کام اچھی طرح سوچ سمجھ کر کیا کرو) کیونکہ ہم دونوں اس ذمہ داری میں برابر کے شریک ہیں "

منذر ابن جارود عبدی دائی اصطخر کے بارے میں خورد برد کی شکایت موصول ہوئی اُسے تحریر کیا "مجھے تمہارے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی آخرت کو بگاڑ کر اپنی دنیا سنوار رہے ہو۔ اور دین سے رشتہ توڑ کر اقربا پروری کر رہے ہو۔ تم اس قابل نہیں کہ تمہیں امانت میں شریک کیا جائے یا خیانت کی روک تھام میں تم پر بھروسہ کیا جائے۔ لہٰذا جب میرا خط ملے تو فوراً میرے پاس حاضر ہو جاؤ "۔ جب منذر حضرت کے پاس آیا تو حساب کتاب کے بعد اُس کے ذمہ تیس ہزار درہم نکلے۔ منذر نے اعتراف جرم سے انکار کیا اور کہا کہ میرے ذمہ کوئی رقم نہیں ہے۔ حضرت نے اُسے قسم کھانے کو کہا لیکن اُس نے قسم کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ آپ نے اُسے فوراً جیل بھیجدیا۔

زیاد بن سمیہ کو لکھا "اگر مجھے معلوم ہو گیا کہ تم نے مسلمانوں کے مال میں خیانت کرتے ہوئے کسی چھوٹی یا بڑی چیز میں ہیرا پھیری کی تو یاد رکھو میں تمہیں ایسی سزا دوں گا جو تمہیں تہی دست، بوجھل پیٹھ والا اور بے آبرو کر کے چھوڑے گا "

ان مثالوں سے جناب امیرؑ کا کنٹرول واضح ہوجاتا ہے۔

سکریننگ

جب قائد ثقل دوم مولا علیؑ کو اقتدار حاصل ہوا تو اُس وقت مملکت پر سابقہ حکومتوں کے مقرر کردہ عمال کا راج تھا۔ ان والیوں نے عوام پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا حضرت عثمان کے قتل کی وجہ بھی یہی تھی۔ اور عوام ان حکام کے کردار سے سخت نالاں تھے۔ چنانچہ جب حضرت علیؑ نے حکومت سنبھالی تو انہوں نے سب سے پہلے اس مسئلے کو ہاتھ میں لیا۔ آپؑ نے اپنی سیاسی بصیرت (جو کہ سیاست الٰہیہ تھی) کے مطابق سارے ملک میں عام سکریننگ کا حکم صادر فرما دیا اور اُن تمام

کلیدی عہدے داروں کی برطرفی کے احکام جاری فرمادیئے جو نا اہل یا بد دیانت وخائن تھے کیونکہ اسلامی سیاست ایک لمحہ کبھی ایسے حاکم کو برداشت نہیں کرتی جو ظلم و تعدّی کو اپنا شیوہ اور لوٹ کھسوٹ کو اپنا وطیرہ بنائے۔ بھلا حضرت امیرؑ جو سیاست الٰہیہ کے علمبردار تھے یہ کس طرح برداشت کرسکتے تھے کہ اُن کی حکومت میں غلط کردار کے لوگ والی رہیں۔

اس سکریننگ پر مکر وفریب کی سیاست اعتراض وارد کرے گی کہ وہ حالات ایسے نہ تھے ویسے نہ تھے۔ کسی حیلے وبہانے سے کام چلایا ہوتا۔ یہ کیا ہوتا وہ کیا ہوتا۔ اور یہ ذہنیت صرف انہی لوگوں کی ہوسکتی ہے جو بے ایمانی ومکاری کو سیاست سمجھتے ہیں اسلامی سیاست کا بے ایمانی ومکاری سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس میں اُلجھاؤ والی کوئی بات نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنے میلان طبع کے تحت الٹی راہ سے ناک پکڑنے ہی کو "سیاسی تدبّر" سمجھا ہے۔ لیکن اسلامی دستور میں یہ چیز ناپسند ہے۔ اسلام تو کسی معاہدے کے الفاظ تک پر بھی یہ پابندی لگا دیتا ہے کہ ایسی عبارت نہ لکھی جائے جس کا مطلب صاف اور واضح نہ ہو اور اس کے دو متبادل معنے نکلتے ہوں۔ چنانچہ باوجود نزاکت حالات اور مخالفت احباب کے آپؑ نے اسلامی قانون کو حکم اعلیٰ قرار دیا۔ اور تمام نااہل اور بداعمال حاکموں کو برطرف کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ چنانچہ جب مغیرہ ابن شیبہ نے یہ رائے دی کہ " دُنیا سازی کے لئے اس وقت معاویہ، عبداللہ ابن عامر اور عہد عثمانی کے دیگر عامل برطرف نہ کئے جائیں پہلے ان سے بیعت طلب کی جائے" تو حضرت امیرؑ نے فرمایا " خدا کی قسم میں دین میں دورُخی (پالیسی) (ڈپلومیسی) نہیں برتوں گا اور نہ اپنی حکومت میں ذلت وپستی کو گوارہ کروں گا"۔ جناب امیرؑ کے شاگرد عبداللہ ابن عباس نے بھی یہی عرض کیا۔ کہ "کم از کم معاویہ کو تو ضروری بحال رہنے دیں اور اگر برطرف کرنا ہے تو بیعت لینے کے بعد برطرف کریں"۔ لیکن جب اسلام دورُخی پالیسی کی مخالفت کرتا ہے تو جناب امیرؑ اس پر کیسے آمادہ ہوسکتے تھے۔ چنانچہ آپؑ نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے فرمایا۔ " اگر میں معاویہ کو عہدے پر باقی رہنے دوں تو اس کا مطلب یہی ہوگا

کہ میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بنا رہا ہوں"۔ (استیعاب جلد ۳ ص ۲۵۹)
لہٰذا اس بارے میں آپؑ نے کسی رائے کو قبول نہ کیا۔ اور اپنی راست روی کی سیاست پر بھروسہ کرتے ہوئے معاویہ اور دیگر عُمّال کو یک لخت برطرف کرنے کا فیصلہ بحال رکھا۔
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر حضرت علیؑ ان مشوروں کو مان کر عام معاملہ فہمی اور اور دورُخی پالیسی پر عمل کرتے تو آپؑ ان اُلجھنوں سے دوچار نہ ہوتے جو آپ کے دَور میں سامنے آئیں۔ مگر یہ خیال دُرست نہیں ہے اگر حضرت علیؑ ان لوگوں کو معزول کرنے کا فیصلہ نہ کرتے تو اور بھی زیادہ خطرناک صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ اور اُن کے مُشکلات دوگنا ہو جاتے۔ اوّلاً عوامی نقصان یہ ہوتا کہ مملکت کو ان کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہ رکھا جا سکتا کیونکہ یہ عُمّال محض معزولی کی وجہ ہی آمادۂ مخالفت نہ تھے بلکہ پہلے ہی سے حضرت علیؑ کے مخالف تھے۔ اُن کے اندازِ فکر اور حضرت علیؑ کے پاک نظریات میں ٹکراؤ تھا۔ لہٰذا اگر وہ بحال رہتے تو کشمکش ہی رہتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اندر ہی اندر سازشوں کا جال بچھائے جاتے۔ اور مسلسل پریشانی اور عدم استحکام حکومت کا باعث بنے رہتے۔ لہٰذا بحالی اور معزولی دونوں حالتوں ہی میں مصائب و الجھنوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ ایسی حالت میں حکومتِ الٰہیہ کے نمائندے کی حیثیت سے آپؑ نے دینی قدروں اور اسلامی تقاضوں کے عین موافق راہ تلاش کی اور وہ یہی تھی کہ خائن اور ظالم افراد کو عہدوں سے سبکدوش کر دیا جائے۔ کیونکہ آپؑ کی سیاسی پالیسی میں کسی حاکم یعنی عامل کے ظلم کی ذمہ داری سربراہ پر ہوتی ہے لہٰذا آپؑ نے نتیجے میں ہونے والے سطحی نقصان کی پرواہ نہ کی اور سیاستِ الٰہیہ پر عمل پیرا ہے جس کے مطابق حضرت علیؑ کا اوّلین مقصد صحیح دینی و اسلامی حکومت کا قیام اور نظامِ الٰہی کا نفاذ تھا۔ اس مقصد کے لئے یہ ضروری تھا کہ خود غرضی، تعیش پرستی، دولت کی حرص و طمع اور مفاد پرستی کی تمام راہیں بند کر کے معاشرہ کی تطہیر کی جائے۔ اور جو غلط سیاسی نظام ملک پر چھایا ہوا تھا اُس کا پورا ڈھانچہ تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ جب آپؑ برسرِ اقتدار آئے تو آپؑ اس مقصد سے غافل نہ تھے۔ چونکہ مسلمانوں میں اسلامی طرزِ معاشرت

کے نشان مدہم پڑ گئے تھے اور عوام استبدادی شکنجوں میں کراہ رہے تھے۔ نااہل افراد کو کنبہ پروری یا دوُرخی پالیسی کے تحت اعلیٰ عہدے دیئے جانے سے حرص و ہوس کا بازار گرم تھا اس لئے جب تک سکریننگ نہ کی جاتی اور عوام کو ظالم حکمرانوں سے نجات نہ دلائی جاتی اسلامی حکومت کی تشکیل مشکل تھی۔ چونکہ حکومتِ الٰہیہ دینی عناصر ہی کے ذریعے پروان چڑھتی ہے لہٰذا ضروری تھا کہ صرف ایسے افراد کو کلیدی عہدے دیئے جائیں جو دین کو دُنیا پر مقدم رکھیں بلکہ وہ دین ہی کو اپنی کائنات سمجھتے ہوں۔ آئینِ اسلام کے سختی سے پابند ہوں اور اسلامی مفاد کو دوسرے تمام مفادات پر ترجیح دیں۔ عوام کی جانب سے یہ مطالبہ حضرت عثمان کے عہد میں بہت زور پکڑ چکا تھا اور یہی قتلِ عثمان کا سبب بنا۔ اُس کے چند ہی روز بعد اگر انصاف پرور نیک کردار اور خوش طبع افراد کو مقرر نہ کیا جاتا تو حضرت علیؑ کو بھی عوام کا وہی ردِ عمل پیش آتا جو حضرت عثمان کو چند روز قبل پیش آیا تھا۔ بلکہ اُس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کُن ہو سکتا تھا۔

حضرت امیرالمومنینؑ خود ان نااہل عُمّال پر ناراض تھے اور سابقہ حکومتوں کو اکثر اُن کے کردار سے آگاہ کرتے رہتے تھے لیکن اُس وقت ممکن ہے کہ اختلافات کی وجہ سے حکومت یہ شبہ کرتی ہو کہ عُمّال کی تبدیلی کا مطالبہ شاید آپ اقتدار حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ لیکن جب عام احتجاج ہوا تو حضرت عثمان کو بھی اس کا احساس تو ہوا ہوگا۔ مگر انہوں نے یہ عذر پیش کر کے اس عوامی مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ معاویہ کو حضرت عُمر نے گورنر مقرر کیا ہے۔ حضرت عثمان جانتے تھے کہ معاویہ کے اطوار کیسے ہیں اس لئے انہیں بغاوت کا خوف تھا۔ پس یہی سیاسی تدبیر انہیں مُناسب معلوم ہوئی کہ معاویہ کو گورنری پر بحال رکھیں۔ یہ روش دنیوی سیاست میں بصیرت کہلا سکتی ہے مگر اسلامی اُصول دیانت اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ آئین خداوندی کی مخالفت کرنے والے کسی شخص کو حاکمیت کے منصب پر برقرار رکھا جائے کیونکہ اسلام میں معیارِ حاکمیت علم کے ساتھ عدل اور تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی سیاستدان کیلئے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ وہ دینِ اسلام اور اُس کے اصولوں سے ایک بال برابر بھی نہ ہٹے لیکن زیرِ بحث عمّال کے نظریات جنابِ امیر علیہ السلام کے اصولوں سے مختلف تھے۔ لہٰذا ان کو مناصب پر قائم رکھنے کا مطلب یہی ہوتا کہ آپ نے بھی اپنے اصولوں کو مطلب برآری پر قربان کر دیا ہے۔ یہ امر ایک طرف آپ کی کمزوری پر محمول کیا جاتا کہ آپؑ نے مخالفین کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور دوسری جانب اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ دیگر عمّال بھی یہ کمزوری تاڑ کر اپنی من مانی کرتے۔ اور آپ محض ایک کٹھ پتلی حکمران بن جاتے۔ یعنی عملاً حکومت عمال کی ہوتی اور صرف مُہر آپ کی اور اس کے ساتھ ساتھ عوام جن کا مطالبہ ہی یہ تھا کہ غلط حاکموں کو ہٹایا جائے الگ خلاف ہو جاتے۔ امن عامہ تباہ ہو جاتا۔ نظم و نسق حکومت کا شیرازہ بکھر جاتا۔ اور آپ کی حکومت کا حال بھی پہلی حکومت جیسا ہوتا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ عبرتناک۔

آپؑ نے مسندِ حکومت پر جلوہ افروز ہونا منظور فرما لینے کے بعد اس کی ذمہ داری کا پوری طرح احساس رکھا۔ آپ جانتے تھے کہ عمال کے غلط رویے کی ذمہ داری سربراہ پر ہوتی ہے۔ اگر آپ اُن عمال کو برقرار رہنے دیتے جو ظلم و ستم رانی کے خوگر تھے تو آج تاریخ آپؑ کو بھی ان ظالموں کا ساتھی تصور کرتی۔ اس لئے ان غیر عادل حاکموں کی برطرفی میں ذرا سی دیر کر دینا بھی اُن کے مظالم میں شرکت کے مترادف ہوتا۔ بھلا جنابِ امیرؑ یہ کیسے گوارہ کر سکتے تھے کہ اُن کے عمال کی غلط کاریوں کو اپنے سر لے کر اپنے دامنِ پاک و صاف کو داغدار کرتے۔ لہٰذا اُن کی بہترین سیاست یہی تھی کہ اُن سے بیزاری و لاتعلقی کا اظہار کر کے سُرخروئی حاصل کریں۔

حضرت علیؑ اور معاویہ دونوں متضاد شخصیتیں ہیں۔ معاویہ کی سیاست یہ تھی کہ دینی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر اپنی ذاتی مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کی جائے اس کے برعکس حضرت امیرؑ کی سیاست ذاتی مفادات سے بالکل پاک تھی۔ دونوں اس تضاد کو بخوبی جانتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف معاویہ کو

یقین تھا کہ میں خلیفۂ وقت سے اسی ذہنی تضاد کے باعث اپنا عہدہ برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اُدھر خلیفۂ برحق کو یہ احساس تھا کہ اگر ناہموار سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ایسے کسی گورنر کو بحال بھی رکھا جائے تو اندرونی ریشہ دوانی لازماً پیدا ہوگی۔ اور جب موقع ملے گا وقت بھی اُسے مل جائے گا۔ اپنے پیر جمانے میں ہر ممکن تدبیر اختیار کرے گا۔ لہٰذا آپؑ نے اسی تدبیر کو فوقیت دی کہ اُسے مزید تقویت نہ پہنچ سکے۔ اس لئے اُسے علیحدہ کر دینا ہی بہتر جانا اگر آپؑ ایسا نہ کرتے تو معاویہ کا بیرونی امداد حاصل کر کے پوری سلطنت پر قابض ہو جانا بھی ناممکن نہیں تھا۔

معاویہ کے عزائم ڈھکے چھپے نہ تھے۔ حضرت عثمان کے زمانے میں جب دیکھا کہ فضا مکدر ہے تو جم غفیر جمع کیا تاکہ پوری حکومت پر قبضہ کیا جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے تحت حضرت عثمان کو رائے دی کہ آپ مدینہ چھوڑ کر شام چلے جائیں جسے حضرت عثمان نے قبول نہ کیا۔ جب یہ حربہ کارگر ثابت نہ ہوا تو بعد میں قصاص عثمان کے نام پر اپنی جدوجہد تیز کر دی۔ اب ایسے کسی گورنر کو اگر علیؑ گورنری پر بحال رہنے دیتے تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ گورنری پر قناعت کر کے بیٹھ جاتے بلکہ امکان یہی تھا کہ ہمیشہ مرکز کے لئے مصیبت بنا رہے۔ لہٰذا ایسے گورنر کو بحال رکھنا بالکل آستین کا سانپ پالنے کے مترادف ہوتا۔

چونکہ قتل عثمان پر عوام کا غوغہ یہ تھا کہ عمال نظم و ضبط کی اہلیت اور رعایا سے جذبۂ ہمدردی کی بنا پر متعین نہیں کئے گئے ہیں بلکہ خلیفۂ وقت کی قرابت داری کے مرہون منت ہیں جیسا کہ "تاریخ الخلفاء" ص۱۰۱ پر علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں "حضرت عثمان بیشتر بنی اُمیہ کے اُن ہی افراد کو امارت کے لئے نامزد کرتے تھے جنہیں پیغمبر کی صحبت کا شرف حاصل نہ ہوتا تھا اور اُن کے بارے میں ایسی خبریں آتی تھیں جنہیں اصحاب رسولؐ ناپسند کرتے تھے۔" پس اسی طرز عمل سے اہل افراد کی حق تلفی ہوتی تھی۔ اور اگر اسی عمل کو حضرت امیر علیہ السلام بھی اپنا لیتے تو باطل کی تائید ہوتی۔ لہٰذا مولا علیؑ نے یہی فیصلہ کیا کہ حق و باطل کے اصول پر مخالفت میں اضافہ ہوتا ہے تو ہوتا رہے مملکت کے استحکام کو دھچکا لگے منظور ہے لیکن دامن حق

ی سیاست نہیں ہے۔ اور حضرت علیؑ کی سیاست یہی تھی
ں لائق اور باصلاحیت افراد موجود تھے جنہیں عہدے دیئے جاسکتے
حکومتیں انصار کو نظر انداز کرتی رہیں جس سے انصار کے دل سخت
اپنے نظر انداز کئے جانے کی بے انصافی کا شدت سے احساس
ت علیؑ کو موقع ملا تو انہوں نے چاہا کہ عہدے صرف ایک ہی گروہ
رہیں اور انصار کی حق تلفی کی تلافی ہو جائے اور یہ اسی طرح ہو سکتا تھا
کلیدی عہدے دیئے جائیں تاکہ ان کی شکایت کا ازالہ ہو جائے۔
علیؑ نے ان افراد کو معزول فرماکر نئے عُمّال کا تقرر کر کے انصار کے
کو رفع کر دیا۔

ہوئے کو آزمانا جہالت ہے۔ اور گزشتہ تاریخی واقعات سے عبرت
رنجی ہے۔ وہ غلط عُمّال حضرت عثمان کے پروردہ تھے۔ مگر جب حضرت
وہ اُنیس دن محاصرے اور گھیراؤ میں رکھا گیا تو کسی ایک پروردہ
مدد نہ کی۔ ان لوگوں نے احسانات کا بدلہ یوں دیا کہ اپنے محسن و سرپرست
کار چھوڑ دیا۔ البتہ اُن کے قتل ہو جانے کے بعد خونِ عثمان کو حصولِ اقتدار
بنا لیا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

مر گیا میں تو زمانے نے بہت یاد کیا
زیست میں کوئی میرے حال کا پُرساں نہ ہوا

اویہ کو تو لوگوں نے اس فعل پر شرمندہ بھی کیا کہ کتاب مروج الذہب
درج ہے کہ "ابو طفیل نے معاویہ سے کہا کہ عثمان پر مصیبتوں کی گھٹا چھائی
تم شام ہی میں بیٹھے رہے اور آرام کرتے رہے۔" جب یہ سارا ماجرا حضرت
فرمایا تھا تو ان لوگوں پر اعتماد کیسے کر سکتے تھے؟ جبکہ معاویہ سے
اصولی اختلاف بھی تھا۔ لہٰذا تقاضائے عقل یہی تھا کہ ایسے بے مروت
فوراً معزول کر دیا جائے۔

ہیں ان اعمال کے کردار بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جب کہ تاریخ میں تحریف و تفریق کے باوجود اُن کے اعمال قبیحہ کا کثیر ذخیرہ موجود ہے۔ تاہم صرف معاویہ کے بارے میں ہم حضرت عمر کا ایک قول نقل کر کے اس بحث کو ختم کر دیتے ہیں: "تم کسریٰ و قیصر کی چالبازیوں کے تذکرے کرتے ہو حالانکہ معاویہ تمہارے درمیان موجود ہے۔" تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۴ (نوٹ :- جناب مولانا کوثر نیازی نے اپنی کتاب "ذکرِ حسین" میں وضاحت کی ہے کہ معاویہ نے یزید کو حکومت پر مسلط کر کے قیصر و کسریٰ کے طریقے پر عمل کیا ہے۔)

بُنیادی حقوق سیاست و شہریت ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہیں جیسے شیر و شکر۔ ہر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ جس معاشرہ میں وہ پیدا ہوا ہے اُس میں ایک طرف تو اُس کے معاشرتی حقوق ہیں دوسری جانب معاشرتی فرائض۔ لہٰذا اس احساس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت بھی کرے اور اپنے فرائض کو بھی پورا کرے۔ چنانچہ ان حقوق کے تحفظ کی سب سے زیادہ ذمہ داری حکومت پر لازم آتی ہے اور حکومت کا دستور اس تحفظ کے بغیر ناکارہ تصور ہوگا۔ بنیادی طور پر یہ حقوق چار ہیں (۱) حقِ حیات (۲) آزادیٔ فکر (۳) آزادیٔ عمل (۴) معاشرتی مساوات۔

حقِ حیات اسلامی سیاست میں انسانی زندگی کا تحفظ کیا گیا ہے اسلام امن کا علمبردار اور حیاتِ انسانی کا پاسبان ہے اور خونِ ناحق کو ناقابلِ برداشت جرم قرار دیتا ہے۔ قتل کر دینا تو درکنار اگر کوئی شخص خود اپنے ہاتھوں خودکشی کرے تو اسلام اسے بھی سنگین جرم قرار دیتا ہے۔ حضرت امیر المومنین جہاں انسانی اقدار کے محافظ تھے وہاں انسانی زندگی کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ تھے۔ اور کسی صورت میں بھی خونِ ناحق کو گوارہ نہ کرتے تھے۔ پیغمبرِ خدا کے دستور کے بالکل مطابق آپ نے ہمیشہ اُس وقت تلوار اُٹھائی جب دشمن آپ پر حملہ آور ہوا۔ آپ کے دورِ حکومت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ خون خرابے کو قطعاً پسند نہ فرماتے تھے۔ دشمن

چھوڑ دینا اسلامی سیاست نہیں ہے۔ اور حضرت علیؑ کی سیاست یہی تھی
انصار میں لائق اور باصلاحیت افراد موجود تھے جنہیں عہدے دیے جا سکتے تھے لیکن سابقہ حکومتیں انصار کو نظر انداز کرتی رہیں جس سے انصار کے دل ستے تھے اور انہیں اپنے نظر انداز کیے جانے کی بے انصافی کا شدت سے احساس تھا
لہٰذا جب حضرت علیؑ کو موقع ملا تو انہوں نے چاہا کہ عہدے صرف ایک ہی گروہ تک محدود نہ رہیں اور انصار کی حق تلفی کی تلافی ہو جائے اور یہ اسی طرح ہو سکتی تھی کہ انصار کو بھی کلیدی عہدے دیے جائیں تاکہ ان کی شکایت کا ازالہ ہو جائے۔
چنانچہ حضرت علیؑ نے ان افراد کو معزول فرما کر نئے عمّال کا تقرر کر کے انصار کے دیرینہ اعتراض کو رفع کر دیا۔

آزمائے ہوئے کو آزمانا جہالت ہے اور گزشتہ تاریخی واقعات سے عبرت حاصل نہ کرنا بدبختی ہے۔ وہ غلط عمّال حضرت عثمان کے پروردہ تھے۔ مگر جب حضرت عثمان کو ایک ماہ انیس دن محاصرے اور گھیراؤ میں رکھا گیا تو کسی ایک پروردہ نے بھی ان کی مدد نہ کی۔ ان لوگوں نے احسانات کا بدلہ یوں دیا کہ اپنے محسن سرپرست کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ البتہ اُن کے قتل ہو جانے کے بعد خونِ عثمان کو حصول اقتدار کا بہانہ و سہارا بنا لیا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

مر گیا میں تو زمانے نے بہت یاد کیا
زیست میں کوئی میرے حال کا پُرساں نہ ہوا

چنانچہ معاویہ کو تو لوگوں نے اس فعل پر شرمندہ بھی کیا کہ کتاب مروج الذہب جلد ۲ ص ۶۲ پر درج ہے کہ "ابو طفیل نے معاویہ سے کہا کہ عثمان پر مصیبتوں کی گھٹائیں چھاتی رہیں لیکن تم شام ہی میں بیٹھے رہے اور آرام کرتے رہے"! جب یہ سارا ماجرا حضرت علیؑ نے مشاہدہ فرمایا تھا تو ان لوگوں پر اعتماد کیسے کر سکتے تھے؟ جبکہ معاویہ سے حضرت علیؑ کو اصولی اختلاف بھی تھا۔ لہٰذا تقاضائے عقل یہی تھا کہ ایسے بے مروت اشخاص کو فی الفور معزول کر دیا جائے۔

ہیں ان اعمال کے کردار بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جب کہ تاریخ میں تحریف و تفریق کے باوجود اُن کے اعمالِ قبیحہ کا کثیر ذخیرہ موجود ہے۔ تاہم صرف معاویہ کے بارے میں ہم حضرت عمر کا ایک قول نقل کر کے اس بحث کو ختم کر دیتے ہیں "تم کسریٰ و قیصر کی چالبازیوں کے تذکرے کرتے ہو حالانکہ معاویہ تمہارے درمیان موجود ہے" تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۲۴۴ (نوٹ :۔ جناب مولانا کوثر نیازی نے اپنی کتاب "ذکرِ حسین" میں وضاحت کی ہے کہ معاویہ نے یزید کو حکومت پر مسلط کر کے قیصر و کسریٰ کے طریقے پر عمل کیا ہے)۔

بنیادی حقوق سیاست و شہریت ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہیں جیسے شیر و شکر۔ ہر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ جس معاشرہ میں وہ پیدا ہوا ہے اُس میں ایک طرف تو اُس کے معاشرتی حقوق ہیں دوسری جانب معاشرتی فرائض۔ لہٰذا اس احساس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت بھی کرے اور اپنے فرائض کو بھی پورا کرے۔ چنانچہ ان حقوق کے تحفظ کی سب سے زیادہ ذمہ داری حکومت پر لازم آتی ہے اور حکومت کا دستور اس تحفظ کے بغیر ناکارہ تصور ہوگا۔ بنیادی طور پر یہ حقوق چار ہیں (۱) حقِ حیات (۲) آزادیٔ فکر (۳) آزادیٔ عمل (۴) معاشرتی مساوات۔

حقِ حیات اسلامی سیاست میں انسانی زندگی کا تحفظ کیا گیا ہے اسلام امن کا علمبردار اور حیاتِ انسانی کا پاسبان ہے اور خونِ ناحق کو ناقابلِ برداشت جرم قرار دیتا ہے۔ قتل کر دینا تو درکنار اگر کوئی شخص خود اپنے ہاتھوں خودکشی کرے تو اسلام اسے بھی سنگین جرم قرار دیتا ہے۔ حضرت امیر المومنین جہاں انسانی اقدار کے محافظ تھے وہاں انسانی زندگی کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ تھے۔ اور کسی صورت میں بھی خونِ ناحق کو گوارہ نہ کرتے تھے۔ پیغمبرِ خدا کے دستور کے بالکل مطابق آپ نے ہمیشہ اُس وقت تلوار اُٹھائی جب دشمن آپ پر حملہ آور ہوا۔ آپ کے دورِ حکومت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ خون خرابے کو قطعاً پسند نہ فرماتے تھے۔ دشمن

نے لشکر کشی کر کے امن عامہ کو نقصان پہنچانا چاہا لیکن اس پر آپؑ نے صلح و آشتی کی دعوت دی اور پُرامن رہنے کی تلقین فرمائی۔ جب ساری کوششیں بے اثر ثابت ہوگئیں اور فریقِ مخالف جنگ پر تلا رہا تو بھی آپؑ نے اُس وقت تک ہاتھ نہ اُٹھایا جب تک دُشمن نے پہل کی۔ اور جنگ میں بھی اس اصولِ مکروہ کی کہ "جنگ میں سب کچھ جائز ہے" آپؑ نے متواتر مخالفت کی محض دفاعی انداز اختیار کیا۔ اور جنگ کے خاتمے پر خُون کے پیاسوں تک کو بخش دیا اور کوئی انتقامی کارروائی نہ کی۔ جنگِ جمل میں اہلِ بصرہ کو مکمل طور پر معاف کر دیا۔ مروان، عبداللہ ابن زبیر وغیرہ سے کوئی مواخذہ نہ کیا۔ اُم المومنین عائشہ کو باحفاظت مدینہ روانہ کر دیا۔ جنگ صفین میں قیدیوں کو بلاشرط رہا فرما دیا۔ جنگ نہروان میں خوارج کے زخمیوں کو اُنکے حوالے کر دیا۔ اس طرزِ عمل سے ہر انصاف پسند فیصلہ کر سکتا ہے کہ آپ کا مقصد صرف فتنہ و فساد کا انسداد تھا۔ اگر کوئی دُوسرا فرماں روا ہوتا تو جنگ میں سب کچھ جائز سمجھتے ہوئے خوب خونریزی کرتا۔ اور دشمنوں کو بارِ دیگر تازہ دم ہونے کا موقع ہی نہ دیتا۔ بلکہ جہاں تک ہو سکتا سفاکی سے کام لیتا تاکہ اُس کی دہشت عوام پر طاری ہو۔ لوگ اس خوفناک انجام سے عبرت پکڑیں۔ مولا علیؑ نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اسلام انسانی جانوں کے اس طرح سے اتلاف کو ناجائز قرار دیتا ہے لہٰذا آپؑ نے ناجائز کُشت و خون سے اپنا دامن بچایا۔ یہ وہ کردار تھا جس سے آپ کا ہادیٔ برحق ہونا ثابت ہوتا ہے اسی لئے دُنیا نے امن پسندی اور انسانی ہمدردی کے لحاظ سے آپؑ کا مقامِ افتخار تسلیم کیا۔ آپؑ ہی کی یہ شان ہے کہ اپنے ظالم قاتل کو شربت پلائیں۔ ایسی مثالِ رحم اور کہیں نہیں ملتی۔

امیرالمومنینؑ جہاں خونِ ناحق کے شدید مخالف تھے وہاں اس اُصول کے بھی حامی تھے کہ کسی کا خون رائیگاں نہ جائے اور قاتل قصاص[1] سے نہ بچ پائے۔ قصاص کے معاملے میں آپؑ بڑے بڑے بااثر و رسوخ افراد سے بھی درگزر نہیں فرماتے تھے چنانچہ

---

[1] قتل عثمان کا جو مسئلہ ہے وہ آئندہ صفحات میں عنوان "قصاصِ عثمان" کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

رُخ کیا تو آپؑ کے لئے ان کو روکنا ضروری ہوگیا۔ اسی طرح مُحض بیعت دینے کے لئے معاویہ کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا۔ بالکل مجبور نہ کیا گیا لیکن جب اُس نے شام میں علم بغاوت بلند کیا تو خلیفہ برحق ہونے کی حیثیت سے اس بغاوت کی سرکوبی آپؑ کا فرض منصبی تھا۔ اسی طرح خوارج کے اعمال کی بھی کوئی پرواہ نہ کی اور انہیں رائے اور عمل کی آزادی دے رکھی لیکن جب وہ قتل و غارت پر اُتر آئے تو ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہوگیا۔

دُنیا کی حکومتوں میں آپ حضرات ملاحظہ فرماتے ہیں کہ ہنگامی حالات میں شخصی آزادی سلب کر لی جاتی ہے لیکن حضرت امیر علیہ السلام نے اس شخصی آزادی کا اس قدر احترام کیا کہ حالتِ جنگ میں بھی اس آزادی پر حرف نہ آنے دیا۔ لوگ آزادی سے کبھی دشمن کے ساتھ مل جاتے اور کبھی پھر واپس آجاتے۔ مگر آپؑ کوئی انتقامی کارروائی نہ فرماتے۔ چنانچہ آپؑ نے والئ مدینہ سہل ابن حنیف کو تحریر فرمایا کہ "مجھے معلوم ہوا کہ تمہارے ہاں کے کچھ لوگ چپکے چپکے معاویہ کی طرف کھسک رہے ہیں۔ تم اس تعداد پر جو نکل گئی ہے اور اس کمک پر جو جاتی رہی ہے ذرا افسوس نہ کرو۔ یہ دُنیادار ہیں جو دُنیا کی طرف جھک رہے ہیں اور اس کی طرف تیزی سے لپک رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے اس عدل کو پہچانا، دیکھا، سُنا اور پوری طرح سمجھ لیا کہ یہاں حق کے اعتبار سے سب برابر سمجھے جاتے ہیں لہٰذا وہ لوگ اِدھر بھاگ کھڑے ہوئے جدھر جانب داری اور تخصیص برتی جاتی ہے۔" اِن شواہد سے معلوم ہوجاتا ہے کہ آپؑ نے کس حد تک شخصی آزادی کو برقرار رکھا۔ اور اس میں کسی دوست، دشمن کا امتیاز نہ کیا۔ یہی وہ آزادی ہے جو ایک متمدن ملک کی رعایا حاکم سے طلب کرتی ہے لیکن اس آزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شہری جو چاہے کرتا پھرے اور نظم و نسق و قانون سے کھیلے۔ اگر ایسی صورتِ حال ہوگی تو حکومت کا فرض ہے کہ اس اخلاقی بے راہ روی، قانون شکنی اور مردم آزاری کی اجازت نہ دے۔

معاشرتی مساوات | اسلام میں انسان کو بنی آدم ہونے کی حیثیت سے یکساں مقام حاصل ہے اور صرف تقویٰ کو معیارِ فضیلت مانا گیا ہے۔ اسلام نے سب انسانوں

کے معاشرتی و معاشی حقوق ایک سطح پر رکھے ہیں۔ خواہ وہ گورا ہو یا کالا، عربی ہو یا عجمی، امیر ہو یا غریب ایک ہی خالق کے مخلوق ہیں۔ رنگ و نسل، خاندانی بلندی و پستی وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ البتہ پرہیزگاری کی وجہ سے اعزاز و احترام سے نوازا جاتا ہے۔

جناب امیر علیہ السلام اسلامی نظریۂ مساوات کے علمبردار اور انسانی حقوق کے نگراں تھے انہوں نے قریشی، غیر قریشی، عربی عجمی، آزاد و غلام سب کے حقوق یکساں قرار دیئے۔ اور انسانی برادری میں تفریق گوارہ نہ کی۔ بیت المال میں جتنا حصّہ ایک آزاد فرد کا تھا اتنا ہی غلام کا ہوتا تھا۔ جیسا عزیزوں کے ساتھ سلوک کرتے ویسا ہی غیروں سے کرتے۔ نہ کسی کالے کو نظر انداز کیا اور نہ کسی گورے کی ناجائز پاسداری فرمائی۔ جیسا سلوک عام رعایا سے کرتے ویسا ہی گورنر سے چنانچہ ایک عامل کی مالی خیانت کے بارے میں شکایت موصول ہوئی تو اُسے لکھا " خدا کی قسم! اگر حسنؑ و حسینؑ بھی وہ کرتے جو تم نے کیا ہے تو میں اُن سے بھی کوئی رعایت نہ کرتا۔ نہ وہ مجھ سے اپنی کوئی خواہش منوا سکتے "۔ یہ مساوات اور حقوق میں برابری کا وہ طرزِ عمل ہے جسے دُنیا کے انسان آج حسرت بھری نگاہوں سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن کچھ جاہل انسان پھر بھی کہتے ہیں کہ علیؑ سیاست سے ناواقف تھے۔ اگر علیؑ سیاست سے واقف نہیں تھے تو ہم کہتے ہیں کہ جسے علیؑ نہیں جانتے تھے وہ سیاست نہیں بلکہ حماقت و قباحت ہے۔

حضرت امیر المومنینؑ کا معاشی نظام ہم نے کتاب ہذا کی فصل " اقتصادیات " میں پیش کیا ہے وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

بیت المال میں جھاڑو

ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ اسلام ذخیرہ اندوزی کی اجازت نہیں دیتا اور نہ یہ اجازت دیتا ہے کہ ذخیرہ اندوزی کے لئے خزانے قائم کر کے بھرے جائیں۔ پیغمبرِ اسلام نے ہمیشہ زکوٰۃ، صدقات، غنائم وغیرہ کو کبھی کسی خزانے میں جمع کر کے محفوظ نہیں کیا بلکہ جس قدر جلد ممکن ہو سکتا تھا آپؐ ساری دولت کو مستحق عوام میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے لہٰذا خزانہ نہیں بنایا لیکن جب حضرت عمر کے دور میں روم اور ایران کے خزانے مسلمانوں

کے ہاتھ لگے تو اس کثیر دولت کو تقسیم کرنے کی بجائے "بیت المال" (خزانہ) کی بُنیاد رکھی گئی۔ اس کے انتظام کے لئے محکمۂ مالیات قائم کیا گیا۔ اس محکمہ کے زیرِ نگرانی سرمایہ اکٹھا کر کے محفوظ رکھا جانے لگا اور بعد میں اس میں سے "من پسند" رفاہی کاموں اور دیگر ضروریات پر صرف کیا جاتا تھا۔ اسی سے سالانہ وظائف کی تقسیم بھی ہوتی تھی۔ حضورؐ کے زمانے میں دولت کی تقسیم مساوی تھی اور سب سے یکساں برتاؤ ہوتا تھا۔ مگر آپؐ کے بعد اس پابندی کا لحاظ نہ رہا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے خیال کے مطابق مدارج و طبقات قائم کر دیئے جن کے مطابق کسی کو کم اور کسی کو زیادہ رقم دی جاتی تھی۔ اُمہات المومنین (ازواجِ رسولؐ) کو اسلام کی دیگر مستورات پر ترجیح دی جاتی تھی۔ ازواجِ رسولؐ میں سے بھی حضرت عائشہ کو دوسری ازواج سے زیادہ وظیفہ ملا کرتا تھا۔ بدری اصحاب کے وظائف غیر بدریوں سے زیادہ تھے۔ مہاجرین کو انصار پر فوقیت دی گئی تھی۔ علیٰ ہذالقیاس ہر ایک کو اس کی مقررشدہ حیثیت کے مطابق حصہ مل جاتا تھا۔ مگر جب حضرت عثمان کا زمانہ آیا تو یہ درجہ بندی بھی قائم نہ رہی بلکہ آپ کی محبتِ اقربا کی وجہ سے ان کے قرابت داروں نے مال کو جی بھر کے سمیٹا۔ چنانچہ عہدِ "پابندیٔ سیرتِ شیخین" کے باوجود حضرت عثمان اس وعدے کو نبھا نہ سکے۔ اور مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ بنی اُمیّہ کیلئے مخصوص ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں دیگر بڑے بڑے لوگ (صحابہ اور صحابیات و ازواج) جن میں اکثر حضرت عثمان کے بہی خواہ تھے اپنے وظائف سے یا تو محروم ہو گئے یا ان میں کمی کر دی گئی۔ لہٰذا اُن کی رائے بھی حضرت عثمان کے خلاف ہو گئی۔

جب حضرت امیر علیہ السلام برسرِ اقتدار آئے اور "بیت المال" آپؑ کے ہاتھ آیا تو آپؑ نے اُسے سمیٹ کر رکھنا پسند نہ فرمایا اور بالکل رسول اللہ کی طرح جہاں جو مال جمع ہوتا تھا اس جگہ مستحقین میں بانٹ کر "بیت المال" کو خالی کر دیتے تھے جب وہ خالی ہو جاتا تو اپنے ہاتھ سے اُس میں جھاڑو دیتے اور نمازِ شکر ادا فرماتے کہ جس طرح خالی ہاتھ اندر داخل ہوا تھا اسی طرح خالی ہاتھ باہر جا رہا ہوں۔ چنانچہ [illegible] جلد ۳ صفحہ پر مرقوم ہے کہ "حضرت علیؑ نے یہ نوبت ہی نہ آنے دی کہ مال

"بیت المال" میں جمع ہو بلکہ رات سے قبل ہی اُسے تقسیم فرما دیتے تھے" ایک دفعہ مال اس وقت آیا جب رات کا اندھیرا شروع ہو چکا تھا۔ حکم دیا کہ اس مال کو ابھی تقسیم کر دیا جائے۔ لوگوں نے عرض کی کہ اب تو رات ہو گئی ہے اسے کل پر اُٹھا رکھیے۔ فرمایا "کیا تم کو یہ یقین ہے کہ میں کل تک زندہ رہوں گا؟" جواب دیا کہ موت کا علم تو خدا کو ہے۔ فرمایا پھر دیر نہ کرو اور اسے بھی تقسیم کر دو۔ چنانچہ روشنی کا انتظام کیا گیا اور سارا مال راتوں رات بانٹ دیا گیا۔

دولت کی غیر مساوی تقسیم معاشی نظام کو غیر متوازن بنا دیتی ہے لہٰذا آپؑ نے سابقہ حکومتوں کے اس طرز تقسیم کو ناپسند فرمایا کہ اسلامی نظریہ مساوات کے خلاف اس کی درجہ بندی کی جائے۔ چنانچہ آپؑ نے اس سلسلے میں چھوٹے بڑے کا امتیاز ختم کر کے ہر ایک کا یکساں حصّہ قرار دیا یہ اقدام یقیناً سرمایہ دار طبقے اور امتیاز پسند ذہنوں پر گراں گزرا۔ چنانچہ اس کی مخالفت کی گئی مگر حضرتؑ اس مخالفت کو خاطر میں نہ لائے اور اسلامی اصُول سے ہٹنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ حضرات طلحہ و زبیر آپؑ کے پاس آئے اور کہا کہ "حضرت عمر تو ہمیں اتنا اور اتنا دیا کرتے تھے۔ آپ بھی اس کا لحاظ رکھتے ہوئے دیجیئے"۔ آپؑ نے فرمایا "اس بات کو چھوڑو کہ فلاں تمہیں کیا دیتا تھا۔ یہ بتاؤ کہ رسُولُ اللہ تمہیں کیا دیتے تھے؟" یہ سُن کر دونوں صاحبان خاموش ہو گئے۔ پھر حضرتؑ نے پوچھا کہ "بتاؤ، رسولؐ اللہ مساوات کی بُنیاد پر تقسیم کے اصُول پر کاربند تھے یا نہیں؟" انھوں نے جواب دیا کہ "ہاں وہ سب میں برابر برابر تقسیم کیا کرتے تھے۔ تو آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ "اب خود ہی بتاؤ۔ سُنّتِ رسولؐ زیادہ قابلِ عمل ہے یا فعلِ عمر؟" انہوں نے جواب دیا کہ "ٹھیک ہے سُنّتِ رسُولؐ ہی قابلِ عمل ہے لیکن ہمیں اسلام میں سبقت کا شرف حاصل ہے ہمیں رسُولؐ سے قربت ہے۔ جہاد میں ہماری خدمات نمایاں ہیں"۔ آپؑ نے فرمایا "تو بتاؤ کہ اسلام میں سبقت تمہیں حاصل ہے یا مجھے؟" انہوں نے کہا "آپؑ کو"۔ آپؑ نے دریافت کیا "جہاد میں میرا حصّہ زیادہ ہے یا تمہارا؟" انہوں نے کہا "آپؑ کا"۔ آپؑ نے پھر پوچھا

"رسول خدا سے زیادہ قریبی میں ہوں یا تم؟" انہوں نے جواب دیا "آپ"۔ تب حضرت علیؑ نے ایک مزدور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "میرا اور اس مزدور کا حصّہ برابر ہے۔ جب میں خود اپنے لئے امتیاز گوارہ نہیں کرتا تو تمہارے لئے کس طرح کر سکتا ہوں؟" معلوم ہوا کہ آپؑ ادنیٰ واعلیٰ، امیر غریب، آقا و غلام سب کا حق مساوی سمجھتے تھے چنانچہ آپؑ نے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ میں یہ سارے امتیازات ختم کرتا ہوں جب یہ اعلان آپؑ کے برادر عقیل نے سنا تو حضرتؑ کے پاس آئے اور کہا کہ "آپؑ مجھے اور مدینہ کے ایک حبشی غلام کو ایک ہی سطح پر رکھیں گے؟" تو آپؑ نے جواب دیا "تشریف رکھئے۔ خدا آپ پر رحم کرے اگر آپ کو کسی پر فضیلت ہو سکتی ہے تو صرف تقویٰ و سبقت کی بنا پر۔"

ایک دفعہ حضرتؑ کے پاس دو عورتیں آئیں۔ حضرتؑ نے دونوں کو برابر دیا۔ اس پر ایک نے کہا "میں عربیہ ہوں اور آزاد، یہ غیر عربیہ ہے اور کنیز۔ آپؑ نے ہم دونوں کو ایک درجہ پر سمجھ لیا ہے حالانکہ میرا مرتبہ بلند ہے" حضرتؑ نے فرمایا کہ "میرے علم میں نہیں ہے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہو مگر اُسے جو اطاعت و تقویٰ میں بلند ہو"۔ اسی طرح ایک مرتبہ سہل ابن حنیف اپنے ایک حبشی غلام کو لے کر خدمتِ مولا علیؑ میں حاضر ہوئے اور عرض کی "یہ بیت المال سے اپنا حصّہ لینے کے لئے آیا ہے۔ آپؑ اِسے کیا دیں گے؟" فرمایا کہ "تمہیں کیا ملا ہے؟" عرض کیا "سب کو تین تین دینار ملے ہیں اور مجھے بھی تین دینار" حکم دیا کہ "اِسے بھی تین دینار دیئے جائیں گے"۔ ایک دفعہ آپؑ کی ہمشیرہ اُمِّ ہانیؑ بنتِ ابی طالب آپؑ کے ہاں آئیں۔ آپؑ نے بیت المال سے بیس درہم انہیں دیئے۔ انہوں نے واپس آکر اپنی ایک غیر عرب کنیز سے پوچھا کہ اُسے کیا ملا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ "مجھے بیس درہم ملے ہیں"۔ اس پر اُمِّ ہانیؑ دوبارہ حضرت امیرؑ کے پاس

لہ طلحہ و زبیر نے آئندہ چل کر جو قدم اُٹھایا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

آئیں اور کہا کہ "آپؑ نے جو ایک کنیز کو دیا ہے وہی مجھے دیا ہے حالانکہ میرا حق فائق ہے" حضرتؑ نے جواب دیا کہ "اللہ کی قسم! اس مال میں بنی اسمٰعیل کو بنی اسحاقؑ پر کوئی فوقیت نہیں ہے"۔

حضرت امیرالمومنینؑ ہی کا یہ سیاسی تدبر تھا کہ آپؑ نظریہ مساوی تقسیم اموال پر ہمیشہ قائم رہے۔ اور اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے ہرگز امتیازی برتاؤ نہ کیا چنانچہ حضرت عقیل ابن ابی طالبؑ اکثر فقر و فاقہ کا شکوہ کیا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے بیت المال سے کچھ طلب کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا "کچھ روز انتظار فرمائیے جب دوسروں کو ملے گا تو آپ کو بھی مل جائے گا"۔ عقیل نے اصرار کیا چنانچہ حضرت علیؑ ان کو بازار میں لے آئے اور ایک بند دکان کے سامنے کھڑا کر کے فرمایا کہ "اس دکان کا تالا توڑ کر سارا مال سمیٹ کر گھر لے جائیے"۔ عقیل نے حیران ہو کر کہا کہ "کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں چوری کروں اور چور کہلاؤں؟" تب آپؑ نے فرمایا کہ "کیا آپؑ مجھے چور بنانا چاہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کے مال سے چوری کر کے آپ کو دے دوں؟"

ایک دفعہ عقیل نے کہا کہ بیت المال سے کچھ دیجیئے تو حضرت علیؑ نے لوہے کی ایک سلاخ کو سرخ کیا اور گرم لوہا حضرت عقیل کے جسم کے قریب لے گئے۔ عقیلؓ ڈر کر پیچھے ہٹے۔ حضرتؑ نے فرمایا "آپ لوہے کے ایک گرم ٹکڑے کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے اور مجھے اس آگ میں جھونک دینا چاہتے ہیں جسے خدا نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے"۔

حضرت امیرالمومنینؑ بیت المال میں ادنیٰ سا تصرف بھی گوارہ نہ فرماتے تھے۔ حالانکہ اگر آپؑ درگزر فرما لیتے تو کوئی آپؑ پر حرف گیری نہ کر سکتا تھا۔ تقسیم اموال کے سلسلے میں جناب امیرالمومنینؑ کا احساس ذمہ داری اس نہج پر تھا کہ آپؑ معمولی سے معمولی چیز کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی کسی قیمتی شے کو دی جا سکتی ہے۔ آپؑ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے تھے جب تک اس کو تقسیم نہ کر دیں۔ چنانچہ ایک دفعہ مال میں ایک معمولی سی رسّی بچ گئی۔ فرمایا اسے بھی لے جاؤ اور بانٹ دو۔ صفہان

سے مال آیا تو اس میں ایک سوکھی روٹی بھی تھی چنانچہ اس روٹی کے ٹکڑے کر کے سات قبیلوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ ایک دفعہ کچھ کپڑے آئے ان میں سے ایک ٹوپی امام حسن علیہ السلام کو پسند آگئی چنانچہ پسند کا اظہار کیا۔ لیکن جناب امیرؑ نے انکار فرما دیا اور تقسیم کرنے پر وہ ٹوپی ایک ہمدانی کے حصے میں آئی۔ اس ہمدانی سے لوگوں نے امام حسنؑ کی پسند کا تذکرہ حضرت علیؑ کے سامنے ہی کر دیا تو جناب امیر علیہ السلام نے ان لوگوں کو منع فرمایا۔

اِن واقعات پر نظر کرنے کے بعد بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت نے تقسیم اموال میں اُسی طرزِ عمل کو اختیار کیا جو سرکار رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل تھا۔ نہ ہی بیت المال میں مال جمع کر کے رکھا اور نہ ہی تقسیم میں کوئی طبقاتی لحاظ فرمایا۔ بلکہ اصولِ اسلامی کے مطابق ہر مسلمان سے مساوی سلوک روا رکھا۔ یہ ایسی مثالیں ہیں جو کسی بھی دوسری حکومت کے عہد میں نظر نہیں آتیں (سوائے جناب امیرؑ کے مرشد و مربّی سرکار رسول آخرالزماںؐ کے دور کے) حضرت امیرالمومنینؑ کی سیاست یہی تھی کہ قومی دولت پر پوری قوم کا مساوی حق ہے اور اس اصول پر وہ اس قدر راسخ تھے کہ حق پسندی کے مقابلے میں محبت و قرابت کے تمام تقاضوں کو نظر انداز فرما دیا کرتے تھے۔ حالانکہ سربراہِ حکومت ہونے کی حیثیت سے آپؑ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اپنے عزیزوں کو عدل کی بنیاد پر کچھ مراعات دے دیتے۔ خیر یہ نہ سہی مسلمانوں سے اجازت لے کر ہی کچھ چیزیں اپنے عزیزوں کو بانٹ دیتے لیکن آپؑ کی خودداری و اصول پسندی نے مسلمانوں پر ذرا سا بوجھ ڈالنا بھی مناسب خیال نہ فرمایا۔ حتیٰ کہ آپؑ اپنے ذاتی مصارف کے لئے غلّہ تک مدینے سے منگواتے تھے۔ اور اپنے حق کے باوجود بیت المال پر اپنا ذاتی بوجھ بھی ڈالنا پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۳ صا۲۰۲ پر تحریر کیا گیا ہے کہ "ایک موقع پر آپ ایک ایسا بوسیدہ کمبل اوڑھے ہوئے تھے جو سردی کے بچاؤ کے لئے کافی نہ تھا۔ چنانچہ ہارون ابن انترہ بیان کرتے ہیں کہ "میں نے امیرالمومنینؑ سے عرض کیا کہ آپؑ کا بھی بیت المال میں حق ہے اس میں سے کوئی نیا کمبل لے لیجئے" لیکن آپ نے جواب دیا کہ "خدا کی قسم میں نے تمہارے مال میں سے

کوئی چیز لے لینا گوارہ نہیں کیا اور یہ کمبل جو اوڑھے ہوئے ہوں مدینہ سے لے کر آیا تھا"
یہ وہ کردار حسین داحساس ذمّہ داری تھا کہ آج تک کسی نے علانیہ یا پوشیدہ طور سے
حضرت امیرؑ پر کبھی خیانت کا شبہ تک نہیں کیا اور نہ ہو سکتا ہے۔ حالانکہ بڑے بڑے
حکمرانوں پر مجمع عام میں لوگوں نے شک کی بناء پر سوال کر دیا کہ فلاں چیز آپ کے حصّے
میں آئی آئی تھی مگر اس وقت وہ زیادہ نظر آرہی ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر کے بارے میں
مشہور ہے کہ آپ نے کچھ چادریں تقسیم کیں لیکن جو حصّہ انہوں نے خود حاصل کیا وہ
اُن کے پیرہن کے لئے کافی نہ تھا۔ چنانچہ جب لوگوں نے ان کو پیرہن پہنے دیکھا تو
ایک نڈر صحابی نے اعتراض کیا کہ "آپ نے پیرہن کس طرح بنوایا ہے جبکہ آپ کے
حصّے کا کپڑا کافی نہ تھا؟" انہوں نے جواب دیا کہ "میرے بیٹے نے اپنا حصّہ مجھے
دے دیا تھا"۔ لہٰذا معترض کا اعتراض رفع ہو گیا۔ لیکن حضرت امیرؑ اس سلسلے میں
بہت زیادہ محتاط ہے۔ اوّلاً تو وہ سرکاری مال پر بوجھ ہی نہ بنے۔ ثانیاً ان کی تقسیم اس قدر
صحیح اندازے سے ہوا کرتی تھی کہ کسی بھی فرد کو کوئی چیز ضرورت سے زیادہ نہ مل پائے۔
جب کسی کے پاس فاضل شے نہ ہوگی تو پھر وہ دے گا کیا؟ لہٰذا ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اگر
حضرت عمر کی جگہ حضرت علیؑ ہوتے تو وہ اس قدر محتاط ہوتے کہ وہ چادر جو آپ کا بیٹا
دے رہا تھا اُسے فالتو سمجھ کر واپس بیت المال میں بھیج دیتے اور اسے بھی سوکھی روٹی
اور ستّی کی طرح تقسیم کر دیتے۔

حالاتِ حاضرہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اب یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ "بیت المال" کی
دولت کی فوری تقسیم فی زمانہ مستحسن قرار نہیں دی جا سکتی کیونکہ جب تک اس دولت کو
باقاعدہ کسی خزانہ میں جمع کر کے اس کا نظم و نسق کسی علیحدہ محکمے سے وابستہ نہ کر دیا جائے۔ کاروبارِ
حکومت کا چلنا امرِ محال ہے۔ لہٰذا حضرت عمر کا جاری کردہ نظام ہی بہتر ہے۔ انہوں نے
اس سلسلے میں اصلاح کی تھی"۔ یہ سوال بظاہر معقول نظر آتا ہے لیکن اگر اس پر تھوڑا سا غور و
فکر کر لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا وہ نظام جو آنحضرت صلعم نے تعلیم فرمایا جس پر
حضرت علیؑ کاربند ہوئے وہی بہترین نظام ہے۔ اگر وہ نظام رائج ہو جاتے تو بیت المال

(جسے شاہی خزانہ کہا جاتا ہے) کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ لیکن جب وہ محمدیؐ نظام رائج نہ ہو تو اس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ حضرت ختمی مرتبتؐ نے کوئی شاہی خزانہ کبھی قائم نہیں فرمایا تھا۔ اگر آپ دین مکمل مانتے ہیں تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ رسولؐ خدا کا نظام حکومت مکمل ہے اس لئے اس میں زیادتی یا کمی کر دینا اصولی طور پر درست نہ ہوگا۔ محمدیؐ نظام دولت کو "عوام کا حق" قرار دیتا ہے اور حاکموں کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ اُسے تجوری میں جمع کر کے رکھیں اور اپنے من پسند طریقوں سے خرچ کریں۔ نظام محمدیؐ میں حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ وہ حقدار کو اس کا حق دے نہ کہ وہ خود سرمایہ دار بن جائے۔ اور لوگوں کے لئے مال جمع کرنے کی مثال قائم کر دے۔ جس دن سے اسلام میں حکومت نے شاہی خزانہ کی بنیاد رکھی اُسی وقت سے مسلمانوں میں سرمایہ داری کا رجحان پیدا ہو گیا۔ تاریخ میں وہ مواقع بکثرت ملتے ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال کے روپے سے کیا کیا کام لئے گئے۔ خلفائے بنی اُمیہ و بنو عباس کے عیش و عشرت کے سامان خزانوں ہی سے مہیا کیے گئے۔ ضمیر کی خرید و فروخت خزانوں ہی کی دولت سے ہوئی۔ عوام پر ظلم کے ذرائع اُسی مال سے پیدا کیے گئے۔ حرص و طمع کا مرض اسی سے عام ہوا۔ لوگوں کو ذاتی چالوں کے لئے اسی دولت کے بل پر خریدا گیا۔ اگر ان حکومتوں کے پاس شاہی خزانہ نہ ہوتا تو مسلمانوں میں سرمایہ داری پیدا نہ ہوتی اور نہ ہی آمریت و ملوکیت آتی۔ نہ ہی حکومتیں جبر و استبداد کرتیں اور نہ ہی عیش و عشرت میں کھو کر دُنیا کو دین پر مقدم کیا جاتا۔ چونکہ اصل نظام محمدیؐ کو نہ اپنایا گیا اور امپیریلزم کے اصولوں پر عمل کیا گیا اور آج بھی ساری دُنیا کی سیاست اسی خزانوی اصول پر چل رہی ہے۔ لہٰذا اندریں حالات شاہی خزانہ ضروری قرار پا جاتا ہے۔ لیکن اگر اسلامی دستورِ حکومت کا نفاذ کر دیا جائے تو خزانوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ دولت کی تقسیم مساوی ہوتی ہے تو پھر حرص و طمع کے پیدا ہونے کا امکان نہیں رہتا اور نہ ہی سرمایہ داری کا رجحان جنم لے سکتا ہے۔ کڑی سے کڑی ہنگامی حالت میں بھی قوم میں جذبۂ خود امدادی کارفرما ہوتا ہے۔ باہمی اتحاد و ہم آہنگی سے ہر آفت کا

حل نکالا جاتا ہے۔ چونکہ امن پسندی حصول ہوتا ہے ... داخلی وخارجی خطرات کے خدشات بہت ہی کم ہوتے ہیں کیونکہ جب پورے افراد پر اسلامی رنگ جما ہو تو کڑی سے کڑی آزمائش بھی بخوبی دور کی جاسکتی ہے۔ پھر حکومت سارا روپیہ رفاہی امور پر خرچ کرتی ہے یا قوم میں تقسیم کردیتی ہے تو رعایا اور حکومت میں پورا اتفاق رہتا ہے۔ آج کے زمانے میں غیر ملکی تجارت کے لئے زرِ مبادلہ کس طرح حاصل ہوگا تو اس کا حل کتاب ہذا کی فصل "اقتصادیات" میں اشارۃً مرقوم ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیے۔ اب ہم نظامِ زکوٰۃ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

نظامِ زکوٰۃ | اسلامی قانون میں جب تک زکوٰۃ ادا نہ کی جائے مال کی تطہیر نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ضرورت مند افراد کی امداد و دستگیری ہوتی رہے۔ چنانچہ نقلِ اوّل میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان ہوئے ہیں جن میں سے سات کا تعلق افراد سے ہے اور ایک کا تعلق اجتماعی و رفاہی اُمور سے۔ چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے کہ "صدقہ زکوٰۃ کے مصارف یہ ہیں۔ فقرا کا حق اور محتاج لوگوں کا حق اور اس کے کارندوں کا حق اور اُن لوگوں کا حصہ جن کی تالیفِ قلب مقصود ہے اور غلاموں کی رہائی کے لئے اور قرض داروں کے ادائے قرض کے لئے اور خدا کی راہ میں امورِ خیر کے لئے اور مسافروں کے لئے۔ اسلام کا مقصد دولت کو سرمایہ دار کے ہاتھ سے کھینچنا ہے تاکہ سرمایہ دارانہ رجحان پیدا نہ ہوسکے۔ گو اس سے امیر و غریب کا فرق ختم نہیں ہوتا لیکن بڑی حد تک معاشی راہ متوازن ہوجاتی ہے۔ مذہب دشمن طبقہ کا زکوٰۃ پر اعتراض ہے کہ خدا نے اس کی مقدار اس قدر قلیل مقرر کی ہے کہ وہ ناکافی ہے اور غربا کی ضرورت پوری نہیں کرپاتی۔ چنانچہ نقلِ دوم کے ہادی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ "اللہ نے دولت مندوں کے مال میں فقیروں کا اتنا ہی حق مقرر کیا ہے جو ان کی ضروریات کی کفالت کرتا ہے۔ اور اگر اللہ یہ جانتا کہ اس سے محتاجوں کی احتیاج برطرف نہیں ہوسکتی تو وہ اس کی مقدار زیادہ کردیتا بلکہ اگر اللہ چاہتا تو فقیر کا حصہ مالک کے برابر کردیتا مگر حکمتِ الٰہیہ کا

تقاضہ یہ ہے کہ صاحب مال کا حصّہ زیادہ ہو کیونکہ یہ مال اس کی محنت و ریاضت کا ثمرہ ہے اور غریب کا اگر اس میں حق ہے تو بلا مشقت۔ جہاں غریب کی ضروریات ہیں وہاں امیر کو بھی احتیاج ہے۔ لہٰذا اس کی محنت و ضروریات کے پیشِ نظر دولت مند کو یہ رعایت دی کہ اس کا حصّہ وافر رکھا لیکن بصورتِ دوم جہاں محنت و مشقت کم ہے وہاں مقدارِ زکوٰۃ بھی زیادہ کر دی۔ چنانچہ اگر گیہوں کی فصل بارانی ہو اور امیر کو آبپاشی پر محنت نہ کرنی پڑے تو زکوٰۃ کی شرح ۱/۱۰ کر دی جبکہ آبپاشی کی صورت میں ۱/۲۰، اسی طرح اگر مویشی صحراؤں اور چراگاہوں میں چرکر اپنا پیٹ خود ہی پال لیں تو مالک پر ان کی زکوٰۃ مقرر کی لیکن اگر وہ خود ان کی پرورش کرتا ہے تو مویشیوں کی کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اللہ نے نہ ہی امیر پر ناقابلِ برداشت بوجھ ڈالا ہے اور نہ ہی فقیر کی کفالت سے چشم پوشی کی ہے۔ اور اگر زکوٰۃ کو صحیح معنوں میں ادا کیا جائے تو یہ مقدار ناکافی ثابت نہیں ہوئی جب کہ زکوٰۃ مستحب کی کوئی مقدار ہی مقرر نہیں کی گئی۔ اور اگر اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے تو سرے سے زکوٰۃ لینے والا ہی ملنا محال ہو جاتا ہے۔

حضرت رسول کریمؐ کے زمانے میں زکوٰۃ کا نظام اجتماعی تھا۔ کارندوں کے ذریعے جمع کی جاتی اور پھر مقررہ مصارف پر صرف کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ جناب امیرؑ نے سنّتِ جنابِ رسالتمآبؐ کے مطابق اپنی نگرانی میں جمع زکوٰۃ و تقسیم کا بندوبست فرمایا۔ چنانچہ آپؑ نے بڑے مخلص و دیانتدار افراد کو زکوٰۃ کی وصولی پر متعین فرمایا اور انہیں ہدایت فرمائی کہ کسی قسم کی سختی روا نہ رکھی جائے جو اپنی مرضی سے زکوٰۃ دے لے لی جائے اور جو یہ کہہ دے کہ اس پر زکوٰۃ نہیں تو اس سے بارِ دیگر نہ پوچھا جائے حضرت نے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے نہ ہی کوئی جبر و تشدّد کیا اور نہ ہی لشکر کشی کی ضرورت سمجھی۔ کیونکہ اگر اس دینی فریضے میں جبر کیا جائے گا تو جبری ٹیکس اور فریضہ زکوٰۃ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت بلا جبر زکوٰۃ جمع کر کے قرآنی مصارف پر صرف کر دیتے اور اسے محاصلِ حکومت کی دوسری مدّوں میں خلط ملط نہ ہونے دیتے تھے۔

نظامِ خراج اسلام میں جو زمینیں دشمن سے لڑائی کے بعد یا شرطِ صلح کے تحت مسلمانوں کو ملتی ہیں انہیں اراضیاتِ خراجیہ کہا جاتا ہے ان میں کاشت کرنے والوں سے زکوٰۃ کے علاوہ معاوضہ کاشت بھی لیا جاتا ہے اگر وہ معاوضہ غلّہ کی صورت میں ہو تو مقاسمہ کہلاتا ہے اور اور اگر قیمت کی صورت میں ہو تو اُسے خراج کہا جاتا ہے خراج کی مقدار ولی امر کے عدل سے وابستہ ہے۔ وہ حالات کے مطابق انصاف سے خراج کا تعیّن کرے گا۔ چنانچہ حضرت امیر علیہ السلام نے خراج کی جمع آوری کا نہایت عمدہ بندوبست کیا۔ مگر آپؑ کی نظر خراج کی نسبت زمین کی آبادی پر زیادہ تھی تاکہ رعایا مالی و زرعی اعتبار سے فارغ البال ہو۔ لہٰذا آپؑ خراج کے بارے میں سختی برتنے کے خلاف تھے۔ چنانچہ آپؑ اپنے کارندوں کو تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ خراج کی وصولی میں اپنا رویّہ نرم رکھیں اور کسی پر تشدّد نہ کریں۔ ایک شخص کو کو قدوقادسیہ کے خراج کی وصولی کے لئے مقرر کیا اور ہدایت فرمائی "خبردار۔ خراج کے درہموں کی خاطر کسی کو اذیت نہ دینا خواہ وہ مسلمان ہو، یہودی ہو یا عیسائی۔ نہ ہی درہموں کے لیے کھیتی باڑی میں کام آنے والے مویشی فروخت کرنا۔ ہمیں تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو اُن کے پاس ضرورت سے زیادہ ہو وہ لیں"۔ اسی طرح مالکِ اُشتر کو ہدایت فرمائی کہ "خراج کی جمع آوری سے زیادہ زمین کی آبادی کا خیال رکھنا کیونکہ خراج تو زمین کی آبادی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور جو حاکم آباد کئے بغیر خراج چاہتا ہے تو وہ ملک کی بربادی اور مخلوقِ خدا کی تباہی کا سامان کرتا ہے اور اس کی حکومت چند روزہ ہوا کرتی ہے"۔ حضرت علیؑ نے خراج کی رقم بھی بہت معمولی تجویز کی تھی جو کسی پر بار نہ تھی۔

نظامِ جزیہ اسلام اقلیتوں کے تمام حقوق کا ضامن ہے بشرطیکہ وہ رعایا بن کر مملکت کے وفادار رہیں۔ اور اگر کسی نظریاتی ریاست میں کسی جماعت کے حقوق تسلیم کئے جاتے ہیں تو اُس پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ چُنانچہ ان معاشرتی و معاشی حقوق کے عوض ملکی قوانین کی پابندی کے علاوہ ایک جزوی ٹیکس بھی عائد ہوتا ہے جس کا نام اصطلاحِ اسلام میں جزیہ ہے۔ یہ لفظ جزاً

سے ہے کہ اس کے معنی بدلہ و عوض کے ہیں۔ اس جزیے سے رفاہی و دفاعی اُمور سرانجام دیئے جاتے ہیں جن سے مسلم و غیر مسلم رعایا مساوی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جزیے کی مقدار بھی خراج کی طرح مقرر نہیں ہے اور سربراہِ حکومت کا کام ہے کہ عدل کے ساتھ جزیہ کی رقم تجویز کرے۔ حضرت امیر المومنینؑ کے عہد میں جزیہ کی شرح یہ تھی۔ امراء سے ۴۸ درہم، متوسط طبقہ سے ۲۴ درہم اور عوام سے ۱۲ درہم سالانہ فی کس۔ بچے، بوڑھے اندھے، دیوانے، مفلس، اپاہج عورتیں اور راہب مستثنیٰ تھے۔

کاروباری طبقے کی نگرانی

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔" چنانچہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہر شخص اپنے زیرِ تربیت و کفالت افراد کی نگہداشت کا ذمہ دار ہے۔ لہٰذا حاکمِ وقت بھی اس جواب طلبی سے بالاتر نہیں۔ اس لئے ہر سربراہِ مملکت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ملت کی نگہبانی اور ان کی اخلاقی نگرانی سے غافل نہ ہو۔ اس ذمہ داری کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ہر کام محض اپنے افسروں کو نہ سونپ دے۔ خود بے فکر ہو کر نہ بیٹھ رہے بلکہ براہِ راست رعایا کے عادات و اطوار کا جائزہ لے۔ ان کے طریقۂ کار کو دیکھے بھالے۔ اور اس کام کے لئے ضروری ہے کہ حاکمِ وقت اور عوام میں کوئی اجنبیت نہ ہو بلکہ دونوں ایک دوسرے کے قریب تر اور گھلے ملے ہوں۔ اسی طریقے سے وہ صحیح نگرانی کر سکے گا۔ چنانچہ حضرت امیر المومنینؑ کا یہ طرزِ عمل تھا کہ وہ خود کبھی چھُپ کر، کبھی علانیہ گلی کوچوں اور بازاروں میں چکر لگاتے۔ تاجروں اور دستکاروں کی سرگرمیاں ملاحظہ فرماتے۔ بھاؤ دریافت کرتے۔ مال جانچتے اور ناپ تول کی پڑتال کرتے۔ دوکانداروں کو خوش معاملگی اور دیانت کا ہمیشہ درس دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک درزی کی دوکان پر تشریف لے گئے اور کھڑے ہو کر فرمایا کہ دھاگہ مضبوط استعمال کرو۔ سلائی باریک رکھو اور ٹانکا دوسرے ٹانکے سے ملا کر بھرو۔ اور سلائی کے بعد کپڑے کے جو ٹکڑے بچ جائیں وہ سب مالک کے حوالے کر دو کیونکہ میں نے رسولؐ خدا سے سُنا ہے کہ روزِ قیامت کپڑے میں خیانت کرنے والے کو اس طرح لایا

جائے گا کہ خیانت سے حاصل کیا ہوا کپڑا اُس پر لدا ہو گا۔

ابن اثیر نے "البدایہ والنہایہ" میں لکھا ہے کہ ابو مطر بصری بیان کرتا ہے کہ میں مسجد کوفہ سے باہر نکل رہا تھا کہ کسی نے آواز دی۔ چادر کا کنارہ اوپر اٹھا کر چلو۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ ایک بادیہ نشین عرب ہاتھ میں ایک دُرّہ لئے ایک چادر باندھے اور ایک چادر اوڑھے ہوئے آ رہا ہے۔ یہ سادگی اتنی پُرعظمت تھی کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک آدمی سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ اس نے جواب دیا "تم نو وارد معلوم ہوتے ہو!" میں نے کہا "ہاں میں بصرے کا رہنے والا ہوں اور وہیں سے آ رہا ہوں۔" اس شخص نے کہا "ہاں اسی لئے تم نے پہچانا نہیں۔ یہ امیر المومنین علیؑ ابن ابیطالب ہیں۔" یہ سُن کر میں لرز گیا اور آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف ہٹا اور آپ کے عقب میں چل دیا۔ میں نے دیکھا کہ آپؑ آگے بڑھ کر سودا سلف بیچنے والوں کے پاس کھڑے ہو گئے ہیں۔ ان سے فرمایا "بیچو مگر قسمیں کھا کر نہ بیچو۔ کیونکہ قسم کھانے سے برکت اُٹھ جاتی ہے اگرچہ مال فروخت ہو جاتا ہے۔" خُرمہ فروشوں کے بازار کا رُخ کیا اور وہاں ایک کنیز کو روتے دیکھ کر ٹھہر گئے۔ اُس سے رونے کی وجہ پوچھی اُس نے کہا کہ "میں نے اس دوکان دار سے ایک درہم کی کھجوریں خریدی تھیں۔ میرے مالک نے ناپسند کیا اور کہا کہ یہ واپس کر آؤ۔ مگر یہ واپس نہیں لیتا۔" حضرتؑ نے اس دوکان دار سے کہا "یہ کنیز ہے اور مجبور ہے تم یہ کھجوریں واپس لے لو۔" اُس نے انکار کیا تو میں نے کہا "اے شخص پہچانتے نہیں ہو کہ تمہیں کون کہہ رہا ہے؟ یہ امیر المومنینؑ ہیں۔" یہ سُنتے ہی اس نے فوراً کھجوریں واپس لے لیں اور درہم کنیز کو واپس کر دیا۔ پھر حضرتؑ نے دوکانداروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا "مسکینوں کو کھانے کے لئے دو۔ تمہارے کاروبار میں اضافہ ہو گا۔" اس کے بعد مچھلی منڈی گئے اور فرمایا۔ خبردار حلال و حرام کا امتیاز کیے بغیر ایسی مچھلی فروخت نہ کرنا جو پانی کے اندر مر چکی ہو۔ پھر آگے پارچہ فروشوں کے بھرے بازار میں آئے اور ایک دوکاندار سے کہا کہ "تین درہم تک کا کوئی کرتہ دکھاؤ۔" اس نے پہچان کر آپ کا خیر مقدم کیا۔ مگر آپؑ نے

وہاں سے کرتہ نہ خریدا۔ اور ایک دوسری دوکان سے تین درہم میں کرتہ خرید فرمایا۔ جب حضرت واپس رحبہ تشریف لائے تو ایک شخص آیا اور اس نے ایک درہم پیش کیا۔ آپؑ نے پوچھا یہ درہم کیسا ہے؟ کہا کہ یا امیر المومنین مجھے دوکانداروں سے معلوم ہوا ہے کہ آپؑ میری دوکان پر تشریف لے گئے تھے اور میرے بیٹے سے کرتہ خرید فرمایا تھا اس نے غلطی سے دو درہم کا کرتہ آپؑ کو تین درہم میں دے دیا ہے۔ یہ وہی درہم ہے جو آپؑ نے زائد دیا ہے۔ حضرت نے وہ درہم واپس لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ سودا خریدار اور دوکاندار کی مرضی سے ہوا ہے لہذا یہ واپس نہیں لیا جا سکتا۔

امیر المومنینؑ نے کبھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ آپؑ نے اسے اپنا دینی و منصبی فریضہ سمجھا کہ جہاں نیکی کی کوئی صورت دیکھیں وہاں اور ترغیب دیں اور جہاں برائی دیکھیں خواہ وہ بظاہر کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو اس سے منع فرمائیں۔ چنانچہ آپؑ کو کسی کا دامن لٹکا کر چلنا بھی معیوب نظر آیا اور اٹھا کر چلنے کی ہدایت فرمائی کہ یہ اندازِ پوشش غرور کی علامت ہے۔ کنیز کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہ کر سکے اور دوکاندار پر رُعبِ حاکمانہ جمانے کی بجائے اخلاق سے اس کی مجبوری بیان فرمائی۔ تاجروں کو مساکین کی اعانت کی ہدایت فرمائی اور برکت کا سبب بتایا۔ حرام چیزوں کی فروخت سے منع فرمایا۔ ایک واقف کار سے کرتہ نہ خریدا کہ محض مروت میں اُسے نقصان نہ پہنچ جائے۔ پھر بائع اور مشتری کے مابین سودا طے ہونے پر زیادہ رقم کی واپسی پر آمادہ نہ ہوئے۔ تو ایسی کئی اور مثالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نے اپنا فرضِ منصبی بڑی خوبصورتی سے پورا کیا۔ اور یہ شرف صرف آپؑ کو یا آپؑ کے آقا حضرت محمد مصطفےٰؐ ہی کو حاصل ہے۔

نادار اور لاوارثوں کا خیال

اسلام میں یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور لاوارثوں کے ساتھ حسنِ سلوک اعمالِ صالح کا اہم جزو ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا کہ "دین امر الہیٰ کی تعظیم اور خلقِ خدا پر شفقت و مہربانی کا نام ہے۔" یوں تو ہر مسلمان کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ شکستہ حال افراد کی خبر گیری کرے مگر سربراہ مملکت

پر یہ ذمہ داری سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے۔ حضرت امیرؑ کا دل محبت و شفقت کے جذبات سے پُر تھا۔ جب کسی مفلوک الحال کو دیکھتے تو تڑپ اُٹھتے۔ کسی بے نوا کی صدا سُنتے تو بے چین ہو جاتے اور یتیموں سے اس طرح پیش آتے کہ انہیں یتیمی کا احساس نہ ہو۔ ایک مرتبہ اصفہان اور حلوان سے انجیر اور شہد کے مشکیزے آئے۔ حضرتؑ نے حکم دیا کہ یتیم بچوں کو لاؤ۔ جب بچے جمع ہو گئے تو آپؑ نے مشکیزوں کے مُنہ کھول کر ان بچوں کے ہاتھوں میں دیدیئے اور پیالوں میں شہد بھر بھر کے تقسیم کرنا شروع کیا۔ بچے شہد بھی انڈیلتے جاتے تھے اور مشکیزوں کے دہانوں پر لگا ہوا شہد بھی چاٹتے جاتے تھے۔ کچھ لوگوں نے کہا۔ ان بچوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اس طرح شہد چاٹ رہے ہیں اور امیرالمومنینؑ بھی انہیں منع نہیں فرما رہے۔ حضرتؑ نے فرمایا: "امام یتیموں کا باپ ہوتا ہے اور اسی پدری تقاضے کی بنا پر انہیں شہد چاٹنے دیا ہے۔"

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت امیرؑ ایک گلی میں سے گزرے۔ دیکھا کہ ایک عورت مشکیزہ کاندھے پر اُٹھائے جا رہی ہے۔ اس سے پوچھا کہ تمہارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے جو باہر کے کام انجام دے۔ اس نے جواب دیا کہ "امیرالمومنینؑ نے میرے شوہر کو ایک مُہم پر بھیجا تھا جہاں وہ شہید ہو گیا اور میرے بچے یتیم ہو گئے۔ میں خود ہی پانی بھرتی اور محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہوں۔" حضرتؑ مشکیزہ اس کے گھر تک پہنچا کر آئے اور ساری رات قلق و اضطراب میں گزاری۔ جب صبح ہوئی تو خورد و نوش کا سامان لے کر اس کے ہاں پہنچے۔ دروازے پر دستک دی۔ اس نے پوچھا کون ہے؟ فرمایا "کل جو تمہارا مشکیزہ اُٹھا کر لایا تھا۔" اسنے دروازہ کھولا۔ حضرتؑ نے وہ سامان اس کے حوالے کیا۔ پھر پوچھا کہ "تم آٹا گوندھو گی یا بچوں کو بہلاؤ گی؟" کہا کہ "میں آٹا گوندھتی ہوں اور آپؑ بچوں کو بہلائیں"۔ جب وہ آٹا گوندھ چکی تو کہا "اے مردِ خدا! اب آپ تنور روشن کریں"۔ حضرتؑ نے تنور میں لکڑیاں ڈالیں اور انہیں آگ لگائی۔ جب شعلے بلند ہوئے تو حضرتؑ نے تپش محسوس کی۔

پھر فرمایا۔ "اے علیؑ یتیموں اور رانڈوں کی طرف سے بے خبری کا مزہ چکھو" اسی اثناء میں محلے کی ایک عورت آئی۔ اُس نے امیرالمومنینؑ کو تنور روشن کرتے دیکھا تو اس عورت سے کہا کہ "تمہیں شرم نہیں آتی کہ امیرالمومنینؑ سے خدمت لے رہی ہو" جب اس عورت نے یہ سُنا تو اُس پہ سکتہ طاری ہوگیا۔ معذرت کرتے ہوئے عرض کیا "یا امیرالمومنینؑ میں شرمسار ہوں کہ آپؑ سے خدمت لیتی رہی ہوں اور آپؑ کو پہچان نہ سکی" حضرت نے فرمایا "میں تو خود نادم ہوں کہ تمہارے بارے میں کوتاہی برتی اور تمہیں اتنے دن تکلیف اُٹھانا پڑی"

ایک مرتبہ نماز سے فراغت کے بعد دیکھا کہ مسجد کے باہر دروازے پر ایک عورت رو رہی ہے۔ وجہ دریافت کی اور معلوم ہوا کہ اُس کے شوہر نے اُسے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہے اور قسم کھائی ہے کہ اُسے ہلاک کر دیگا۔ حضرت نے اُسے تسلی دی اور فرمایا کہ "ذرا دھوپ ڈھلنے دو۔ میں تمہارے شوہر کو بُلا کر سمجھاتا ہوں" اس نے کہا کہ اس وقفہ میں خدا جانے وہ کیا کر بیٹھے" حضرت نے فرمایا "اچھا میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں" جب اس کے مکان پہ پہنچے تو اُسے آواز دی وہ باہر آیا تو حضرت نے فرمایا "اے بندۂ خدا۔ اللہ سے ڈرو اور اپنے اہلِ خانہ کو نہ ستاؤ" وہ شخص حضرت کو پہچان نہ سکا اور بولا "آپ ہمارے گھریلو معاملات میں دخل اندازی کرنے والے کون ہوتے ہیں؟" اگر نہیں بھی ستاتا تھا تو اب ستاؤں گا" اتنے میں چند ہمسائے بھی جمع ہوگئے۔ انھوں نے امیرالمومنینؑ کو پہچان لیا اور اس شخص سے مخاطب ہوئے کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ گستاخانہ گفتگو کس سے کر رہے ہو۔ یہ امیرالمومنینؑ ہیں۔ یہ جان کر اس پر لرزہ طاری ہوگیا اور معذرت خواہ ہو کر اقرار کیا کہ آئندہ کبھی سختی نہ کرے گا۔ خواہ اس کی بیوی کی جانب سے کتنی ہی زیادتی کیوں نہ ہو۔ حضرتؑ نے اس عورت کو گھر کے اندر بھیجا اور اُسے نصیحت فرمائی کہ وہ شوہر کی نافرمانی نہ کرے۔

جناب امیرؑ اس خدمتِ خلق کے ساتھ اپنی ضروریات کو نظرانداز فرما کر بھی حاجتمندوں کی حاجت روائی کرتے تھے۔ کبھی کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔ قبل از حکومت کا واقعہ

ہے کہ ایک سائل نے حضرت سے سوال کیا۔ آپؑ نے امام حسنؑ سے فرمایا۔ گھر سے ایک درہم اسے دیدو۔ امام حسنؑ نے عرض کیا کہ گھر میں صرف چھ درہم ہیں جن سے آٹا خریدنا ہے فرمایا کہ مومن کو اپنے ہاں کی چیز سے اللہ کے ہاں کی چیز پر زیادہ اعتماد ہونا چاہیئے۔ جاؤ اسے چھ کے چھ درہم لاکر دے دو۔ امام حسنؑ نے وہ درہم لاکر دیدیئے۔ ابھی حضرت اپنی جگہ پر سے اُٹھے نہ تھے کہ ایک شخص اونٹ ہنکاتا ہوا آیا۔ حضرتؑ نے پوچھا۔ یہ اونٹ فروخت کے لئے ہے۔ اسنے کہا ہاں۔ حضرتؑ نے وہ اونٹ ایک ہفتے کے وعدے پر ایک سو چالیس درہم میں خرید لیا۔ اتنے میں ایک شخص آیا۔ اور اسنے دو سو درہم میں حضرتؑ سے خرید لیا۔ حضرت نے ایک سو چالیس درہم قرض خواہ کو دیئے اور بقیہ ساٹھ درہم لے کر گھر میں تشریف لائے۔ جناب سیدہؑ نے درہم دیکھے تو پوچھا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں۔ فرمایا کہ اللہ نے چھ درہموں کے بدلے میں ساٹھ درہم دلوائے ہیں۔ اس کا وعدہ سچا ہے کہ جو نیکی کرے اُسے ویسی دس نیکیاں بدلے میں ملیں گی۔

غلاموں سے سلوک

گزشتہ زمانے میں دُنیا کے ہر گوشے میں غلامی کا رواج عام تھا۔ اور غلاموں سے بہت ناروا سلوک کیا جاتا تھا۔ اسلام غلامی کو پسند نہیں کرتا تھا مگر اس قبیح رواج کو یک قلم ختم کرنا امر ناممکن تھا۔ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "اسلام نے غلام خریدنے اور رکھنے کو حرام کیوں قرار نہ دیا"۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اسلام کی حکومت پوری دُنیا پر نہیں تھی۔ اگر اسلام غلام رکھنے اور خریدنے کو حرام قرار دے دیتا تو نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ مسلمان تو غلاموں کو نہ خرید سکتے لیکن غیر مسلم ملکوں میں تو خریداری بند نہ ہوتی۔ غیر مسلم تو ضرور خریدتے یعنی بکنے والے غلام سب کے سب غیر مسلم ملکوں میں کفّار کے قبضے میں جاتے جو اُن بکنے والوں کو حسب دستور خرید کر اپنے بے رحمانہ سلوک اور ظلم و ستم کا نشانہ بناتے رہتے اور پھر اُن غلاموں کی آزادی کا بھی کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔ اس لئے اسلام نے یہ بہتر جانا کہ مسلمانوں پر غلاموں کی خریداری کو حرام قرار نہ دیا جائے تاکہ فروخت ہونے والے مظلوم اور مصیبت زدہ انسانوں کی کچھ تعداد تو مسلمانوں کی خریداری میں آکر کفّار کے قبضے میں جانے اور اُن کے ظالمانہ و بیرحمانہ

سلوک کا نشانہ بننے سے بچ جائے۔ کیونکہ مسلمانوں کو رحم کی تعلیم دی گئی ہے اس لئے رسولِ خدا جانتے تھے کہ مسلمان لوگ اپنے خریدے ہوئے غلاموں سے کافروں کی طرح ظالمانہ سلوک نہ کریں گے پس ایک وجہ تو یہ تھی کہ سب فروخت ہونے والوں کو تو کافروں کے ظلم و تشدد سے بچایا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ اسلام کی حکومت ساری دُنیا پر نہیں ہے لیکن ایک بڑی تعداد کو خرید کر کفار سے بچایا جاسکتا ہے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام نے مختلف گناہوں کا کفارہ غلام آزاد کرنے کو قرار دیا تھا جس کی وجہ سے مُسلم دُنیا میں غلاموں کو آزادی ملنے کے مواقع میسّر ہوسکتے تھے۔ مگر کفار کے قبضے میں جانے والوں کو آزادی ملنا قریباً ناممکن تھا۔ اس لئے اسلام نے غلام خریدنے کو حرام قرار نہیں دیا۔ تاکہ غلاموں کی ایک بڑی تعداد کو کفّار کی دائمی غلامی سے بچا کر آزادی کے مواقع دیئے جائیں۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی رحم و کرم سے متاثر ہوکر اور اسلام کی خوبیوں کو دیکھ کر غلاموں کے اسلام قبول کرلینے کا امکان تھا۔ پس اسلام نے چاہا کہ فروخت ہونیوالوں کی ایک بڑی تعداد کافروں کے ظالمانہ برتاؤ سے بھی بچ جائے، ان کو آزادی کے مواقع میسّر آجائیں اور ان کو راہِ ہدایت نصیب ہونے کا موقع بھی ملے۔ ان وجوہات کی بناء پر غلامی کو حرام قرار نہ دینا ہی بہتر تھا۔

اور جہاں تک حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ کا تعلق ہے انہوں نے تو غلاموں اور کنیزوں سے ایسا عمدہ اور رحم دلانہ سلوک کیا کہ اُن کے غلام اور کنیزیں آج فخرِ اسلام ہیں۔ حضرت قنبر کے متعلق حضرت شمس تبریزؒ نے کہا "شمس غلامِ قنبرت دم دم علیؑ علیؑ" (گلزارِ شمس)، یعنی اے مولا علیؑ! شمس تو آپ کے قنبر کا غلام ہے اور شمس کا وظیفہ ہر ہر سانس میں علیؑ علیؑ ہے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت علیؑ کی شان میں ایک قصیدہ کہا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

نظام الدین حیا دارد کہ گوید بندہ شاہم
ولیکن قنبرِ اُو را کمینہ یک گدا باشد

(ترجمہ) کہ نظام الدین یہ کہنے سے حیا رکھتا ہے (یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا) کہ میں شاہ (علیؑ) کا غلام ہوں" لیکن اُن کے قنبرؓ کا کینہ گدا (فقیر) ہے۔ (تجلّی عرفان)

حضرت بی بی فِضّہؑ کو زہراؑ کی کنیزی کا یہ صلہ ملا کر حسنؑ و حسینؑ اُن کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے یہاں تک کہ "اماں فِضّہ" کہہ کر بات کرتے تھے۔ اور جو کوئی اہلبیتؑ اطہار کے پاس آگیا وہ اہلبیتؑ کے پاس سے جانا گوارہ ہی نہ کرتا تھا۔ وہ آزادی کو ان کی غلامی پر قربان کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ نے حضرت فِضّہؑ سے کہا کہ "آپ کو جنّت کی بشارت ہو۔" تو حضرت فِضّہؑ نے کہا "کون سی جنّت؟" تو عبداللہ بن مسعودؓ نے حیران ہو کر کہا کہ "آپ بابِ مدینۃ العلم علیؑ اور بضعۃ الرسولؐ حضرت فاطمہؑ زہرا کے گھر میں رہتی ہیں۔ کیا آپ کو ابھی تک جنّت کا پتہ نہیں ہے؟"، تو حضرت فِضّہؑ نے کہا کہ "اے قاریٔ قرآن عبداللہ بن مسعودؓ! میری جنّت تو کاشانۂ زہراؑ ہے۔" یعنی مجھے زہراؑ کے گھر میں ایسا آرام و سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے کہ مجھے اس کے سامنے جنّت بھی کوئی شئے نظر نہیں آتی۔ اسی طرح کربلا میں حضرت امام حسینؑ نے ایک غلام (فخرِ اسلام) حضرت جونؑ علیہ السّلام سے فرمایا کہ "جونؑ تم جا سکتے ہو۔ تم کیوں ہمارے ساتھ مصیبت اٹھاؤ۔ تمہیں جانے کی اجازت ہے۔" تو حضرت جونؑ نے رو کر کہا۔ "اے فرزندِ رسولؐ! کیا آپ مجھے اس لئے اجازت دے رہے ہیں کہ میرا کالا اور بودار خون آپ کے خون کے ساتھ نہ مل جائے۔ مولا! میں ہرگز جانا نہیں چاہتا۔ میں تو آپؑ کے اور اسلام کے اوپر جان قربان کروں گا۔" آخر مَولا حسینؑ نے جونؑ کی محبّت اور جذبۂ وفا و جہاد کا لحاظ رکھتے ہوئے شہادت کی اجازت دے دی! درجونؑ پر آئمۂ طاہرینؑ فخر کرتے رہے۔ سلام بھیجتے رہے اور جونؑ علیہ السلام فخرِ اسلام ہیں۔ حضرت جونؑ کے واقعۂ شہادت اور اُن کی امام حسینؑ سے گفتگو نے ثابت کر دیا کہ جو شخص اہل بیتِ اطہارؑ کے پاس غلام ہو کر آتا تھا اہلبیتِ طاہرینؑ اُس سے ایسا بے نظیر سلوک رحم و کرم فرماتے تھے کہ وہ غلام اُن پاک ہستیوں کی غلامی پر فخر و ناز کرتا تھا اور آزادی سے بھی بہتر آرام و سکون اُسے ملتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ راہِ ہدایت پا کر، ان ہستیوں پر قربان ہو جانے کو زندہ رہنے پر ترجیح دیتا تھا۔

خود حضرت محمد مصطفیٰؐ نے اپنے غلام حضرت زیدؓ کو آزاد کیا اور اُن سے ایسا سلوک کیا کہ لوگ حضرت زید کو "فرزند رسولؐ" کہنے لگے۔ آخر قرآن کو کہنا پڑا کہ "محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں اور لیکن اللہ کے رسولؐ اور خاتم النبیین ہیں" حضرت زیدؓ کی جنگ موتہ میں شہادت کے بعد رسولؐ خدا نے حضرت اسامہؓ بن زید کو اس لشکر کا سردار مقرر فرمایا جو حضورؐ نے مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے ترتیب دیا تھا اور بڑے بڑے صحابہ کو (جن میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ بھی تھے) حضرت اُسامہؓ کے ماتحت مقرر کیا۔ صحابہ نے اس بات پر کچھ چوں چرا کی تو حضورؐ غضبناک ہو کر منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ "تم لوگ اُسامہؓ کی سرداری لشکر پر اعتراض کرتے ہو۔ خدا کی قسم اُسامہؓ سرداری کے لائق ہے اور اس کا باپ (زیدؓ) بھی سرداری کے لائق تھا۔ اور پھر دُعا کی جو شخص لشکر اُسامہؓ سے تخلف کرے (یعنی اُسامہؓ کے ماتحت مقرر ہو جانے کے بعد بھی ساتھ نہ جائے)، تو اُس پر اللہ کی لعنت ہو (الملل والنحل شہرستانی ص۵) یعنی ماتحت مقرر ہونے والوں میں سے جو نہ جائے وہ رسولؐ خدا کے ارشاد کے مطابق ملعون ہے۔ اُس پر اللہ کی لعنت ہے۔" (مشکوٰۃ شریف باب مناقب اہل بیت نبیؐ تاریخ الخمیس جلد ۲ ص۱۵۴، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص۱۸۲ سطر اوّل)

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ حضرت علیؑ کو حضورؐ نے لشکرِ اُسامہؓ میں نہیں رکھا تھا یعنی اُسامہؓ کا ماتحت نہیں بنایا تھا۔

نہایت اہم نکتہ

حضورؐ کی وفات کے بعد جب یہ لشکر حکومتِ اوّل میں بھیجا گیا تو کون گیا؟ کون نہیں گیا؟ یہ بات پوری توجّہ کے لائق ہے۔

المختصر اسلام نے پہلے تو غلامی کو صرف حربی کفّار میں محدود کر دیا جو جنگ و قتال کے نتیجے میں اسیر کر لیے جاتے تھے اور یہ ایک ناگزیر ضرورت تھی کیونکہ اسلام کی جنگ اسی وقت ہوتی ہے جب دشمن حد سے تجاوز کر کے انتہائی خطرناک صورتِ حال پیدا

کردے۔ اب اگر ایسے گروہ کے آدمی کو آزاد چھوڑ دیا جائے گا تو وہ تخریب کاری سے باز نہیں رہ سکے گا۔ کیونکہ جو لوگ بغاوت وسرکشی سے امن عامّہ کو خطرے میں ڈال چکے ہوں آئندہ بھی اُن پر اعتماد نہیں رہتا۔ اور موجودہ سیاست کے مطابق ایسے افراد کی سزا موت یا حبسِ دوام ہے لیکن اسلام کے قوانین میں سنگدلی کی بجائے عفو درحم زیادہ غالب ہے چنانچہ ایسے لوگوں کے لئے اسلام نے یہی سزا تجویز کی ہے کہ نہ اُن کو قتل کیا جائے اور نہ ہی جیل بھیجا جائے بلکہ اُن کی آزادی سلب کر لی جائے جو نسبتاً بہت نرم سزا ہے اُس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ دشمن کو نسلاً بعد نسل غلامی کا ڈر مسلمانوں کے خلاف جنگ کا محاذ قائم کرنے سے مانع ہو۔ پھر پیغمبرِ اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی اور بردہ فروشی کی سختی سے مذمت فرمائی۔ کفّارہ میں غلاموں کی آزادی کو جگہ دی۔ مصارفِ زکوٰۃ میں اُن کی آزادی کا حصّہ قائم کیا۔ کسی جسمانی لاغری سے اگر غلام ناکارہ ہو جائے تو وہ خود بخود آزاد متصوّر ہوگا۔ اگر کنیز صاحبِ اولاد ہو جاتی ہے تو مالک کی وفات کے بعد ہمیشہ کے لئے آزاد ہوگی۔ اور پھر یہ کہ اگر تھوڑے سے غلام باقی رہ جائیں تو پھر اُن سے حُسنِ سلوک مساوات کی بُنیاد پر ہو۔ چنانچہ رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا "جو خود پہنتے ہو وہی انہیں پہناؤ اور جو خود کھاتے ہو وہی انہیں کھلاؤ"۔ جب غلام سے اس بُنیاد پر حُسنِ سلوک ہو تو آزاد ہو کر از خود اس کی کدورت رفع ہو چکی ہوتی ہے اور اسلامی تعلیم کا اس پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

حضرت امیر المومنینؑ غلاموں سے گہری ہمدردی رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ حضرتؑ نے اپنی محنت کی کمائی سے تقریباً ایک ہزار غلاموں کو خرید کر آزاد کر دیا۔ حضرتؑ صرف غلاموں کو خرید کر آزاد کر دینے پر ہی اکتفا نہ فرماتے تھے بلکہ محتاج غلاموں کی کفالت بھی اپنے ذمّہ لے لیتے تھے۔ اور اُن پر اس قدر مہربان وشفیق تھے کہ یہ گمان تک نہ ہوتا تھا کہ کسی قصور پر انہیں سزا بھی دیں۔ ایک مرتبہ ایک غلام کو کسی کام کے لئے آواز دی۔ چند بار پکارنے پر بھی وہ نہ آیا۔ آپؑ نے باہر جھانکا تو دیکھا کہ وہ باہر کھڑا ہے۔ فرمایا۔ میں نے تمہیں اتنی بار بُلایا ہے۔ کیا تم نے میری آواز نہیں سُنی؟ اُس نے جواب دیا۔ میں

تو خاموش اس لئے رہا کہ مجھے آپؑ کی طرف سے یہ خطرہ نہ تھا کہ میرے جواب نہ دینے پر آپؑ مجھے سزا دیں گے۔ حضرتؑ نے جب یہ سُنا تو فرمایا۔ الحمد للہ کہ اس نے مجھے ایسا قرار دیا جس کے گزند سے خلقِ خدا اپنے کو محفوظ سمجھتی ہے۔ اُٹھو تم راہِ خدا میں آزاد ہو۔"

ایک دفعہ جناب امیرؑ اپنے ایک عزیز غلام قنبرؓ کے ساتھ بازار گئے۔ دو پیراہن خریدے۔ ایک عُمدہ اور ایک سستا۔ قنبرؓ سے کہا کہ "عُمدہ کپڑا تم لے لو اور سادہ میرے لئے رہنے دو۔" قنبرؓ نے عرض کیا "مولا! آپ آقا ہیں۔ اچھا کپڑا خود زیب تن فرمایئے۔" آپؑ نے ارشاد فرمایا "قنبر تم جوان ہو۔ تم میں شباب کا ولولہ ہے۔ مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے کہ میں (پوشش میں) اپنا معیار تم سے بلند رکھوں۔" یہ بات اس لحاظ سے نرالی نہیں ہے کہ ایک آقا نے کم قیمت لباس پہنا اور غلام کو مہنگا کپڑا دیا۔ کیونکہ کئی حکمران ایسے کردار کے ملتے ہیں جنہوں نے اپنے غلاموں کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ مگر محض لباس فاخرہ و ظاہری نمائش سے احساسِ غلامی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس طرح کی وضع قطع بعض اوقات غلامی کا احساس اُبھارتی ہے۔ اس واقعہ میں امیر المومنینؑ کی انسانی نفسیات و احساسات پر نظرِ غائر قابلِ توجہ ہے کہ کس انداز سے انہیں کپڑا دیا کہ قنبرؓ کو یہ احساس نہیں ہوا کہ عمدہ لباس غلام نوازی کی بناء پر عطا ہوا ہے۔ بلکہ آپؑ نے شباب و پیری کے فرق کو بیان فرما کر ایسا خیال اُبھرنے ہی نہ دیا۔ اور غلام کا ذہنی رُخ موڑ کر یہ تاثر دیا کہ سن و سال کے لحاظ سے انسان کے طبعی تقاضوں میں فرق ہوتا ہے۔ مگر انسان ہونے کے اعتبار سے سب کے احساسات یکساں ہوتے ہیں۔ یہ وہ طرزِ عمل تھا جس نے غلاموں میں بیداری پیدا کی۔ ان میں مخفی صلاحیتوں کو روبہ عمل لانے کی تحریک پیدا کی۔ چنانچہ اسی ذہنی نمود کے نتیجہ میں غلاموں میں سے ایک طبقہ غلامی کی زنجیریں توڑ کر اپنی سعی و کاوش سے تختِ شاہی کی بلندیوں تک پہنچا اور سلطنتوں کا بانی قرار پایا۔

قیدیوں سے برتاؤ قید و بند کی سزا کا دستور زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے حکومتیں جنہیں مجرم قرار دیتی تھیں (خواہ وہ فی الحقیقت مجرم نہ ہوں) انہیں قید خانوں میں ڈال دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ حضرت یوسفؑ کئی برس تک زندان میں بند رہے۔

حضورؐ کے زمانے میں بھی باغیوں اور جنگی قیدیوں کو زیر حراست رکھا جاتا تھا آنحضرتؐ کے بعد کی تین حکومتوں میں بھی قید و بند کی سزا دی جاتی تھی۔ مگر کسی عمارت میں قید کرنے کی بجائے کنوؤں میں رکھا جاتا تھا (" محاضرۃ الاوائل" شیخ علاؤالدین ص۱۶۲) لیکن حضرت علیؑ نے کنوؤں میں رکھنے کی بجائے قید خانہ تعمیر کرایا۔ چنانچہ علامہ زمخشری نے لکھا ہے " حضرت علیؑ نے ایک قید خانہ (کچا) تعمیر کروایا اور اس کا نام مانع رکھا۔ لیکن جب چوروں نے اس میں نقب لگائی تو کنکروں اور پتھروں سے تعمیر کرایا اور اس کا نام مخیس رکھا"

اموی و عباسی دور میں قیدیوں کو تہ خانوں میں بند کیا جاتا تھا اور کسی کو ملاقات کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ ان پر اس قدر سختی کی جاتی تھی۔ کہ اُن کا زندہ نکلنا گویا معجزے سے کم نہ ہوتا تھا۔

امیرالمومنینؑ نے کبھی بھی کسی کو انتقامی جذبے کی بناء پر قید کی سزا نہ دی۔ بلکہ ایسے افراد کو قید میں ڈالتے تھے جو خیانت و غصب کے مرتکب ہوتے تھے۔ انہیں قید میں رکھنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ان کی مجرمانہ ذہنیت کی اصلاح کی جائے تاکہ معاشرے میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر سکیں۔ اُن پر صرف اتنی پابندی عائد ہوتی تھی جتنی ذہنی اصلاح کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ انہیں مقررہ اوقات میں باہر نکلنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ نماز کے وقت جیل کے دروازے کھول دیئے جاتے تھے۔ موسم کے لحاظ سے لباس، رہائش اور خورد و نوش کا بندوبست ہوتا تھا۔ اگر وہ مخیر ہوتے تو کھانے پینے کا خرچہ اُن سے وصول کیا جاتا اور اگر غریب ہوتے تو سرکاری مال سے اُن کے اخراجات ادا کئے جاتے تھے۔

ذمیوں سے سلوک

" ذمی " اسلامی ریاست کے وہ غیر مسلم ہوتے ہیں جو حسب معاہدہ حکومت کو جزیہ ادا کرتے ہیں۔ اسکے عوض حکومت اُن کے تمام معاشی، معاشرتی و مذہبی حقوق کے تحفظ کا ذمہ لیتی ہے۔ چنانچہ جناب امیرؑ کا ذمیوں سے برتاؤ بہت رحمدلانہ تھا۔ آپؑ کے عہد میں ان کو پوری آزادی تھی اور مذہبی اختلاف کی وجہ سے ان کی تحقیر آپؑ کو کبھی گوارہ نہ تھی۔ آپؑ اپنے گورنروں کو بھی ذمیوں کے حقوق

کی حفاظت کی تلقین فرماتے تھے۔ اس حُسنِ سلوک کے باعث ذمّی ہمیشہ جناب امیرؑ کے دل سے وفادار رہے۔ ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ "میں اس شخص (علیؑ) کے بارے میں کیا کہوں جسے ذمّی بھی دل و جان سے چاہتے تھے، حالانکہ وہ لوگ (پیغمبرؐ کی) نبوت کی تکذیب کرتے تھے۔"

ایک دفعہ امیر المومنینؑ کوفہ کی طرف جا رہے تھے کہ ایک ذمّی آپ کا ہم سفر ہوگیا۔ اس نے حضرت سے دریافت کیا کہ آپؑ کدھر جائیں گے۔ فرمایا کوفہ کچھ فاصلہ دونوں ساتھ رہے۔ جب اس ذمّی نے اپنی منزل کی طرف مڑنا چاہا تو حضرت بھی اس کے ساتھ چل دیئے۔ اس نے کہا یہ راستہ تو کوفہ نہیں جاتا۔ فرمایا مجھے معلوم ہے مگر حُسنِ رفاقت اور ہم سفری کا تقاضہ یہ ہے کہ میں چند قدم تمہارے ساتھ جاؤں اور تمہیں رخصت کروں۔ کیونکہ ہمارے رسولؐ نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔ اس نے کہا کیا واقعی آپ کے پیغمبرؐ کی یہی تعلیم ہے؟" فرمایا "ہاں"۔ اس نے کہا "وہ دین بہترین دین ہے جو ایسے اعلیٰ اخلاق کا درس دیتا ہے۔ اب میں آپؑ کے ہمراہ کوفہ جاؤں گا۔" چنانچہ وہ آپؑ کے ساتھ کوفہ آیا اور جب اس کو معلوم ہوا کہ آپؑ امیر المومنینؑ ہیں تو حلقہ بگوشِ اسلام ہوگیا۔

اوقاف و تعمیراتِ خیریہ

اسلام نے جہاں انسانیتِ عامہ کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے اعمالِ صالحہ پر زور دیا ہے وہاں رفاہِ عامہ کے کاموں کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ جیسا کہ زکوٰۃ جیسے اہم فریضہ میں مصرف فی سبیل اللہ کی تجویز بھی ہے۔ جس میں تمام رفاہی امور شامل ہیں۔ جیسے کنویں، چشمے کھدوانا، مسافر خانے و عبادت خانے بنانا، شفاخانے و درس گاہیں تعمیر کرنا کہ جن سے تمام بنی نوعِ انسان کو مساوی طور پر فائدہ پہنچے۔

سرکار امیر المومنینؑ نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں سنگین اندرونی خلفشار ہونے کے باوجود رفاہی امور کی جانب مناسب توجہ فرمائی۔ ابن شہر آشوب نے مناقب میں تحریر کیا ہے کہ آپؑ نے حاجیوں کے لئے ینبع میں سو چشمے کھدوائے۔ مدینہ، کوفہ اور ینبع میں کنوئیں کھدوائے۔ مکہ و کوفہ کے درمیان سڑک تعمیر کی۔ ایک کاریز ملا ذس تعمیر کرایا۔ حضرتؑ نے خود اپنے ہاتھوں

سے کئی چشمے کھودے۔ اور باغات لگوائے۔ اور ان کو فقرا المسلمین کے لئے وقف کر دیا حضرتؑ کے ایک آزاد کردہ غلام بیان کرتے ہیں کہ حضرتؑ ایک مرتبہ اپنی جاگیر ابی نیزر اور بغیبغہ پر تشریف لائے۔ میں نے روکھا سوکھا کھانا پیش کیا۔ وہ کھایا۔ ایک سے پانی پیا اور پھاوڑہ لے کر گڑھا کھودنا شروع کیا یہاں تک کہ پسینہ میں شرابور ہو گئے۔ جب چشمہ پھوٹ پڑا تو فرمایا۔ یہ صدقہ جاریہ ہے اور اپنے ہاتھ سے یہ تحریر قلمبند فرمائی۔

"یہ وہ ہے جسے خدا کے بندے علیؑ امیر المومنین نے صدقہ کیا ہے۔ یہ دونوں جاگیریں عین ابی نیزر اور بغیبغہ فقرائے مدینہ اور مسافروں کے لئے صدقہ کی ہیں تاکہ اُن کے ذریعے اپنے چہرے کو قیامت کے دن جہنم کی آنچ سے بچائیں۔ ان دونوں جاگیروں کو نہ بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بازگشت اللہ کی طرف ہو اور وہ بہترین وارث ہے۔ البتہ اگر حسنؑ و حسینؑ کو ان کی احتیاج ہو تو ان کے لئے بندش نہیں ہے اور اُن کے علاوہ اور کسی کو یہ حق نہیں ہے۔" چنانچہ ایک مرتبہ امام حسینؑ سے معاویہ نے عین ابو نیزر دو لاکھ دینار میں خریدنا چاہا مگر آپؑ نے بیچنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میرے والد نے اسے صدقہ کیا ہے۔ ان جاگیروں کے علاوہ جناب امیرؑ نے ارباحا، اربیہ، رغدر، رزین اور رباح بھی وقف کر دیں۔

حضرتؑ نے تعمیرِ مساجد (جو درسگاہ کا کام بھی دیتی تھیں) میں خصوصی توجہ فرمائی۔ مدینہ میں مسجدِ فتح تعمیر کی۔ کوہ اُحد پر حضرت حمزہؑ کی قبر کے قریب مسجد بنوائی۔ میقات میں ایک مسجد تعمیر کی۔ کوفہ، بصرہ اور آبادان میں مساجد بنوائیں۔ صفین کی طرف جاتے ہوئے جب اقسطار میں منزل کی تو وہاں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی۔

اسلامی شہریت دیگر قوانینِ اسلامیہ کی طرح شہریت کے اُصول و قوانین بھی عام دہمہ گیر ہیں۔ چنانچہ سرچشمۂ معارفِ اسلام، حضرت بابِ مدینۃ العلم علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے کلمات و حکمیہ اس باب میں نقل کئے جاتے ہیں جو مفکرینِ عالم کو دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔

معاشرتی بہبود کا بنیادی عنصر عدل و انصاف ہے جس سے کمزور و طاقتور میں

توازن پیدا ہوتا ہے اس لئے

(۱) قولِ امیر المومنینؑ یہ ہے کہ" عدل کی روش پر چلو اور ظلم و بے راہروی سے کنارہ کش رہو۔ کیونکہ بے راہ روی کے نتیجے میں گھر بار چھوڑنا پڑے گا اور ظلم تلوار اٹھانے کی دعوت دے گا۔

شہریت کا تقاضا ہے کہ ایک دوسرے کا احترام کیا جائے۔ اسی لئے

(۲) قولِ امیر المومنینؑ یہ ہے کہ" جو چیز اپنے لئے پسند کرتے ہو دوسروں کے لئے بھی پسند کرو۔ اور جس چیز کو اوروں کے لئے ناپسند کرتے ہو اس سے خود بھی پرہیز کرو"

فخر و غرور سے اجتناب کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے نفرت بڑھتی ہے اور تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ لہٰذا

(۳) قولِ امیر المومنینؑ یہ ہے کہ" سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ فخر نہ کرو"

معاشرتی خوبی یہ ہے کہ کمزور و پسماندہ افراد سے ہمدردی کی جائے۔ اس لئے

(۴) قولِ امیر المومنینؑ یہ ہے کہ" اپنے کمزوروں سے ہمدردی کرو۔ یہ ہمدردی تمہارے لئے اللہ کی رحمت کا باعث ہوگی"

معاشرت کا تقاضا ہے کہ کسی کی برائی کو نشر نہ کیا جائے۔ اس لئے

(۵) قولِ امیر المومنینؑ یہ ہے کہ" جس نے کسی بری بات کو سنا اور اسے ظاہر کیا تو ایسا ہی ہے جیسے وہ خود برائی کا مرتکب ہوا"

کسی کی خوشحالی کے بعد بدحالی پر خوش ہونا مذموم ہے۔ اس لئے

(۶) قولِ امیر المومنینؑ یہ ہے کہ" کسی کی تباہ حالی پر خوش نہ ہو۔ خبر نہیں کل زمانہ تمہارے ساتھ بھی یہی برتاؤ کرے"

جہاں تک ممکن ہوسکے لڑائی جھگڑے سے گریز کرنا چاہیئے۔ اس لئے

(۷) قولِ امیر المومنینؑ یہ ہے کہ" جو شخص اپنی عزت و ناموس کو محفوظ رکھنا چاہے اسے لڑائی جھگڑے سے کنارہ کش رہنا چاہیئے"

باہمی اعتماد پر معاشرتی زندگی کا انحصار ہے۔ اس لئے

(۸) قولِ امیرالمومنینؑ یہ ہے کہ "جو دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا۔"

دوستی و تعلقات کی بناء پر کسی کے حق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے

(۹) قولِ امیرالمومنینؑ یہ ہے کہ "باہمی روابط کی بناء پر کسی بھائی کی حق تلفی نہ کرو کیونکہ پھر وہ بھائی کہاں ہے جس کا تم حق تلف کر رہے ہو۔"

معاشرت میں حاجت مند سے خندہ پیشانی سے پیش آنا خوبی ہے۔ اس لئے

(۱۰) قولِ امیرالمومنینؑ یہ ہے کہ "اگر کسی موقع پر لوگوں کو تمہاری احتیاج ہو تو اُن سے عجز و انکسار اور خندہ پیشانی سے پیش آؤ۔ ہو سکتا ہے کہ کل تم کو کوئی حاجت لیکر اُن کے پاس جانا پڑے۔ تو تمہیں اپنے طرز عمل پر معذرت کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔"

معاشرتی و اخلاقی برائیوں کو روکنا اور معاشرہ کی اصلاح کرنا اسلامی فریضہ ہے۔ اس لئے

(۱۱) قولِ امیرالمومنینؑ یہ ہے کہ "جو شخص نہ زبان سے نہ ہاتھ سے اور نہ دل سے برائی کی روک تھام کرتا ہے وہ زندوں میں چلتی پھرتی لاش ہے۔"

حضرت امیرالمومنینؑ نے اس سلسلے میں صرف زبانی پند و نصائح ہی پر اکتفا نہیں فرمائی بلکہ عملاً بھی ہر معاشرتی برائی کو کچلنے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر اصلاح فرماتے رہتے۔ ایک دفعہ دو آدمیوں کو جھگڑتے دیکھا۔ وجہ نزاع دریافت فرمائی۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔ امیرالمومنینؑ! میں نے اس کے ہاتھ ایک کپڑا نو درہم میں بیچا ہے۔ اور اس سے شرط یہ تھی کہ قیمت کھرے اور معیاری درہموں میں ادا کرے۔ مگر اس نے خراب اور ٹوٹے پھوٹے درہم مجھے دینا چاہے۔ میں نے اِن سکوں کو لینے سے انکار کر دیا۔ تو اس نے طمانچہ دے مارا۔ اور سر بازار میری ہتک کی۔ حضرتؑ نے اس واقعہ کی تصدیق کرکے دوسرے شخص سے کہا کہ وہ درہم تبدیل کر دے۔ اس نے درہم بدل دیئے۔ پھر پہلے شخص سے کہا کہ تم بھی

ایسے طمانچے کے عوض طمانچہ مارو۔ اس نے کہا میں اسے معاف کرتا ہوں حضرتؑ اس درگزر پر خوش ہوئے۔

اس فیصلہ پر معاملہ کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا کیونکہ صاحب حق نے خود ہی حق چھوڑ دیا تھا مگر جناب امیرؑ کے نزدیک ایک حق اور بھی تھا۔ وہ اجتماعی و معاشرتی حق تھا جس کا تقاضا تھا کہ حکومت ایسے بداطوار لوگوں کو سزا دے کر دوسروں کو عبرت دے۔ اور حضرتؑ کی نظروں سے یہ حق اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس شخص کو بدعہدی اور ایذا رسانی کی پاداش میں پندرہ کوڑوں کی سزا دی۔

حضرتؑ قمار بازی وغیرہ کے سخت دشمن تھے۔ چنانچہ آپؑ گلی کوچوں میں اس حرکت پر نظر رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ شطرنج کھیلتے نظر آگئے۔ تو اُن کو دھوپ میں کھڑا کر کے سزا دی۔ جناب امیرؑ کو معلوم ہوا کہ محلّہ زرارہ میں شراب کشید کی جاتی ہے اور فروخت ہوتی ہے۔ آپؑ دریا عبور کر کے وہاں پہنچے اور اس اڈے کو جلا دیا۔
("معجم البلدان" یاقوت حموی)

معاشرتی زندگی کی اصلاح افراد کی اصلاح ہی پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر افراد صالح ہوں گے تو معاشرہ بھی صالح کہلائے گا۔ چنانچہ حضرت علیؑ لوگوں کی اخلاقی حالت کا جائزہ لیا کرتے تھے اور سختی سے محاسبہ کرتے تھے تاکہ انہیں معاشرتی اصولوں کا پابند بنائیں۔

مُلکی انتشار اور امیر المومنینؑ کا سیاسی تدبّر

حضرت امیر المومنینؑ کی ابھی بیعت ہو رہی تھی کہ آپؑ کے گرد سازشوں کا جال بُنا جانے لگا۔ اگر ایک فتنے کو کچلا جاتا تو دوسرا اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آپؑ کا مختصر دورِ حکومت انہی اُلجھنوں کو سُلجھانے میں گزر گیا۔ حضرت علیؑ کے دشمنوں نے آپؑ کی راہ میں اتنی مشکلات کھڑی کیں کہ جن کو حل کرنا مولا مشکل کشا ہی کا کام تھا۔ آپؑ نے تمام مسائل بڑے تدبّر سے حل کئے۔ وہ تمام اُلجھنیں اور مصائب اس دَور میں یکجا ملتے ہیں جو کسی بھی حکمران کی آزمائش کے لئے

کسوٹی ہوسکتے ہیں۔ منشائے خداوندی یہی نظر آتا ہے کہ وہ اس مردِ خدا کو اپنی حجت تمام کرے کہ میرا مقرر کردہ نمائندہ حکومت اس اہلیت کا حامل ہوتا ہے۔ پُرسکون اور متوازن حالات میں ایک نااہل بھی حکومت کی سربراہی کے فرائض انجام دے سکتا ہے لیکن کسی حاکم کی صلاحیتوں کا معیار مُلکی انتشار ہی میں جانچا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضرتؑ کا دور پیچیدہ ہونے سے دُنیا پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اسلامی سیاست کا دستور کس طرزِ عمل کا متقاضی ہے۔ حضرت امیرالمومنینؑ کے عہد میں ہر ممکن پہلو سمجھایا گیا اور دُنیا کو تعلیم دی گئی کہ حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوجائیں۔ آئینِ الٰہی عالمگیر ہے اور اُسے کٹھن سے کٹھن، دُشوار سے دُشوار اوقات میں بھی نافذ کرنے سے تمام مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ اور راہِ سعادت یہی ہے کہ انسان حوادث سے گھبرا کر غلط راہوں پر نہ بھٹکے اور راستبازی کو چھوڑ کر چال بازی اور فریب کو "سیاست کی حکمتِ عملی" کا جامہ نہ پہنائے۔ چنانچہ زمانے نے دیکھ لیا کہ علیؑ کو کامیابی ہوئی جیسا کہ حضرت علیؑ نے خود وقتِ ضربتِ شہادت قسم کھا کر اعلان کیا "ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا"۔ دُنیائے انصاف علیؑ کے سیاسی تدبّر کی قصیدہ خواں ہوگئی اور لوگ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ "اگر کوئی صاحبِ انصاف علیؑ کی سیاست پر نظرِ غائر ڈالے اور دیکھے کہ آپؑ اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں کس صورتِ حال سے دوچار تھے تو معاملات کی سختی اور پیچیدگی کی بنا پر آپؑ کی سیاست ایک معجزے سے کم نہ ہوگی۔ علیؑ کے حریفوں کی عارضی حکومتیں تباہ ہوگئیں۔ ان کی چال بازی اور خیانت اُن کے لئے قدح و رُسوائی کا موجب ثابت ہوئی۔ عوام الناس نے نہ ہی اُن لوگوں کے اُصولوں کو دُرست تسلیم کیا اور نہ ہی اُن کی ذاتی تعظیم رہی۔ لیکن جو مقام آج مولا علیؑ کو حاصل ہے کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ علیؑ کی سیاست کامیاب ہے؟" جب کبھی سیاستِ حسنہ کا سوال آتا ہے تو سیاستِ علویہ کے سوا کونسی سیاست کام آتی ہے؟ کس کو دوام حاصل ہے؟ علیؑ کا پیش کردہ دستور اور علی کے مخالفین کا طرزِ عمل، دونوں کا موازنہ کیجئے۔ حق و باطل کی تمیز خود بخود ہوجاتی ہے۔ اور متعصب سے متعصب، حتّٰی کہ ناصبی و خارجی لوگ بھی یہ ماننے پر

مجبور ہیں کہ علیؑ کا دستورِ حکومت فخرِ دساتیرِ عالم ہے اور آپؑ نے خود جس طرح اس پر عمل کیا اور بعد از رسولؐ اسے نافذ کیا۔ اس کا سہرا صرف آپ ہی کے سر ہے۔

سطحی نظر سے دیکھنے والے لوگ حضرتؑ کے عہد کی شورش و بے چینی سے یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ جنابِ امیرؑ سیاست کی چالاکیوں سے ناواقف تھے اور آپؑ بس "دین" ہی کو مقدم رکھتے تھے لہٰذا ملکی نظم و نسق سے قاصر رہے۔ حالانکہ اگر ان کی اس رائے ہی پر سوچا جائے تو یہ علیؑ کے سیاسی تدبر کا اقرار مخفی ہے کہ وہ "دین کو مقدم رکھتے تھے" اور یہی تو سیاست ہے کہ دین کو مقدم رکھا جائے۔ اگر علیؑ اس سیاست سے کسی بھی مرحلے پر گریزاں نظر آتے ہیں تو کہیے۔ کسی سیاست دان کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ وہ قوتِ ارادہ کا پکا ہو۔ اپنے منشور پر اول تا آخر قائم رہے اور کسی بھی مخالفت و مخاصمت کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے۔ جو بات کہے کر کے دکھا دے۔ نیز یہ کہ ضد اور ہٹ دھرمی بھی نہ کرے کیونکہ یہ معیوب ہے۔

بلاشبہ حضرت کا دورِ خانہ جنگی و ہنگامہ آرائی کی جولانگاہ بنا رہا۔ ملکی حدود میں وسعت نہ ہو سکی۔ مگر اس کی وجہ آپ کی سیاست سے ناواقفیت نہ تھی بلکہ ہر مورخ یہ اقرار کرنے پر مجبور ہے کہ یہ پراگندگی آپؑ کے لئے عہدِ رسالتؐ کے بعد ہونے والی حکومتوں نے چھوڑی تھی اور ناگوار حالات کی داغ بیل آپؑ کے اقتدار سنبھالنے سے بہت پہلے پڑ چکی تھی جن کی وجہ سے حضرت عثمان قتل ہوئے اور جب حضرت علیؑ تخت نشین ہوئے تو فضا پوری طرح مسموم تھی۔ ہوسِ ملک گیری، حرصِ غنائم اور سرمایہ کی فراوانی مسلمانوں کے ذہنوں کے رخ بدل چکی تھی۔ اگر ایسے حالات کسی نااہل حاکم کے سامنے ہوتے تو یقیناً تخت کا تختہ ہو چکا ہوتا وہ کبھی بھی اس مکدر فضا کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

امیر المومنینؑ جب مسندِ حکومت پر آئے تو ایک طرف دارالحکومت مدینہ شورشوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ تو دوسری طرف بعض گورنر ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ لوگوں میں یہ مسموم نظریہ سرایت کر چکا تھا کہ حکومت اور دین دو نوں الگ الگ چیز ہیں

ہیں اور عوام میں سے بہت سے با اثر افراد دُنیا کی طرف زیادہ جُھک چکے تھے۔ جب حضرتؑ نے اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے امورِ سلطنت دینی دستور کے مطابق سرانجام دینا شروع کئے تو اُس ذہنیت کے افراد کو یہ چیز ناگوار گزری اور انہوں نے دین کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دنیوی اقتدار حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ معاویہ کا مقصد تو پوری سلطنت کا حصول تھا ہی لیکن ادھر جب حضرات طلحہ و زبیر کی اُمیدیں بر نہ آئیں اور ان کو حضرت ایئں سے کوئی مالی منفعت حاصل نہ ہو سکی تو وہ بھی حضرت علیؑ کے خلاف اپنی اپنی جستجو میں لگے۔ چُنانچہ ان سب نے مل کر اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ جب ان کو خفیہ سرگرمیوں میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو انہوں نے امنِ عامہ میں خلل ڈالنے کی ٹھان لی اور خانہ جنگی کے شعلے بھڑکا دیئے۔ آج کے ترقی یافتہ دَور میں بھی ایسے حالات میں حکومتیں ہنگامی حالت اور تحفظِ امن کے قانون نافذ کر کے بُنیادی حقوق سلب کر لیتی ہیں لیکن یہ حضرت علیؑ ہی کی حکومت تھی کہ ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ ایک طرف نظم و نسق کے فرائض سرانجام دیتے رہے اور دوسری طرف ان بغاوتوں کو کچلتے رہے اور جو لوگ آپؑ کے پرچم تلے جمع تھے ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنہیں حضرتؑ سے خلوص نہ تھا اور ان کے خیالات و نظریات مختلف تھے۔ یہ آپؑ کا ہی سیاسی شعور تھا کہ ان مختلف الآرا افراد کو مرکزیت پر لا کر اور انہیں کو لے کر دشمن سے نبرد آزما ہوتے اور کسی موقع پر اپنے اصُول کو نہ چھوڑا۔ حضرتؑ کا یہ موقف ہی نہ تھا کہ دین میں لچک پیدا کر کے زمانہ سازی کی جائے جیسا کہ عام خود غرض سیاسی مدبّر کیا کرتے ہیں۔ اگر آپؑ عارضی فائدے کی خاطر ایسا کر لیتے تو پھر اپنے بنیادی مقصد میں ناکام ہو جاتے اور حق پرستی سے محروم رہ جاتے کیونکہ خوبی تو یہی ہے کہ انسان مردانہ وار اپنے مقاصد کی حفاظت کرے۔ ایسے "سیاست دان" بہت ملتے ہیں جنہوں نے جائز و ناجائز کا لحاظ کئے بغیر اپنے اغراض حاصل کرنے کی کامیابیاں حاصل کی ہیں لیکن یہ چیز خوبی کے زمرے میں جگہ نہیں پاتی بلکہ اسلامی تدبر یہ ہے کہ ہر کام آئین و اصُولِ اسلام کے عین مُطابق کیا جائے۔ اس لحاظ سے رسُولِ خداؐ کے بعد سب سے

بڑے مدبّر حضرت علیؑ ہی ہیں۔ سرکار علی مرتضیٰؑ اللہ کے نمائندہ تھے۔ لہٰذا آئینِ خداوندی کو محض چند روزہ اقتدار کے لئے فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ پس آپؑ نے کسی بھی معاملے میں حیلہ گری، دُنیا سازی، دورُخی سیاست اور جھوٹ کو نہیں اپنایا جس طرح خدا کا قانونِ فطرت قائم ہے خواہ اللہ کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے وہ اپنے قانون میں کوئی لچک پیدا نہیں کرتا۔ اور اس کی سُنّت میں تغیر و تبدل نہیں۔ ذرا غور فرمایئے کہ کئی جھوٹے لوگ، اللہ کے مقابلے پر "خدا" بن بیٹھے۔ سچے خدا سے باغی ہو گئے۔ اسی طرح دہریئے منکرِ خدا ہو گئے مگر اللہ اس بات کا ضرورت مند نہیں کہ وہ کافر لوگ اللہ کو ضرور خدا مانیں کیونکہ اُن کافروں کے نہ ماننے سے اس کی خدائی نہیں جاتی۔ اسی لئے اللہ ان باغیوں پر فوراً ہی عرصۂ حیات تنگ نہیں کرتا بلکہ انہیں ڈھیل دیتا ہے اور جس وقت چاہتا ہے کیفرِ کردار کو پہنچا دیتا ہے مگر اپنے قانون و اصُول میں لچک پیدا نہیں کرتا۔ اسی طرح اللہ کا مقرر کیا ہوا ہادیٔ برحق باغیوں کو ڈھیل دیتا ہے اور سُنّتِ الٰہی پر عمل کرتا ہے دستورِ خداوندی سے نہیں ہٹتا اور نہ ہی باغیوں کی خاطر سے اپنے اصُولوں میں تبدیلی و لچک پیدا کرتا ہے۔ باغی کو افہام و تفہیم سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے اور حُجّت تمام کرنے کے بعد سختی کرتا ہے چنانچہ یہی اصُول حضرتِ امیرؑ نے قائم رکھا۔ اگر حضرتؑ بھی (معاذ اللہ) مکر و فریب سے ظاہری کامیابی کی طرف لپک جاتے تو ایک عام فرمانروا اور نمائندہ خدا میں کیا فرق رہ جاتا ہے لہٰذا آپؑ کی اصل کامیابی یہی ہے کہ آپؑ کا مقصد کامیاب ہے اور اُسے دوام حاصل ہے۔ اُس کے برعکس آپؑ کے مخالفین کے عرائم فہرستِ قبائح میں رقم کئے جاتے ہیں اور اُن کو دہرانا بھی پسند نہیں کیا جاتا ہے۔

مولا علیؑ نے گندی سیاست کی اس تدبیر کی مخالفت فرمائی کہ عوام پر "بڑے بڑے لوگوں" کو ترجیح دی جائے۔ آپؑ نے ہمیشہ عوام کو سربرآوردہ لوگوں پر ترجیح دی چنانچہ "بڑے لوگوں" کا طبقہ آپؑ کے خلاف ہو گیا۔ کیونکہ ایسے لوگ جاہ و حشمت کے حریص ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب اُن کی اُمیدیں ٹوٹ گئیں اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا تو انہوں

نے نظم ونسق کو درہم برہم کرنے کی ٹھان لی۔ اور حضرت علیؑ کی مساوی تقسیم مال نے تو اور بھی ان کے دلوں میں تشنگی پیدا کر دی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو آپؑ قومی سرمایہ میں (معاذ اللہ) خیانت کر کے اُن کے ضمیر خرید لیتے اور اپنا ضمیر فروخت کر دیتے یا پھر اُن کا دلیرانہ مقابلہ کرتے۔ ایک عادل حکمران کی بہترین حکمت عملی یہی ہے کہ اس مذموم ذہنیت کو تبدیل کرنے کی راہ اختیار کرے جو وعظ ونصیحت کے بے اثر ہونے کے بعد سزا تک پہنچ سکتی ہے۔ ویسے تو حضرتؑ کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہ تھا کہ چند سکوں کے بدلے اُن افراد کو اپنا ہمنوا بنا لیتے لیکن پھر ایک بہت بڑا دھبہ آپؑ کی پاکیزگی پر آجاتا جو تاریخ میں نمایاں طور سے نظر آتا رہتا۔ پھر آپؑ امام برحق ہرگز نہ مانے جاتے۔ آپؑ اس بُرے طریقے کو از خود سہل جانتے تھے اور لوگ بھی آپؑ کو ایسے مشورے دیا کرتے تھے لیکن حضرتؑ کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد فرمایا "کیا تم مجھے اس امر پر لانا چاہتے ہو کہ بے راہ روی سے کچھ لوگوں کی امداد حاصل کروں؟ خدا کی قسم جب تک سورج نکلتا اور کوئی ستارہ آسمان پر چمکتا رہے گا میں ایسا نہیں کروں گا۔ اگر یہ مسلمانوں کا مال میرا ذاتی مال بھی ہوتا تب بھی میں اُسے مساوی ہی تقسیم کرتا۔ حالانکہ یہ مال انہیں کا ہے (یعنی میں اُس کی تقسیم میں طبقاتی امتیاز نہیں برتوں گا)"

اس کے برعکس آپؑ کے حریف نے خزانے کا مُنہ کھول رکھا تھا اور دھڑا دھڑ لوگوں کا ایمان ودین خریدا جا رہا تھا۔ چنانچہ تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۳ ص۲۳۱ میں لکھا ہے کہ حضرت علیؑ کے باغی حریف نے کہا "میں نے اُن لوگوں سے اُن کا دین خرید لیا ہے"۔ لیکن حضرت امیر المومنینؑ کے نزدیک ایسی خریداری خود فروشی کے برابر تھی۔

سرمایہ پرستی کے رجحان نے مسلمانوں میں خلاف شرع اُمور بھی پیدا کر دیے تھے جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ دین وایمان کی بھی (گویا ایک لوٹا سمجھ کر) خرید وفروخت کرتے تھے۔ لہٰذا حضرت امیرؑ نے اس طرح کی ذہنیت تبدیل کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ ادنیٰ خلافِ دین فعل بھی آپ برداشت نہ کرتے تھے اور اصلاح کی کوشش فرماتے تھے مگر لوگ اُن باتوں کے عادی ہو چکے تھے اسلئے آپؑ کی نصیحت اُن کو ناگوار ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک

شخص عبیدہ السلمانی نے تو آپؑ سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "آپؑ ایک اکیلے کی رائے سے ہمیں آپؑ کی وہ رائے زیادہ پسند ہے جو جماعت کی رائے کے موافق ہو۔"

اس نکتہ چینی کے باعث دشمن کو پروپیگنڈے کا موقع مل جاتا تھا۔ لیکن حق بات کہنا ہی کامرانی ہے۔ اگر لوگوں کے خوف سے بُرائی کا انسداد نہ کیا جائے تو معاشرہ غلط سے غلط تر ہوتا جاتا ہے اس لئے اسلامی حکمران کا فرض ہے کہ وہ بُرائی کا انسداد کرے خواہ کسی کو ناگوار ہو یا پسند آئے۔

بُرائی کے انسداد کے لئے غلط گورنروں کی برطرفی ضروری تھی لہٰذا مولا علیؑ نے اپنا فرض پورا کیا جس کا مفصل بیان ہم نے پہلے کر دیا۔

قصاص عثمان

قصاص عثمان کی تحریک، جنگِ جمل، جنگِ نہروان کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ہم کوشش کریں گے کہ کوئی بات کسی کو تلخ و ناگوار معلوم نہ ہو۔ اور اختصار بھی ملحوظ ہے۔ لہٰذا نہایت احتیاط سے حضرت عثمان کے قتل کے قصاص کے بارے میں مُلا علی قاری کا بیان نقل کرتے ہیں:

"حضرت علیؑ نے عثمان کے قاتلین کو قتل نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ باغی تھے۔ اور جو باغی ہوتا ہے وہ قوت و طاقت بھی رکھتا ہے۔ اور اپنے اقدام کے جواز کی تاویل بھی، وہ لوگ حضرت عثمان کے قتل میں تاویل بھی رکھتے تھے اور حکومت سے ٹکراؤ کی قوت بھی۔ اور حضرت عثمان کی ناپسندیدہ باتوں کی وجہ سے اس اقدام کو جائز و حلال سمجھتے تھے اور ایسے باغیوں کا حکم شرعی یہ ہے کہ جب وہ امام عادل کے مطیع ہو جائیں تو جو کچھ وہ پہلے اہل عدل کا نقصان کر چکے ہوں۔ ان کا خون بہا چکے ہوں اور ان کے بدنوں کو مجروح کر چکے ہوں اُن سے اُن چیزوں کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا حضرت علیؑ کے لئے ضروری نہ تھا کہ وہ انہیں قتل کریں یا قصاص طلب کرنے والوں کے حوالے کریں۔"
شرح فقہ اکبر ص۶۴

فقیہ اہلِ سنّت ملّا علی قاری کے مندرجہ بالا بیان کے مُطابق حضرت علیؑ اس معاملہ میں قطعاً بری الذمہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپؑ نے قاتلوں کو سزا دینے سے

انکار نہیں کیا۔ مگر جب تک کسی پر کوئی قوی شہادت مہیا نہ ہو کس طرح قتل کیا جا سکتا ہے۔ جناب امیرؑ کا انصاف اور فیصلے مشہور ہیں بلکہ دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمرؓ مشکل و اہم فیصلوں میں حضرت علیؑ سے رہنمائی حاصل کیا کرتے تھے۔ لہٰذا اس سلسلے میں خود حضرت علیؑ کیسے بے انصافی کر سکتے تھے؟ چنانچہ آپؑ نے اس بارے میں تحقیقات فرمائیں اور کوئی بھی چشم دید گواہ ایسا نہ ملا جو قاتلوں کی شناخت کر سکے۔ حضرت عثمان کے قتل کی واردات پر صرف آپ کی زوجہ نائلہ موقع کی گواہ تھیں۔ لہٰذا ان کا بیان نقل کرتا ہوں۔

"مجھے معلوم نہیں ہے۔ البتہ محمد بن ابو بکر کے ساتھ دو آدمی اندر گھسے تھے۔ میں ان دونوں کو نہیں پہچانتی"۔ (صواعق محرقہ ص۱۱۸)

اندریں حالات کس کو سزا دی جا سکتی تھی۔ حالانکہ تاریخ میں مذکور ہے کہ جب لوگوں سے دریافت کیا گیا تو بیس ہزار کے انبوہ کثیر نے یک زبان ہو کر کہا "ہم سب عثمان کے قاتل ہیں"۔ (اخبار الطوال ص۱۴۱) اور ان میں متعدد صحابی حضرات طلحہ و زبیر بھی شامل تھے۔ جو جنگ جمل میں قصاص کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پس ایسی صورت میں کہ نہ تو کوئی شرعی شہادت ہو اور نہ ہی شناخت تو سزا کس کو دی جاتی۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جب آپ حضرت علیؑ کو صاحب علم وہبی و لدنی تسلیم کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ان کو قیامت تک ہونے والے تمام واقعات کا علم تھا تو لازم آتا ہے کہ حضرت علیؑ کو قاتل عثمان کا بھی علم تھا۔ پھر اس قاتل کو کیوں نہ سزا دی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی شہادت کے بغیر حضرت علیؑ کسی کو اپنے علم لدنی کی شہادت کی بناء پر قاتل قرار دے کر سزا دیتے تو حضرت علیؑ کی شہادت کو لوگ "ناکافی" قرار دیتے کیونکہ پہلے معاملہ فدک میں ناکافی قرار دے دی گئی تھی۔ اب اگر حضرت علیؑ محض اپنے علم خاص کی بناء پر کسی کو قصاص میں قتل کر دیتے تو لوگ اس کے خون کا قصاص حضرت علیؑ سے لیتے اور یہ کہتے کہ علیؑ نے بغیر کسی گواہ کی شہادت کے اور بغیر شناخت کے محض اپنی کسی ذاتی دشمنی کی وجہ سے قصاص عثمان کا بہانہ بنا کر فلاں شخص کو بے گناہ قتل کر دیا۔ اگر (معاذ اللہ) محمد بن ابی بکر کو سزا دیتے تو لوگ یقیناً یہ کہتے کہ ان کے والد

سے باغ فدک وغیرہ کی رنجش تھی اُس کی وجہ سے ایسا کیا۔ پھر ایک اور مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت محمد بن ابی بکر نے حضرت عثمان کو ہرگز قتل نہیں کیا اور نائلہ زوجہ عثمان نے بھی محمد بن ابی بکر کو قاتل نہیں گردانا۔ علاوہ ازیں "قصاص عثمان" کا شور مچانے والوں نے باقاعدہ مقدمہ پیش نہیں کیا۔ نہ گواہ پیش کئے۔ بلکہ بغاوت کردی۔ پھر حضرت علیؑ پر کیا الزام آسکتا ہے؟ (حضرت طلحہ کی مخالفت کا ثبوت دیکھئے (تاریخ طبری ج ۳ صـ۱۱۱ میں ہے اور زبیر کی مخالفت شرح ابن ابی الحدید جلد ۲ صـ۱۱۱ میں مرقوم ہے)

جنگ جمل جنگ جمل خدا اور رسولؐ کے حکم کے اور خلیفہ برحق، امام برحق، ولی امر حق حضرت علیؑ کے خلاف اُم المومنین حضرت عائشہ کی قیادت میں لڑی گئی۔ اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ اپنی غلطی پر خود اُم المومنین اظہارِ افسوس کیا کرتی تھیں۔ پس جنگ جمل کے واقعات اور علل واسباب کو ہم نہیں لکھتے کیونکہ ایک تو اختصار ملحوظ ہے۔ دوم رواداری۔

ع انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

لہٰذا یہ معاملہ عادل مطلق خدائے ذوالجلال کے انصاف پر چھوڑتے ہوئے ہم صرف جناب امیرؑ کے چند جملے نقل کریں گے جو انہوں نے اہل بصرہ کی کج روی کے بارے میں خاتمہ جنگ کے بعد فرمائے تھے کہ

"تم ایک عورت کی سپاہ اور ایک چوپائے (اونٹ) کے تابع تھے۔ وہ بلبلایا تو تم "لبیک" کہتے ہوئے بڑھے اور وہ زخمی ہوا تو تم بھاگ کھڑے ہوئے۔ تم پست اخلاق اور عہد شکن ہو۔ تمہارے دین کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ۔ تمہاری سرزمین کا پانی تک شور ہے۔ تم میں اقامت کرنے والا گناہوں کے جال میں جکڑا ہوا ہے اور تم میں سے نکل جانے والا اپنے خدا کی رحمت کو پا لینے والا ہے"

ہم ناظرین کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تاریخ کی کتب میں اس جنگ کے حالات ملاحظہ فرمائیں اور حضرت امیرؑ کا تدبر دیکھیں کہ اس بلاوجہ تھوپی گئی جنگ میں آپؑ نے کس قدر اس ناگہانی بلا کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن آپؑ کو اس قدر مجبور کر دیا گیا کہ اس

خوں ریزی کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ پھر اس جنگ کے اسیروں سے نرمی کا سلوک کرنے کے واقعات بھی آپ کو متاثر کئے بغیر نہیں رہیں گے۔ ان سب امور پر توجہ فرمانے کے بعد انصاف پسند ذہن اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ حضرت علیؑ مرتضیٰ کو سیاست الٰہیہ کا مدبرِ عظیم تسلیم کرے۔

جنگِ صفین حضرت امیرؑ کی سیاست میں یہ چیز ہر جگہ ملتی ہے کہ آپؑ نے کسی کے خلاف جنگ میں کبھی پہل نہیں کی۔ آپ حتی المقدور مسائل کو آئینی طریقے سے حاصل کرنے کے خواہش مند رہے۔ جب پند و نصائح اور بات چیت کی ساری راہیں بند ہو گئیں تب سختی فرمائی۔ معاویہ کا کردار محتاجِ تعارف نہیں وہ ہے۔ بغاوت میں نمایاں ہے اور قوی شواہد موجود تھے کہ نظر پہلی سلطنت پر جمی ہوئی تھی۔ اور کئی برسوں سے آس لگائی ہوئی تھی کہ وہ گھڑی آجائے کہ میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے۔ جب حضرت علیؑ نے اقتدار سنبھالا تو معاویہ کو برطرف کر دیا۔ کیونکہ آپؑ معاویہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ اُصولاً اور اخلاقاً معاویہ کو معزولی قبول کر لینا چاہیئے تھی۔ لیکن معاویہ نے مرکز سے علیحدہ ہو کر "قصاصِ عثمان" کے بہانے سے اپنی سیاسی مراعات حاصل کرنے کی تدابیر کیں۔ حضرت علیؑ نے افہام و تفہیم کے ہر ممکن ذریعے سے خبردار کیا کہ اپنی مذموم حرکات سے باز آجائے لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ اور تخریبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب کسی حکومت کی صوبائی حکومت سرکشی پر اُتر آئے اور امن و امان کو مخدوش کر کے مرکز کو تباہ کرنے کے عزائم کرے تو مرکزی سربراہ کی غفلت ملک و قوم کے لئے سخت مُضر ہے۔ مرکز کا فرض ہے کہ اس کی سرکوبی کرے اور فتنہ کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اسی فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت علیؑ کو جنگِ صفین کا سامنا کرنا پڑا اور بہت سے جلیل القدر، بدری صحابہ رضوان اللہ علیہم اس جنگ میں حضرت علیؑ کے حق میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ شہید ہونے والوں میں حضرت اویس قرنیؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ بھی تھے۔ اس جنگ میں حضرت علیؑ کا حق پر ہونا انہیں کے ارشاد میں ملاحظہ فرمائیے۔

"بار الہا! تو خوب جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ تیری رضا اس میں ہے کہ میں دریا میں کود پڑوں تو میں ایسا کر گزروں گا۔ اے خدا تو جانتا ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ تیری خوشنودی اس میں ہے کہ میں تلوار کی نوک اپنے سینے پر رکھوں اور اتنا جھکوں کہ تلوار میرا سینہ چیر کر پشت کے پار ہو جائے تو مجھے اس میں بھی دریغ نہ ہو گا۔ میں آج کے دن (روز صفین) تیری خوشنودی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں سمجھتا کہ ان فاسقوں سے جہاد کروں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس عمل سے بڑھ کر کوئی عمل تجھے خوش کرنے والا ہے تو میں اس میں کوتاہی نہ کرتا۔ (تاریخ طبری جلد ۲ ص ۲۶)

مولا علیؑ کے یہ الفاظ جو انہوں نے جنگ صفین کے بارے میں اللہ سے عرض کئے جتنے مختصر ہیں اُتنے ہی مُفصّل ہیں۔ اور ان کے بعد کسی بحث کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ آپؑ کی نظر میں یہ جنگ فاسقوں کے خلاف جہاد تھا اور اس سے اعلیٰ عمل اور کوئی نہ تھا جو اس سے زیادہ خوشنودیٔ خدا کا باعث ہوتا۔ چونکہ دستورِ حکومت الٰہیہ میں رضائے خدا کے حصول کو تقدیم حاصل ہے اس لئے آپؑ نے رضائے الٰہی کی خاطر دنیا کی مخالفت کے باوجود اس جنگ میں قتال کیا۔ مکاری کی سیاست کو نہیں اپنایا۔

اسی جنگ کے ایک شہید، محترم صحابی حضرت عمار یاسرؓ کے بارے میں رسولِ خدا کا فرمان تھا "عمارؓ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا جو سیدھی راہ سے منحرف ہو گا اور عمارؓ کا آخری رزق دودھ ہو گا جس میں پانی ملا ہوا ہو گا۔" (تاریخ کامل جلد ۳ ص ۱۵۷)

یہ حدیثِ رسولؐ ثابت کرتی ہے کہ گروہ معاویہ باغی بھی تھا اور سیدھی راہ سے منحرف بھی۔ لہٰذا حضرت علیؑ نے بغاوت کی سرکوبی کے لئے، جارحیت کے خلاف یہ جہاد فرما کر اپنا فریضہ ادا کیا۔ اور فرض شناسی کا حق یہی ہوتا ہے کہ طمعِ دُنیا غالب نہ آنے پائے۔

اس جنگ میں معاویہ نے قصاص کے بہانے کو بطور حربہ استعمال کیا لیکن جب خود کو اقتدار حاصل ہُوا تو اپنے دور میں اس بارے میں کچھ نہ کیا۔ کیا قول و فعل کے اس تضاد سے یہ حقیقت ظاہر نہیں ہو جاتی ؟ کہ "قصاص" کا شور محض حکومت پر قابض

ہونے کا ایک حیلہ تھا۔

جس طرح حضرت رسولؐ خدا نے کفارِ مکہ سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ کر لیا اسی طرح جب معاویہ کو اپنی شکست سامنے نظر آئی تو دامنِ دین کی آڑ لینی چاہی۔ اور حضرت علیؑ نے ایک صلح نامے (جسے "قرار دادِ تحکیم" کہا جاتا ہے) کے تحت جنگ روک دی۔ جنگ کی روداد تو تاریخ میں موجود ہے اس میں جہاں حضرت علیؑ کی شجاعت اور آپؑ کے مخالفین کی بزدلی کے واقعات ہیں وہاں وہ طریقہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرتؑ کی جنگ اور قتال کس قدر محتاط طریقے سے حدودِ شرعی میں تھی۔ گھمسان کے باوجود آپؑ نے حدودِ الہیٰ کی پاسداری فرمائی۔ معاویہ نے آپؑ کا پانی بند کیا لیکن آپؑ نے دشمن کی فوج پر پانی بند نہیں کیا حالانکہ دریا پر آپؑ کا مکمل کنٹرول ہو گیا تھا۔ اور کسی بھاگنے والے کا پیچھا کر کے اُسے قتل نہیں کیا۔ تمام اسلامی آدابِ جنگ کو ملحوظ رکھا۔ بلکہ حضرتؑ قتل کرتے وقت اپنے علمِ وہبی کی روشنی میں یہ بھی مطالعہ فرماتے رہے کہ سامنے آنے والے کی نسل کیسی ہو گی جس کی نسل سے کوئی مومن پیدا ہونے والا ہوتا اُس شخص کو حضرت علی ہرگز قتل نہ کرتے تھے۔ یہ علم امامت وولایت تھا۔

المختصر کافی قتال و جدال کے بعد "قرار دادِ تحکیم" قلمبند ہوئی اور جنگ بند کر دی گئی۔ اس قرارداد کی بنیادی دفعہ صرف ایک ہی ہے کہ دونوں فریقین اپنے تنازعات کا فیصلہ قرآن و سنتِ نبیؐ کے مطابق کریں گے۔ حضرت علیؑ کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس معقول بات کو مان لیں کیونکہ آپؑ تو چاہتے ہی یہ تھے کہ تمام فیصلے قرآن و سنت کے مطابق طے پائیں اور اسی اصول کو قائم رکھنے کے لئے حضرت علیؑ نے شوریٰ میں "سیرتِ شیخین" کی شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لہٰذا آپؑ اپنے اصول سے کیسے منحرف ہو سکتے تھے۔ اور یہی ان کا سیاسی اندازِ فکر تھا اگر علیؑ اس قرارداد کو ماننے سے انکار کر دیتے تو تاریخ اُن پر یہ الزام دیتی کہ علیؑ نے اقتدار کی خاطر احکامِ خدا و سنتِ رسولؐ کا دامن چھوڑ دیا۔ پھر اقتدار بھی ہر حالت میں چھوڑنا پڑتا کیونکہ فریقِ مخالف کی نیت یہی تھی۔ خود حضرت علیؑ کو اس کا احساس تھا لیکن آپؑ کے آقا حضرت رسولِ مقبولؐ کا اُسوہ حسنہ

آپ کے پیش نظر تھا اور صلح حدیبیہ آپؐ کی نگاہ میں تھی۔ چنانچہ صلح حدیبیہ اور اس قرارداد کو دونوں کو آمنے سامنے رکھ دیا جائے تو دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا ہے۔

لیکن آئندہ رونما ہونے والے واقعات بتاتے ہیں کہ جس طرح قصاص عثمان کا شور، اور نیزوں پر قرآن بلند کرنا دھوکا اور فریب تھا اس تحکیم میں بھی بدعہدی اور فریب کاری تھی۔ چنانچہ مخالف فریق نے اس معاہدے کی بھی دھجیاں اڑادیں۔ نہ کتاب اللہ کو دیکھا گیا اور نہ کسی نے سنتِ رسولؐ پر نظر کی اور خدا اور رسولؐ کے نام کی آڑ لے کر کئے گئے معاہدے کو سیاسی چال بنا کر اپنا کارنامہ سمجھا اور ایسے ہی مذموم کارناموں پر لوگوں نے ان پر اجتہاد کی سند بھی چسپاں کر دی۔

تحکیم اور خوارج

ابھی فوجیں صفین ہی میں تھیں کہ معاہدۂ تحکیم کے بعد عراقیوں نے تحکیم کے خلاف سرگوشیاں شروع کردیں حالانکہ کچھ دیر قبل انہی لوگوں نے اس معاہدے کے مان لینے پر زور دیا تھا چنانچہ ان شرپروں نے "لاحکم الا اللہ" کا نعرہ بلند کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ "حکم اللہ کے لیے مخصوص ہے" انہوں نے اپنے زعم باطل سے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا اور تلوار لے کر میدان میں آنکلے۔ عراقیوں میں یک جہتی ختم ہوگئی۔ انہوں نے حضرت امیرؑ کو یہ معاہدہ توڑ دینے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ لیکن حضرت علیؑ کی سیاست یہ تھی کہ عہد باندھ کر توڑ دینا خلاف اصول ہے چنانچہ آپؑ نے فرمایا "کیا معاہدہ تحریر کرنے کے بعد ہم عہد شکنی کریں۔ یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔" (اخبار الطوال ص۱۹۷)

واضح ہو کہ جب جنگ صفین میں معاویہ کی فوج نے یقینی شکست کا اندازہ کیا تو انہوں نے ایک چال چلتے ہوئے نیزوں پر قرآن بلند کر دیئے۔ حضرت علیؑ اس کو "فریب" جانتے تھے لہٰذا آپؑ نے فوج کو جنگ جاری رکھنے کا حکم دیا۔ لیکن لوگ اس چال کو نہ سمجھ سکے اور فریب میں آگئے جس کے نتیجے میں یہ معاہدہ حضرت علیؑ نے مان لیا۔ لیکن بعد میں جب خود ہی ان لوگوں پر مخالف گروہ کی قلعی کھلی تو ضبطِ تحریر کے بعد منحرف ہونے کے

صلاح و مشورے حضور امیر المومنینؑ کو پیش کرنے لگے۔ لیکن معاہدہ کر لینے کے بعد توڑنا حضرت علیؑ کے لئے کیونکر ممکن تھا؟ چنانچہ جب ان لوگوں کی بات نہ مانی گئی تو وہ بغاوت پر اتر آتے اور اس بغاوت کے سرکردہ دو لڑکے جعد اور معدان تھے جو حقیقی بھائی تھے۔ حضرت امیرؑ نے اس جماعت کی سرکشی و نافرمانی کے باوجود سختی کرنا گوارہ نہ فرمایا۔ چنانچہ دلائل و براہین سے ان کو خود جا کر سمجھایا۔ لیکن وہ کج فکری اور کج ذہنی پر بضد رہے چنانچہ تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۱۶۶ پر ہے کہ "خوارج" نے اپنے زعم باطل میں جو کچھ کہا ہے سراسر جھوٹ ہے۔"

حضرت امیرؑ کے حلم و ضبط اور نرم روی کا اثر لینے کی بجائے خوارج نے اپنی جارحانہ سرگرمیاں تیز تر کر دیں اور اپنی جماعت کو بڑے زور شور سے منظم کرنا شروع کر دیا۔ اور امت میں تفرقہ بازی شروع کر دی۔ جیسا کہ پیغمبرؐ خدا ان کے بارے میں پہلے ہی یوں ارشاد فرما چکے تھے۔

"میری امت دو فریقوں میں تقسیم ہوگی۔ ان دو میں سے ایک اور فرقہ نکل کھڑا ہوگا۔ اس فرقے کے لوگ سر منڈوائے، مونچھیں باریک کتروائے آدھی پنڈلیوں تک تہبند باندھے ہوں گے۔ وہ قرآن کی تلاوت کریں گے۔ مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ انہیں وہ شخص قتل کرے گا جو مجھے اور اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے!"

(تاریخ بغداد جلد ۱ صفحہ ۱۶۰)

در اصل خارجیت کے جراثیم زمانۂ رسولؐ میں ہی پیدا ہو گئے تھے اور اندر ہی اندر پھلتے پھولتے رہے۔ یہ لوگ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور تخریبی کارروائیاں کرتے تھے۔ ان کی گستاخی و شوخ چشمی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے حضرت رسولؐ خدا کی عدالت و دیانت پر حملہ کر دیا تھا۔ حالانکہ کفار بھی آپ کو "امین" تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک ایسے شخص ذوالخویصرہ تمیمی نے گستاخانہ لہجے میں آنحضرتؐ سے کہا کہ آپؐ عدل و انصاف کریں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر میں عدل نہ کروں گا تو پھر کون ہے جو عدل کرے گا۔ اس پر حضرت عمر بگڑے اور بارگاہ رسالتؐ

میں عرض کی یا رسول اللہ کیا ہم اس کو قتل نہ کر دیں۔ مگر رسول ؐ نے ارشاد فرمایا۔

"چھوڑ دو اسے۔ اس جیسے اور بھی اس کے ساتھی ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی ان کی نمازوں کے مقابلے میں اپنی نمازوں کو اور ان کے روزوں کے مقابلے میں اپنے روزوں کو دیکھے گا تو اپنی نمازوں اور روزوں کو حقیر سمجھے گا۔ یہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار کو چیر کر نکل جاتا ہے"۔ (صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۳۴)۔

چنانچہ یہ لوگ بظاہر شعائر اسلام اور احکام دین کے پابند تھے۔ نماز، روزہ اور تلاوت قرآن کے دلدادہ تھے۔ مگر اسلام کی رُوح سے ناآشنا اور دین کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ لوگ ان کی ظاہری وضع قطع اور عبادات کی نمائش سے اُن کے فریب کا شکار ہو جاتے تھے اور تو اور اصحاب رسول ؐ تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے [1]۔

چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ذوالخویصرہ کو حضورؐ نے نماز پڑھتے دیکھا کہ آپؐ نماز سے فارغ ہو گئے ہیں اور وہ سجدہ میں پڑا ہے۔ حضورؐ نے حضرت ابوبکر کو حکم دیا کہ جاؤ اور اسے قتل کر دو حضرت ابوبکر قریب آئے اور اُسے بڑے خشوع و خضوع سے سجدہ میں پایا۔ لہٰذا اسے قتل کرنا مناسب خیال نہ کیا اور واپس آ گئے۔ اسی طرح حضرت عمر کو مامور کیا لیکن وہ بھی اس کی نماز سے متاثر ہوئے اور واپس لوٹ آئے اور معذوری ظاہر کر دی کہ وہ نمازی ہے اس لئے اس کی جان لینے کو جی نہیں چاہا۔ پھر علیؑ کو بھیجا مگر آپؑ کے پہنچنے سے پہلے وہ جا چکا تھا۔ آپؑ نے واپس آ کر عرض کیا کہ حضور وہ جا چکا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر وہ آج قتل ہو جاتا تو فتنہ دب جاتا۔ وہ اُس گروہ کا ایک فرد تھا جو دین سے اس طرح نکل جائے گا جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ (صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۳۴)

لہٰذا حضورؐ کی پیش گوئی کے مطابق آپؐ کے بعد اُن لوگوں کی اکثریت مرتد ہو گئی۔ اور ان میں سے ایک عورت سجاع بنت حارث نے نبوت کا دعوے کر کے اسلام میں رخنہ اندازی

---

[1] کلمہ پڑھنے کے بعد ذوالخویصرہ نے صحبت رسول ؐ بھی پائی لہٰذا صحابی تو تھا مگر عقیدہ درست نہ تھا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ صرف صحابی ہونا عقیدے کی درستی کی دلیل نہیں۔

کی۔ یہی گروہ کبھی ارتداد کی صورت میں ظاہر ہوا اور کبھی خروج کی صورت میں بعض لوگوں نے خوارج کو شیعہ قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ ان کا کوئی بھی عقیدہ شیعوں جیسا نہ تھا۔ البتہ وہ عمومی رعایا ہونے کی حیثیت سے خلیفہ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے اور رعایا میں صرف شیعہ عقیدے ہی کے لوگ نہ تھے بلکہ اکثریت غیر شیعوں کی تھی جو حضراتِ ثلاثہ کو بھی خلفائے رسولؐ تسلیم کرتے تھے۔ یہ عقیدہ شیعہ وسنی کے امتیاز کیلئے کافی ہے۔

المختصر خوارج کا یہ مطالبۂ عہد شکنی حضرت علیؑ نے قبول نہ فرمایا لیکن اس تحکیم کا فیصلہ بہت ہی بے ضابطہ ہوا۔ امیرالمومنینؑ کو ابوموسیٰ پر اعتماد نہ تھا کیونکہ جنگِ جمل میں اس کا کردار بالکل واضح تھا۔ لیکن اُن ہی لوگوں نے جو بعد میں مخالف ہوئے اس پر اعتماد ظاہر کر کے اسے نمائندہ مقرر کیا اور ابوموسیٰ کو علم تھا کہ حضرت علیؑ کی کامیابی پر اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا لیکن معاویہ کی حمایت کا صلہ کسی عہدے یا بھاری انعام کی صورت میں مل سکتا تھا چنانچہ اس نے بڑا بھولا سا بن کر اپنے کردار کو خوب ادا کیا اور پھر معاویہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد بصد احترام اُسے "امین اللہ" کا لقب دے کر فرشی سلام کر کے اپنی کارکردگی کا صلہ مانگا۔ جب ابوموسیٰ اِدھر اُدھر ہوئے تو معاویہ نے اپنے درباریوں سے یوں کہا۔ "یہ بزرگ اس لئے آئے ہیں کہ میں انہیں کسی صوبے کا حاکم بنا دوں مگر خدا کی قسم میں انہیں کوئی عہدہ نہیں دوں گا" (تاریخ طبری جلد ۶ صفحہ ۱۲۵)

ابوموسیٰ کی حرصِ اقتدار نے جو قرآن وسنت کے مطابق فیصلہ کیا وہ ہر خاص و عام پر ظاہر ہے اور اس غیر عادلانہ فیصلے کے نتیجے میں اختلافات ویسے کے ویسے ہی رہے بلکہ حضرت امیرؑ کے خلاف دو طرفہ محاذ قائم ہو گیا۔ ایک طرف خوارج کا اور دوسری طرف شامیوں کا۔ آپؑ نے جس تدبر سے دونوں کا مقابلہ کیا وہ کسی اور سیاست دان کے بس کی بات نہ تھی۔

ابوموسیٰ نے امیرالمومنینؑ کی برطرفی اور عمرو ابنِ عاص نے اس برطرفی کے ساتھ معاویہ کے تقرر کا جو کھیل کھیلا اور جس طرح قرآن وسنت کے تقاضوں کو نظرانداز کیا اور عہد و پیمان کے بخیے اُدھیڑے وہ تاریخ دانوں سے مخفی نہیں۔ وہ لوگ جو میدانِ حرب سے فرار

میں اور اُصولی سیاست میں حضرتؑ کو شکست نہ دے سکے وہ مکر و فریب کا جوا جیت گئے اور حق و دیانت سے مُنہ موڑ کر معاویہ کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بن گئے۔

جنگِ نہروان تحکیم کا فیصلہ جنابِ امیرؑ کے لئے خلافِ توقع نہ تھا، چنانچہ جب فریقِ مخالف نے خود عہد شکنی کر دی تو آپؑ کے لئے یہ بات جائز ہوگئی کہ دشمن کو فریب کاری کی سزا دیں۔ چنانچہ آپؑ نے شام پر چڑھائی کا ارادہ فرمایا۔ اور چاہا کہ خوارج (جو معاویہ پر حملہ کے لئے بے چین تھے) کو بھی شریکِ جنگ ہونے کی دعوت دیں۔ چنانچہ آپؑ نے انہیں تحریر کیا "ہم نے جن دو آدمیوں کو ثالث مانا تھا انہوں نے کتابِ خدا کی مخالفت کی ہے اور نفسانی خواہشات کی رو میں بہہ گئے ہیں۔ انہوں نے نہ قرآن پر عمل کیا ہے اور نہ ہی سُنّتِ رسولؐ پر۔ اب ہمارا موقف وہی ہے جو تحکیم سے پہلے تھا۔ لہٰذا تم ہم سے تعاون کرو تاکہ اپنے مشترکہ دشمنوں کی طرف قدم بڑھائیں۔ اور ان سے جنگ کریں۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔ خوارج نے جواب میں لکھا کہ اب آپ خدا کی خوشنودی کی خاطر جنگ کے لئے کھڑے نہیں ہوئے بلکہ اپنے نفس کی خاطر جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔ (معاذ اللہ) اگر آپؑ اپنے کُفر کا اعتراف کرنے کے بعد توبہ کریں (نعوذ باللہ من ذلک) تو پھر ہم غور کریں گے کہ ہمیں آپ کا ساتھ دینا چاہیئے یا نہیں اور اگر آپؑ نے اقرارِ کفر کے بعد توبہ نہ کی تو ہم آپ سے لڑیں گے اور اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ چنانچہ جب حضرت علیؑ کو معلوم ہوا کہ خوارج آپؑ کا ساتھ دینے پر تیّار نہیں ہیں تو آپؑ نے انہیں نظر انداز کر دیا۔ اور فوج فراہم کرنا شروع کر دی۔ اہلِ کوفہ کے اجتماع میں خطبہ دیا۔

"اے اہلِ کوفہ! یاد رکھو جو جہاد سے ہاتھ اُٹھا لیتا ہے وہ تباہی و بربادی سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اُٹھو اور ان لوگوں کے مقابلے میں کمربستہ ہو جاؤ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمن ہیں اور خدا کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں۔ یہ ظالم خطاکار اور راہِ حق سے برگشتہ ہیں۔ یہ نہ قرآن کو سمجھتے ہیں اور نہ دین میں سوجھ بوجھ رکھتے ہیں اور

نہ خلافت کے اہل ہیں۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ برسرِ اقتدار آ گئے تو اسلامی قدروں کو پامال کر کے ہرقلی اور کیسری نظام قائم کریں گے۔ اٹھو! اور ان دشمنانِ دین سے جنگ کرو۔ ہم نے بصرہ سے بھی فوجی مدد طلب کی ہے۔ اس کے آتے ہی ہم شام کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔

چنانچہ اس طرح آپؑ نے کوفہ، مدائن اور بصرہ سے کوئی ستّر ہزار افراد اپنے پرچم تلے جمع فرمائے۔ اس اثناء میں خوارج کی تخریب کاریوں میں متواتر اضافہ ہوتا رہا جس کی بناء پر لوگوں نے حضرتؑ کو مشورہ دیا کہ پہلے خوارج کا قلع قمع کیا جائے لیکن آپؑ نے فرمایا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ اگر ہم ادھر مصروفِ پیکار ہو گئے تو معاویہ کو مزید طاقتور بننے کا موقع فراہم ہو جائے گا۔

لیکن خوارج کی شوریدہ سری نے قتل و غارت گری کی صورت اختیار کر لی اور عوام الناس کا جینا دوبھر ہو گیا۔ یہ ملعون ہر مسلمان سے پوچھتے کہ تحکیم کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے اگر وہ اظہارِ بے زاری کرتا تو چھوڑ دیتے ورنہ ہلاک کر دیتے۔ لہٰذا انکے خوف سے لوگ ذمّی بن کر اپنی جان چھڑاتے۔ جب ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی تو ان وحشت اور بربریت کے مظاہروں کے بعد ان کو چھوڑ دینا مملکت کے امن کے لئے انتہائی خطرناک تھا لہٰذا حضرتؑ نے حفاظتِ جان و مالِ رعایا کے فریضے کے مطابق یہی بہتر خیال کیا کہ پہلے خارجیت کے سانپ کو کچلا جائے۔ چنانچہ مرتبہ پروگرام میں تبدیلی فرماتے ہوئے شام جانے سے پہلے آپؑ نے نہروان کا رُخ کیا اور خوارج کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا اور رسول اللہ کی پیشین گوئی کے مطابق آپؑ نے بحیثیت محبوبِ خدا اور رسولؐ ان دشمنانِ خدا اور رسولؐ کو واصلِ جہنم کیا۔ اس جنگ میں حضرت کے لشکر کے صرف آٹھ مجاہدین نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ خوارج کا حشر ایسا ہوا کہ لوگوں نے حضرت امیرؑ سے عرض کی کہ اب صفحۂ ہستی سے ان کا نام مٹ گیا ہے لیکن آپؑ نے فرمایا۔ ہرگز نہیں ابھی تو وہ مردوں کی صلبوں اور عورتوں کے شکموں میں موجود ہیں۔ جب بھی ان کا کوئی گروہ اٹھے تو اُسے کاٹ کر رکھ دیا جائے گا یہاں تک کہ ان کی آخری فرد چور اور ڈاکو ہو کر رہ جائے گی۔

حضرتؑ نے اس جنگ کے بعد لوگوں سے فرمایا۔ اللہ اکبر! نہ میں نے کبھی جھوٹ کہا ہے اور نہ مجھے جھوٹی خبر دی گئی۔ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہو کہ تم عمل سے روگردان ہو جاؤ گے تو میں ان خوارج سے بصیرت کے ساتھ جنگ کرنے والوں، اور جس حق پر ہم ہیں اس حق کے پہچاننے والوں کے لئے اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کی زبان سے جس اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اس سے تمہیں آگاہ کرتا " (تاریخ طبری جلد ۴ ص ۶۶)

اس جنگ سے خوارج کی کمر ٹوٹ گئی۔ لیکن جو باقی بچے وہ جتھوں کی صورت میں گوریلا جنگ کرتے رہے اور ان کی سرکوبی ہوتی رہی۔

سقوطِ مصر قیس ابن سعد مصر کے عامل تھے اور انہوں نے صوبے کا نظم و نسق برقرار رکھا تھا مگر خاص وجہ سے یعنی آذربائیجان کی گورنری کے لئے حضرت علیؑ نے قیس کو واپس بلا لیا اور ان کی جگہ محمد بن ابوبکر کو گورنر مقرر فرمایا۔ وہ پُرجوش نوجوان تھے اس لئے شورش اور ہنگاموں میں انہوں نے دبنے میں سختی اختیار کی جس سے حالات بگڑنے کا اندیشہ پیدا ہوا[۱] جب حضرت امیرؑ کو اس بدنظمی کی خبر ہوئی تو آپؑ نے فرمایا کہ مصر کے حالات پر یا تو قیس قابو پا سکتے ہیں یا مالک اشترؒ لیکن قیس کو آپ روکنا چاہتے تھے اور انہیں آذربائیجان کا والی نامزد کر چکے تھے۔ آخر نظر انتخاب مالک اشتر پر پڑی۔ چنانچہ مالک جو اس وقت نصیبین کے عامل تھے انہیں فرمان جاری کیا کہ محمد بن ابوبکر کو مصر کا انتظام سونپا تھا مگر وہ نوجوان اور جنگ و جدل سے ناآزمودہ کار ہے وہاں بغاوت کے آثار ہیں لہذا فوراً پہنچ کر قابو حاصل کرو۔

دوسری طرف جب معاویہ کو جاسوسوں نے یہ اطلاع دی کہ محمد بن ابوبکر کی بجائے مالک اشتر کو گورنر مقرر کیا جا رہا ہے تو اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ چنانچہ اس نے علاقہ قلزم کے ایک باجگزار جایستار کو پیغام بھیجا۔

---

[۱] یہ تاریخ کامل لکھنے والے ابن اثیر کا خیال لکھا گیا ہے اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ حضرت محمد بن ابی بکر کی زحمت کا خیال فرما کر تبادلہ کرنا چاہا تھا۔

" مالک اشتر مصر کا حاکم مقرر ہوا ہے۔ اگر تم اُسے میرے راستے سے صاف کر دو گے تو جب تک میری اور تمہاری زندگی باقی ہے تم سے خراج نہیں لوں گا۔" (تاریخ کامل جلد ۳ ص ۱۷۵)

ہم اس اقدام کی شرعی اور اخلاقی حیثیت پر کچھ کہنا نہیں چاہتے کیونکہ اس بادشاہ کا ہر جرم اجتہاد کے پردے میں گم کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ باجگزار اپنی ڈیوٹی پر قلزم آگیا اور اُسنے میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے حضرت مالک اُشتر کو شہد میں زہر ملا کر دیدیا اور وہ جنّت مقیم ہو گئے۔ جب معاویہ کو یہ خوشخبری دی گئی تو اس نے کہا۔

"علیؑ کے دو ہاتھ تھے۔ ایک صفین میں قطع ہو گیا یعنی عمار ابن یاسر اور ایک آج قطع ہو گیا یعنی مالک اشتر۔" (تاریخ کامل جلد ۳ ص ۱۷۵)

جب امیر المومنینؑ نے حضرت مالک اُشترؓ کی خبر شہادت سُنی تو انا للہ کے بعد فرمایا "مالکؒ کا کیا کہنا وہ اپنی مثال آپ تھے۔ اللہ ان پر رحمت نازل فرمائے۔ انہوں نے اپنے عہد کو پورا کیا اور اپنے پروردگار کے حضور پہنچ گئے۔ ہمارے لئے سب سے بڑی مصیبت رسولؐ اللہ کا سانحہ ارتحال تھا اور اس کے بعد تو ہم ہر مصیبت پر صبر کرنے کے خوگر ہو گئے ہیں۔"

حضرت محمد بن ابوبکر کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے حضرتؑ نے تحریر کیا کہ "میں نے تمہاری تبدیلی اس لئے تجویز نہیں کی تھی کہ تمہیں کام میں سست اور ادائے فرض میں کمزور پایا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تمہیں ایسی جگہ مقرر کروں جہاں تمہیں زحمت کم اُٹھانا پڑے۔ میں نے جسے تمہاری جگہ والی بنا کر بھیجا تھا وہ ہمارا دوست و خیرخواہ اور دشمنوں کے لئے شمشیر قاطع تھا۔ خدا اس پر رحمت کرے اس کی زندگی ختم ہو گئی اور وہ اس جہانِ فانی سے جوار پروردگار میں پہنچ گیا ہم اس سے راضی تھے۔ خدا اس سے راضی و خوشنود ہو۔ تم دشمن کے حملے کو روکنے کے لئے تیار رہو۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔"

حضرت محمد بن ابی بکر نے جواباً تحریر کیا کہ "میں آپ کی خوشنودی خاطر کو ہر چیز

پر مقدم سمجھتا ہوں۔ آپ جو حکم دیں گے میں اس پر عمل کروں گا۔ اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ دشمن سے لڑوں گا۔"

ادھر معاویہ نے حضرت مالکؓ کا رشتۂ حیات منقطع کرنے کے بعد اپنے حواریوں سے مصر کی تاخت کے بارے میں صلاح مشورہ کیا۔ عمرو بن عاص نے جنگ کی رائے دی۔ چنانچہ حضرت محمد بن ابوبکر پر حملہ کر دیا گیا۔ اور آپ بڑی بے جگری و شجاعت سے مقابلہ کرتے رہے۔ مرکزی امداد طلب کی اور جناب امیرؑ نے فوجی دستوں کی روانگی کا بندوبست فرمایا اور اس کمک کو روانہ ہوئے دو تین دن ہی گزرے تھے کہ حضرتؑ کو محمد بن ابی بکر کی شہادت کی خبر موصول ہو گئی۔ جتنی خوشی محمد بن ابوبکر کے قتل کی معاویہ کو ہوئی اس سے کہیں زیادہ حضرت امیرؑ رنجیدہ ہوئے۔ لوگوں نے یہ کیفیت دیکھ کر پوچھا کہ آپؑ اس قدر غمگین کیوں ہیں۔ تو آپؑ نے فرمایا۔

"کیوں رنجیدہ نہ ہوں۔ وہ میرا پروردہ، میرے بیٹوں کا بھائی، اور میں اس کا باپ تھا اور اُسے اپنا بیٹا شمار کرتا تھا۔" (شرح ابن ابی الحدید جلد ۶ ص ۳۰۲)

معاویہ نے جارحانہ طریقے سے مصر کو اپنی مقبوضہ ریاست بنا لیا۔ اگر دنیا کی سیاست میں جارحیت کو کوئی حسن و خوبی حاصل ہے تو ہم اس حملے کو "سیاسی تدبر" مان لینے کو تیار ہیں۔ اگر حضرت امیرؑ بھی ایسی چالوں پر عمل کرتے تو پھر ساری دنیا تک اپنی سلطنت کے حدود وسیع کر سکتے تھے۔ مگر آپؑ کی کوئی سیاسی تدبیر ایسی نہیں ملتی جو عدل و انصاف اور اخلاقی ضابطوں کے خلاف ہو۔

مصر پر قبضہ جمانے کے بعد معاویہ کی حرص علاقہ گیری میں اضافہ ہو گیا۔ بصرہ لینے کی کوشش کی مگر وہاں ہزیمت اُٹھائی۔ اس کے بعد گاہے بگاہے اشتعال انگیزیاں کی جاتی رہیں اور حضرت امیرؑ کے لئے نئی نئی مشکلات پیدا کی گئیں لیکن باوجود ان حالات کے حضرتؑ کے قدم اپنے اصولوں سے نہ ڈگمگائے۔ حضرت علیؑ کے سیاسی اُصول آج بھی روشنی اور ہدایت سے پُر ہیں لیکن معاویہ کی ساری فرضی سیاست شرمندہ ہو کر "اجتہاد" کے پانی میں غرق ہو گئی اور لوگ اس "اجتہاد" کی کارگزاریاں

سُننے پر بھی تیار نہیں ہوتے۔ معاویہ کی عارضی حکومت فنا ہو گئی۔ لیکن علیؑ کی حکومت کا سکّہ آج بھی مومنوں کے دلوں پر چل رہا ہے۔ کامیاب سیاست مولا علیؑ کی ہے جن کی حکومت آج بھی دلوں پر قائم ہے۔ علیؑ کا دستور زندہ ہے جسے تا قیامت بقا حاصل ہے۔

اَب تک کی بحث کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت کی بُنیاد دو چیزوں پر ہے۔

(۱) اقتدارِ اعلےٰ خدا کا (۲) حکومت خدا کے نمائندے کی۔

رعایا کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی پسند سے حاکم چُنے۔ لہٰذا حضرت رسُولؐ خدا کو اللہ نے اپنی حکومت کا نمائندہ مُقرر کر کے حکومتِ الٰہیہ کا عملی نمونہ پیش کر دیا۔ اس نمونۂ حکومت سے اختلاف کی صورت میں کوئی حکومت اسلامی نہیں ہو سکتی۔ اِسلامی حکومت میں نہ ہی بلا وجہ فوج کشی کی ضرورت ہے اور نہ ہی ناجائز فتوحات کی۔ اِسلامی قانون حکومت کو خزانہ شاہی کا مالک تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ بیت المال رعایا کی امانت ہے اور حاکم اس کا امین ہے۔ عدل و انتظام کی نگرانی حکومت کا فرض ہے۔ اِسلامی دستورِ حکومت میں تقویٰ، اطاعتِ خداوندی و پیروی اسوۂ رسولؐ بنیادی دفعات ہیں۔ اور کسی بھی صورت میں ان سے انحراف ناقابلِ برداشت ہے۔ حضرت امیرالمومنینؑ کی سیاست اسی دستور پر قائم تھی۔ آپؑ نے حکومت سے محرومی اور اقتدار، دونوں حالتوں میں عملی نمونہ پیش کرتے ہوئے ثابت کر دیا کہ اگر کوئی حاکم اِسلامی دستورِ حکومت پر عمل کرے تو یہی اس کی سعادت ہے۔ آپؑ کی سیاسی زندگی میں ایک فعل بھی ایسا نظر نہیں آتا جس میں اُصول سے انحراف کا شُبہ ہو سکے۔ اِنتہائی دشواریوں اور شدید مصائب میں گھرے ہوئے ہوتے بھی جس حُسن و خوبی سے آپؑ نے اپنے دستور العمل کی حفاظت فرمائی وہ آپؑ کے سیاسی شعور و تدبّر کی روشن مثال ہے۔ آپؑ خدائی حکمران ہیں اور آپ کی سیرت تمام دنیوی حکام کے لئے ہدایت کا نمونۂ کامل ہے۔

سیاستِ حسنیہؑ

حضرت امیرالمومنینؑ کو رسُولؐ خدا کی پیشین گوئی کے مطابق بدترین شقی عبدالرحمٰن بن ملجم نے عالتِ نماز میں خوارج کے

گروہ کی ایک ذلیل عورت کے عشق میں ضربت لگائی رسول اکرمؐ نے پہلے ہی اطلاع دی تھی۔

"رسولؐ خدا نے علیؑ سے کہا کہ "پہلے لوگوں میں شقی ترین شخص کون تھا؟" کہا "اونٹنی کو پے کرنے والا"۔ فرمایا "بعد والوں میں سب سے زیادہ شقی کون ہے؟" علیؑ نے جواب دیا "اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں"۔ فرمایا "وہ تمہارا قاتل ہے"۔ (تاریخ خطیب بغدادی جلد ۱ ص ۱۳۵)۔

۱۹ ماہ رمضان تھی جس روز جناب امیرؑ پر حملہ ہوا۔ اس دن سحری کے وقت آپؑ نے امام حسنؑ سے فرمایا کہ "میں نے آج رسولؐ کریم سے خواب میں ملاقات کی ہے اور عرض کیا ہے کہ یا رسول اللہ! آپؐ کی امت نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے"۔ حضورؐ نے فرمایا "ان کے خلاف اللہ سے دعا کرو"۔ پس میں نے دعا کی کہ "اے خدا! مجھے ان کے بدلے بہتر لوگ عطا کر اور ان لوگوں کو میری بجائے شر پسند حاکم دے"۔ چنانچہ مولا علیؑ کی دعا قبول ہوئی، آپؑ کو دارالآخرت کی بشارت دی گئی اور لوگوں کے حصے میں ملوکیت کا شکنجہ آیا۔

حضرت امیر علیہ السلام کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن علیہ السلام مسند حکومت پر آئے۔ سیرۃ الصحابہ میں لکھا ہے کہ حضرت علیؑ کے بعد معاویہ کے مقبوضہ علاقے کے علاوہ باقی سارے ملک کی نظریں حضرت امام حسنؑ پر تھیں چنانچہ جب آپؑ اپنے بابا کی تدفین کے بعد مسجد میں تشریف لائے تو مسلمانوں نے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ آپؑ نے ان سے بیعت لی اور بیعت کے بعد خطبہ دیا۔ تاریخ الائمہ ص ۳۳۲ پر مرقوم ہے کہ ایران، عراق، خراسان، حجاز اور یمن کے رہنے والوں نے آپؑ کو خلیفہ تسلیم کیا۔

معاویہ بن ابوسفیان کو پوری مملکت پر حکومت کرنے کی شدید خواہش تھی۔ چنانچہ جب معاویہ نے دیکھا کہ حسنؑ جیسا امن پسند مسند حکومت پر ہے تو خواہش حکومت اور بھی شدت اختیار کر گئی۔ معاویہ کو معلوم تھا کہ امام حسنؑ قتل و خونریزی سے شدید

نفرت کرتے ہیں اور اس قیمت پر آپ اقتدار رکھنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ لہٰذا معاویہ نے پیش قدمی شروع کی عبداللہ بن عامر کو مقدمۃ الجیش کے طور پر مدائن کی طرف روانہ کیا اور خود چھ ہزار کا لشکر لے کر مسکن کے مقام پر قیام کیا۔ امام حسنؑ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ خود لشکر لے کر مدائن میں آ گئے اور قیس بن سعد کو معاویہ کی پیشقدمی روکنے کے لئے روانہ کیا۔ اس دوران میں معاویہ نے ایک اور چال چلی کہ ایک شخص کو مدائن بھیجا اور افواہ پھیلا دی کہ قیس بن سعد نے معاویہ سے صلح کر لی ہے اور اسی طرح قیس بن سعد کی فوج میں یہ ہوا گرم کرا دی کہ امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کر لی ہے۔ اس بے بنیاد افواہ سے دونوں لشکروں میں پھوٹ پڑ گئی اور فوجی امام حسنؑ کے خیمے پر ٹوٹ پڑے۔ اس پر امام حسنؑ نے معاویہ کے اس معاندانہ رویّہ کے خلاف خط لکھا کہ یہ حرکت خطرناک ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تو آمادۂ جنگ ہے لیکن حضرتؑ کے احتجاج کا معاویہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ادھر معاویہ نے لوگوں کو مختلف قسم کے لالچ دے کر خفیہ طور پر امام حسنؑ کے قتل پر مامور کر دیا اور خود ایک لاکھ سے زیادہ فوج کے ساتھ عراق پر چڑھائی کر دی۔ امامؑ نے اس فوج کشی پر اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور دعوت جہاد دی۔ لوگوں نے آپؑ کی دعوت پر لبیک نہ کہا۔ معاویہ کے جاسوسوں نے لوگوں کو بڑے بڑے لالچ دیئے اور طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر دین فروشی پر کمربستہ کر دیا۔ امامؑ کے خلاف یہ پروپیگنڈا عام ہو گیا کہ آپؑ معاویہ سے صلح کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ خوارج نے معاذاللہ آپؑ کو کافر و مشرک کہہ کر نعرے بلند کئے۔ آپؑ جیسے امن پسند کو جنہیں رسولؐ نے سردار جنّت کا لقب عطا کیا اور اپنے دوش پر سوار کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ میرا پھول ہے جسمانی اذیتیں دی گئیں۔ گروہ کے گروہ آپؑ کا ساتھ چھوڑتے رہے اور معاویہ سے ملتے رہے۔ کچھ دھوکے میں آکر اور کچھ لالچ سے۔ معاویہ نے اپنے حواریوں کے ذریعہ اہل کوفہ کے فرضی خطوط اپنے نام منگوائے جن میں اُسے حمایت کی یقین دہانی کرا دی گئی تھی۔ پھر معاویہ نے امام حسنؑ کو تحریر کیا کہ لوگ آپؑ کے ساتھ غدر کر رہے ہیں جس

طرح کہ وہ آپؑ کے والد کے ساتھ کر چکے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپؑ میرے ساتھ صلح کر لیں۔

قوم کی حالت یہ تھی کہ چند ہی دنوں میں آپؑ کے ساتھ صرف چند مخلص احباب رہ گئے تھے۔ تاریخ کامل جلد ۳ صفحہ ۱۶۳ میں ہے کہ امام حسنؑ نے معاویہ کی طرف لکھا تھا کہ اگر میں کسی اہل قبلہ سے جنگ چھیڑتا تو ابتدا تجھی سے کرتا اور تجھے محض مصلحت اُمّت اور اس کو قتل عام سے بچانے کے لئے چھوڑ دیا لیکن اپنے لشکر کی پھوٹ کی وجہ سے اور مجبور ہو گئے کہ جب معاویہ کی طرف پیغام صلح ملا تو آپؑ نے اپنے ساتھیوں کے گروہ سے خطاب فرمایا۔

" تعجب ہے ایسی قوم پر جس کے پاس حیا ہے نہ دین۔ اگر معاویہ سے صلح کروں تو تمہیں کبھی خوشی نصیب نہیں ہو گی۔ اور بنی اُمیہ تمہیں ایسے سخت عذاب میں مبتلا کریں گے کہ تم تمنا کرو گے کہ کاش ان کے بجائے ہم کسی حبشی کے ماتحت ہوتے۔ اگر میرے پاس کچھ مخلص مددگار ہوتے تو میں کبھی معاویہ سے صلح نہ کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ سلطنت بنو اُمیہ پر حرام ہے۔ پس تم پر تف ہو اے دنیا پرستو!۔ لیکن اس پر بھی لوگوں کی خوابیدہ غیرت نہ جاگی اور ان کی غداری کے سبب حضرت امام حسنؑ نے صلح پر آمادگی ظاہر کر دی اور اپنے نانا کے حضور یوں فریاد فرمائی۔

" نانا! میں نے اُمّت کی خیر خواہی کے پیش نظر تیری اُمّت کو اس طرح آگاہ کیا۔ اے لوگو! غفلت کی نیند سے جاگو۔ ظلمات کی تاریکیوں سے نکلو۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو شگفتہ کیا اور رُوح کو بیدار کیا۔ اور اپنی عظمت کو روا قرار دیا۔ اگر تم میں ایک صاف دل نیک طینت جماعت میرے ساتھ ہو جائے جس میں نفاق کی ملاوٹ نہ ہو تو میں بڑھ بڑھ کر جہاد کروں گا اور جوانب و اطراف کو تلواروں اور نیزوں سے بھرپور کر دوں گا گھوڑوں کی کثرت سے زمین کو تنگ کر دوں گا۔ کچھ تو جواب دو خدا کے بندو! اللہ تم پر رحم کرے گویا کہ خاموشی کی لگام ان کے منہ میں تھی اور میری آواز صدا بصحرا رہی۔ اس پر صرف بیس آدمی اُٹھے اور انہوں نے

کہا۔ یابن رسول اللہ! ہمارے نفس اور ہماری تلواریں حاضر ہیں۔ ہم آپؑ کے مطیع ہیں اور ہمارے سر تسلیم آپؑ کے سامنے خم ہیں۔ پھر میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ انکے علاوہ کسی نے بھی "لبیک" نہ کہا۔ پس میں نے فیصلہ کر لیا کہ میرے لئے میرے نانا کا اسوۂ حسنہ مشعلِ راہ ہے جس طرح انہوں نے ایک مدت تک اللہ کی مخفیہ عبادت کی۔ حالانکہ ان کے پاس انتالیس مسلمان تھے جب خدا نے چالیس کی تعداد کو پورا کر دیا تو اعلانیہ امر الٰہی کی تبلیغ کی اور کارِ رسالت انجام دیا۔ نانا! اگر میرے پاس مخلص مومنوں کی اتنی ہی تعداد ہو جاتی تو میں ایسا جہاد کرتا جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔" علامہ وحید الزماں اہلِ حدیث اپنی کتاب انوار اللغت پ ۲ ص ۹ میں صلح امام حسنؑ کے متعلق لکھتے ہیں: "اللہ تعالیٰ اس بات کا گواہ ہے کہ ہمارے امام اور شہزادے نے اپنی خوشی سے یہ خلافت معاویہ کو نہیں دی بلکہ مجبوری سے۔ آپؑ نے دیکھا کہ میرے ساتھ لوگ دَرپردہ معاویہ سے سازش رکھتے ہیں اور معاویہ جنگ پر تُلا ہوا ہے۔" پھر علامہ وحید الزماں نے آگے یہ بھی لکھا ہے کہ "آپ معاویہ کو ظالم اور غاصب جانتے تھے اور ہرگز خلافت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ (اسی طرح انوار اللغت کے پ ۱۸ ص ۱۷ میں لکھا ہوا ہے)۔

حضرت امام حسنؑ کی اس فریاد سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس صلح کا سب سے پہلا سبب قلتِ انصار تھا۔ چنانچہ آپؑ نے اس کا اظہار معاویہ کے نام ایک خط میں یوں فرمایا۔

"اے معاویہ! خلافت میرا اور میرے اہل بیت کا حق ہے۔ تجھ پر اور تیرے اہل بیت پر حرام ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے جدِ پاکؐ سے سنا ہے۔ اگر میرے پاس چند ایسے آدمی ہوتے جو جہاد فی سبیل اللہ میں صابر اور میری امت کے عارف ہوتے تو میں کبھی تیرے ساتھ صلح کرنے پر آمادہ نہ ہوتا۔"

امام حسنؑ کی یہ صلح بالکل دستورِ حکومتِ الٰہیہ کے مطابق تھی۔ اور یہ اسوۂ رسولؐ اور سیرۃ علویہ کی پیروکاری تھی۔ اگر آپؑ صلح نہ کرتے تو مندرجہ ذیل نتائج کا احتمال تھا۔

۱۔ اگر امام حسنؑ صلح نہ کرتے تو سوائے قتل و غارت اور گرفتاری کے کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔

۲۔ معاویہ کی استبدادی قوت میں اضافہ ہو جاتا اور اس پر اعتراض و تنقید کرنے کا کسی

میں بھی حوصلہ نہ ہوتا۔

۳۔ خود امام حسنؑ کی جان خطرہ میں تھی۔ لہٰذا ان کو قتل کر کے الزام شیعوں پر عائد کردیا جاتا اور اُن سے گِن گِن کر بدلے لئے جاتے حضرتؑ کو اپنے وفاداروں کا تحفظ منظور تھا۔

۴۔ حق و باطل کا فرق معلوم نہ ہوتا۔

۵۔ یہ صلح اُمّتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے لئے کی گئی جیسا کہ اس کی شرائط سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ خود امام حسنؑ فرماتے ہیں۔

"اگر میری کوششیں دُنیاوی اغراض، ذاتی خواہشات اور اقتدارِ ظاہری کے لئے ہوتیں تو یہ معاویہ نہ مجھ سے زیادہ دانا ہے اور نہ زیادہ چالاک بلکہ جو مصالح و مقاصد میرے پیشِ نظر ہیں ان کو تم نہیں دیکھتے میں نے اُمّتِ اسلامیہ کو خون ریزی سے بچانے کے لئے یہ اقدام کیا ہے۔ چنانچہ امنِ عامّہ کی بحالی کو بھی شرائط میں داخل کردیا ہے۔"

۶۔ معاویہ کو تجربتاً معلوم ہوچکا تھا کہ بنی ہاشم کے خلاف تلوار اٹھانے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے لہٰذا خفیہ چالیں بروئے کار لائی گئیں۔ اسی پروگرام کے تحت پہلے اس نے امام حسنؑ کی فوج میں غلط افواہیں پھیلا کر تذبذب پیدا کیا اور بعد میں خود ہی پیغامِ امن بھیجدیا۔ اب اگر امام حسنؑ صلح سے انکار کردیتے تو حُبِّ جاہ سے متہم ہوتے۔ اور آئندہ ساری خونریزی کا الزام آپؑ کی ذاتِ مقدس پر آجاتا۔

۷۔ شرائطِ صلح کسی حد تک دستورِ حکومتِ الٰہیہ کے مطابق تھیں اور اگر ان سے حضرتؑ انکار کردیتے تو آپ پر فساد کا الزام آجاتا۔

شرائطِ صلح علامہ ابنِ حجر مکّی نے ایک کتاب عقائدِ شیعہ کی تردید میں لکھی ہے جس کا نام صواعقِ محرقہ ہے۔ پہلے ہم ان شرائط کو اُسی کتاب کے ص۸۱ سے نقل کرتے ہیں۔

۱۔ معاویہ حکومتِ اسلام میں کتابِ خدا اور سنّتِ رسول اور صحیح راستے پر چلنے والے خلیفوں کے طریقہ پر عمل کرے گا۔[1]

---

[1] شرط میں خط کشیدہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔

۲۔ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

۳۔ شام، عراق، حجاز، یمن سب جگہ کے لوگوں کے لئے امان ہوگی۔

۴۔ حضرت علیؑ کے اصحاب و شیعہ جہاں بھی ہیں ان کے جان و مال و ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔

۵۔ معاویہ حسنؑ بن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ اور خاندانِ رسولؐ میں سے کسی کو بھی نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ نہ خفیہ طریقے پر نہ اعلانیہ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ ڈرایا، دھمکایا اور دہشت میں مبتلا نہیں کیا جائے گا۔

اگر ان شرائط پر غور کیا جائے کیا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت امام حسنؑ نے کس قدر اپنے سیاسی تدبّر سے اپنا مقصد حاصل کیا ہے جس کے لئے ان کی فریقِ مخالف کے ساتھ منازعت تھی۔ حکومتِ الٰہیہ کی سیاست میں ذاتی عناد یا شخصی اغراض کیلئے تصادم کرنا روا نہیں ہے۔ لہٰذا معاہدۂ صلح کی اوّلین شرط سے معاویہ کو پابند قانونِ خداؐ سُنّتِ رسولؐ بنایا گیا۔ نیز حضرتؑ نے خود معاویہ سے تسلیم کروالیا کہ اب تک وہ جس نہج پر شام میں قابض رہا وہ کتاب و سُنّت کے خلاف تھا کیونکہ صلح نامہ کی بنیادی باتیں وہی ہوتی ہیں جو محلّ نزاع ہوں۔ اگر معاویہ نے کتاب و سُنّت کی پابندی کی ہوتی تو اس شرط کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اسی طرح ہر شرط کو دیکھئے اور سوچئے کہ پیش کردہ شرائط پر معاویہ کی پُر اسرار خاموشی بتلا رہی ہے کہ وہ اُن سب باتوں کا مرتکب تھا۔ ورنہ کہیں تو اعتراض کیا ہوتا کہ جب ایسا ہے ہی نہیں تو شرط کیسی؟ حضرتؑ کے سیاسی تدبّر نے اُسے خود اعترافِ جرم کرنے پر مجبور کر دیا اور آئندہ کے لئے پابندِ شریعت رہنے کا عہد لے لیا۔

یہ امام حسنؑ کی سیاسی کامیابی ہے کہ انتہائی پُر امن انقلاب سے آپؑ نے ایک باغی عامل کو نیچا دکھا کر اپنی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ اگر بقول بعض لوگوں کے آپؑ نے معاذاللہ معاویہ کو خلیفہ تسلیم کیا تھا تو پھر یہ شرائط کس بات کی تھیں؟ لیس امام حسنؑ نے معاویہ کو ہرگز خلیفہ تسلیم نہیں کیا محض دفع شر کے لئے یہ صُلح کی تھی جس کے معنے یہ ہیں

کہ جنگ نہیں کریں گے اور شرائط کے ساتھ حکومت ٹھیکے پر دے دی، امام حسنؑ نے بہت بڑے فتنے کو انتہائی بردباری اور دانشمندی سے فرد کیا۔

سبّ نہ کرنے کی شرط

سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ علامہ ابن حجر مکی نے ایک نہایت اہم شرط صلح کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور وہ شرط امام حسنؑ نے، حضرت علیؑ پر سبّ کو رکوانے کے لئے رکھی تھی جو تاریخ طبری جلد ۶ صـ ۹۲ و تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۳ صـ ۱۶۲، تاریخ ابی الفدار جلد اوّل صـ ۱۹۲ اور عقد الفرید ابن عبد البر جلد ۳ صـ ۱۲۶ میں موجود ہے کہ امام حسنؑ نے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ "معاویہ، حضرت علیؑ کو سبّ (یعنی گالی) نہ دے گا" لیکن معاویہ نے اس شرط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر امام حسن نے یہ شرط رکھی کہ مجھے سُنا کر (یا میرے سامنے) گالی نہ دینا تو معاویہ نے اس شرط کو تسلیم کر لیا تھا مگر اس کو پورا نہ کیا (نوٹ:- اسی طرح تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۳۱۷ مطبوعہ مصر میں بھی ہے)

پس حضرت امام حسنؑ نے اس صلحنامے میں معاویہ سے صاف اقرار کرا لیا کہ اس کی جانب سے اس فعل کا ارتکاب ہوتا تھا۔ حالانکہ رسولِ خدا کی حدیث موجود تھی کہ "جس نے علیؑ کو گالی دی اس نے مجھے گالی دی" قابلِ غور بات ہے کہ عبد العزیز محدّث دہلوی نے فتاوی عزیزی مطبوعہ مجتبائی دہلی صفحہ ۲۹۱ میں معاویہ کو مرتکب کبیرہ و باغی تسلیم کیا ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ معاویہ عطیہ میں کثیر رقوم حضرت امام حسنؑ کی خدمت میں ارسال کیا کرتا تھا تو بھی اصولی طور پر حرج نہیں ہے۔ اوّل تو امام حسنؑ۔ امام برحق تھے اور معاویہ کی حیثیت جیسا کہ شرائط سے ظاہر ہے ایک ٹھیکہ دار کی سی تھی۔ لہٰذا امامؑ وہ رقوم حاصل کر کے جائز مصرف پر خرچ کرتے تھے اور آپؑ کی سخاوت مشہور تھی۔ جیسا کہ تاریخ اسلام (مولفہ سید عبد القادر یا پروفیسر شجاع) میں تحریر ہے "حضرت حسنؑ نے مدینہ منورہ کو اقامت کے لیے منتخب کیا۔ آپؑ نے رمضان ۴۰ھ سے ربیع الاوّل ۴۱ھ تک امور سلطنت کو انجام دیا۔ مدینہ میں حضرت کے اوقات عبادت، ریاضت

تعلیم و تبلیغ میں بسر ہوتے تھے۔ معاہدہ کے مطابق جو سالانہ وظیفہ آپ کو وصول ہوتا تھا۔ اس کا زیادہ حصّہ مسکینوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ آپ کے دروازے ہر مفلوک الحال اور مصیبت زدہ پر کھلے رہتے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام حسین علیہ السّلام نے اس معاہدۂ صلح کی مخالفت کی۔ حالانکہ یہ بات قطعی طور پر بے بنیاد ہے اور روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ سبطِ اصغرِ مصطفےٰ اس معاہدے سے متفق تھے۔ گو معاویہؒ نے بعد میں اُن میں سے کسی ایک بھی شرط کی پابندی نہیں کی تو یہ اس کی اپنی سیاست تھی جس سے بحث کرنا ہمارا مدعائے بیان نہیں ہے۔ بہر حال اس کی عہد شکنی کو کسی دشمن نے بھی مستحسن قرار نہیں دیا ہے۔ ہماری بحث اسلامی دستورِ سیاست سے ہے اور اس کی رُو سے معاہدے کی پابندی لازمی قانون ہے افراد کے جرائم افادۂ قانون کی قباحت پر دلیل نہیں ہوا کرتے۔ پس قانونِ سیاست الٰہیہ مفید ہے اور عہد شکنی کو تو ہر قانون میں جرائم کے زمرے میں جگہ دی جاتی ہے۔ پھر یہ اسلامی سیاست کا اصول کیوں کر ہو سکتی ہے۔

نکتہ:- یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ جب آئمہؑ کو معلوم تھا کہ لوگوں کی رائے نقصان دہ ہے اور اس بات کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ تو پھر انہوں نے اپنی رائے استعمال کیوں نہ کی؟ تو جواب یہ ہے کہ اسلام میں جبر و اکراہ نہیں ہے کسی پر قوتِ اقتدار یا دوسری طاقت کے ذریعہ جبر نہیں کیا جاسکتا۔ آئمہؑ نے نتائج سے آگاہ کر دیا۔ تو اب ملّت کا کام تھا کہ وہ خبردار رہے۔ دوسرے جب تعاونِ قوم شامل نہ ہو تو اکیلا سربراہ کیا کر سکتا ہے؟ تیسرے اگر ایسا ہو جاتا تو پھر آئمہ کی تصدیق کس طرح ہوتی۔ ان کی حیثیت عام بادشاہوں کی سی رہ جاتی۔

قضایا

اسلامی سیاست کی بنیاد عدل پر قائم ہے اسی لیے قضایا کو ہم نے سیاسیات کے باب میں مدون کیا ہے۔ اکثر اوقات ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے یہ سُنتے رہتے ہیں کہ "ہمارا اسلامی نظام تو بہت ہی مکمل و جامع ہے اور اہل یورپ نے ہمیں سے سب کچھ سیکھا ہے۔ اگر ہم خود اسلامی اصولوں پر چلیں تو ہمارے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں"۔ تو یہ سُن کر ایک طرف تو ہمیں مسرت ہوتی ہے کہ حق کی تائید کی جارہی ہے۔ لیکن دوسری طرف جب ہم ادھر نظر کرتے ہیں کہ دین اور سیاست دونوں کو الگ الگ بھی کر دیا جاتا ہے تو حیران ہو جاتے ہیں کہ اتنے بلند دعوے کی بنیاد اس قدر کمزور کیوں؟

آج ہم اس نظام کی طرف توجہ کرتے ہیں جسے دنیا اسلامی نظام سے تعبیر کرتی ہے تو ہمیں دو صورتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اول یہ کہ ایسا نظام امپیریلزم کے متشابہ ہے اور اگر اسلام نے یہی نظام تعلیم کیا ہے تو یہ اس کی اپنی کوئی نئی راہ نہیں ہے؟ دوسری صورت یا پھر یہ ہے کہ اصل اسلامی نظام میں تحریف کر کے کچھ آمروں نے حسبِ ضرورت اسے اپنے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اول صورت اس واسطے پیدا ہوتی ہے کہ امپیریلزم کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے دونوں میں کوئی خاص فرق معلوم نہیں ہوتا اور دوسری صورت اس لیے پیدا ہوئی کہ یہ نظام اس نظام سے بہت مختلف ہے جو پیغمبر اسلام نے اپنی حیاتِ طیبہ میں تعلیم فرمایا تھا۔

مثال کے طور پر دیکھئے کہ اہلِ یورپ اپنی کتاب سیاست کا یہ دیباچہ قائم کرتے ہیں کہ "اور انتظامیہ میں کارکنان انتظامیہ عمل و انصاف کا خیال نہیں رکھ سکتے اس واسطے عدالتی اور انتظامی محکمے (یعنی عدلیہ اور انتظامیہ) جدا جدا رہتے

ہیں یہی رائے مسلمانوں کے پیش کردہ نظام کے لئے ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر نے اپنے دور میں عدالتی اور انتظامی صیغوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ چنانچہ مولوی شبلی نعمانی حضرت عمر کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "صیغہ عدالت بھی اسلام میں حضرت عمر کی بدولت وجود میں آیا۔ ترقی و تمدّن کا پہلا زینہ یہ ہے کہ صیغۂ عدالت انتظامی صیغہ سے علیحدہ قائم کیا جائے۔ دنیا میں جہاں جہاں حکومت و سلطنت کے سلسلے قائم ہوئے مدّتوں کے بعد ان صیغوں میں تفریق ہوئی لیکن حضرت عمر نے خلافت کے چند ہی روز بعد اس صیغہ کو الگ کر دیا۔ حضرت ابوبکر کے زمانہ تک خود خلیفۂ وقت اور افسرانِ ملکی قضا کا کام بھی کرتے تھے حضرت عمر نے بھی ابتدا میں یہ رواج قائم رکھا۔ اور ایسا کرنا ضروری تھا حکومت کا نظم و نسق جب تک کامل نہیں ہو لیتا۔ ہر صیغہ کا اجراء رعب وداب کا محتاج رہتا ہے۔ اس لئے فصلِ قضایا کا کام وہ شخص انجام نہیں دے سکتا جس کو فصلِ قضایا کے سوائے اور کوئی اختیار نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ حضرتِ عمر نے ابوموسیٰ اشعری کو لکھا کہ جو شخص با اثر اور صاحبِ عظمت نہ ہو قاضی مقرّر نہ کیا جائے۔ بلکہ اسی بناء پر عبداللہؓ ابنِ مسعود کو فصل قضا سے روک دیا۔ لیکن جب انتظام کا سکّہ اچھی طرح جم گیا تو حضرت عمر نے قضاء کا صیغہ بالکل الگ کر دیا۔" (الفاروق حصّہ دوم ص۲۰۱)

مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ محکمہ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ غیر مسلم ممالک میں جہاں حکومت و سلطنت کے سلسلے قائم ہوئے اُن کے تجربات کی بنا پر یہ تقلید کی گئی۔ اس لئے معلوم ہوگیا کہ یہ کوئی نیا یا انوکھا اصول نہ تھا بلکہ دوسری حکومتوں کی نقل پر مبنی تھا۔ دوسری قابلِ غور توضیح یہ ہے کہ بقول مولوی شبلی نعمانی رسولِ خدا صلعم اور حضرت ابوبکر کے زمانے میں ابھی تمدّن کا پہلا زینہ بھی شروع نہ ہو پایا تھا۔ اور ان دونوں نے معاذ اللہ اپنی ساری زندگی غیر مہذّب طرزِ معاشرت میں گذاری۔ ایسی توضیحات کے بعد یہ دعویٰ کرنا کہ ہم معلمینِ عالم ہیں کیا وزن رکھ سکتا ہے؟ حالانکہ اس سے تو بالکل الٹ یہ

بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ان مسلمانوں نے دوسروں سے مستعار لے کر قوانین بنائے۔

پس اس مثال سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دور میں محکمہ عدالت حکومت سے الگ نہ تھا۔ بلکہ حضرت ابوبکر اور کچھ وقت حضرت عمر بھی اسی اصول پر قائم رہے۔ لیکن بعد میں کسی خاص مصلحت کی بناء پر حضرت عمر نے یہ تبدیلی کر دی اور دونوں صیغے جدا جدا کر دیئے۔ لیکن ہمارا مدعا یہ ہے کہ جب دین مکمل ہو گیا اور نعمت تمام کر دی گئی۔ خود سرکارِ رسالت مآب ؐ نے عملاً ایک حکومت بنا کر اس کا دستور نافذ فرما کر یہ بھی دکھا دیا کہ وہ دستورِ الٰہی کامیاب رہا تو پھر اس میں ردوبدل کا کیا جواز ہے؟

مغربی ممالک نے جو انتظامیہ و عدلیہ کے محکموں کی تفریق کا تخیل لیا ہے ان کے پیشِ نظر یہ خود ساختہ کلیہ ہے کہ "امورِ انتظامیہ میں انصاف مدِنظر نہیں ہوتا انہیں بسا اوقات خلافِ عدل احکامات صادر کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے" مگر ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ صورتِ حال عام دنیوی حکومتوں ہی میں پیدا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اسلام کی تو خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس کی روح عدل ہے۔ اور جب اسلام سے عدل ہی جاتا رہے گا تو باقی ڈھانچہ بے جان ہو جائے گا۔ اب حکومتِ الٰہیہ میں تو کوئی بھی ایسی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ ان دونوں صیغوں کو جدا جدا کر دیا جائے۔ خود مولوی شبلی نعمانی صاحب جیسے عالم نے بھی بڑی کدّ و کاوش کے بعد ایک وجہ بیان کی۔ وہ بھی بچوں کا تماشہ معلوم ہو رہی ہے کہ "محکمہ قضا میں کچھ رعب و داب ہی نہیں" اب آپ خود انصاف کیجیئے کہ کیا "کسی جج کا جو کروڑوں روپے تک کی جائیداد کا فیصلہ کرے، چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دے، زانی کو سنگسار کرنے کا حکم دے، قاتل سے قصاص دلائے کیا اس شخص کا کوئی رعب و داب نہ ہو گا؟" لہٰذا معلوم ہو گیا کہ ان دونوں صیغوں کی جدائی کی کوئی معقول وجہ و دلیل نہیں ہے بلکہ مولوی شبلی نعمانی نے جو یہ لکھا ہے کہ "فصل قضایا کا کام وہ شخص انجام نہیں دے سکتا جس کو فصل قضایا کے سوائے اور کوئی اختیار نہ ہو" یہ بات خود اس امر کی

دلیل ہے کہ عدلیہ اور انتظامیہ الگ الگ نہیں ہونے چاہئیں بلکہ عدلیہ کو اختیارات والے انتظامیہ ہی کے پاس رہنا چاہیئے۔ اگر عدلیہ علیحدہ ہو جائے تو اسے صرف فصل قضایا (یعنی مقدمات کے فیصلے کرنا) کے سوائے کوئی اختیار نہ ہوگا۔ اختیارات تو انتظامیہ کے پاس ہوں گے۔ اس بات پر اچھی طرح غور فرمائیے۔

پھر مولوی شبلی لکھتے ہیں۔ "لیکن جب انتظام کا سکہ اچھی طرح جم گیا تو حضرت عمرؓ نے قضا کا صیغہ بالکل الگ کر دیا۔" ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی "انتظام کا سکہ جمنے" کے بعد عمل میں لائی گئی۔ یعنی اس علیحدگی سے پہلے جو انتظامی سکہ جما وہ اسی نظام قضایا سے جما جس میں رسولِ خداؐ کے زمانے سے عدلیہ اور انتظامیہ علیحدہ نہیں تھے۔ جس سے ثابت ہوا کہ عدلیہ اور انتظامیہ کا اکٹھے رہنا انتظام کا سکہ جما دینا ہے۔ اس لئے وہی بہتر ہے۔

اب ذرا غیر مسلموں کی ان حکومتوں کے نظریہ پر نظر ڈالیئے جن کی تقلید میں ایسا کیا گیا کہ وہ خود حکومت کو عادل تصور نہیں کرتے بلکہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ "حکومت کبھی کبھار بے انصافی کے احکام صادر کرے۔" اور ایسا طریقہ ایسی قوم کے لئے موزوں متصور ہو سکتا ہے جہاں حکومت کا دار و مدار حیوانی طاقت پر مبنی ہو۔ عدل و انصاف حاصل کرنے کے لئے مصنوعی ذرائع استعمال کرنا پڑیں۔ اور جہاں لوگوں کے اخلاق اس قدر گرے ہوئے ہوں گے وہاں افسران خود بھی ظالم ہوں گے اور دوسروں کے مظالم میں حوصلہ افزائی کریں گے۔ ایسی صورت میں خود محکمہ قضا بھی قابلِ اعتماد نہیں رہتا۔ دور نہ جائیے۔ ایسی حکومتوں کے حالات آپ کے سامنے ہیں کہ انصاف کے حصول میں کس قدر دقتیں پیش آتی ہیں غرضیکہ ایسے مصنوعی طریقے سے عدل و انصاف حاصل کرنا اسلامی اصول نہیں ہے۔

حکومت الٰہیہ کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ رعایا کے نزاعی امور کا بے لاگ فیصلہ کرنے کی ذمہ داری لے۔ ایسی عدالتیں قائم کرے جہاں پر ادنیٰ و اعلیٰ کو انصاف کا حصول یکساں ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو انصاف کے حصول

کے لئے لوگوں کو عرصہ دراز تک کورٹ کے چکر نہ لگانے پڑیں۔ وکیلوں اور کورٹ فیسوں کا بوجھ نہ ہو۔ سفارش و رشوت ستانی کی گنجائش نہ ہو پس اسلام قضایا کا انتظام نہایت شاندار کرتا ہے۔ اگر اسلام کے مقرر کردہ قواعد و ضوابط رکھے جائیں تو حصولِ انصاف میں نہ کوئی دشواری پیش آتی ہے اور نہ ہی مالی اعتبار سے زیر بار ہونا پڑتا ہے۔

اسلام دینِ عدل ہے اور عدل ہی کو ہر شعبہ میں کارفرما دیکھنا چاہتا ہے' اور اس محکمہ قضا کا تو بنیادی مقصد ہی قیامِ عدل ہے۔ پھر اس کو حکومت سے علیحدہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ثقل اوّل میں متعدد آیات عدل کے بیان میں موجود ہیں۔ اور خود حضرت رسولِ خداؐ نے اپنے دورِ پاک میں اس محکمہ عدالت کو انتظامیہ سے الگ نہ فرمایا۔ بلکہ آپ خود اس کی نگرانی فرماتے تھے اور خود خداوند تعالیٰ نے آپ کو یہ محکمہ انتظامیہ کے ساتھ ساتھ سپرد فرمایا تھا۔ جیسا کہ سورۃ النساء ۵۹ میں ہے :" اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبانِ امر ہیں۔ پھر اگر کسی امر میں تم تنازعہ کرو تو اس امر کو اللہ اور رسولؐ کے حوالے کر دو۔ اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور زیادہ اچھی تاویل ہے ۔"

پھر اسی سورۃ کی آیت ۶۵ میں ارشاد ہے۔

"پس نہیں ہوں گے آپؐ کے رب کی قسم (لوگ) نہیں ایمان والے ہوں گے جب تک وہ اپنے باہمی جھگڑوں میں آپؐ کو حَکَم نہ تسلیم کریں (پھر یہ بھی ضروری ہے کہ) آپؐ جو فیصلہ کریں اس سے اپنے دلوں میں تنگی محسوس کئے بغیر اسے پوری طرح (دل سے) تسلیم کر لیں ۔"

چنانچہ ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ نے منصب قضا حضورؐ ہی کو سپرد کیا حالانکہ سربراہِ انتظامیہ بھی آپؐ ہی تھے۔ اسی کے مطابق آپؐ خود اس محکمہ کی نگرانی فرماتے اور صرف ان لوگوں کو یہ عہدہ سونپتے تھے جو تقویٰ اور عدل سے آراستہ

ہوتے اور اسلامی قوانین پر اجتہادی نظر رکھتے تھے۔ جناب رسولِ خدا نے حضرت علی علیہ السّلام کو منصبِ قضا سونپا اور زمانۂ رسولؐ میں آپؑ نے اپنی انصاف پروری معاملہ فہمی اور نکتہ شناسی کا سکّہ دلوں پر بٹھا دیا تھا بلکہ اور کی حکومتیں بھی قضا کے سلسلے میں آپؑ کی مدد کی محتاج رہیں۔ چنانچہ حضرت عمر کا قول ہے۔

"میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ایسے وقت سے کہ کسی مشکل میں پڑوں اور علیؑ میری مشکل حل کرنے کے لئے موجود نہ ہوں۔"

حضرت امیرالمومنینؑ نے اپنے دورِ حکومت میں قضایا کو خاص اہمیت دی اور سنّتِ رسولؐ کے مطابق عمل کیا۔ ہر مرکزی مقام پر قاضی مقرر کئے۔ ایسے لوگوں کو منصبِ قضا پر فائز کیا جو اسلام کے مقررّہ معیار پر پورے اترتے تھے۔ چونکہ قضایا کا آپ کو عملی تجربہ دورِ سرکارِ رسالتؐ ہی سے تھا۔ لہٰذا قضایا کے انتظام کو عین اسلامی خطوط پر استوار فرمایا اور اس نہج پر ترتیب دیا کہ رشوت، سفارش اور جانب داری سے بالکل پاک انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔ قاضیوں کے معقول وظیفے مقرر کئے تاکہ انہیں معاشی پریشانی نہ رہے اور غلط راہوں پر گامزن نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ہی آپؑ ہمیشہ قاضیوں کی مالی حالت اور معیارِ زندگی پر کڑی نگاہ رکھتے۔ ان کی املاک و جائیداد پر نظر رکھتے اور شبہ کی صورت میں بازپرس کرنے کے علاوہ بوقتِ ضرورت تنبیہ و سرزنش اور اگر صورتِ حال سنگین ہوتی تو برطرف کرنے سے بھی دریغ نہ فرماتے تھے۔

چنانچہ شریح ابنِ حارث حضرت عمر کے زمانے سے کوفہ کا قاضی چلا آرہا تھا۔ حضرت علیؑ کو معلوم ہوا کہ اس نے ۸۰ دینار میں ایک مکان خریدا ہے۔ آپؑ نے اُسے طلب فرمایا اور اس سے پوچھا۔ اس نے اقرار کیا۔ حضرت نے غصّہ میں فرمایا "اے شریح ایسا تو نہیں ہے کہ تم نے اس گھر کو دوسرے کے مال سے خریدا ہو؟ یا حرام کی کمائی سے قیمت ادا کی ہو؟ اگر ایسا ہے تو تم نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی۔"

اسلامی عدل کا تقاضا یہ ہے کہ سماعت کے دوران فریقین سے یکساں طرزِ عمل

اختیار کیا جائے۔ دعویٰ اور جواب دعویٰ پر برابر توجہ دی جائے۔ قاضی کو چاہیئے کہ ہر دو فریقین سے مساوی سلوک کرے۔ امیرالمومنینؑ کا یہ مستقل کردار تھا کہ وہ انصاف کے معاملے میں فریقین میں (خواہ کوئی مسلم ہو یا غیر مسلم) ادنیٰ تمیز کے بھی روادار نہ ہوتے تھے۔ اور یہی عمل وہ دوسرے قاضیوں کا دیکھنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ واقعہ ہے کہ خود حضرت امیرالمومنینؑ ایک ذمّی کے ساتھ فریق مقدمہ کی حیثیت سے قاضی شریح کی عدالت میں آئے۔ قاضی نے کھڑے ہو کر آپ کا استقبال کیا۔ حضرت نے فوراً فرمایا۔ "یہ تمہاری پہلی ناانصافی ہے۔"

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص آپ کے ہاں مہمان ٹھہرا اور اسی مہمانی کے دوران اس نے آپ کی عدالت میں کسی کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ آپؑ نے اس شخص سے نرمی سے فرمایا کہ "تم فریق مقدمہ ہو اور پیغمبرؐ کا ارشاد ہے کہ یہ امر تقاضائے انصاف کے خلاف ہے کہ فریقین مقدمہ میں سے ایک کو مہمان ٹھہرایا جائے اور دوسرے کو مہمان نہ کیا جائے۔ لہٰذا تم میرے ہاں سے رخصت ہو جاؤ۔"

حضرت عمر کے دورِ حکومت کا واقعہ ہے کہ جناب امیر علیہ السّلام ایک مقدمے کے سلسلے میں اُن کے ہاں گئے۔ حضرت عمر نے آپ کو کنیت سے یعنی "یا ابا الحسنؑ" کہہ کر مخاطب کیا اور آپؑ کے حریف کو اس کے نام سے پکارا۔ اس پر حضرت امیرؑ کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے۔ حضرت عمر نے وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا۔ "عدل کا تقاضہ یہ تھا کہ فریقین مقدمہ کے طرزِ تخاطب میں بھی یکسانیت رہتی۔ ایک کو نام سے اور دوسرے کو کنیّت سے مخاطب کرنا تقاضائے عدل کے خلاف ہے۔"

ان واقعات کو اور ایسے کئی مقدمات کو دیکھنے کے بعد اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت علیؑ کی نگاہیں عدل کے جملہ پہلوؤں پر رہتی تھیں اور ان کی باریک بین نگاہوں سے کوئی بھی گوشہ اوجھل نہ رہ سکتا تھا۔

جن ملکوں میں حکومتوں کے نظام ناقص ہیں اُن میں اکثر حلقے عدلیہ کو

انتظامیہ کے دباؤ سے الگ رکھنے کے حامی ہیں۔ تاکہ عدلیہ صرف حکومت کے مقاصد کی پشت پناہی نہ کرے کہ عوامی مفاد کا تحفظ باقی نہ رہے۔ جب ایسا نظام رائج ہو تو انتظامیہ و عدلیہ کو الگ کر دینا کوئی معیوب نظر نہیں آتا کیونکہ عدلیہ قانون کی ترجمان ہے اور قانون کی بالادستی عوام تک محدود نہیں بلکہ جو حکومت آئین کی پابند ہو وہ بھی اس کے آگے جھکنے پر مجبور ہے۔ مگر اس کے یہ معنی قطعی نہیں ہیں کہ عدلیہ کو اتنا آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اس کے غلط و صحیح فیصلوں کی جانچ پڑتال نہ کی جائے اور اس محکمہ کی کوئی روک ٹوک نہ کی جائے۔

اسی لئے اسلامی حکومت کے دستور میں حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عدالتی فیصلوں سے باخبر رہے اور ان کے حسن و قبح سے واقف ہو۔ غلط فیصلوں کو کالعدم قرار دے۔ اسی لئے جناب امیرالمومنینؑ نے قاضیوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی کہ اہم امور کے فیصلے ان کے علم میں لائے بغیر صادر نہ کئے جائیں۔ چنانچہ آپؑ کی ہدایت تھی کہ :-

"خبردار! قصاص یا حدودِ الٰہی میں سے کسی حد کا اجراء اور مسلمانوں کے حقوق میں سے کسی حق کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک وہ فیصلہ میرے سامنے پیش نہ کر دو۔"

البتہ جہاں تک عمومی فیصلوں میں آزادی اور انسانی مساوات کا تعلق ہے تو حضرتؑ اس کے سب سے بڑے حامی تھے۔ آپؑ عدل کے اقتضا اور قانون کی بالادستی کے مقابلے میں کسی کی برتری کے قائل نہ تھے۔ نہ ہی ترجیحی سلوک کے روادار تھے۔ حتیٰ کہ خود اپنی ذات کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ سمجھتے تھے جیسا کہ یہ واقعہ شاہد ہے کہ صفین سے پلٹتے ہوئے آپؑ کی زرہ گم ہو گئی۔ چند دنوں کے بعد ایک عیسائی کو وہی زرہ پہنے دیکھا تو اس سے پوچھا کہ تم نے یہ زرہ کہاں سے لی ہے؟ یہ زرہ میری ہے۔ نصرانی نے اپنی ملکیت ظاہر کی۔ حضرتؑ نے قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ قاضی کے دریافت کرنے پر نصرانی

نے کہاکہ یہ زرہ میری ہے ۔ اور میرا قبضہ دلیلِ ملکیت ہے ۔ شریح نے امیرالمومنین سے پوچھاکہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ زرہ آپ کی ہے ؟ آپ نے جواب دیاکہ یہ زرہ میری ہے کہ میں نے نہ تو اسے بیچا ہے اور نہ ہی ہبہ کیا ہے۔ شریح نے سوچاکہ ایک طرف یہ احتمال بھی نہیں ہے کہ غلط دعویٰ کیا ہو اور دوسری طرف شرعی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ قبضہ کو دلیلِ ملکیت سمجھا جائے تاوقتیکہ اس کے خلاف ثبوت مہیّا نہ کیا جائے ۔ قاضی کو آپؑ کے خلاف فیصلہ دینے میں تردّد ہوا۔ حضرتؑ نے اسے متردّد پایا تو فرمایا کہ وہی فیصلہ دو جو منصبِ قضا کا تقاضا ہے۔ چنانچہ فیصلہ حضرت کے خلاف ہوا اور زرہ نصرانی ہی کے پاس رہی۔

اس فیصلے کا تجزیہ کیا جائے تو عدل کے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جو حضرتؑ کی انصاف پسندی کا روشن ثبوت ہیں۔ سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت سے آپ خود بھی اس کا فیصلہ کر سکتے تھے اور وہ فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوتا۔ لیکن آپؑ نے یہ پسند نہ کیاکہ مدعی اپنا فیصلہ خود کرے ۔ اس لئے اس کا فیصلہ قاضی کے سپرد کیا اور قاضی سے یہ کہنے کی بجائے کہ اس نے چوری کی ہے یا چور سے خریدی ہے یہ فرمایاکہ میں نے اس کے ہاتھ بیچی ہے نہ ہبہ کی ہے ۔ اگرچہ مقصد یہی تھاکہ یہ سرقے کا مرتکب ہوا ہے کیونکہ جب بیچی بھی نہیں گئی اور ہبہ بھی نہیں کی گئی تو پھر چوری کے ذریعے ہی اس تک پہنچ سکتی ہے۔ لیکن سبحان اللہ۔ احتیاط ملاحظہ کیجئے کہ اگر حضرتؑ چوری کی نسبت دیتے تو خلافِ واقعہ نہ ہوتا مگر آپؑ نے اسے چور کہہ کر جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائی اور نہ اس کے وقار کو مجروح کرنا چاہا۔ اس لئے کہ آپؑ کی نظروں میں ایک زرہ کے مقابلے میں انسانی اقدار کا تحفّظ زیادہ عزیز تھا۔ اگرچہ فیصلہ آپ کے خلاف ہوا اور مقدمہ ہار گئے مگر حقیقتاً یہ حضرتؑ کی اخلاقی جیت تھی۔ جس کا ردِّعمل یہ ہوا کہ اس عیسائی کو جیت کے باوجود اپنی شکست کا احساس ہوا۔ اس کا ضمیر جاگا۔ جب عدالت گاہ سے باہر نکلا تو حضرت سے آنکھ نہ ملا سکا۔ دبے لہجے میں معذرت کرتے ہوئے کہاکہ یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔

میں نے صفین کے راستے سے اسے اٹھایا تھا۔ اب یہ زرہ حاضر ہے اور میں آپ کی بلند نفسی، عالی ظرفی اور عدل پسندی کو دیکھ کر اسلام قبول کرتا ہوں۔ حضرت علیؑ زرہ کی واپسی پر تو کیا خوش ہوتے البتہ اس کے اسلام لانے پر خوش ہوئے اور وہ زرہ اسے ہبہ کر دی اور اس کے ساتھ ایک گھوڑا بھی مرحمت فرمایا۔

چنانچہ مندرجہ بالا مثالوں سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ عدل کا مقام اسلامی حکومت میں کیا ہے؟ اور اسی اہمیت کے باعث اسلامی دستور میں عدلیہ انتظامیہ سے علیحدہ نہیں۔ اسے آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا کہ جو مرضی فیصلے کرتا پھرے انصاف میں ہر امیر، غریب، ادنیٰ و اعلیٰ مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ اور اسلام سب کو عدل و انصاف کی ضمانت دیتا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے اب ہم چند مثالیں تحریر کرتے ہیں کہ خلیفہ اسلامیہ نے کیسے کیسے منصفانہ فیصلے کئے جو اپنی مثال آپ ہیں کہ جن سے حضرت علیؑ کے علم قضایا پر مزید روشنی پڑے اور معلوم ہو کہ اللہ کے نمائندے جناب علیؑ مرتضیٰ نے کیسے کیسے پیچیدہ مقدمات کے کتنے منصفانہ فیصلے کئے۔

آقا و غلام

حضرت امام جعفر صادقؑ روایت کرتے ہیں کہ جناب امیرؑ کے دورِ حکومت و خلافت میں ایک شخص اپنے غلام کے ساتھ بیت اللہ کی زیارت کو گیا۔ دورانِ سفر کسی بات پر اس نے اپنے غلام کو سزا دی۔ جس پر وہ سرکشی پر آمادہ ہو گیا اور اس نے غلامی سے انکار کر دیا اور اپنے آقا سے کہا کہ میں آقا ہوں اور تم غلام۔ دونوں کے درمیان یہ جھگڑا برابر جاری رہا۔ دونوں شہر کوفہ میں وارد ہوئے۔ آقا نے غلام سے کہا کہ اے خدا کے دشمن آؤ امیر المومنین کے پاس چلیں۔ وہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے۔ دونوں حضرت امیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آقا نے کہا یا حضرتؑ! یہ میرا غلام ہے۔ اسے میں نے سزا دی تو اس نے میری غلامی سے انکار کر دیا۔ غلام نے فوراً قسم کھائی کہ میں اس کا غلام نہیں بلکہ یہ میرا غلام ہے۔ میرے باپ نے اسے

میرے ساتھ حج کے سفر کے لئے روانہ کیا تھا۔ تاکہ یہ مجھے مناسک حج تعلیم کرے مگر اب یہ میرے مال پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ اور خود آقا بن بیٹھا ہے۔ آقا غلام کا یہ جھوٹ سن کر حیران رہ گیا اور قسم کھائی کہ یا حضرت بخدا یہ جھوٹا ہے۔ حضرتؑ نے دونوں کو فرمایا کہ گھر چلے جاؤ۔ کل میرے پاس آنا اور صحیح بات بتانا۔ لوگوں نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ آج ایسا مقدمہ پیش ہوا ہے جو کبھی اس سے قبل پیش نہیں ہوا۔ دیکھیں علیؑ ابن ابی طالب کیونکر فیصلہ کرتے ہیں۔ دوسرے روز صبح دونوں آقا اور غلام حضرت امیرؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور گزشتہ روز والے بیان کا اعادہ کیا۔ حضرتؑ نے قنبرؓ کو حکم دیا کہ دیوار میں دو سوراخ کر دو جن میں آسانی سے سر داخل ہوسکیں۔ قنبرؓ نے دیوار میں دو سوراخ بنا دیئے۔ حضرتؑ نے قنبرؓ سے فرمایا میری تلوار تھام لو۔ آپؑ نے قنبرؓ کو پہلے ہی یہ ہدایت کر دی تھی کہ جب میں کہوں غلام کی گردن اڑا دو تو خبردار نہ مارنا۔ صرف ڈرانے کے لئے میں ایسا کہوں گا۔ چنانچہ غلام و آقا دونوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے سر سوراخوں میں داخل کر دیں۔ جب دونوں نے اپنے اپنے سر سوراخوں میں ڈال دیئے تب جلدی سے آپؑ نے قنبرؓ کو کہا۔ "قنبر! غلام کا سر قلم کر دو۔" ان میں سے غلام نے جیسے ہی یہ الفاظ سُنے فوراً اپنا سر سوراخ سے باہر کھینچا۔ اس وقت آپ نے اس (غلام) سے فرمایا "تو کہتا تھا کہ میں غلام نہیں ہوں۔" اس (غلام) نے عرض کی۔ "حضرتؑ کیا کرتا اس نے مجھ پر بہت سختی کی تھی۔ اس لئے میں نے اس کی غلامی سے انکار کر دیا۔" آپؑ نے غلام کی تادیب کی اور آقا کے سپرد کر دیا اور فرمایا "اگر آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو تمہارا ہاتھ کاٹ دوں گا۔"

ماں بیٹا

حضرت عمر کے دور کا واقعہ ہے کہ ان کے ہاں ایک عورت اور ایک لڑکا پیش کیا گیا۔ لڑکا کہتا تھا کہ یہ میری ماں ہے۔ اسی نے میری پرورش کی ہے اور اب یہ میری ماں ہونے سے انکار کر رہی ہے اور مجھے گھر سے نکال رہی ہے اور کہتی ہے کہ میں تجھے جانتی ہی نہیں۔ ادھر عورت نے اپنے

چار بھائیوں کے ساتھ آئی اور اس کے بھائیوں نے قسموں کے ساتھ گواہی دی کہ یہ لڑکا جھوٹ بولتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہماری بہن کو رسوا کرے کیونکہ یہ ابھی تک پاکیزہ ہے۔ حضرت عمر نے اس لڑکے پر حد جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ حضرت علیؑ اس وقت موجود تھے۔ جب لڑکے کی نگاہ آپ پر پڑی تو فوراً پکار اٹھا۔ "یا حضرتؑ! میری مدد فرمائیے۔ اور میرے اور میری ماں کے درمیان انصاف فرمائیے۔" حضرت علیؑ نے عورت کے بھائیوں سے کہا کہ تمہاری بہن کے بارے میں جو فیصلہ میں کروں گا اُسے مان لوگے؟ انہوں نے اقرار کیا۔ آپ نے فرمایا: "اس معاملہ میں خداوند کریم اور حاضرین کو گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں نے اس عورت کی تزویج اس لڑکے سے چار صد درہم مہر پر کر دی۔ یہ رقم مہر میں خود ادا کروں گا۔ آپؑ نے غلام کو رقم لانے کا حکم دیا۔ یہ فیصلہ سن کر عورت چلائی۔ الامان، الامان یا علیؑ۔ کیا بیٹے سے ماں کا نکاح بھی ہو سکتا ہے؟ بخدا یہ میرا فرزند ہے۔ میرے بھائی اس کے باپ کے مال پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس لڑکے کی ماں ہونے سے انکار کر دوں۔ میں نے بھائیوں کے خوف سے ایسا کیا ہے۔ حضرتؑ نے دونوں کو رخصت کر دیا اور حضرت عمر نے کہا کہ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔"

بیڑی کا وزن

حضرت عمر ہی کے زمانے کا ذکر ہے کہ دو اشخاص نے ایک غلام کو بیڑی پہنے دیکھا اور بیڑی کے وزن پر شرط باندھی۔ ایک نے کہا اگر بیڑی کا وزن اتنا نہ ہو تو میری بیوی کو طلاق۔ دونوں نے غلام کے آقا سے کہا کہ غلام کے پیر سے بیڑی نکال دے تاکہ ہم اس کا وزن کر لیں لیکن آقا نے انکار کر دیا۔ دونوں خلیفۂ وقت کے دربار میں پیش ہوئے۔ اور وہاں سے فتویٰ ملا کہ تم دونوں اپنی اپنی بیویوں سے الگ ہو جاؤ۔ پھر یہی معاملہ حضرتِ امیرؑ کے ہاں پیش ہوا۔ آپؑ نے فرمایا ایک پانی کا بڑا سا برتن لایا جائے۔ جب پانی کا ظرف آگیا تو حضرتؑ نے غلام کو حکم دیا کہ اس میں پیر رکھے پھر اس برتن میں پانی ڈالتے گئے۔ جب بیڑی اور پاؤں دونوں پانی میں ڈوب گئے تو جہاں تک پانی پہنچا

وہاں نشان کر دیا۔ پھر بیٹری کو پانی سے نکال لیا گیا تو پانی نیچا ہوگیا۔ اب لوہے کا برادہ پانی میں ڈالا گیا جب نشان تک پہنچ گیا تو آپؑ نے فرمایا۔ جتنا اس لوہے کے برادے کا وزن ہے اتنا ہی بیٹری کا وزن ہے۔

ہم نے جو کچھ سیاسیات اور قضایا کے بارے میں گوش گذار کرنا تھا کر چکے۔ اور ناظرین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی کہ سیاست الٰہیہ کا اصل مفہوم کیا ہے۔ نیز آج کل جو سیاست "اسلامی نظام" کے لبادے میں پیش کی جاتی ہے۔ اس کا حقیقی اسلامی سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس جرأت میں ہم نے کوئی پہلا قدم نہیں اٹھایا ہے بلکہ اکثر مفکرین اسلام نے اس کی نقاب کشائی کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن چند پابندیوں کی بناپر وہ ایسی بے باکی اختیار نہ کر سکے کہ ان کا موقف عام فہم ہو جاتا۔ حالیہ دور میں "دو مفکر" اس سلسلے میں لائق تحسین و آفرین ہیں کہ انہوں نے اپنے اردگرد کے حالات کے سنگینی و ناسازگاری سے بے خوف ہو کر اس جرأت کا مظاہرہ کیا اور اظہارِ حق کر دیا۔ ان دونوں زعما کا تخیّل بلاشبہ نہایت زبردست ہے۔ ان کے اسمائے گرامی جناب علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی مرحوم اور جناب ابو الاعلیٰ مودودی ہیں۔ علامہ مشرقی کی کتاب "تذکرہ" قابلِ تعریف ہے۔ جس میں کم سے کم انہوں نے اپنے آبائی مذہب کے اصول و عقائد سے نکلنے والے منطقی نتائج کے اظہار میں بہت دلیری سے کام لیا ہے۔ اور برملا یہ اقرار کر لیا ہے کہ "ہمارے آباؤ اجداد و بزرگانِ دین کا طرزِ عمل کچھ اور بتاتا ہے۔ جبکہ قرآن کچھ اور کہتا ہے۔" لہٰذا انہوں نے محسوس کر لیا کہ اسلاف نے دولت حکومت اور وجاہتِ دنیوی حاصل کرنے کے لئے دین کو الگ کر لیا ۔ احکامِ رسولؐ کی پرواہ نہ کی۔ یہ بے باکانہ جرأتِ جلی علامہ صاحب ہی کا کام تھا۔

دوسرے بزرگ مودودی صاحب ہیں۔ وہ کچھ جھجک محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ مدّعا ان کا بھی یہی ہے لیکن اظہارِ برملا کی وہ جرأت نہیں رکھتے جو علامہ مشرقی نے کی۔ لیکن ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ جو کچھ مودودی صاحب نے کہا ہے وہ اب تک اس کی قیمت ادا کر رہے ہیں اور ہر طرف سے ان پر دباؤ بڑھ رہا ہے۔ بہرحال

انہوں نے اپنی کتاب "تجدید و احیائے دین" میں یہ رائے قائم کی ہے کہ

" جاہلیت یعنی کفر کو اسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو حکومتِ اسلامی کی تیز رفتار وسعت[1] اور دوسرے حضرت عثمان کا ان خصوصیات کا حامل نہ ہونا جو حضرات شیخین کو عطا ہوئی تھیں[2]۔ اگرچہ حضرت عثمان[3] و علیؑ نے جاہلیت کے اس حملہ کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ رُکا اور آخر کار حضرت علیؑ کے بعد خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہوگیا۔ اور ملک عضوض (یعنی TYRANT KINGDOM) نے اس کی جگہ لے لی۔ اس طرح حکومت کی اساس اسلام کی بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہوگئی۔ اور آخر دم تک اسی پر قائم رہی۔"

آگے چل کر مودودی صاحب لکھتے ہیں " تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدّد کامل پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ ان کے بعد جتنے مجدّد پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبہ یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجدّد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا لیڈر پیدا ہو خواہ وہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزار گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی کا نام " الامام المهدی " ہے جس کے بارے میں صاف پیشین گوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں۔ (تجدید و احیائے دین۔ ابوالاعلیٰ مودودی صد۳۱)

یہاں یہ امر نہایت قابلِ غور ہے کہ لوگ اپنے ووٹوں سے اگر اپنے کسی نمائندے کو "امام مہدیؑ" بنانا چاہیں تو ہرگز نہیں بنا سکتے۔ پس معلوم ہوا کہ جن " الامام المهدیؑ "

---

[1] یعنی کثرتِ فتوحات (مصنّف)

[2] پھر حضرت عثمان نے سیرت شیخین پر چلنے کا وعدہ کیوں کیا تھا؟ (مصنّف)

[3] حضرت عثمان کی ایسی کوششیں ثابت نہیں۔ (مصنّف)

کا تمام مسلمان انتظار کر رہے ہیں۔ وہ لوگوں کے بنائے ہوئے عوامی نمائندہ نہیں ہیں بلکہ اللہ ہی کے بنائے ہوئے نمائندہ الٰہی ہیں۔ اور آپؑ کے متعلق کتب حدیث میں ارشادِ رسولؐ موجود ہے کہ "وہ زمین کو عدل سے اسی طرح بھر دیں گے جس طرح پہلے ظلم سے بھر چکی ہوگی"۔ پس ثابت ہوا کہ خلیفہ و امام وہی ہو سکتا ہے جو اللہ کا مقرر کیا ہوا نمائندہ ہو۔ ہر لحاظ سے مکمل اور ہر نقص سے پاک نظامِ عدل وہی نمائندہ الٰہی نافذ کر سکتا ہے۔ یہ غیر معصوم و ناقص العلم افراد کے بس کا کام نہیں ہے۔ اسی وجہ سے تمام امت (مودودی صاحب سمیت) کسی ہادیٔ برحق، نمائندۂ الٰہی کا انتظار کر رہی ہے۔ مکمل اور بالکل صحیح اسلامی حکومت امام مہدیؑ ہی قائم کر سکتے ہیں۔ خیال رہے کہ ہم نے صرف "خلافت و امامت" کے متعلق ثابت کیا ہے کہ اس میں جمہوریت نہیں ہے۔

موجودہ زمانے میں اگر طرزِ اسلامی پر حکومت کرنے کی کسی ملک میں کبھی خواہش ہو تو صرف امام مہدیؑ کے ظہور تک کام چلانے کے لئے قرآن و اہل بیتؑ اطہار کی ہدایات کو مشعلِ راہ بنا کر، معیاریت علم، و جسم کو (نہ کہ دولتوں کو) ملحوظ رکھتے ہوئے عہدے دیئے جائیں، اسلامی نظام میں معاشیات اور فقۂ اہل بیتؑ کے احکام نافذ کئے جائیں تو کچھ کام چل سکتا ہے۔ اور مسلم قوم ترقی کر سکتی ہے۔

جناب مودودی صاحب کا غور و فکر کتنے صحیح نتیجے پر پہنچا ہے۔ جو کچھ کمی رہ گئی ہے وہ شخص آبائی عقیدے کا اثر ہے۔ بہرکیف ہماری بحث تو یہ ہے کہ جناب رسولِ خداؐ نے جو نظام تعلیم فرمایا وہ بالکل مکمل اور جامع ہے۔ اور اس میں ایک نقطے کی بھی رد و بدل کی گنجائش نہیں کیونکہ ایسا کر لینے سے دین کے مکمل اور الہامی ہونے کی نفی ہو گی۔ آپؐ کا نظام ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر حالت میں قابلِ عمل ہے۔ اور اس میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ عقلی اور فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ لیکن وفاتِ رسولؐ کے بعد اس تحریک نے انقلاب پیدا کر دیا جو آنحضرتؐ کی حیات ہی میں ذاتی اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے تھی اور آپؐ کے قائم کردہ نظام کے

خلاف نہ صرف درونِ پردہ بلکہ بعض اوقات ظاہراً بھی سرگرمِ عمل رہتی تھی۔

لیکن جب اس تحریک کو کامیابی ہوئی اور اس کا اقتدار مستحکم ہوتا چلا گیا تو اسلامی وغیر اسلامی اصول اس قدر شیر و شکر ہو گئے کہ امتیاز کرنا دشوار ہو گیا۔ لہٰذا آج بھی اکثر لوگ جو نظام بڑے شدّ و مد سے "اسلامی" کہہ کر پیش کرتے ہیں اگر اس پر تھوڑا غور کر لیا جائے تو اس کشمکش سے نجات مل سکتی ہے اور امراضِ قوم کا علاج بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ علاج تمسک بالثقلین ہی سے نصیب ہو سکتا ہے۔

اب تک جو کچھ ہم نے فصلِ "سیاسیات و قضایا" میں تحریر کیا اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:-

۱۔ سیاست ایک سوشل سائنس ہے اور اس کو شہریت سے گہرا ربط ہے۔

۲۔ علمِ سیاست کا مرکزِ بحث ریاست ہے اور ریاست چار عناصر کا مجموعہ ہے علاقہ، عوام، حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ۔

۳۔ حکومت و اقتدار دو بڑے عناصر ہیں جن پر علمِ سیاست میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۴۔ سیاست میں حکومت کے کئی اقسام ہیں اور انہیں میں سے ماہرین کے نزدیک جمہوریت سب سے بہترین ہے۔

۵۔ باوجودیکہ سیاست میں جمہوریت کو مقامِ اعلیٰ دیا گیا ہے لیکن اس میں متعدد خرابیاں ہیں۔

۶۔ قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ باوجود کثیر التعداد نقائص کے اکثر اہلِ اسلام جمہوریت کو "اسلامی نظام" سمجھتے ہیں۔

۷۔ اسلامی نظام اور جمہوریت دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔

۸۔ دینِ اسلام میں حکومت کا نظام یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ اللہ کا ہے، اور حکومت اللہ کے منتخب نمائندے کی۔

۹۔ ثقلِ اوّل میں موجود متعدد مثالوں سے مذکورہ نظام ثابت ہے۔

۱۰۔ خدائی نمائندہ حکومت کے لئے خدا نے معیارِ اہلیت مقرر کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اللہ کا نمائندہ حکومت ظالم نہ ہوگا۔ وہ عالم ہونے کے ساتھ شجاع بھی ہوگا۔ بعد از ختمی مرتبت اس نمائندے کو خلیفہ کہتے ہیں۔ جسے اللہ نے (جو اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہے) خود مقرر فرمایا ہو۔ اور اس میں عوامی رائے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۱۱۔ جمہوریت میں جو خرابیاں موجود ہیں اسلامی حکومت الٰہیہ کے پاس اُن کا حل موجود ہے۔

۱۲۔ سرکارِ رسولِ مقبولؐ کو خود خدا نے اپنا نمائندہ اور رعایا کا حاکم مقرر فرمایا۔ لہٰذا انہوں نے جو نظام وحی الٰہی سے تعلیم فرمایا وہ ہر لحاظ سے جامع و مکمل ہے اور اُسے عالمگیر حیثیت حاصل ہے۔

۱۳۔ اسلام امن کا علمبردار ہے وہ ہوسِ ملک گیری کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس لئے بلا وجہ بزورِ اسلحہ حدودِ سلطنت کی وسعت اصولِ اسلام میں شامل نہیں ہے۔ لہٰذا ارضی فتوحات کی بجائے قلبی فتوحات کا تقاضا کرتا ہے۔

۱۴۔ اسلامی نظام میں ملک کی دولت عوام کی ہوتی ہے اور ہر ایک اس میں حصّہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے حکومت خزانے میں مال وغیرہ جمع نہیں کرتی۔۔۔۔۔
اسی لئے حضورؐ کے دور میں کوئی بیت المال یعنی خزانہ قائم ہی نہیں کیا گیا بلکہ مال کو عوامی امانت سمجھ کر حضورؐ جلد از جلد اسے حق داروں میں تقسیم فرما دیتے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت میں امپیریلزم کا رجحان جنم نہ لے۔

۱۵۔ پورے اسلام کے نظام کی روح عدل ہے۔ اس لئے اسلامی نظامِ حکومت عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی پسند نہیں کرتا۔ بلکہ حکومت کو انصاف کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

۱۶۔ اسلامی دستورِ حکومت "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" پر مرتب ہے اور تقویٰ اور اتباعِ سنّتِ رسولؐ اس کے دو ستون ہیں۔

۱۷۔ اسلام نے جو دستور پیش کیا ہے اس کی کوئی نظیر ممکن نہیں ہے اور وہ تمام

سیاسی مسائل کا حل ہے۔

۱۸۔ حضرت امیرالمومنین علیؑ، بعداز رسولؐ، اللہ کے مقرر فرمودہ نمائندۂ حکومت ہیں اور ان کی سیاسی زندگی دستور حکومتِ الٰہیہ کا کامل نمونہ ہے۔

۱۹۔ آپؑ نے وفاتِ رسولِ خداؐ کے بعد دوسروں کے ادوارِ حکومت میں سیاست کے ہر پہلو پر عملی تعلیم فرمائی اور حکومت پر انتہائی پُرامن رہتے ہوئے تنقید کرتے رہے۔ تخریبی حربوں سے قطعاً اجتناب کیا۔ اور باوجود صعوبتوں اور مصائب کے آپؑ نے امنِ عامہ میں خلل نہ ڈالا۔ حالانکہ آپؑ کے پاس ایسے تمام ذرائع موجود ہو سکتے تھے جو حکومتِ وقت کے لئے پریشانیاں مہیا کر سکتے تھے۔

۲۰۔ جب آپ نے اقتدار سنبھالا تو سیرتِ شیخین کی پابندی قبول نہ کی اور حکومت کو عین محمدیؐ دستورِ اسلام کے مطابق چلایا۔ آپؑ نے اپنی حکومت کا انتظام کتاب اللہ و سنّتِ رسولؐ کے تحت قائم کیا۔

۲۱۔ حضرت امیر علیہ السّلام نے باوجود گوناگوں مشکلات کے معاشرہ کی تطہیر فرمائی اور رفاہِ عامہ کے امور انجام دیئے۔

۲۲۔ عمّال کے تقرّر دستورِ اسلام کے مقرّر کردہ معیارِ اہلیّت کی بنیاد پر کئے۔

۲۳۔ ناقابلِ اعتماد، نااہل اور سرکش افسران کی سکریننگ کے اور برطرفی کے احکام صادر فرمائے۔

۲۴۔ بنیادی حقوق کی ضمانت دی۔ حقِ حیات کو تحفظ بخشا۔ آزادیٔ فکر و عمل بخش اور معاشرتی مساوات قائم کی۔

۲۵۔ اتباعِ رسولؐ کے مطابق بیت المال کو عوام کی امانت قرار دیا اور حکومت کی ملکیت تسلیم نہ کیا۔ قومی دولت عدل و انصاف سے تقسیم کرتے اور اپنے پرائے کی کوئی تمیز روا نہ رکھتے تھے۔

۲۶۔ نظامِ زکواۃ و خراج و جزیہ کو سنّتِ رسولؐ کے مطابق قائم کیا اور

ظلم کی راہیں بند کر دیں ۔

۲۷۔ تجارتی طبقے کی حوصلہ افزائی فرمائی اور ان کو اکثر و بیشتر ہدایات دیتے رہے۔

۲۸۔ رعایا کے ناداروں اور لاوارثوں کے حقوق کی نگہداشت فرمائی ۔

۲۹۔ غلاموں اور آقاؤں کا فرق مٹانے کی عملی تعلیمات دیں اور کئی غلام آزاد کئے۔

۳۰۔ قیدیوں سے حسنِ سلوک کر کے ان کی مجرمانہ ذہنیت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تعلیم دی ۔

۳۱۔ ذمیّوں سے رحم دلانہ برتاؤ کر کے ان کو حلقہ بگوشِ اسلام کیا۔

۳۲۔ اوقاف و تعمیراتِ خیر کی جانب خصوصی توجہ فرمائی ۔

۳۳۔ اسلامی شریعت کے قوانین نافذ کئے اور معاشرہ کو صحیح خطوط پر لانے کی کوشش فرمائی ۔

۳۴۔ ملکی انتشار کا مقابلہ انتہائی سیاسی تدبّر سے کیا۔

۳۵۔ جنگِ جمل آپؑ پر بلاوجہ تھوپی گئی اور حریف نے اس کی تصدیق کی ۔

۳۶۔ ایک باغی عامل سے جنگِ صفین لڑنا پڑی جس میں معاہدۂ تحکیم کیا ۔

۳۷۔ خوارج نے خود ہی معاہدۂ تحکیم کی حمایت کی اور حضرت کو اسے ماننے پر مجبور کیا ۔ لیکن معاہدہ ہو جانے کے بعد معاہدہ شکنی پر اصرار کرنے لگے ۔ لیکن حضرتؑ نے انکار کر دیا کیونکہ عہد شکنی اسلامی دستور کے خلاف ہے ۔

۳۸۔ گروہ خوارج جو دورِ رسولؐ ہی سے موجود تھا آپ کے خلاف ہو گیا اور انہوں نے ملک کے نظم و نسق اور امن و امان کو منتشر کرنے کی سنگین کارروائیاں کرنا شروع کر دیں ۔ باوجود پند و نصائح کے ان کی تخریبی سرگرمیوں میں روز بروز اضافہ ہوا ۔ لہٰذا جنگِ نہروان میں ان کی کمر توڑنا پڑی ۔

۳۹۔ باغی عاملِ شام نے بصرہ پر جارحیت کی اور حضرت محمدؒ بن ابوبکر کو شہید کرنے کے بعد اس پر قابض ہو گیا۔

۴۰۔ حضرت علیؑ کا مختصر سا دور انتہائی پُرآشوب رہا۔ لیکن آپؑ نے مردانہ وار اور انتہائی تدبر سے حالات کا مقابلہ کیا۔

۴۱۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد لوگوں نے حضرت امام حسنؑ کو خلیفہ تسلیم کر لیا۔

۴۲۔ والئ شام نے حضرت امام حسنؑ کی امن پسندی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کی فوج میں سازشوں کے ذریعے پھوٹ ڈال دی۔

۴۳۔ مجبوراً حضرت امام حسنؑ نے ایک صلح نامہ کے تحت امورِ سلطنت معاویہ کو سونپ دیئے۔

۴۴۔ یہ صلح نامہ سیاسی لحاظ سے بہت اہم تھا کیونکہ اس سے امام حسنؑ کا مقصد پورا ہو جاتا تھا۔

۴۵۔ حاکمِ شام اس عہد پر قائم نہ رہا۔

۴۶۔ شرائطِ صلح سے حضرت امام حسینؑ بھی متفق تھے۔

۴۷۔ چونکہ دنیوی، غیر اسلامی حکومتیں عدل پر خود قائم نہ رہ سکتیں اس لئے انہوں نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر لیا۔

۴۸۔ لیکن اسلامی حکومت عادل ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے دستور میں قضا کی ذمہ داری براہِ راست حکومت پر ہے۔

۴۹۔ حضرت علیؑ نے محکمہ قضا کو اسلامی خطوط پر قائم کیا اور براہِ راست اس کی نگرانی فرمائی۔

۵۰۔ رسولِ کریمؐ نبی ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کے مقرر کردہ حاکم بھی تھے اور آپؐ کا دین مکمل ہے۔ لہٰذا آپؐ کا تعلیم کردہ نظامِ حکومت بھی مکمل ہے اور اس میں ردوبدل کی گنجائش نہیں ہے۔

۵۱۔ لیکن آپؐ کے بعد یہ نظام تبدیل ہو گیا۔ اور ہوتا چلا گیا۔ اب پھر کسی خدائی نمائندۂ حکومت کا انتظار ہے کہ وہ اصلاحِ معاشرہ کرے۔ وہ نمائندے حضرت آخر الزماں مہدی علیہ السلام ہیں جس کی حضورؐ نے پیش گوئی فرمائی ہے۔

۵۰۔ تمام سیاسی مسائل کا واحد علاج صرف حکومتِ الٰہیہ کا نظام سیاست ہی ہے۔

اللہ کی توفیق سے ہماری یہ فصل پوری ہوئی۔ الحمد للہ وشکراً للہ۔
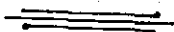
فصل چہارم

علم جغرافیہ وسیارگان

ارشادِ خالقِ کائنات ہے کہ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾ یعنی "بندوں میں سے اللہ کا خوف کرنے والے صرف صاحبانِ علم ہیں۔ بے شک اللہ عزیز اور غفور ہے" سورہ فاطر ۲۸

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اہلِ علم حضرات ہی معرفتِ خدا حاصل کرنے والے اور ڈرنے والے ہیں۔ کیونکہ اگر علم صحیح ہوگا تو یقیناً خوفِ خدا بھی ہوگا۔ خلقتِ انسان کا مقصد یہی ہے کہ خلاقِ کائنات کی پہچان ہو۔ اور یہ پہچان صرف علم ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ پس علم تمام اشیاء سے اعلیٰ ترین شے ہے۔ اور جس قدر کسی شخص کو علم میں فضیلت ہوگی اسی قدر وہ افضل ہوگا۔ مخلوقِ خدا میں حضرتِ رسالتؐ مآب کا علم سب سے افضل و برتر ہے لہٰذا جو بھی شخص ان کی نیابت کا دعویدار ہوگا اسے میدانِ علم میں اس دعوے کو ثابت کرنا پڑے گا۔ اسی لئے آپؐ کے خلیفہ بلا فصل حضرت امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ نے اکثر اپنی علمی فضیلت کو دنیا کے سامنے پیش کیا جبکہ ان کے غیر اس میدان میں اُترہی نہ پائے۔ جناب امیر علیہ السلام نے اعلان فرمایا۔

"لوگو! مجھے کھونے سے پہلے مجھ سے پوچھ لو۔ کہ میں اس زمین کے راستوں سے زیادہ آسمانی راہوں سے واقف ہوں۔ اس سے قبل کہ تغیر زمانہ اور فتنہ اپنے قدم اٹھائے اور جدھر نکیل سمائے ادھر چلا جائے اور قوم کا اسلام لے جائے"۔

حضرت امیرؑ کی یہ تنبیہہ اہلِ اسلام کے لئے جہاں آپؑ کے عالمِ بے بدل ہونے کا ثبوت ہے وہاں یہ پیغام بھی دے رہی ہے کہ میں ہی ہادیٔ برحق

ہوں لہذا میرے علم سے فائدہ اٹھاؤ۔ میں نہ صرف زمین کے علوم سے واقف ہوں بلکہ آسمانی علوم پر بھی دسترس رکھتا ہوں۔ آپؑ نے قبل از وقت اس خطرے سے آگاہ کر دیا کہ اگر تم میرے علم سے فائدہ حاصل نہ کروگے تو زمانہ کے حالات کی تبدیلی تمہیں غلط راہوں پر پھینک دے گی اور تمہارا اسلام جو عقل سلیم ہے وہ بھی محفوظ نہ رہے گا۔ یعنی تم دین سے بے پرواہ ہوکر لادینی راہوں پر چل دوگے۔ چنانچہ آپؑ کا ارشاد سو فیصد درست ثابت ہوا۔ مسلمانوں نے آپؑ کے اس اعلان کو کوئی اہمیت نہ دی اور آپؑ کے علوم وہبی سے استفادہ کرنے کی جانب توجہ نہ کی لہذا غیر مسلموں کے نظریات اور رازموں سے مرعوب مغلوب ہوکر دین سے دور ہونے لگے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ کائنات بھی کتنی عجیب ہے کہ ایک حصّہ میں دن ہوتا ہے تو دوسرے میں رات۔ اس خطہ پر موسم گرما ہے تو دوسرے پر موسم سرما۔ اگر یہاں صحرا ہے تو وہاں سرسبز و شاداب فلک بوس پہاڑ۔ کہیں باد سموم چل رہی ہے اور کہیں باد نسیم۔ اس طرف سمندر میں موجوں کا طوفان ہے اور دوسری جانب عجائبات زمین یا چٹیل میدان۔ غرضیکہ کائنات میں ایک ہی وقت پر یہ اختلاف و تفاوت ساتھ ساتھ جاری ہے۔ ان ہی امور کے اسباب و اثرات وغیرہ پر علم جغرافیہ کے ذریعہ بحث کی جاتی ہے۔

علم جغرافیہ جغرافیہ کو انگریزی زبان میں (GEOGRAPHY) کہتے ہیں یہ لاطینی زبان کے دو الفاظ (GEO) یعنی "زمین" اور (GRAPHY) یعنی لکھا ہوا سے مرکب ہے۔ جس کے عام معنی "زمین کا حال" ہوتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں جغرافیہ اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے زمین کی حرکات، مختلف حصّوں کے حالات یعنی بارش، آب و ہوا، پیداوار، آبادی، ملکی حالات وغیرہ اور ان کے باہمی تعلقات اچھی طرح واضح ہوتے ہیں۔

جغرافیہ کی شاخیں | علم جغرافیہ کی مندرجہ ذیل چار شاخیں ہیں۔
(۱) حسابی جغرافیہ (۲) طبعی جغرافیہ (۳) اقتصادی جغرافیہ (۴) ملکی جغرافیہ۔

حسابی جغرافیہ :۔ اس شاخ کا نام ہے جس سے زمین کی شکل وصورت، اس کی وسعت، سالانہ وروزانہ گردش اور دوسرے ستاروں وسیاروں سے تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔

طبعی جغرافیہ :۔ وہ شاخ ہے جس میں سطح زمین پر ظاہر ہونے والے طبعی یا قدرتی واقعات مثلاً قدرتی تقسیم، آب وہوا، بارش، سمندری رویں اور مدّوجزر وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔

اقتصادی جغرافیہ :۔ اُسے کہتے ہیں جس میں دنیا کے مختلف حصّوں کی پیداوار، تجارت، صنعت وحرفت، آمدورفت کے وسائل اور انسانی پیشوں کی تقسیم پر بحث ہوتی ہے۔

ملکی جغرافیہ :۔ جغرافیہ کی اس شاخ کو کہتے ہیں جس میں ملکوں کے حدود ورقبہ، سطح، آب وہوا، پیداوار، آبادی، طرزِ حکومت اور شہروں کا بیان درج ہوتا ہے۔

ہمارا مدّعا علم جغرافیہ پر تفصیلی بحث کرنا نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصد ثقلین کی ان ہدایات کو پیش کرنا ہے جو علم جغرافیہ کی روح کی حیثیت رکھتی ہیں اور اُن ہدایات میں شاندار سائنسی علوم موجود ہیں۔

ارضِ خداوندی

جغرافیہ دانوں کے مطابق زمین وہ کرہ ہے جو آج سے کئی لاکھ سال قبل دوسرے سیاروں کی طرح سورج کا ہی ایک حصّہ تھا۔ کہتے ہیں کہ سورج اس قدر گرم تھا کہ دھاتیں اور دیگر ٹھوس اجسام اس میں گیس کی حالت میں تھے۔ ماہرین

سے خیال کے مطابق ایک بہت ہی بڑا استارہ سورج سے قریب آیا جس کی کشش کی وجہ سے سورج کا بہت سا مادہ علیحدہ ہوکر چکر لگانے لگا۔ یہ مادہ ٹھنڈا ہوکر مختلف سیاروں کی شکل اختیار کرگیا۔ یہ سیارے سورج کے گرد چکر لگانے لگے چونکہ زمین بھی ایک سیارہ ہے اس لئے یہ بھی اسی طرح بنی۔ یہ زمین تقریباً گول ہے۔ اس کی سطح بے قاعدہ ہے۔ کہیں خشکی ہے اور کہیں سمندر، کہیں اونچے پہاڑ ہیں اور کہیں نشیب۔ اس کرّے کو ہر طرف سے ہوا کے ایک وسیع کرّے نے گھیر رکھا ہے۔ یہ ہوائی کرہ بھی اس کا ایک جزو ہے اور زمین کی روزانہ و سالانہ گردش کے ساتھ ساتھ یہ ہوائی کرہ بھی حرکت کرتا ہے اور نظام قدرت کے مطابق اس میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اس لئے اصطلاحی اعتبار سے زمین چار مختلف ہم مرکز کرّوں کا مرکب ہے۔

(۱) ہوائی کرہ ATOMOSPHERE (۲) آبی کرہ HYDROSPHERE

(۳) قشر الارض LITHOSPHERE (۴) فلزی یا وسطی مرکز RARYSPHERE

تخلیق کائنات اور تعلیم ثقلین

تخلیق کائنات کے سلسلے میں ثقل اول میں ارشاد ہے کہ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىٕعِیْنَ ۞ یعنی پھر اللہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا وہ اس وقت دھواں (گیس) تھا۔ سورۂ حم السجدہ ۱۱

ثقلین اپنے دامن میں دنیائے انسانیت کی اصلاح کے اصول و قوانین لئے ہوئے ہیں اور کائنات کے تمام علوم و حقائق سمیٹے ہوتے ہیں۔ سائنسدان جس حقیقت پر کئی سالوں کی محنت و تجربات اور آلات کے ذریعے پہنچے، قرآن مجید نے اسے ایک ہی جملہ میں بیان کر دیا۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اہل علم کی طرف رجوع نہ کیا۔ موجودہ ماہرین کا یہ نظریہ ہے کہ سیاروں اور ستاروں کی تخلیق سے قبل تمام کائنات میں گیس پھیلی ہوئی تھی۔ یعنی دوسرے الفاظ میں تمام سیارے گیس کے کرّے تھے جو تیزی سے اپنے محور کے گرد گھوم

رہے تھے۔ شروع میں کنارے کی گیس میں انجماد پیدا ہوا جو کہ آہستہ آہستہ کناروں سے مرکز کی طرف بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ان سدیموں کی مرکزی گیس بھی سیاروں میں تبدیل ہوگئی۔ یعنی اس گیس کی باہمی کشش سے اس کہر گیس میں جنبش پیدا ہوئی جس سے موجیں پیدا ہوئیں جس کی بنا پر اس گیس کے ٹکڑے ہو گئے اور ٹکڑے سمٹ کر بادل بن گئے اور ان بادلوں نے کرّوں کی صورت اختیار کر لی اور اپنی جگہ پر حرکت کرنا شروع کر دیا۔ یہ کہکشاں اسی گیس کا نتیجہ ہے۔ مگر یہ گیس کہاں سے آئی؟ اس کے متعلق موجودہ سائنس خاموش ہے۔ لیکن ثقلین اس سوال میں بھی رہبری کرتے ہیں چنانچہ ثقلین کی تعلیم کے مطابق گیسی بخارات سے قبل پانی تھا اور اسی پانی کے سمندر میں تلاطم سے جو بخارات پیدا ہو کر فضا کی طرف بلند ہوتے انہیں سے خداوند عالم نے آسمانوں کو پیدا کیا۔ مذکورہ بالا آیت اسی مفہوم کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس کی پُر معنی وضاحت قائد ثقل دوم حضرت علی علیہ السلام نے ایک خطبہ میں بیان فرمائی جس کا اقتباس ہم نے فصل اوّل "موت کے علاج" کے عنوان کے تحت نقل کیا ہے۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ منقولہ حصّہ بار دیگر ملاحظہ فرمائیں (کتاب ہذا کا صفحہ ۱ دیکھیں)

موجودہ علم جغرافیہ کی وسعت کے حدود صرف اس کرۂ ارضی تک محدود ہیں لیکن ماہرین نے طاقتور دوربینوں سے جو وسعتِ کائنات کا نظارہ کیا ہے اس نے عقلِ انسانی کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ صرف اسی نظامِ شمسی کو ساری کائنات سمجھتے تھے لیکن اسلام نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ اس نظامِ شمسی کے علاوہ بھی کئی نظام شمسی ہیں چنانچہ ثقل اوّل میں ارشادِ خداوندی ہے کہ "تمام تعریف اللہ کی ہے جو تمام عالمین کا پروردگار ہے"؛ چنانچہ سائنس دانوں نے اربوں ستاروں کی تصاویر لی ہیں جن میں ہر ستارہ اپنے مقام پر سورج نظر آتا ہے اور اس کے گرد کئی سیارے نظر آتے ہیں۔ ان

سیاروں کے درمیان فاصلے ہیں۔ ان کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ بعض ستارے سرخ رنگ کے ہیں اور بعض نیلے رنگ کے۔ سرخ ستارے نیلے ستاروں سے بڑے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ نیلے رنگ کے ستارے کی وسعت کا اندازہ یہ ہے کہ ایک نیلے ستارے میں ہمارے سورج جیسے ایک ہزار سورج سما سکتے ہیں اور سرخ ستارے کی وسعت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ اس میں ایک ہزار نیلے ستارے بآسانی سما سکتے ہیں۔ جب ایک ایک ستارے کا یہ عالم ہے تو پھر پوری کائنات کا اندازہ عقلِ انسانی کس طرح لگا سکتی ہے۔ ان حقائق کو جن کا اظہار آج کے ماہرین نے کیا ہے ہمارے رسول مقبولؐ نے آج سے چودہ سو سال قبل یوں بیان فرمایا تھا کہ

"تمہاری زمین کے علاوہ خداوند عالم نے ستر زمینیں سونے (سنہری) کی اور ستر زمینیں چاندی (سفید) کی اور ستر زمینیں مشک (رنگ) کی اور ستر زمینیں ایسی ہیں جن کے رہنے والے فرشتے ہیں۔ ان میں نہ گرمی ہے نہ سردی اور ہر زمین کا طول دس ہزار برس کی مسافت کے برابر ہے پیدا کی ہیں۔"

جن سرخ اور نیلے رنگ کے ستاروں کا دوربینوں کے ذریعے سے انکشاف ہوا ہے وہ ہماری اس زمین سے اتنی دوری پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی کو ہماری زمین تک پہنچنے کے لئے کئی سال درکار ہیں۔ ہماری زمین سے قریب ترین ستارے کی روشنی ہماری زمین تک ساڑھے چار ہزار سال نوری میں پہنچتی ہے جبکہ روشنی کی رفتار ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کے قریب ہے۔ اگر آج یہ ستارہ تباہ ہو جاتے تو پھر بھی ساڑھے چار ہزار سال تک ہمیں برابر نظر آتا رہے گا اور بعض ستارے تو ایسے بھی ہیں جن کی روشنی کروڑوں سال بعد ہم تک پہنچتی ہے۔ اس وسیع کائنات میں اتنی دوری پر واقع تمام ستارے جس نظام سے منسلک ہیں وہ کہکشاں اور سدیم کہلاتے ہیں۔ کائنات میں ہزاروں سدیم اور کہکشائیں یعنی مجموعہ ہائے نجوم ہیں اور ہر

کہکشاں اور سدیم کے حلقے و دائرے ہیں کئی سورج اپنے نظام ہائے شمسی کے ساتھ موجود ہیں ایک کہکشاں جس کے حلقے اور دائرے میں کئی سورج ہیں اس کی شکل قندیل کی طرح ہے یعنی ہر کہکشاں اپنے سورجوں کے ساتھ قندیل کی صورت کا نظارہ پیش کرتی ہے اس ہی مفہوم کی طرف حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اشارہ فرمایا ہے کہ "یقیناً اللہ نے ایک لاکھ نورانی قندیلیں خلق کی ہیں جنہیں (وسیع کائنات میں) خداوند عالم نے معلق فرمادیا ہے۔ عرش، تمام آسمان۔ زمین اور ان میں جو کچھ ہے یہاں تک کہ جہنم و جنت تمام ایک قندیل کے دائرے و حلقے میں واقع ہیں اور باقی قندیلوں میں جو کچھ ہے اسے سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔"

اتنی وسیع اور عظیم کائنات اور لاکھوں نظام ہائے شمسی کے تصور کے بعد اللہ کی ربوبیت اور رسولؐ کی حکومت کا تصور کتنا وسیع وعظیم ہے اتنے بڑے تصور کو خدا نے قرآن میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ سورۃ الفاتحہ یعنی تمام (شایانِ شان) تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام عالموں (دنیاؤں) کا پروردگار (پرورش فرمانے والا۔ پالنہار) ہے۔ اور اپنے عظیم ترین رسولؐ کی بابت فرمایا کہ

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ سورۃ انبیاء ۱۰۷ اور (اے رسول اعظمؐ!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں (یعنی تمام کائنات) کے لئے رحمت کی حیثیت میں بھیجا ہے۔"

اس وسعت کائنات جس کا کچھ تصور آج کی سائنسی ایجادات کے ذریعہ ہوا ہے آج سے قریباً چودہ سو برس قبل ثقل اوّل اور ثقل دوم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا اور خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد مشاہدہ پر رکھی۔ چنانچہ سرور کائناتؐ نے اپنے معراج کا حال بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

معراج النبیؐ

"میں نے ساتویں آسمان میں تمہاری زمین کے میدانوں کی طرح میدان دیکھے اور فرشتوں کو گروہ در گروہ دیکھا۔ جو دوسرے

گروہ کی پرواہ کئے بغیر محو پرواز تھے۔ میں نے جبرائیلؑ سے کہا یہ کون ہیں؟ جبرائیلؑ نے کہا مجھے معلوم نہیں ہے۔ میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہیں؟ جبرائیل نے کہا مجھے پتہ نہیں۔ میں نے جبرائیل سے کہا ان سے دریافت کرو۔ جبرائیل نے کہا مجھے ان سے پوچھنے کی جرأت بھی نہیں ہے۔ آپؐ حبیب اللہ ہیں لہذا خود ہی دریافت فرمایئے۔ پھر میں نے ایک فرشتے سے کہا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے جواباً کہا کہ میرا نام کیکائل ہے۔ میں نے پوچھا تم کہاں سے آ رہے ہو؟ اس نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میں یہ بھی نہیں جانتا۔ میں نے کہا تم کتنے عرصے سے محو پرواز ہو۔ کہا اے حبیبؐ خدا! مجھے اس کا بھی علم نہیں ہے لیکن اتنا جانتا ہوں کہ خداوند عالم ایک ہزار سال بعد ایک ستارہ ظاہر فرماتا ہے اور میں ایسے چھ ہزار ستارے دیکھ چکا ہوں۔"

رسول مقبولؐ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کس قدر وسیع ہے۔

زمین کی شکل و صورت و ساخت

حضرت مسیح علیہ السلام سے چھ سو سال قبل تک لوگوں کا خیال تھا کہ زمین چپٹی ہے لیکن اب اس بات پر اتفاق ہے کہ زمین گول ہے مگر قطبین پر محوری گردش کے سبب قدرے پچک گئی ہے۔ چونکہ قبل از اسلام لوگوں نے زمین کی شکل و صورت پر اتفاق کر لیا تھا اور اب تک وہی نظریہ ہے لہذا اس بارے میں مزید کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے اور اس کی ساخت کے بارے میں ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ پانی سے جو گیس پیدا ہوئی اور سورج کے اردگرد چکر کاٹتی رہی وہی ٹھنڈی ہو کر زمین بن گئی۔

البتہ نقل اوّل میں ہے کہ "وہی تو (خدا) ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم بنایا۔ تاکہ تم اس کے اطراف و جوانب میں چلو پھرو اور اس کی روزی کھاؤ۔ اور پھر

اس (اللہ) کی طرف قبر سے اٹھ جانا ہے۔ کیا تم اس کی ذات سے جو آسمانوں میں بھی حکومت کرتا ہے اس بات سے بے خوف ہو کہ تمہیں زمین میں دھنسا دے تو پھر تمہیں الٹ پلٹ کر رکھ دے" (سورۃ الملک)

اگر ہم زمین کی ساخت پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ تو پتھر کی طرح سخت بنائی گئی ہے کہ اس پر کوئی چیز اگ نہ سکے، چشمے نہ نکل سکیں، مکان نہ بن سکیں اور نہ ہی اتنا نرم بنایا گیا ہے کہ اس پر چلنا پھرنا اور رہنا سہنا مشکل ہو۔ نہ ہی اسے شیشے کی طرح شفاف بنایا گیا ہے کہ جس میں سورج کی شعاعیں اتنا اثر کر سکیں کہ نباتات جل جائیں۔ اور نہ ہی زمین کو مضطرب و بے چین بنایا کہ جانداروں کی زندگی دشوار ہو جائے بلکہ ایسی آرام دہ بنائی جیسے شیر خوار بچے کے لئے جھولا آرام دہ ہوتا ہے۔ اضطراب و بے چینی سے محفوظ رکھنے کے لئے اور اس کی حرکت کو مفید حد تک رکھنے کے لئے پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے ہیں کہ کہیں وہ تمہیں لے کر جھک نہ جائے۔ چنانچہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ" پہاڑوں کا ظاہری وجود حفاظت کے لئے ہے اور ان کے اندر خزانہ ہے"۔ نقل دوم کے دسویں ہادی حضرت امام علیؑ نقی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے پہاڑوں کے بطن میں سونا، چاندی، جواہرات اور ایسی دیگر چیزیں پیدا کی ہیں۔ چنانچہ خدا نے قرآن مجید میں اشارہ فرمایا ہے کہ" زمین و آسمان کے خزانے اللہ ہی کے ہیں" لہذا جن قوموں نے ان خزانوں کی تلاش کی وہ کامیاب ہو کر ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں۔

زمین کی گردش

سورہ شمس میں ارشادِ خداوندی ہے کہ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا۝ سورۂ شمس " یعنی اور قسم ہے زمین کی اور اس کی جس نے اسے لڑھکایا" اس آیت سے علم ہیئت کے دو اصول واضح ہو جاتے ہیں کہ زمین گول ہے اور متحرک ہے۔ کیونکہ لفظ" طحو" عربی زبان میں کسی گیند کے لڑھکانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن مجید اس کی تصدیق کرتا ہے کہ زمین گیند کی مانند گول ہے اور فضائے بسیط میں لڑھک رہی ہے۔

اسی طرح سورۃ زخرف میں ہے کہ: "اور وہ جس نے تمہارے لئے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہارے لئے راستے بنائے تاکہ تم راہ معلوم کرسکو۔"

پرانے نظام شمسی میں یہ مسلمہ تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج متحرک لیکن آج یہ فرسودہ بات ہے۔ چنانچہ قرآن مجید زمین کو گہوارہ سے تشبیہہ دیکر اس کی گردش کی طرف واضح اشارہ کر رہا ہے جو سینکڑوں سال پرانے نظام شمسی کے لئے چیلنج تھا۔

خداوند کریم نے زمین کی طبیعت کو ایسا سخی اور کریم بنایا ہے کہ ایک دانہ سینے کے اندر چھپا کر کچھ مدت کے بعد کئی دانے عطا کرتی ہے۔ نیز زمین کو محوری گردش پر رواں دواں کیا تاکہ دن رات پیدا ہوتے رہیں۔ انسان دن میں کام کاج کرے اور رات میں راحت و آرام کی نعمت سے ہمکنار ہو۔ اگر یہ محوری گردش نہ ہوتی تو زمین کے ایک حصّہ پر مسلسل دن رہتا اور دوسرے حصّہ میں رات جس سے حیات باقی نہ رہتی۔ لہذا زمین کی محوری گردش کا اہتمام کر کے زندگی کی بقا کا انتظام کر دیا۔ اور سورج کو زمین سے اتنے فاصلے پر رکھا کہ زمین پر حیات باقی رہ سکے۔ اگر قریب رکھا ہوتا تو گرمی سے زندگی مفقود ہو جاتی اور اگر زیادہ دور رکھا ہوتا تو ضروری حرارت نہ مل سکتی۔ اور زمین اتنی سرد ہو جاتی کہ زندگی ختم ہو جاتی پس زمین کو ایسے مقام با اعتدال اور ایسی منزل پر رکھا کہ جہاں حیات محفوظ رہ سکے۔ نیز زمین کو سورج کے گرد چکر لگانے پر معمور کر دیا تاکہ اس گردش سے موسم تبدیل ہوتے رہیں۔ اور تمام جاندار زندگی کا لطف حاصل کرتے رہیں۔ زمین کو قوت جذب و دفع دونوں عطا کی گئی ہیں، جس سے زمین اپنے محل و مقام پر برقرار ہے نہ تو وہ سورج میں جذب ہوتی ہے اور نہ ہی سورج سے دور بھاگتی ہے۔ اگر یہ قوتیں نہ ہوتیں تو زمین کب کی کسی سیارے سے ٹکرا کر تباہ ہو جاتی۔ تمام نظام شمسی کے سیاروں کو ایسی کشش کی زنجیر میں جکڑ دیا گیا ہے۔ وہ کون ذات ہے جس نے تمام سیاروں کو اپنے مدار پر رواں کیا۔ وہی ذات خالق کائنات ہے جس نے سیاروں

میں قوتِ کشش کو خلق فرما کر ستاروں کو آپس میں ٹکرانے سے محفوظ کر دیا۔

سورج کی حرکت اور زمین سے فاصلہ

نقل اوّل کے سورہ یٰسٓ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اور (خدا کی ایک نشانی) سورج ہے جو اپنے مقام پر چل رہا ہے اور یہ خدائے عزیز و علیم کا (باندھا ہوا) اندازہ ہے۔ اور ہم نے چاند کے لئے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ پھر (آخر ماہ میں) کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح (پتلا اور ٹیڑھا) ہو جاتا ہے۔ اور (سورج چاند ستارے) ہر ایک اپنے (مدار) آسمان پر چکر لگا رہے ہیں۔"

اس متن سے واضح ہو جاتا ہے کہ تمام سیارے متحرک ہیں۔ قائد ثقل دوم شاگرد شمس العارفینؑ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ سورج تک مسافت کتنی ہے؟ حضرتؑ نے فوراً جواب دیا کہ "گھوڑے کی پانچ سو سال کی مسافت جتنی سورج کی زمین سے مسافت ہے۔" بابِ مدینۃ العلم کا یہ فوری جواب آج کی سائنس کے لئے حجت ہے۔ آپؑ نے یہ مسافت اس زمانے میں بتائی جب کہ نہ ہی علوم و فنون موجودہ ترقی کے مطابق تھے اور نہ ہی کوئی آلات ایجاد ہوئے تھے۔

عربی گھوڑے کی اوسط رفتار ۲۱½ میل فی گھنٹہ ہے۔ اس لحاظ سے مندرجہ ذیل مسافت حاصل ہوتی ہے۔

گھوڑے کی ایک دن و رات کی مسافت = ۴۳/۲ × ۲۴ = ۵۱۶ میل

ایک ماہ کی مسافت = ۵۱۶ × ۳۰ = ۱۵،۴۸۰ میل

ایک سال کی مسافت = ۱۵،۴۸۰ × ۱۲ = ۱،۸۵،۷۶۰ میل

پانچ سو سال کی مسافت = ۱۸۵۷۶۰ × ۵۰۰ = ۹،۲۸،۸۰،۰۰۰ میل

یعنی زمین اور سورج کا درمیانی فاصلہ ۹ کروڑ اٹھائیس لاکھ اسی ہزار میل کے قریب ہے۔ دورِ حاضر میں سائنسدانوں نے جو اندازہ لگایا ہے وہ ۹،۲۸،۳۰،۰۰۰ میل ہے جو اس فاصلے کے قریب ہے۔ ۵۰،۰۰۰ میل کا جو فرق ہے وہ سائنسدانوں

ہی کی غلطی سے ہے کیونکہ جس ہستی نے اس دور میں سائنسی آلات کی مدد کے بغیر صرف علم وہبی سے اتنا صحیح فاصلہ بتایا کہ کروڑوں اور لاکھوں کا حساب صحیح ہے تو ہزاروں کا حساب بھی غلط نہیں ہو سکتا بلکہ سائنسدانوں نے جو حساب لگایا ہے اس میں کوئی غلطی ہو گئی ہے جو تحقیق سے پکڑی جا سکتی ہے۔

سورج کا محیط ایک شامی نے حضرت علی علیہ السلام سے سورج کے طول و عرض یعنی محیط کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فوراً جواب دیا کہ نو سو فرسخ کو نو سو فرسخ سے ضرب دیدو جو حاصل ضرب ہوگا وہی سورج کا طول و عرض ہے۔

یعنی ۹۰۰×۹۰۰ = ۸,۱۰,۰۰۰ فرسخ (آٹھ لاکھ دس ہزار فرسخ)

۸ فرسخ = ۲۷ $\frac{۱}{۴}$ میل

۱ فرسخ = $\frac{۱۰۹}{۴}$ × $\frac{۱}{۸}$ = $\frac{۱۰۹}{۳۲}$ میل

۸,۱۰,۰۰۰ فرسخ = $\frac{۱۰۹}{۳۲}$ × ۸,۱۰,۰۰۰ = ۲۷,۵۹,۰۶۲ $\frac{۱}{۲}$ میل

عرب کے اس غیر ترقی یافتہ ملک اور دور میں سائنسی ساز و سامان کے بغیر اتنا صحیح فلکیاتی حساب بتانا اور یہ دعویٰ کرنا کہ "میں آسمانوں کے راستوں کا زمین کے راستوں سے زیادہ علم رکھتا ہوں" اس بات کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے کہ جس ہستیؑ کے علم کے دروازے کی یہ شان ہے اس رسول معظمؐ کا علم کیسا ہوگا؟ اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جن لوگوں کو اہلبیتؑ کے مقابلے پر لایا جاتا ہے ان کے بارے میں کوئی ایسی علمی مثال تاریخ سے پیش نہیں کی جا سکتی ہے۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ وہ لوگ بھی مشکل مسائل میں باب مدینۃ العلم علی مرتضیٰ علیہ السلام کے ہی محتاج تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علیؑ نے ان سے کبھی کوئی مشکل مسئلہ نہ تو دریافت کیا اور نہ آپؑ کو کوئی ایسی مشکل پیش آئی۔ پھر وہ اور علیؑ مشکل کشا برابر کیسے؟

سورج اور فلسفہ قدیم فلسفہ قدیم کے اکثر نظریات کو موجودہ سائنس نے باطل قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کی اساس علم حقیقی پر نہ تھی۔ جیسا کہ پرانے ماہرین کا خیال تھا کہ آسمان ٹھوس ہے اور سیارے اس میں جڑے ہوئے ہیں یعنی آسمانوں ہی کی حرکت سے سیارے متحرک ہیں لیکن موجودہ سائنس نے اس بات کی تردید کردی ہے۔ تمام سیاروں کی ذاتی حرکت کو تسلیم کیا ہے جبکہ قرآن مجید نے اس نظریہ کو قریباً چودہ سو برس پہلے ہی پیش کردیا تھا۔ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۝ یعنی ہر سیارہ اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے اسی طرح قدیم فلسفہ نے یہ نظریہ قائم کرلیا تھا کہ سورج بالذات نہ تو گرم ہے اور نہ ہی سرد یعنی سورج کی نورانیت ذاتی نہیں ہے لیکن موجودہ دور میں یہ نظریہ بھی غلط ثابت ہوگیا ہے اور اب ماہرین نے کہا ہے کہ سورج بالذات نور و نار کا مرکز ہے۔ اس کی روشنی ذاتی ہے۔ کرۂ خورشید آگ و بخارات کے طبقات سے مرکب ہے۔ لیکن قرآن مجید نے صدیوں پہلے اس نظریہ کی نشاندہی کردی تھی جیسا کہ ارشادِ خلاقِ عالم ہے کہ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا۝ سورۃ النبا "اور ہم نے سورج کو روشن چراغ بنایا" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح چراغ کی روشنی ذاتی ہوتی ہے اور اس میں اپنا ذاتی مواد جلتا ہے۔ اسی طرح سورج کی روشنی ذاتی ہے اور اسی کے اندر کا ایندھن جلتا ہے۔ آیت منقولہ میں "وھاجا" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور "وھج" عربی زبان میں اس نورانی چیز کو کہا جاتا ہے جو بالذات نور و حرارت کا مرکز ہو۔

اسی طرح سورہ یونس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً یعنی وہی خدا ہے جس نے سورج کو چمکدار اور روشن بنایا ہے" یہاں رب العالمین نے لفظ "ضیاءً" استعمال کیا ہے جس کے معنی سفید نور و روشنی کے ہیں جو سات رنگین قسم کی شعاعوں کا مرکب ہے یعنی قرآن نے چودہ سو سال پہلے بتا دیا تھا کہ سورج کی شعاعیں کئی رنگین شعاعوں کا مجموعہ ہیں اور موجودہ دور کے ماہرین نے اب سائنسی

آلات سے شعاعوں کا تجزیہ کیا ہے اور ارشاد خداوندی کی تائید کرتے ہیں۔

موجودہ سائنسی تحقیق نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اجرام فلکی سورج، چاند ستارے سب بالآخر فنا ہوجائیں گے۔ اس کی نشاندہی بھی قرآن نے سورہ تکویر میں صدیوں پہلے کردی تھی اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ ۝ سورۃ التکویر یعنی جب آفتاب کو لپیٹ لیا جائے گا اور سب ستارے گر جائیں گے۔"

نظام شمسی کے مرکز سورج کا ایندھن بہت تیزی سے جل رہا ہے۔ ایک ایک سیکنڈ میں سورج میں کروڑوں ایٹم ٹوٹ کر آگ کی حرارت اور شعلوں میں شدت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ہزاروں میل کی بلندی تک شعلے اٹھ رہے ہیں اور ان کے بعد گرم بخارات کے بادل ہیں جو کئی لاکھ میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ چونکہ سورج ایک عظیم کرہ ہے اس لئے اس کے ایندھن کے ختم ہونے کے لئے ابھی طویل مدت درکار ہے۔ لیکن یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ آخرکار سورج اور تمام سیارے فنا ہو جائیں گے۔ جب سورج کا ایندھن ختم ہوجائے گا تو اس کو لپیٹ لیا جائے گا۔ تمام سیاروں کی قوت میں اضمحلال پیدا ہوجائے گا۔ اور اپنے مداروں پر حرکت نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا ٹوٹ ٹوٹ کر گریں گے اور آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گے۔ یہی قیامت کا منظر ہے جو موجودہ سائنس بھی تسلیم کر رہی ہے۔ پھر قرآن مجید اور حضرت محمد مصطفےٰ پر ایمان نہ لانے کی وجہ صرف ضد ہے اور کچھ نہیں۔

سورج کی نورانیت

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے دیدار کو محال بیان کرتے ہوئے سورج کی نورانیت کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں۔

"سورج (کا نور) کرسی کے نور کے ستر حصوں میں ایک حصہ ہے۔ کرسی نور عرش کے ستر جزوں میں سے ایک جزو ہے اور عرش کا نور نور حجاب کے ستر جزوں میں سے ایک جزو ہے۔ اور حجاب کا نور ستر کے نور کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے پس اگر یہ لوگ سچے ہیں (جو دیدار خدا کا اعتقاد رکھتے ہیں) تو جب

بادل نہ ہوں تو سورج سے پوری آنکھیں ملا کر تو دیکھیں۔"

سورج کا رخ حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ اگر سورج کا پورا رُخ زمین کی طرف ہوتا تو اس کی حرارت کی شدت کی وجہ سے اہلِ زمین وخطۂ زمین اور جو کچھ بھی زمین پر ہے جل جاتے۔

سورج کی تخلیق باقرالعلوم حضرت امام محمد بن علی الباقر علیہ السلام سے سلام بن مستیر نے پوچھا کہ سورج چاند سے زیادہ گرم کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا "خلاق عالم نے سورج کو آگ کے نور اور صاف پانی سے پیدا کیا ہے۔ ایک تہ نور کی دی تو اس پر ایک تہ پانی کی دی۔ اس پر پھر آگ کے نور کی تہ دی۔ اس پر پھر پانی کی تہ دی۔ اس طرح سات طبق وتہیں ہوئیں۔ پھر آخر میں اسے (سورج کو) آگ کا لباس پہنا دیا۔ اسی لئے آفتاب چاند کی نسبت گرم ہے۔"

ہوا

سورۂ روم میں ارشادِ خداوندی ہے کہ "اور اُسی کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہواؤں کو (بارش کی خوشخبری کے واسطے (پہلے) بھیج دیا کرتا ہے تاکہ تمہیں اپنی رحمت کا مزہ چکھائے۔ اور اس لئے بھی کہ (اس کی بدولت) کشتیاں اس کے حکم سے چل کھڑی ہوں۔ تاکہ اس کے فضل وکرم سے (اپنی روزی) کی تلاش کرو اور اس لئے بھی تاکہ تم شکر کرو۔"

ہوا خداوند عظیم کی نعمت ہے۔ اسی پر انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی کا انحصار ہے۔ اسی لئے اللہ نے اسے کافی مقدار میں پیدا کیا ہے۔ ہوا بادلوں کی سواری ہے۔ بادلوں کو مختلف مقامات پر لے جاتی ہے۔ اگر ہوا نہ ہو تو بادل خشکی تک نہ پہنچ سکیں۔ نہ ہی بارش ہو اور نہ ہی خشک زمین آباد ہو سکے۔ چنانچہ خشک زمین سے نہ ہی نباتات اُگ سکیں اور نہ ہی اناج پیدا ہو۔ یہ احسان قدرت ہے کہ اس نے ہواؤں کو اس خدمت پر مامور کر دیا ہے کہ وہ بادلوں کو مزروعی مقامات پر پہنچائے۔

موسم گرما میں سورج کی شعاعوں سے پانی کی نسبت زمین جلد اور زیادہ گرم ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے زمین کی ہوا خفیف ہو کر اوپر کو اٹھتی ہے۔ اور اس کی جگہ پُر کرنے کے لئے سمندر کی ہوا خشکی کا رُخ کرتی ہے۔ اس ہوا کو بادِ صبا یا نسیم سحر کہتے ہیں۔ اور غروب آفتاب کے وقت زمین و سمندر دونوں مقامات پر خنکی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن سمندر کی نسبت زمین جلدی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ اور سمندر کا پانی دیر تک گرم رہتا ہے جس کی وجہ سے سمندر کی ہوا اوپر کو اٹھتی ہے اور اس کی جگہ پُر کرنے کے لئے خشکی کی ہوا سمندر کی جانب رُخ کرتی ہے اسے نسیم برّی کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ہوا کی کئی قسمیں ہیں جب ہوا کی رفتار میں شدت پیدا ہو جاتی ہے تو آندھی کہلاتی ہے۔ پھر کوئی سرخ آندھی اور کوئی سیاہ آندھی کہلواتی ہے۔ ہوا ہی پودوں کی نشو و نما کرتی ہے۔

ہوا میں کئی گیسیں شامل ہیں۔ آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائڈ، ہائیڈروجن، نائٹروجن۔ ہوا میں ان تمام گیسوں کی ایک خاص مقدار موجود ہے۔ اگر اس مخصوص مقدار میں ذرہ برابر بھی فرق پیدا ہو جاتے تو یہی ہوا مہلک بن جائے گی۔ جس ذات نے ہوا میں ان گیسوں کو ایک خاص مقدار سے ملایا وہی ذات ہے جو خلاقِ کائنات ہے۔ چنانچہ اس نے سورہ لقر میں ارشاد کیا ہے کہ" ہم نے ہر شے کو ایک صحیح اندازے پر خلق فرمایا ہے"۔

ہوا کے اجزائے ترکیبی میں دو اہم جزو ہیں۔ آکسیجن اور نائٹروجن۔ درخت دن میں کاربن ڈائی آکسائڈ جذب کرتے ہیں اور آکسیجن خارج کرتے ہیں اور رات کو کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کرتے ہیں۔ اسی لئے رات کو درختوں تلے سونا مضر ہوتا ہے۔

آکسیجن زندگی کے لئے بہت ضروری ہے کہ اس کے بغیر زندہ رہنا محال ہوتا ہے۔ اس گیس کا نہ ہی کوئی رنگ ہے اور نہ ہی ذائقہ لیکن پانی میں حل

ہوجاتی ہے۔ اسی کی بدولت آبی جانور زندہ ہیں۔ نائٹروجن گیس بھی بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ ہوتی ہے۔ ہوا میں اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آکسیجن کے عمل کو مناسب حد تک دھیما کر دیتی ہے کیونکہ خالص آکسیجن گیس چیزوں کے جلنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ اگر ہوا میں صرف آکسیجن ہی ہوتی تو تمام چیزیں خود بخود جل جاتیں لیکن یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے آکسیجن کے ساتھ نائٹروجن گیس کی خاص مقدار ملا کر اسے ممد حیات بنا دیا ہے۔ اکابرینِ اسلام نے ہوا کے بارے میں جو ارشادات فرمائے ہیں ان میں سے چند نقل کئے جاتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ "اگر ہوا کی کثرت نہ ہوتی تو اس دھوئیں اور بخارسے جو کہ فضا میں موجود ہے لوگوں کے دم گھٹ جاتے اور پھر انسان کو عاجز کر دیتے۔" سرکار صادقؑ اپنے شاگرد مفضلؒ سے ہوا کا تذکرہ فرماتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ "اے مفضلؒ کیا دیکھا نہیں کرتے ہو کہ جب ہوا تھم جاتی ہے تو کیسی بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ جو جان لینے کے قریب ہو جاتی ہے۔ صحتمندوں کو بیمار اور مریضوں کو کمزور، پھلوں کو خراب اور سبزیوں کو متعفن کر دیتی ہے بدنوں میں وبا اور غلوں میں خرابیاں پیدا کر دیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہوا کا چلنا حکیم مطلق کی تدبیر سے ہے۔ ہوا کی ایک اور خاصیت سے تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ آواز ایک اثر ہے۔ جو اجسام کے ہوا میں باہم ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہوا اسے کانوں تک پہنچاتی ہے۔ اور تمام انسان اپنی ضرورت و معاملات کے متعلق دن بھر اور رات کے کچھ حصہ تک گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ اسی سے چلنے والی ہوا بھی پیدا ہوتی ہے جو جسموں سے فسادات کو رفع کرتی ہے۔ اور بادل کو ایک مقام سے دوسرے مقام کیطرف اڑا کرلے جاتی ہے تاکہ اس کا فائدہ عام ہو اور وہ (بادل اسی میں) کثیف ہوں کہ ان سے مینہ برسے پھر انہیں منتشر کر کے ہلکا بادل کر دیتی ہے تو وہ منتشر ہو جاتے ہیں۔ ہوا درختوں میں پھل پھول پیدا کرتی ہے۔ کشتیوں کو چلاتی ہے۔ غذا کو نرم و لطیف بناتی ہے۔ پانی کو ٹھنڈا کرتی ہے۔ آگ کو بھڑکاتی

ہے۔ تر چیزوں کو خشک کرتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ تمام اشیاء کو قائم اور زندہ رکھتی ہے اور اگر یہ چلنے والی ہوا نہ ہو تو نباتات خشک ہو جائیں، حیوان مرجائیں اور تمام چیزیں خراب ہو جائیں"۔

جنوبی ہوا کی احادیث حضرت صادقؑ جنوبی ہوا (نسیم بحری) کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"جنوب کی ہوا کیسی (نعمت) ہے کہ مساکین سے سردی کی شدت کم کرتی ہے۔ درختوں کو حاملہ کرتی ہے اور نہروں کو جاری کرتی ہے"۔

دیکھنے کے لئے ہوا ضروری ہے۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام ہوا کی احادیث اس طرح بیان کرتے ہیں "دیکھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ دیکھنے والے اور دیکھے جانے والی شئے کے درمیان ہوا موجود نہ ہو۔ اور اس ہوا کا لطیف ہونا ضروری ہے تاکہ اس سے نور بصر گذر سکے" یہی وجہ ہے کہ جب سخت آندھی یا دھند کی وجہ سے ہوا کثیف ہوتی ہے تو زیادہ فاصلے کی چیزیں نظر نہیں آتی ہیں۔

ہوا کا دبیز غلاف سطح زمین سے تقریباً تین سو میل کی بلندی تک زمین کو محیط کئے ہے اور جوں جوں بلندی کی طرف جائیں ہوا لطیف ہوتی جاتی ہے۔ تین سو میل کے بعد بھی انتہائی لطیف ہوا یا دیگر گیسیں موجود ہیں۔

ہوائی سمندر بہرحال کچھ میل کی بلندی پر ہوا کے سمندر ہیں۔ انہیں سمندروں میں مچھلی سے مشابہ چھوٹے چھوٹے جاندار موجود ہیں۔ چنانچہ چند سال قبل بھارت کے شہر آگرہ میں بارش ہوئی اور بارش کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جاندار بھی برسے جن کی شکل مچھلی کی طرح تھی۔ اور اس حقیقت کا انکشاف ثقل دوم کے چھٹے ہادیؑ نے بہت پہلے کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ سے کسی نے پوچھا۔ ہوا میں بند و محفوظ موج ہے۔ کیا اس میں مخلوق ہے؟ فرمایا ہاں۔ دریافت کیا اس میں کون سی مخلوق ہے؟ فرمایا ایسی مخلوق ہے جن کے بدن مچھلیوں کی مانند اور سر پرندوں

کی طرح اور مرغ کی طرح کلغی ہے۔ اور پس وہ گردن سے بھی مرغ کی طرح ہیں۔ ان کے پر پرندوں کی طرح اور ان کا رنگ چمکدار چاندی کی طرح ہے۔

عذاب کی ہوا جہاں رحمت کی ہوائیں ہیں وہاں عذاب کی ہوائیں بھی ہیں ان کا تذکرہ کلامِ باری میں موجود ہے۔ جو کسی قوم پر عذاب کے لئے بھیجی گئی ہیں۔ انہی میں سے ایک قسم "عقیم" ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ حضرت صادقؑ آلِ محمدؐ اس ہوا کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں کہ "ریح عقیم عذاب کی ہوا ہے جس سے ارحام اور نباتات کسی چیز کو جنم نہیں دیتے۔"

ہوا کی اقسام موجودہ جغرافیہ دانوں نے ہوا کی تین قسمیں بیان کی ہیں:۔
(ا) دوامی یا غیر متغیرہ ہوائیں:۔ وہ ہوائیں جو ہمیشہ ایک ہی رُخ کو چلتی ہیں مثلاً تجارتی اور منقلب تجارتی ہوائیں۔ قطبی ہوائیں۔
ثقلِ اوّل قرآن مجید میں اس قسم کو ایسی ہوا بتایا گیا ہے جس سے کشتیاں چل کھڑی ہوتی ہیں۔

(ب) موسمی ہوائیں:۔ وہ ہوائیں جو خاص موسموں میں اپنے اوقات پر چلتی ہیں مثلاً نسیم بری و بحری۔ اور مون سون ہوائیں۔
یہ وہی ہوائیں ہیں جن کے بارے میں خدا نے کہا ہے کہ وہ خوشخبری کے واسطے بھیجتا ہے کہ اپنی رحمت کا ذائقہ چکھائے۔

(ج) متغیرہ ہوائیں:۔ وہ ہیں جو بے قاعدہ اور اتفاقیہ چلتی ہیں۔ مثلاً گردباد اور منقلب گردباد۔
یہ وہ ہوائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ عذاب وغیرہ کی شکل میں بھیجتا ہے۔

پانی

دنیا کے نقشے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سطح زمین کے ایک ¼ چوتھائی حصے میں خشکی اور تین ¾ چوتھائی حصے میں پانی ہے۔ پانی خداوند کریم کی عظیم نعمتوں میں سے ہے اسی پر زندگی کا انحصار ہے۔ اللہ کے فرمان کے مطابق ہر جاندار شے پانی سے خلق کی گئی ہے۔ اگر پانی نہ ہو تو سطح زمین پر حیات کا خاتمہ ہو جائے۔ نہ ہی کوئی جاندار رہے اور نہ ہی نباتات۔ اللہ تعالیٰ سورۂ انعام میں فرماتا ہے۔ " اور وہی (خدا ہے کہ) جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے اس کے ذریعے ہر قسم کی نبات اگائی۔ اور ہم نے ہی اس سے ہری ہری شاخیں نکالیں۔ پھر ایسے خوشے نکالے کہ جن کے دانے آپس میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور کھجور کے بور سے ایسے خوشے پیدا کئے جو (زمین پر) جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور (اسی پانی سے) انگور، زیتون، انار کے باغات جو آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور (مزے میں) جدا جدا بھی (پیدا کئے) ہر درخت کے پھل کی طرف غور تو کرو۔ بے شک اس میں مومنوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں۔"

بارش جب برستی ہے تو مردہ زمین میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ زمین کی تہ میں دبی ہوئی بے شمار جڑیں اور بیج زمین کا سینہ چیرتے ہوئے یکایک نمودار ہو جاتے ہیں۔ اسی پانی سے تمام نباتات سیراب ہوتے ہیں۔ باوجودیکہ ایک ہی پانی تھا لیکن ہر ایک پودے کا رنگ جدا، شکل و صورت الگ اور ہر پھل کا ذائقہ علیحدہ ہے۔ بارش کا قطرہ سانپ کے منہ میں بھی اور صدف کے منہ میں بھی لیکن کہیں زہر بنا اور کہیں گوہر۔ پانی ایک تھا۔ لیکن محل و مقام بدلا ہوا۔ لہٰذا خاصیت بھی الگ الگ ہوئی سا اثرات بدل گئے۔ سمندر کے پانی کو نمکین بنایا۔ اس لئے کہ اس میں کروڑوں جاندار روزانہ مرتے

ہیں۔ اور نمک کی خاصیت ہے کہ یہ تعفّنات کو ختم کرتا ہے۔ اگر سمندر کا پانی نمکین نہ ہوتا تو جو جانور سمندر میں مرتے ان کی لاشوں سے اس میں بدبو پیدا ہو جاتی۔ اور ایسا ذی حیات کے لئے نقصان دہ ہوتا۔ بیماریاں بکثرت پھیلتیں جو حیوانات و انسانوں کے لئے باعثِ ہلاکت ہوتیں۔ یہ اللہ ذی شان کا احسان ہے کہ اس نے سمندر کا پانی نمکین بنا کر لاکھوں نفوس کی حفاظت جانی فرمائی۔

پانی کی خاصیّت یہ ہے کہ برف بننے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کی خاصیّت کی طرف بھی غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں بھی قدرت کی مصلحت پوشیدہ ہے۔ اس لئے کہ اگر پانی جمنے کے بعد ہلکا نہ ہوتا اور بھاری رہتا اور زمین کی سطح پر آتا، تو لاتعداد جاندار اس کے نیچے آکر دب جاتے۔ خشکی کی طرف پانی پہنچانے کا انتظام بھی کس قدر پُرحکمت ہے کہ سورج کی شعاعیں سطحِ آب سے پانی کے قطرات کو بخارات کی صورت میں مسلسل فضا میں لے جارہی ہیں۔ اور فضا میں پانی بادل کی شکل میں نظر آتا ہے۔ پھر ہوا ان کو مقررہ مقامات تک لے جاتی ہے۔ اور وہاں وہ برستے ہیں۔

پانی کی ترکیب دو اہم گیسوں سے ہوئی (۱) آکسیجن (۲) ہائیڈروجن۔ آکسیجن میں جلانے کی خاصیّت ہے۔ اور ہائیڈروجن سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ ایک حصّہ آکسیجن اور دو حصّے ہائیڈروجن کے اجتماع سے پانی وجود میں آتا ہے۔ اگر یہ تناسب قائم نہ رہے تو پانی "پانی" نہ رہے۔ دونوں گیسیں علیحدہ علیحدہ مضر تھیں لیکن جب دونوں ایک خاص مقدار سے مل گئیں تو پانی وجود میں آیا جس پر زندگی کا دارومدار ہے۔ حضرتِ صادقؑ فرماتے ہیں کہ "پانی کا مزہ زندگی کا مزہ ہے"۔

صباغ بن نصر ہندی نے حضرت امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے دریافت کیا کہ پانی کی اصل اور حقیقت کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا:۔

پانی کی اصل "خشیۃ اللہ" ہے۔ بعض دفعہ پانی آسمان سے برستا ہے اور زمین پر دریاؤں کی صورت میں بہتا ہے۔ اور کبھی زمین کے حصّے اوپر آجاتے ہیں۔ تو چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اصل اس کی ایک ہے۔ یعنی صاف و شیریں۔ سائل نے

عرض کیا۔ مٹی کے تیل کے چشمے، گندھک، تار کول، نمک کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا آبی جوہر کے تغیرات سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے نطفہ منقلب ہو کر علقہ اور پھر مضغہ اور پھر خلقت مجتمعہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ جس کی بنیاد چار متضاد طبیعتوں پر ہے سائل نے عرض کیا جب زمین پانی سے پیدا ہوئی ہے اور پانی سرد اور تر ہے تو پھر زمین سرد اور خشک کیوں ہے؟ فرمایا تری اس سے سلب کر لی گئی ہے۔ اس لئے خشک ہے۔ سائل نے پوچھا حرارت زیادہ مفید ہے کہ برودت؟ فرمایا حرارت زیادہ مفید ہے کیونکہ حرارت زندگی ہے اور برودت موت۔ مہلک بادِ سموم کے حملے سے آدمی بچ جاتا ہے لیکن مہلک سرد ہوا سے نہیں بچ سکتا۔"

ثقلین کے اقوال متعلقہ علمِ جغرافیہ

مندرجہ بالا بیان میں ہم نے "ثقلین" کے چند اقوال نقل کئے جو علمِ جغرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اسی بات سے ہو جاتا ہے کہ یہ ہدایات نہ تو کسی تجربے پر منحصر ہیں اور نہ ہی مشاہدے پر بلکہ ان کی اساس خالص علمِ وہبی پر ہے۔ اب ہم چند اور ارشادات نقل کرتے ہیں جو نہایت ہی قابلِ غور ہیں اور ضرورت ہے کہ ان کے مطابق مسلمان سائنسی تحقیقات کر کے اسلام اور مسلم قوم کی ترقی کے لئے کام کریں۔

رنگین قطعاتِ ارضی

سورۂ فاطر میں ارشادِ خداوندی ہے: "کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ یقیناً خدا ہی نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم (خدا) نے اس (کے ذریعہ) سے طرح طرح کی رنگتوں کے پھل نکالے اور کچھ پہاڑ بھی جن میں قطعات (ٹکرے راستے) ہیں۔ جن کے رنگ مختلف ہیں۔ کچھ تو سفید، کچھ لال اور کچھ بالکل کالے سیاہ۔"

پیغمبرِ اسلام کی ساری زندگی عرب میں گذری۔ جو ریگستان ہے۔ اس سرزمین میں رنگین قطعات و راستے نہیں ہیں۔ یہ سفید سرخ اور کالے حصے تنزانیہ مشرقی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ جن کی خبر قرآن نے دی۔ قرآن مجید کی یہ آیت اللہ کی اس قدرت

کی جانب توجہ دلا رہی ہے کہ وہ ایک ہی پانی سے مختلف رنگوں کی چیزیں پیدا کرتا ہے۔

سات راستے

سورۂ مومنون میں ہے کہ:۔
" اور ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے ہیں۔ اور ہم مخلوق سے غافل نہیں ہیں"

حرکت وگردش

سورہ رعد میں اللہ فرماتا ہے کہ:۔
" خدا وہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جنہیں تم دیکھتے ہو (یعنی قوت کشش و دفع کے سہارے سیاروں اور ستاروں کو قائم کیا۔ پھر وہ عرش (کے بنانے) پر آمادہ ہوا۔ اور سورج و چاند کو (اپنے حکم و قانون کا) پابند بنا دیا ہے۔ (اس سارے نظام کی) ہر چیز ایک مقررہ وقت تک چل رہی ہے۔

آسمان کے کناروں میں نشانیاں

ارشادِ ربانی ہے کہ:۔
" ہم عنقریب انہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں آسمان کے کناروں میں دکھائیں گے۔ اور خود ان میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی یقیناً حق ہے" (حٰم السجدہ)

اس آیت میں پیشنگوئی ہے کہ انسان خلائی سفر کر کے یا نہایت طاقتور دوربینوں کے ذریعے آسمان کے کناروں کو دیکھیں گے۔ اور آسمانوں میں بھی مشاہدات کریں گے۔ یہ پیش گوئیاں پوری ہو رہی ہیں۔

آسمانوں کے سمندر و دریا

پیغمبرِ خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے آسمانوں میں سمندر موجود ہونے کی خبر دی ہے۔

" یقیناً سات آسمانوں میں ایسے سمندر ہیں جن میں ہر ایک کی وسعت و گہرائی پانچ سو سال کی راہ کے برابر ہے۔" اسی کی تائید میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

" یقیناً خداوندِ عالم نے آسمان و زمین کے درمیان ایک دریا پیدا کیا ہے۔ اور

اسے اپنی قدرتِ کاملہ سے ٹھہرا دیا ہے۔ یہ سبزی جو ہمیں دکھائی دیتی ہے اسی دریا کے پانی کی سبزی ہے"

مشارق و مغارب

نقلِ اوّل قرآن مجید میں ہے ۔" میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی یقیناً ہم قادر ہیں" (المعارج)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ کئی سورج اور کئی نظامِ شمسی ہیں جن کی وجہ سے کئی مشرق اور کئی مغرب ہیں۔

نقل دوم کے چھٹے ہادی امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اللہ نے کئی آسمانی قُبّے" خلق کئے ہیں۔ بلکہ خدا نے تمہارے اس مغرب کے آگے انتالیس مغرب پیدا کئے ہیں، (اور) سفید زمین ہے جس میں رہنے والی مخلوق کے لئے اسی (زمین) کی روشنی کافی ہے اور ان لوگوں نے ذرہ برابر بھی خدا کی معصیت نہیں کی۔ اور انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ آدم پیدا بھی ہوئے ہیں یا نہیں ۔

سات زمینوں کا باہمی فاصلہ

سرکارِ رسالت مآبؐ فرماتے ہیں کہ:۔ "ساتوں زمینوں میں سے ہر ایک زمین کا دوسری زمین تک کا فاصلہ پانچ سو برس کا ہے"

نوٹ:۔ بغیر تعین رفتار وسواری کے احادیث میں جو فاصلے بیان کئے جاتے ہیں۔ ان میں عموماً پرندے کی یومیہ پرواز سے حساب لگایا جاتا ہے اور پرندے کی اوسطاً یومیہ رفتار ایک سو فرسخ مانی جاتی ہے یعنی تقریباً تین سو پچاس میل یومیہ۔

۱۴ چودہ کعبے

قائد نقلِ دوم حضرت باب مدینۃ العلمؑ کے شاگردِ رشید حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ "یہ خانہ کعبہ چودہ گھروں (کعبوں) میں سے ایک ہے۔ اور سات زمینوں میں ہماری طرح کی مخلوق ہے"

ثابت ہوا کہ ایسی سات زمینیں ہیں جن میں ہماری زمین کی طرح انسانی آبادی

ہے۔ سات زمینوں کا جو ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اس میں ایسی ہی آباد زمینیں مراد ہیں۔ اور حضرت امام رضاؑ فرماتے ہیں کہ ایک زمین تو ہمارے نیچے ہے (کہ جس کے اوپر ہم رہتے ہیں) اور باقی چھ زمینیں اوپر واقع ہیں۔

دیگر سیّاروں میں آبادی کا تصوّر

سائنس دان ابھی سیّاروں میں آبادی کا پتہ نہیں لگا سکے۔ لیکن ثقلِ اوّل نے یہ اطلاع دے دی ہے جیساکہ سورۃ النحل میں ارشادِ خداوندی ہے کہ "آسمانوں اور زمین کی چلنے والی جاندار مخلوق اور فرشتے صرف خدا کو ہی سجدہ کرتے ہیں اور وہ سرکشی نہیں کرتے۔" (ھُمْ کی ضمیر جانداروں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔)

دیگر سیّاروں میں انسان کے پہنچ جانے کی پیشگوئی

سورۃ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ" اور خدا کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا بھی ہے۔ اور ان میں جاندار چلنے والی مخلوق کا پیدا کرنا بھی ہے۔ جس کو اس نے آسمانوں اور زمین میں پھیلا دیا ہے۔ وہ جب چاہے ان کے جمع کرنے پر قادر ہے۔"

اسی طرح حضرتِ امیرؑ کا ارشاد ہے "یقیناً تمہارے اس آسمان میں زمین کے شہروں کی طرح شہر بسے ہوئے ہیں۔"

سرکارِ قائدِ ثقلِ دوم حضرت امیر المومنین علی علیہ السّلام ثقلِ اوّل کی اس آیت کہ" اے گروہِ جن و انس اگر تم میں استطاعت ہے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل سکو تو نکل جاؤ۔ مگر تم بغیر قوت و طاقت کے نہیں نکل سکتے۔" (الجن) کی تفسیر اپنے ایک خطبہ میں یوں ارشاد فرمائی:۔

" گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان علوم و فنون ایسے درجے تک پہنچا دے گا کہ تم اپنے اس مقصد میں یعنی عروجِ سمأ میں کامیاب ہو جاؤ گے "

ستاروں کا آگے پیچھے ہونا

نیبولا گیس (NEBULA GAS) اُن گیسوں کو کہا جاتا ہے جو ستارے فضا میں چھوڑتے رہتے ہیں۔ ان گیسوں کی گہرائی دو ہزار میل تک معلوم کی گئی ہے۔ اور یہ گیس ایک طرف سے دوسری طرف تیزی سے جاتی ہے۔ جو ستیارہ ان کی زد میں آ جاتا ہے اسے جھٹکا دے کر پیچھے ہٹا دیتی ہے۔ اور پھر قوتِ کشش اس ستیارے کو واپس اپنے مقام پر لے آتی ہے۔ یہ بات سائنس نے اب معلوم کی ہے مگر ثقلِ اوّل میں اس کا ذکر سینکڑوں سال پہلے کیا گیا ہے جیسا کہ سورۂ تکویر میں ارشاد ہے "قسم ہے اُن ستاروں کی جو چلتے چلتے پیچھے ہٹ جاتے ہیں"

ستاروں کا چھوٹے بڑے نظر آنا

ابن السلام نے حضرت رسولِ کریمؐ سے سوال کیا کہ ستارے چھوٹے بڑے کیوں نظر آتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "اس لئے کہ فضا اور ستاروں کے درمیان سمندر ہیں۔ ہوا ان کی موجوں میں تلاطم پیدا کرتی رہتی ہے اس لئے وہ چھوٹے اور بڑے نظر آتے ہیں۔"

سرد ستیارہ

حضرتِ صادق علیہ السّلام نے ایک ستیارے کے متعلق فرمایا۔ "خداوندِ عالم نے ساتویں آسمان پر ایک ستیارہ ٹھنڈے پانی سے خلق فرمایا اور باقی چھ چلنے والے ستیاروں کو گرم پانی سے"

۱۹۳۰ء میں پلوٹو نامی ایک ستیارہ دیکھا گیا جو سورج سے تقریباً چار ارب میل دور ہے یعنی یہ فاصلہ زمین و آفتاب سے چالیس گنا ہے۔ غالباً اس دوری کی وجہ سے یہ ستیارہ خنک ہے۔

حرکتِ قمری اور ماہتاب کا محیط

سورہ یٰسں میں ارشادِ خداوندی ہے ۔۔ "اور ہم نے چاند کے لئے منزلیں مقرر کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ پھر کر (آخر ماہ میں) کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح (پتلا ٹیڑھا) ہو جاتا ہے۔ اور نہ ہی تو سورج سے بن پڑتا ہے کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ ہی رات

دن سے آگے بڑھ سکتی ہے اور ہر ایک اپنے مدار پر چکر لگاتا ہے۔"

حضرت امام زین العابدینؑ کا کلام :- "اے فرمانبردار، سرگرم عمل اور تیز رفتار مخلوق اور مقررہ منازل میں یکے بعد دیگرے وارد ہونے والے اور نظم و تدبیر کے خلق میں تصرّف کرنے والے اس ذات پر ایمان لایا جس نے تیرے ذریعہ تاریکیوں کو روشن اور پوشیدہ چیزوں کو آشکار کیا۔ اور تجھے اپنی شاہی اور فرمانبرداری کی نشانیوں میں سے ایک نشانی بنایا۔ اور اپنے غلبے و اقتدار کی علامتوں میں سے ایک علامت قرار دیا۔ تجھے بڑھنے، گھٹنے، نکلنے، چھپنے اور چمکنے، گہنانے سے تسخیر کیا۔ ان تمام حالات میں تو اس کے زیر فرمان اور اس کے ارادہ کی جانب رواں دواں ہے۔ تیرے بارے میں اس کی تدبیر و کارسازی کتنی عجیب اور تیری نسبت اس کی صنّاعی کتنی لطیف ہے۔ تجھے آئندہ حالات کے لئے نئے مہینہ کی کلید قرار دیا . . . . . الخ "

حضرت علیؑ سے ایک شخص نے چاند کے محیط کے متعلق سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا۔ "چالیس۴۰ فرسخ کو چالیس۴۰ فرسخ سے ضرب دو۔ حاصل ضرب چاند کا محیط ہو گا۔" یعنی ۴۰×۴۰ = ۱۶۰۰ فرسخ

نوٹ :- ایک فرسخ ۳½ میل کا ہوتا ہے۔

سیّارچے کا محیط

بحار الانوار میں ہے کہ حضرت علیؑ سے ایک مرد شامی نے پوچھا کہ وسیع کائنات میں چھوٹے چھوٹے سیارے (سیّارچے) ہیں۔ ان میں سے کسی کا محیط بتائیں۔ چنانچہ آپ نے فی الفور فرمایا " بارہ۱۲ فرسخ کو بارہ۱۲ فرسخ سے ضرب دے دو، یعنی ۱۲×۱۲ = ۱۴۴ فرسخ۔

نجم الطّارق

حضرت علیؑ سے "النجم الطارق" کے متعلق جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے دریافت کیا گیا۔ آپؑ نے فرمایا۔"وہ آسمان میں بہت خوبصورت ستارہ ہے۔ جسے عام لوگ نہیں جانتے اور اسے طارق اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا نور آسمان سے گذر کر ساتویں آسمان کو طے کر جاتا ہے۔ پھر وہاں سے درجہ بدرجہ نیچے کو اتر کر اپنی جگہ پر واپس آجاتا ہے۔ (انوار النعمانیہ)

ستارۂ سکینہ

ایک عراقی منجم نے اپنے کمالِ علم کا اظہار کیا تو حضرتِ امام جعفر صادقؑ نے اس سے امتحاناً پوچھا "ستارۂ سکینہ زہرہ کی روشنی کا کون سا جزو ہے ؟" اس نے کہا یہ وہ ستارہ ہے جسے میں نے کسی سے نہیں سنا کہ کوئی اس کا ذکر بھی کرتا ہو۔ فرمایا سبحان اللہ العظیم۔ کیا تم نے ستارے کو بالکل ہی حذف کر دیا ہے۔ تو پھر تم حساب کس طرح نکالتے ہو؟ (البحار۔ کافی) اس سے معلوم ہوا کہ نجومیوں کا حساب درست نہیں ہے۔

سورج کا لوح محفوظ سے نور اخذ کرنا

بیاع صابری سے حضرت امام جعفر صادقؑ نے پوچھا "آفتاب کس قدر اپنی روشنی چاند پر ڈالتا ہے؟" اس نے کہا "مجھے معلوم نہیں۔" امامؑ نے فرمایا "آفتاب کس قدر اپنی روشنی زہرہ پر ڈالتا ہے ؟" کہا یہ بھی مجھے معلوم نہیں ہے۔ فرمایا "سورج کس قدر نور لوحِ محفوظ سے حاصل کرتا ہے ؟" کہا مجھے معلوم نہیں نہ ہی کبھی یہ بات میں نے سنی ہے۔ امامؑ نے فرمایا۔ یہ ایسی بات ہے کہ اگر اسے کوئی جان لے تو وہ یہ بھی جان سکتا ہے کہ جھاڑی کے اندر بیج کی نے کون سی ہے۔"

یہ تو آج سائنس دان بھی تسلیم کرتے ہیں کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ مگر حضرتِ امام جعفر صادقؑ نے یہ بات سینکڑوں سال پہلے بتائی تھی۔ بلکہ اس ارشاد میں یہ بھی بتایا کہ ستارہ زہرہ بھی سورج ہی سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سائنس دان ابھی تک یہ معلوم نہیں کر سکے کہ سورج کہاں سے روشنی لیتا ہے۔ لیکن امام جعفر صادقؑ بتا گئے کہ سورج لوحِ محفوظ سے روشنی لیتا ہے۔ اور حیات القلوب کی بعض احادیث اہلبیتؑ میں وارد ہوا ہے کہ "لوحِ محفوظ" ہم اہلبیتؑ ہیں۔ تو ثابت ہوا کہ کائنات میں جہاں تک روشنی کا وجود ہے اس کا مرکز اہلبیتؑ ہیں۔ جن کا نور خدا نے تمام کائنات سے پہلے پیدا کیا۔

حضرت علیؑ کی نجومی سے گفتگو

روضۃ الشہدا میں مرقوم ہے کہ "نہروان کی راہ میں جناب امیر المومنینؑ لشکر سمیت دیر سے گذرے۔ ایک بوڑھا نصرانی دیر کے اوپر تھا۔ چیخ مار کر کہا۔ اے لشکر اسلام! اپنے پیشوا سے کہو کہ میرے پاس آئے۔ جب یہ خبر امیر المومنینؑ کو پہنچی۔ حضرت نے گھوڑے کی باگ ادھر کو پھیری۔ جب نزدیک پہنچے نصرانی نے کہا۔ اے سردار لشکر! کہاں جاتے ہو؟ فرمایا دشمنانِ دین سے لڑنے کے لئے۔ وہ بولا۔ دشمنوں سے جنگ کرنے نہ جاؤ۔ کیونکہ اس وقت مسلمانوں کا ستارہ پستی میں ہے۔ اور اہلِ اسلام کی ملّت کا طالع نہائت ضعیف اور کمزور ہے۔ چند روز توقف کیجئے۔ کہ وہ ستارہ بلند ہو جائے اور طالع قوت پکڑ جائے۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا چونکہ تو علمِ آسمانی کا دعویٰ کرتا ہے ذرا مجھ کو فلاں ستارے کی سیر و حرکت کا حال تو بتا؟ بوڑھے نے کہا۔ خدا کی قسم میں نے کبھی اس ستارے کا نام بھی نہیں سُنا۔ حضرت امیرؑ نے دوسرا سوال کیا۔ بوڑھا جواب نہ دے سکا۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا۔ معلوم ہوا کہ تو آسمان کے حالات سے چنداں واقف نہیں ہے۔ زمین کے کچھ حالات دریافت کروں؟ ذرا یہ تو بتا کہ یہاں جس مقام پر تو کھڑا ہے معلوم ہے کہ تیرے قدم کے نیچے کیا چیز دفن ہے؟ بوڑھا بولا خدا کی قسم مجھے کچھ خبر نہیں ہے۔ فرمایا ایک برتن ہے اس قدر دیناروں سے بھرا ہوا ہے اور اس کے سکّے کا نقش ایسا ہے۔ بوڑھے نے کہا۔ تجھے کیونکر معلوم ہوا؟ فرمایا خدا تعالیٰ کی مہربانی اور لطف سے۔

نیز فرمایا جب میں اس قوم مخالف سے جنگ کروں گا تو لشکر اسلام میں دس سے کم آدمی مارے جائیں گے اور مخالفوں کے لشکر میں سے دس سے کم زندہ رہیں گے۔ بوڑھا یہ باتیں سُن کر حیران ہوا۔ پھر حضرتؑ کے حکم سے اس کے پاؤں کے تلے کی زمین کھودی گئی۔ ایک برتن دیناروں سے بھرا ہوا نکلا۔ جنکی تعداد اور سکّہ بالکل حضرتؑ کی فرمائش کے مطابق تھا۔ بوڑھے نے اسی وقت دیر سے نکل کر سرکارِ امیرؑ کے دستِ حق پر بیعت کی اور مسلمان ہو گیا۔ امیر المومنینؑ نہائت

شان وشوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ نہروان کی طرف روانہ ہوئے اور لشکر خوارج سے جو ضلالت میں پڑ کر حضرت کی اطاعت سے نکل گئے تھے مقابلہ لیا۔ ان چار ہزار نامرادوں میں سے تین ہزار نو سو اکانوے میدانِ کارزار میں کام آئے اور نو شخص بھاگ گئے۔ اور لشکرِ اسلام کے صرف نو (۹) آدمی شہید ہوئے۔ اور باقی صحیح سلامت رہے۔ فتح پانے کے بعد "ذوی الثدیہ" کے تلاش کرنے کا حکم دیا۔ ایک دفعہ کشتوں میں تلاش کیا گیا مگر نہ ملا۔ بعض کہنے لگے شاید مارا نہ گیا ہو اور میدانِ جنگ سے بھاگ گیا ہو۔ حضرتؑ نے فرمایا خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں کہتا وہ مارا گیا ہے۔ اس کو تلاش کرو۔ جب دوسری دفعہ تلاش کیا تو دیکھا کہ چالیس مردوں کے نیچے اسی طرز پر جس طرح کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا تھا، پڑا ہوا ہے۔

علمِ جغرافیہ اور سید الساجدینؑ کی دعا

ثقلِ دوم کے چوتھے ہادی حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے ایک دعا میں فرمایا۔

"اے پروردگار! محمدؐ و آلِ محمدؐ علیہم السلام پر اپنی رحمت نازل فرما۔ جو تیرے عرش کے اور جو کچھ بھی زیرِ عرش (تمام عالم) ہے، اس کے ہم وزن ہو۔ جو اس قدر ہو کہ تیرے آسمانوں کو اور جو کچھ ان کے اوپر ہو سب کو بھر دے اور جو کچھ تیری زمینوں اور جو کچھ ان کے نیچے اور ان کے اندر ہے سب کے شمار کے برابر ہو۔"

سرکار سید الساجدینؑ کی اس دعا پر "آمین" کہتے ہوئے ہم اس فصل کو ختم کرتے ہیں اور مسلم سائنسدانوں کو علمِ وہبی کے ارشادات پر غور و فکر و تحقیق و تجربات کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس فصل کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے :-

علم معرفت کا ذریعہ ہے۔ جو شخص جس قدر عالم ہو گا اسی قدر افضل ہو گا۔

بعد از رسولؐ مقبول حضرت علی علیہ السّلام سب سے بلند پایہ عالم ہیں اور ان کا یہ
اعلان کہ جو جی میں آئے پوچھ لو۔ ان کے علیم ہونے کا ثبوت ہے۔ قائدِ ثقل دوم
حضرت علیؑ نے لوگوں کو اس خدشہ سے آگاہ کر دیا تھا کہ اگر تم مجھ سے ہدایت
حاصل نہ کرو گے تو زمانہ کا تغیّر اور فتنہ تمہیں دین سے بھٹکا دے گا۔ امّت نے
آپ کے اس اعلان کی پرواہ نہ کی لہٰذا علم سے محروم رہی اور پستی اس کا مقدر ٹھہرا۔
ثقلین نے جغرافیہ کے ایسے حقائق صدیاں قبل بیان کر دیئے تھے۔ جن میں سے بعض
کو سائنس نے سینکڑوں سال بعد اب معلوم کیا ہے۔ اور بعض تک سائنس دانوں
کی تاحال رسائی نہیں ہو سکی حالانکہ حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ کے پاس نہ تو سائنسی آلات
تھے اور نہ ہی انہوں نے دنیا کی کسی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہ ہی تجربات
کئے تھے۔ پھر ایسے حقائق بتا دینا جہاں ان کے علمِ وہبی کی دلیل ہے وہاں وجود خداوندی
کی بھی ناقابلِ تردید برہان ہے۔ علمِ جغرافیہ صرف ایک زمین سے متعلقہ امور پر بحث
کرتا ہے۔ جبکہ ثقلین کے اقوال میں کئی زمینوں کی نشاندہی ملتی ہے۔ واقعۂ معراج
الرسولؐ سے وسعت کائنات اور کئی جغرافیائی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ زمین
کی بناوٹ و ساخت اور اس کی حرکات و گردش وغیرہ ثقلین کے ارشادات کے
مطابق ہیں۔ ثقلین نے سورج کا زمین سے فاصلہ بغیر سائنسی آلات کے چودہ سو برس
قبل بتا دیا تھا جس کی تصدیق سائنس حاضرہ نے بھی کر دی ہے۔ حضرت علیؑ نے
سورج کا محیط بھی بغیر آلات کے بتا دیا۔ سورج کے متعلق فلسفہ کے نظریات دنیوی علوم
کے مطابق تبدیل ہوتے رہے لیکن ثقلین نے جو سورج کے متعلق حقائق بیان کئے ہیں
وہ مسلّمہ اصول ہیں اور آج کی سائنس ان کی تائید کرتی ہے۔ سورج کا نور کرسی
کے نور کا سترواں حصّہ ہے۔ سورج کا پورا رُخ زمین کی طرف نہیں ہے۔ اگر ایسا
ہوتا تو حیات مفقود ہو جاتی۔ سورج کی تخلیق پانی و آگ سے کی گئی ہے او ۔ ۔
کے سات طبقات ہیں۔ قرآن اور اہلِ بیتؑ اطہار نے چودہ سو برس پہلے نہ صرف
آسمانی دنیاؤں میں زندگی کے وجود کا پتہ بتا دیا تھا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ ہماری

زمین کے لوگ بھی آسمانی زمینوں پر جانے لگ جائیں گے۔ سائنس دان ابھی تک کسی آسمانی جاندار مخلوق کو تو دریافت نہیں کر سکے لیکن خود یہاں کے آدمیوں کو چاند پر بھیج کر ان کے زندہ واپس آنے سے یہ معلوم کر چکے ہیں کہ چاند پر زندہ رہنا ممکن ہے۔ اس بات سے ثقلین کے ارشادات کی تصدیق ہو گئی ہے۔ اور معراجِ جسمانی پر کئے جانے والے قیاسی اعتراضات کی تردید بھی۔ اور سورج کو روشنی کہاں سے ملتی ہے۔ یہ بات سائنسدان معلوم نہیں کر سکے لیکن اہلبیتؑ اطہار نے بتادیا کہ سورج کو لوحِ محفوظ سے روشنی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی حیات القلوب علامہ مجلسیؒ میں وہ احادیث قابلِ توجہ ہیں جن میں اہلبیتؑ نے یہ فرمایا ہے کہ لوحِ محفوظ ہم ہیں۔ ثقلین نے کئی حقائق کی جانب اشارات کئے ہیں۔ جن پر غور و خوض کرنے سے بڑے بڑے عمدہ نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً رنگین زمین۔ سات آسمان و زمین۔ سات راستے۔ آسمان کے کناروں کی نشانیاں۔ آسمانی سمندر و دریا۔ کئی مشرق کئی مغرب۔ زمینوں کا درمیانی فاصلہ اور چودہ کعبے۔ امام زین العابدینؑ کی دُعا سے جغرافیائی حقائق کی جانب قابلِ غور اشارات ملتے ہیں۔ کائنات میں ایک خاص نظم و ترتیب موجود ہے جو صانع و خالق حکیم کے وجود کا واضح ثبوت ہے۔ اور عترت اہل بیتِ رسالتؐ کا علم وہبی جو ان کے ارشادات سے ظاہر ہے ان کے ہادیانِ برحق ہونے کا ثبوت ہے۔ اور یہ علم اُن دوسرے لوگوں میں کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتا جن کو عترتِ اہلبیتؑ کے برابر لانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

~~~~~~
~~~~~~

فصل پنجم

علم جمادات

مشہور ہے کہ خلاقِ کائنات نے اِنسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے اور دیگر مخلوقات اسکے ماتحت اسکی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے خلق کی گئی ہیں۔ علاوہ دیگر مادّی اَشیاء کے پتھر انسانی ضروریاتِ زندگی میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں، بلکہ مطالعۂ تاریخِ اِنسان سے معلوم ہوتا ہے کہ اِنسان اور پتھر کا بڑا ہی قدیم رشتہ ہے اور بنی آدم کی تاریخ کے اوّلین دَور کو "پتھر کا دَور" کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں انسان اپنی اکثر ضروریات کو پتھر ہی سے پورا کرتا تھا۔ پتھروں سے آگ روشن کی جاتی تھی اور ان ہی پتھروں سے شکار کیا جاتا تھا۔ پرانے زمانے میں پتھروں کے زیورات، برتن اور زیبائش کا سامان تیار کیا جاتا تھا اور آثارِ قدیمہ میں آج بھی ان باتوں کے ثبوت موجود ہیں۔ نہ صرف پتھروں سے معاشرتی فوائد حاصل کئے جاتے تھے، بلکہ ان سے سامانِ حرب بھی تیار کیا جاتا تھا یعنی ہتھیار بھی بنائے جاتے تھے۔

اِسلام چونکہ ہر گوشۂ حیات پر حاوی ہے، لہٰذا اِسلام نے پتھروں کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا، بلکہ "حَجَرُالاَسود" کو عینِ حرم کعبہ میں رکھ کر مسلمانوں کو اس کو بوسہ لینے کا حکم دے کر پتھر کی عظمت کو اور بلند کر دیا، سورۂ فیل میں اَبابیلوں سے لشکرِ "اَبرَہہ" پر سنگ باری کرانے کا تذکرہ موجود ہے جس سے ایک طرف تو پتھر کا ہتھیارِ جنگ ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف بمباری کا تصوّر بھی ملتا ہے۔

الغرض اِنسانی تنزّل و ترقی کیساتھ پتھر کو بھی ایک اَٹوٹ رشتہ حاصل ہے۔ علم جمادات میں پتھر کے خواص اور اثرات اور اَقسام کے متعلق بحث کی جاتی ہے۔ دَورِ حاضر میں اکثر لوگ جمادات کو عبث تصور کر کے حکمتِ خداوندی

کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگوں نے تحقیقات و ریسرچ کر کے یہ بات ثابت کی ہے کہ ہر شئے میں کچھ نہ کچھ اثرات صدر ہوتے ہیں، چنانچہ پتھروں کے اثرات معلوم کرنے میں بھی اب کچھ دلچسپی پائی جاتی ہے "علیقی رنگ" اور اس قسم کی دیگر ایجادات نے لوگوں کو مجبور کر دیا ہے کہ پتھروں کے خواص و اثرات کو بھی تسلیم کر لیں۔

چنانچہ ہادیانِ اسلام نے بھی جمادات کی قوتوں کے پوشیدہ خزانوں سے عوام الناس کو آگاہ کیا ہے اور جمادات کے طبی فوائد کے علاوہ دیگر داخلی و خارجی اثرات کی بھی تعلیم فرمائی ہے۔

حجرُ الاسود

حجرالاسود (کالا پتھر)، اس پتھر نے دیگر تمام پتھروں کے مقابلے پر احترام کی آخری منزل پر پہنچ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر اللہ کسی پتھر کو بھی اپنی طرف منسوب کرے، تو اس کی منزلت اس قدر عالی شان ہو جاتی ہے کہ اشرف المخلوقات کو اسے بوسہ دینا پڑتا ہے۔ بلکہ سیّد الانبیاء نے بھی اُسے بوسہ دیا ہے۔

سیاہ رنگ کا یہ پتھر دیوارِ خانۂ کعبہ میں زمین سے کچھ اونچا نصب ہے۔ حاجی اس سے چمٹ کر دعائیں مانگتے ہیں اور اسکو مس کرنا کفارۂ گناہان سمجھتے ہیں۔ روزِ جزاء یہ پتھر اپنے زائرین کی گواہی دیگا۔ کتب میں بیان ہے کہ اس پتھر کو کوئی غیر معصوم اسکی جگہ پر نصب نہیں کر سکتا۔ یہ پتھر شروع میں روشن تھا اور حضرت جبرائیلؑ اسے جنت سے لائے تھے۔ سرکار رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حجرالاسود کے پاس دعا قبول ہوتی ہے۔ اسکو مس کرنا رسولِ خدا سے مصافحہ کرنے کے مثل ہے بیمار اگر اسے مس کرے تو شفا پاتا ہے۔ ایک شخص نے کہدیا تھا کہ حجرالاسود کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتا حضرت علیؑ نے اسکی تردید فرمائی فرمایا "پہنچائیگا"۔

دُرِّ نجف

یہ پتھر سفید رنگ کا چمکدار ہوتا ہے نجف اشرف میں پایا جاتا ہے۔ اسکی فضیلت میں تحریر ہے کہ اسکی انگوٹھی تحائف میں خدائے تعالیٰ نے حضرت علی علیہ السّلام کو عطا فرمائی۔ اسکی عظمت میں اور کوئی پتھر اسکے ہم رتبہ نہیں ہے۔ یہ کثیر مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ارزاں ہے۔ شہر نجف میں دو طرح کے دُرِ نجف فروخت ہوتے ہیں۔ بری و بحری۔ بحری دُرِ نجف نہایت سفید براق ہوتا ہے، اور بری میں چمک کم ہوتی ہے۔ روایت میں ہے کہ ایک روز مفضّل دُرِ نجف کی انگوٹھی پہنے امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا۔

"اے مفضل! یہ نگینہ درد چشم میں ہر مومن اور مومنہ کے لئے مفید ہے۔"

اس نگینہ کی انگوٹھی پر نظر کرنا اور ہاتھ میں پہننا بہت ثواب رکھتا ہے اور یہ مزاج میں خوشی پیدا کرتا ہے۔" "دُرِ نجف" ہر شخص استعمال کر سکتا ہے۔ یہ پتھر سوائے فائدہ کے نقصان کرتا ہی نہیں۔

دہانۂ فرنگ

اس پتھر کو فارسی میں انگارِ فرنگی یا انگارِ معدنی، عربی میں فرنج اور انگریزی میں (KIDNEY STONE) کڈنی اسٹون کہا جاتا ہے، اسکا رنگ نیلا، سبز و سفید اور دودھیا ملا جلا ہوتا ہے، اس پتھر سے اکثر نگ بنتے ہیں، یہ پتھر سونے چاندی، تانبے اور لوہے کی کانوں سے نکلتا ہے۔ اس لحاظ سے اسکا کس بھی جس دھات کی کان سے نکلا ہوا ہو، اسی دھات کا رنگ دیتا ہے، طلائی اور نقرئی کس کا یہ پتھر عمدہ ہوتا ہے۔

اسکا مزا پھیکا، مزاج سرد و خشک اور گرم و خشک ہے۔ اکثر زہروں کا تریاق ہے۔ اس پتھر کو منھ میں رکھ کر تھوک نگلنا بھی مہلک ہے۔ حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں کہ آنکھ کی پتلی میں سفیدی آجانے پر اس پتھر کو انتہائی باریک پیس کر مثل سُرمہ استعمال کرنے سے مرض جاتا رہتا ہے۔

سونے چاندی کے کس والا نگینہ، درد گردہ اور درد پتہ کیلئے مفید ہے۔ بشرطیکہ انگوٹھی اس طرز سے بنوائی جائے کہ نگینہ انگلی سے مس ہوتا رہے۔ اس انگوٹھی کو اگر تندرست پہن لے تو پیشاب میں اکثر جلن یا سوزش کی شکایت ہو جاتی ہے۔ یہ پتھر امریکہ، مصر، چین اور بھارت میں پایا جاتا ہے۔

زبرجد

اس پتھر کو عربی میں زبرجد اور انگریزی میں بیرل (BERYL) کہتے ہیں، مزاج سرد و خشک اور مزا تلخ ہوتا ہے۔ اس میں تانبے کے اجزاء بھی شامل ہیں۔ قیمتی جواہر ہے۔ یہ مثل زمرد کے سبزی مائل ہے۔ امام علی الرضا سے منقول ہے کہ اسکی انگوٹھی غربت کو تونگری میں تبدیل کر دیتی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق نے اس پتھر کی بہت تعریف فرمائی ہے۔ حکمائے سابقین کے خیال کے مطابق مفرح اور دافع مرض جذام ہے۔ نظر کو قوت دیتا ہے۔ کھانسی اور دمہ کو رفع کرتا ہے۔ پتھری کو توڑتا ہے۔ مرگی کے دورے سے بچنے کیلئے اسکا لاکٹ پہننا چاہیئے۔ مردانہ قوت اور اعضاء رئیسہ کیلئے مقوی ہے۔ زبرجد پر اگر سانپ کی نظر پڑ جائے تو اندھا ہو جاتا ہے۔ حاملہ عورت کے ہاتھ میں ہونے سے وضع حمل میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ پتھر بُرے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسے گھس کر داد پر لگانے سے مرض سے نجات مل جاتی ہے۔ اسکا منجن مفید ہوتا ہے۔ اکثر تانبے کی کانوں سے دستیاب ہوتا ہے۔ مصر، اسکاٹ لینڈ، امریکہ اور برازیل

زمرد یعنی پنا

زمرد تمام سبز رنگ کے پتھروں سے افضل ہے سبز رنگ امام حسنؑ سے منسوب ہے، یہ پتھر جواہرات میں شامل ہے اسکا مزاج سرد و خشک ہے اسکی انگوٹھی مقوی دل و دماغ ہے اور روح کو طاقت دیتی ہے۔ بچوں کے گلے میں اسکا لاکٹ پہنانے سے مرض امّ الصبیان اور مرگی سے بچاؤ ہوتا ہے۔ اسکا سرمہ نظر کو تیز کرتا ہے۔ اسکی انگوٹھی غم و غصہ کو دفع کرتی ہے۔ مزاج میں خوشی محبت اور وفاداری پیدا کرنا اس پتھر کی خصوصیت ہے۔ یہ پتھر آفت اور سخت مصیبت میں ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے۔ اسکے نگینہ کو اگر زبان کے نیچے رکھا جائے تو مزاج میں فقرا جیسی صفت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس پر نگاہ رکھنے سے بصارت تیز ہوتی ہے۔ اسکی انگوٹھی مرض سِل کو دفع کرتی ہے اور مشکل کام میں آسانی ہوجاتی ہے۔ اس پتھر کو سر سے باندھنے سے درد سر جاتا رہتا ہے حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا، زمرد ہر مشکل کو آسان کرتا ہے۔ حضرت علیؑ کا بھی ایسا ہی ارشاد ہے۔

زمرد اور حضرت خلیلؑ

حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں پھینکنے کا انتظام کیا گیا۔ تو خدائے تعالےٰ نے حضرت جبرئیل کے ذریعے آپ کو زمرد کی انگوٹھی بھیجی تھی جس پر مندرجہ ذیل کلمات تھے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ فوضت امری الی اللہ اسندت ظهری الی اللہ حسبی اللہ۔

یہ پتھر نبض کی حرکت تیز کرتا ہے۔ اسکا گشتہ مقوی جگر ہے۔ زمرد میں نیلم سے سوراخ کیا جا سکتا ہے۔ اسمیں گرمی پہنچانے سے برقی طاقت بڑھتی ہے۔ چار رتی کا وزنی زود اثر ہوتا ہے۔ یہ پتھر گائے کے دودھ سے صاف ہوتا ہے۔ اس میں قدرتی طور پر دھاریاں ہوتی ہیں۔ جو سرے کی سطح سے متوازی ہوتی ہے۔ اچھا اور عمدہ زمرد رنگ میں مثل طوطے کے پر اور بالکل ہری گھاس کی مانند ہوتا ہے۔ پرانے لوگوں میں یہ خیال عام تھا اگر کوئی شخص عہد شکنی کرے۔ تو زمرد اسکے ہاتھ اپنا رنگ تبدیل کر لیا کرتا ہے۔ اس پتھر میں شگاف، غلط لکیر، پرت، مکڑی کے جالے کی سطح پر ہونا عیب میں شامل ہے۔

سنگِ سلیمانی

(ONYX) یہ پتھر عقیق کی قسم کا ہے اور عقیق کی کان سے دستیاب ہوتا ہے یہ مختلف رنگ کا ہوتا ہے۔ مثلاً سفید، سیاہ، سرخ، پیلا وغیرہ۔ عموماً اس میں بھوری، سیاہ، سفید رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس پر رنگ کے چھاپے چڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں رطوبت جلد جذب

کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کا مزاج گرم وخشک ہے طبی لحاظ سے خشکی بہت کرتا ہے جسم میں گرمی پیدا کرتا ہے۔ لقوہ یرقان اور اُم الصبیان کو دفع کرتا ہے بچوں کے گلے میں ڈالنے سے خراب رطوبت خارج ہوتی ہے۔

اس کو پاس رکھنے سے غم وغصہ میں اضافہ ہوتا ہے، اکثر بھیانک خواب آتے ہیں آنکھ میں اس کا سرمہ لگانے سے موتیہ وجالا کو فائدہ ہوتا ہے، زخم پر لگانے سے زخم بھر جاتا ہے۔ خراب گوشت کاٹتا ہے۔ بالوں میں باندھنے سے دردزہ میں کمی ہوتی ہے وضع حمل میں آسانی ہوتی ہے۔

اس کی انگوٹھی جس کا نگینہ سیاہ وسفید ہو یا اس پتھر کو پاس رکھنے سے عزت بڑھتی ہے دافع یرقان ہے اور حاکم وقت کو مسخر کرتا ہے۔

جزع یمانی حضرت امام علیؑ رضا اپنے جد امجد حضرت رسول کریمؐ اور جد اعلیٰ جناب امیرالمومنینؑ سے نقل فرماتے ہیں کہ ایک روز جناب رسولؐ جزع یمانی کی انگوٹھی پہنے گھر سے باہر تشریف لائے اور نماز پڑھائی جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا جو شخص اس کی انگوٹھی پہن کر نماز پڑھے اس کی نماز ستر نمازوں سے افضل ہے۔ یہ نگینہ تسبیح پڑھتا اور استغفار کرتا ہے جس کا ثواب انگوٹھی پہننے والے کو بھی پہنچتا ہے۔ اس پتھر کی نسبت حضرت سلیمانؑ سے دی جاتی ہے جناب امیرؑ ارشاد فرماتے ہیں اس کی انگوٹھی شیاطین کے مکر کو دور کرتی ہے اس پتھر کی رگڑ سے برقی قوت بھی حاصل ہوتی ہے۔

عقیق CORELIAN عقیق کئی رنگ کا ہوتا ہے، سُرخ، سفید، زرد، نیلا، سیاہ اور سبز، اس کا مزہ پھیکا اور مزاج سرد وخشک ہے۔ یہ مفرحِ قلب اور مقوی نظر ہے گلے میں پہننے سے غم وغصہ دور ہوتا ہے، منہ سے خون آنے اور چوٹ سے خون جاری ہونے کو بند کرتا ہے اس کی انگوٹھی گناہوں سے دور رہنے اور شہادت کی طرف طبیعت کو راغب کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ قدیم صوفیا اس پتھر کی مالا پہنا کرتے تھے اس کا نگینہ مزاج کے چڑچڑاپن کو دفع کرتا ہے دنیوی امور کے لئے معاون نگینہ ہے کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے انسان میں خود اعتمادی مستقل مزاجی اور حوصلہ مندی پیدا کرتا ہے اس کا لاکٹ گلے میں پہننے سے اختلاجِ قلب

دور ہوتا ہے دافع خفقان ہے کلیجی رنگ کا پتھر عورتوں میں خون کی زیادتی روکتا ہے عقیق پر کندہ الفاظ ہمیشہ اپنی اصلی حالت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

علاوہ دیگر اثرات کے عقیق کی صفتِ خاص یہ ہے کہ دل سے کینہ و نفاق دور کرتا ہے اس پتھر کی بہت سی قسمیں ہیں۔ سب سے اعلیٰ و بہتر عقیق یمنی ہے اس کے پہننے سے مزاج میں سنجیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ پتھر شیاطین کے مکر و فریب کو دور کرتا ہے۔ پہننے والے کا غصہ کم ہوتا ہے۔ دشمنوں کو زیر کرتا ہے اس کا سُرمہ نظر تیز کرتا ہے اور اس کا منجن پائیریا کے لئے اکسیر ہے۔

بعض عقیقوں میں ابرک کی طرح پرت بھی ہوتے ہیں جو شخص کافور و عنبر کے ساتھ عقیق کو گھس کر اُسے ماتھے پر لگا کر حاکم کے سامنے جائے حاکم مہربان ہو لیکن عقیق کھانے سے معدہ میں امراض پیدا ہوتے ہیں۔

امام موسیٰ کاظم فرماتے ہیں کہ عقیق کی تسبیح کے دانے پھرا کر ذکرِ خدا کرنے سے ایک دانے کے عوض چالیس حسنہ نامۂ اعمال میں منجانب خدا لکھے جاتے ہیں۔

عقیق کی انگوٹھی حضرت آدمؑ سے حضرتِ خاتمؐ تک جاری ہے اس کا پہننا باعثِ ثواب ہے۔ حضرتِ صادق کا ارشاد ہے کہ عقیق کی انگوٹھی پہن کر نماز پڑھنا چالیس درجہ زیادہ شرف رکھتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ جس ہاتھ میں عقیق کی انگوٹھی ہو گی بشرطیکہ وہ دوستدارِ علیؑ ابنِ ابی طالب ہو وہ ہاتھ آتشِ جہنم سے محفوظ ہو گا۔ روایت میں ہے کہ حضرت آدمؑ کے ہاتھ میں سُرخ عقیق کی انگوٹھی تھی۔ اسی طرح حضورؐ کا ارشاد ہے کہ بہشت سے جبرئیلؑ عقیق سُرخ لائے اور مجھے پہننے کے لئے کہا۔ اور میری اُمت کے لئے بھی کہا کہ وہ اُسے پہنے۔ آئمہ معصومینؑ کا ارشاد ہے کہ عقیق سفر میں جمیع بلیات سے نگہبانی کرتا ہے۔

فیروزہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ جو شخص فیروزے کی انگوٹھی پہنے گا محتاج نہ ہو گا۔ جناب امیر المومنینؑ کی انگوٹھی فیروزہ کی تھی۔ اور اس میں نگینہ کے اوپر کی جانب "لِلّٰہِ الْمُلْکُ" نقش تھا جس کے معنی ہیں سلطنت اللہ کی ہے، اور نگینے کی نیچے کی جانب "اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّار" نقش تھا جس کے معنی ہیں کہ سلطنت خدائے واحد قہار کی ہے۔ حضرت امام موسیٰ کاظم کے پاس حسن ابن علی ابن مہران نے وہ انگوٹھی دیکھی۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا کہ وہی انگوٹھی

ہے اور یہ نگینہ جبرائیلؑ اس رسولؐ خدا کے لیئے بہشت سے ہدیہ لائے تھے۔ اور حضورؐ نے یہ انگوٹھی حضرت علیؑ کو عنایت فرمائی تھی جو درجہ بدرجہ ہم تک پہنچی ہے۔

رسول کریمؐ حدیث قدسی بیان فرماتے ہیں کہ پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا "جس ہاتھ میں عقیق اور فیروزہ کی انگشتری ہو اور وہ ہاتھ میرے حضور دعا کے لئے پھیلایا جائے تو میں اُسے ناامید نہیں پھیرتا"

حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں علی ابن محمد ضمیری نے عرض کیا کہ میں نے جعفر ابن محمود کی بیٹی سے شادی کی اور مجھے اس سے بڑی محبت ہے مگر اس سے اولاد نہیں ہوتی امام علیہ السلام نے اس کی بات سن کر تبسم کے ساتھ ارشاد فرمایا فیروزہ کے نگینے والی انگوٹھی لے اور اس کے نگینے پر رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰارِثِیْنَ کندہ کروا تعمیل ارشاد کرنے پر ایک سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ اللہ نے اُسے اُسی زوجہ سے فرزند عطا فرمایا۔

(نوٹ:۔ اہل بیتؑ نے فرمایا کہ فیروزہ خوش رنگ ہونا چاہیئے)

موتی

قرآن مجید پ۲۷ سورہ رحمٰن آیت ۲۲ میں اللہ سبحانہ نے مرجان کے ساتھ موتی کو اپنی خاص نعمتوں میں قرار دیا ہے۔ احادیث اہل بیتؑ میں وارد ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ دونوں شہزادوں نے ایک مرتبہ تختیاں لکھیں۔ اور یہ فیصلہ کروانے کے لیئے کہ کس کا خط زیادہ اچھا ہے اپنے نانا سید عالمین محمد مصطفےٰؐ کی خدمتِ بابرکات میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے بارگاہ الٰہی میں دعا فرمائی کہ اے میرے پروردگار اس امر کا تو خود فیصلہ فرما۔ تو جناب جبرئیلؑ پانچ موتی جنت سے لیکر حاضر بارگاہ رسالتؐ ہوئے اور وہ موتی زمین پر ڈال کر دونوں شہزادوں سے کہا کہ جو زیادہ موتی اٹھائے گا۔ اُسی شہزادے کا خط دوسرے کی نسبت زیادہ اچھا مانا جائے گا۔ دونوں شہزادوں نے موتیوں پر ہاتھ ڈالے اور دو دو موتی ہاتھ آئے۔ جب پانچویں موتی کی طرف دونوں نے ہاتھ بڑھائے تو قدرت الٰہی سے پانچواں موتی دو بالکل برابر ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا اور ہر ایک کے ہاتھ نصف موتی آیا معلوم ہوا کہ موتی جنت کی نعمتوں میں بھی موجود ہے اور خداوند عالم نے دونوں شہزادوں کو جو انعام میں دیئے وہ موتی ہی تھے۔ احادیث میں یہ بھی منقول ہے کہ غم حسینؑ میں بہنے والے ہر اشک مومن کو قیامت کے دن پروردگار عالمین موتیوں میں تبدیل فرما دے گا۔ اور

جب ان کی قیمت کا سوال آئے گا، تو وہ قیمت جنت قرار دی جائے گی۔ کتاب "روضۃ الشہدا" میں علامہ حسینؒ علی واعظ کاشفی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ جو حسینؑ پر رونے یا رُلائے اس پر جنت واجب ہو گی پس ثابت ہوا کہ موتی بہت بڑی نعمت ہے علم طب میں موتی کے فوائد مسلّمات میں سے ہیں تمام دُنیا میں موتیوں کو قدر و قیمت سے دیکھا اور استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا سورہ رحمٰن کا ارشاد بالکل صحیح ہے۔

یاقوت حضرت امام علی رضاؑ سے منقول ہے کہ یاقوت کی انگشتری پہننے سے پریشانیاں زائل ہو جاتی ہیں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یاقوت اور زبرجد کی انگشتری داہنے ہاتھ میں پہننا سُنّت ہے۔ امام رضاؑ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یاقوت زرد دپھراج کی انگشتری جو شخص پہنے گا کبھی فقیر نہ ہو گا۔ اور یاقوت کو تمام اقوام عالم میں قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کئی کتابوں سے ثابت ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی انگشتری یاقوت کے نگینے والی تھی جس کا حضرت امام مہدیؑ کے پاس موجود ہونا بھی کتابوں سے ثابت ہے یہی انگشتری سب آئمہ اہلبیتؑ کے پاس رہی ہے۔ اور حضرت علیؑ نے اس کے نگینے پر سبحان من فخری ان لہ عبدًا (پاک ہے وہ کہ جس کا بندہ ہونے میں مجھے فخر ہے) تحریر فرمایا حضرت امام جعفرؑ صادق فرماتے ہیں کہ نگینہ یاقوت فاخر ترین ہے۔ اور جن پانچ نگینوں کو آپؑ نے اہل ایمان کے لیے تجویز فرمایا ان میں سب سے اوّل یاقوت ہی کو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ وہ سب سے عُمدہ ہے۔

سُورہ رحمٰن میں بھی یاقوت کا ذکر موجود ہے اور روایات سے ثابت ہے کہ یاقوت جنت کی نعمتوں میں سے ہے اور سب سے زیادہ قیمتی جواہرات میں سے ہے۔ جس میں شعاعیں گذر کر نہایت مفید اثر ڈالتی ہیں، پتھروں کے خواص پر نکتہ چینی وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں یہ علم نہیں کہ عام جمادات میں عموماً اور نگینے والے پتھروں میں خصوصاً شعاعی قوت اخذ کرنے کی صلاحیت موجود ہے، جیسا کہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ عقیق ستارہ مشتری کی شعاعیں اخذ کر کے پہننے والے کے جسم میں منتقل کرتا

ہے جس کے نہایت اچھے اثرات صحت و ذہن پر ہوتے ہیں۔

خاکِ شفا

حدیث کی بڑی بڑی کتابوں میں ذکر آیا ہے کہ رسول پاکؐ کے لعاب دہن میں تاثیر شفا تھی۔ جیسا کہ جنگ خیبر کے موقعہ پر اپنے لعاب دہن سے حضورؐ نے آشوب چشم علی المرتضیٰؑ کو زائل فرمایا۔ اور ایک جگہ ایک کڑوے پانی کے کنوئیں میں اپنا پُر اعجاز لعاب دہن ڈال کر اس پانی کو شیریں کر دیا یعنی ان تمام زمینوں سے کڑواہٹ کے اثرات کو زائل کر دیا۔ جن میں سے گذرنے کی وجہ سے پانی کڑوا ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کے وضو کے پانی کو جس میں حضورؐ کی کلیوں کا پانی ہوتا تھا اصحاب رسولؐ تبرکاً بامید شفا لے لیتے تھے۔ حضرت امام حسینؑ نے رسول کریمؐ کا لعاب دہن حضورؐ ہی کی زبانِ مبارک سے چوس چوس کر پرورش پائی تھی۔ اور آپ حضورؐ ہی کے نور کا ٹکڑا ہیں۔ جیسا کہ حدیث "حُسَیْنٌ مِنِّی وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْن" سے ثابت ہوتا ہے۔ پس اگر آب زم زم حضرت اسمٰعیلؑ کی ایڑیوں کی رگڑ کی وجہ سے آج تک متبرک ہے۔ اور باعثِ شفا سمجھا جاتا ہے تو وہ خاکِ پاک جس میں خونِ حسینؑ ملا ہوا ہے وہ خاکِ شفا کیوں نہیں ہو سکتی! خونِ حسینؑ میں لعابِ دہن رسولؐ کی تاثیرِ شفا اور نورِ محمدیؐ کی شعاعوں کی نوری تاثیر شامل ہے۔

اس خونِ حسینؑ کا ایک معجزہ پاکستان کے شہر ملتان میں بھی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ وہاں ریاست پٹیالہ کے شہر سامانہ کے ایک مہاجر خاندان کے پاس خاکِ شفا کی ایک ایسی مقدس متبرک اور پُر اعجاز تسبیح ہے کہ جس میں خونِ حسینؑ اب بھی جوش مارتا ہے یعنی جب بھی روزِ عاشورہ آتا ہے وہ تسبیح بالکل سُرخ ہو جاتی ہے اور بل کھاتی ہے اور یہ کیفیت گویا ایک اعلانِ مظلومیت ہے کہ جو خود حسینؑ کا لہو ہر سال روزِ عاشورہ کرتا ہے اور اپنی مظلومیت کے ساتھ ساتھ قرآن کی صداقت بھی ثابت کرتا ہے کہ قرآن مجید نے جو دعویٰ کیا ہے کہ شہید زندہ ہوتے ہیں یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے دیکھ لو کہ میری شہادت کے سینکڑوں سال بعد بھی میرے خون میں زندگی ہے حسینؑ کے سرِ مبارک نے بر سرِ نوکِ سناں قرآن مجید کی تلاوت فرمائی جس کا ذکر "سرّ الشہادتین" میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی کیا ہے اور معین الدین چشتی تو حسینؑ ہی کو دین اور بنائے لا الٰہ تسلیم کرتے رہے ہیں پس جو خون دین کا خون ہے بنائے لا الٰہ کا خون ہے اور جس خون میں تاثیر شیر زہراؑ بھی ہے اور تاثیر

لعاب دہنِ رسولؐ بھی ہے وہ جس زمین میں ملا اس زمین کی خاک یقیناً خاکِ شفا ہے اسی لئے ائمۂ طاہرین نے فرمایا ہے کہ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی قبرِ مبارک کی خاک اور قبر پاک سے ایک میل کے فاصلے تک کی مٹی خاکِ شفا ہے کہ جس میں ہر بیماری کے لئے شفا اور ہر خوف کے لیئے امان ہے۔ اور جس شخص کو اس مٹی کے خاکِ شفا ہونے کا یقین ہے جب وہ اس سے معالجہ کرے گا تو پھر اُسے دوسری دوا کی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ سب یقینِ محکم کی بات ہے۔ بے ایمان اور بے یقین کو کوئی فائدہ ہونا ضروری نہیں ہے جس طرح کہ بنجر زمین کو بارش کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اور جیسے ابوجہل نے تعلیماتِ رسولؐ کا کوئی اثر نہیں لیا جس طرح بارش میں کمی نہیں بنجر زمین کا ظرف خراب ہے اس میں اثر لینے کی صلاحیت نہیں اسطرح تعلیماتِ رسولؐ میں کمی نہ تھی ابوجہل کا ظرف خراب تھا اور رحمت کا اثر لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ اس طرح اگر کسی کا ظرفِ دل بے ایمانی و بے یقینی کی وجہ سے خراب ہوا ور اُسے شفا نہ ملے تو خاکِ شفا میں کوئی کمی نہیں بلکہ اس بے ایمان و بے یقین شخص کا ظرف رحمتِ شفا قبول نہیں کرتا

سجدہ گاہ کا ثبوت

خاکِ شفا کے تذکرہ میں ایک اور اعتراض اہل تشیع پر کیا جاتا ہے کہ وہ سجدہ گاہ کیوں استعمال کرتے ہیں لہٰذا اس کا جواب تحریر کر دینا بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ اہل سنتہ کی کتاب صحیح بخاری مترجم مطبوعہ سعیدی کراچی جلد ۱ کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ علی الخمرہ باب ۲۶۴ کے صفحہ ۲۲۰ پر حدیث ۳۷۱ یوں تحریر ہے "ابوالولید، شعبہ، سلیمان شیبانی، عبداللہ بن شداد، حضرت میمونہ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم خمرہ پر نماز ادا فرمایا کرتے تھے" (مزید ملاحظہ فرمایئے سنن کبریٰ بیہقی مطبوعہ حیدرآباد دکن جلد نمبر ۲ باب الصلوٰۃ علی الخمرہ ص ۴۲۱) چنانچہ کتاب "مجمع بحار الانوار" مصنفہ علامہ محمد طاہر فتنی مطبوعہ نولکشور جلد اوّل باب الخاء مع المیم ص ۳۷۵ سطر ۱۹ میں "خمرہ" کے معنی اس طرح لکھے ہیں " یہ وہی چیز ہے جس پر اب شیعہ سجدہ کرتے ہیں۔ یہ بھی واضح ہے۔ اہلِ سنتہ والجماعتہ (بریلوی) کے رہنما علامہ احمد رضا خان بریلوی نے اپنی کتاب "حیات الموات" میں علاّمہ محمد طاہر صاحب مجمع بحار الانوار کو فاضل محدث تحریر کیا ہے۔

شعاعی قوت
(RAYS ENERGY)

ثقل اول نے متعدد آیات میں جمادات کا ذکر فرمایا ہے جس میں لوہے کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک سورۃ کا نام ہی حدید (لوہا) قرار دیا ہے اور اس میں ارشادِ قدرت ہوتا ہے "اور ہم نے اس لوہے کو نازل کیا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہے۔ تاکہ اللہ اس شخص کو ظاہر کرے جو اللہ کی اور اس کے رسولوں کی غیبی نصرت کرتا ہے" (سورۃ حدید)

علم جمادات پر گفتگو کرتے ہوئے جب ہم لوہے کے متعلق غور کرتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ عام لوہا جو انسانی استعمال میں آرہا ہے اور جس سے عام آلات و ہتھیار، مختلف قسم کی چیزیں اور ہلکی و بھاری مشینیں بنائی جاتی ہیں یہ زمین ہی سے نکلتا ہے آسمان سے نازل نہیں ہوتا۔ لیکن آیت مندرجہ بالا میں ارشادِ قدرت ہے کہ ہم نے خاص لوہا نازل کیا۔ وہ نازل ہونے والا لوہا جس سے کسی ایک خاص شخص نے اللہ اور اس کے رسولوں کی نصرت کی وہ اس زمین سے نکلنے والا لوہا نہ تھا یا تو تسلیم کرلیا جائے کہ وہ "ذوالفقار حیدرِ کرار" ہے۔ جس کے ذریعے سے حضرت علی علیہ السلام نے اللہ اور رسولوں کی نصرت فرمائی یا پھر عام لوہے کا نزول ثابت کیا جائے خیر اس بحث کو چھوڑ کر ثقلِ اوّل کی اس عظیم الشان آیت پر غور کیا جائے تو یہ بتا رہی ہے کہ عالمِ سماوی میں لوہا موجود ہے۔

پھر دوسری جگہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر فرماتے ہوئے ثقل اوّل میں فرماتا ہے کہ "ہم نے داؤدؑ کے لئے لوہے کو نرم کردیا تھا" اور اس آیت کی تفسیر میں اہل بیت اطہار نے فرمایا ہے کہ حضرت داؤد اپنے ہاتھ ہی سے لوہے کو نرم کرکے زرہ وغیرہ بنا لیتے تھے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کے جسم نوری میں اللہ نے نور کی ایسی شعاعیں رکھی تھیں جو لوہے پر پڑتے ہی لوہے کو نرم کردیتی تھیں۔ حالانکہ عام انسان ایسا کرنے سے عاجز ہے۔ اسی لئے اس کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ معجزات حدودِ عقلانی سے باہر نہیں ہیں لہٰذا ایسی شعاعوں کا ثبوت ویلڈنگ (WELDING)

کی شعاعیں ہیں جن سے دھاتوں کو پگھلایا اور نرم کیا جا سکتا ہے مختلف قسم کی شعاعوں میں مختلف قسم کے اثرات ہیں۔ جیسا کہ ایک وہ شعاع ہے جس کے ذریعے سے جسم کے اندرونی حصوں کی فلم لی جاتی ہے اور اس شعاع کو (X-RAY) ایکسرے کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نور کی ایک شعاع کا ذکر حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا ہے" کہ حضرت موسٰی جب کوہِ طور پر مناجات فرماتے تھے تو اُن کے چہرہ مبارک کے نور کی شعاعیں (RAYS) جب طور کی) زمین پر پڑتی تھیں تو وہ پتھر عقیق بن جاتے تھے۔

امام حسینؑ کے اس ارشاد سے ہمیں یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ شعاعوں کی ایک قسم ایسی بھی ہے کہ اگر وہ پتھروں پر ڈالی جائے تو انہیں عقیق میں تبدیل کر سکتی ہے اسی طرح دوسری قسم کی شعاع یاقوت میں، تیسری قسم کی شعاع زمرد میں اور اسی طرح سے مختلف شعاعیں پتھروں کو مختلف جواہرات میں تبدیل کر سکتی ہیں اس لئے جن ہستیوں کی خلقت نور سے ہوئی ہے۔ ان کے لئے مٹی کو سونا، پتھروں کو جواہرات بنانا یا پانی پر اپنے نوری ہاتھوں کی شعاعیں ڈال کر اُسے جواہرات میں تبدیل کر دینا ناممکن نہیں ہے۔ پتھروں اور پہاڑوں پر گفتگو کرتے ہوئے جب ہم واقعۂ کوہِ طور پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نور کی تجلی ہونے یعنی پہاڑ پر نور کی شعاعیں پڑنے سے پہاڑ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا، اور ستر آدمی جو وہاں موجود تھے مر گئے لیکن حضرت موسیٰؑ کو اس شعاعِ نور نے ہلاک نہیں کیا کیونکہ وہ خود نوری تھے۔ اس واقعے سے نور کی شعاعوں کی ایسی طاقت کا پتہ چلتا ہے کہ اس سے پہاڑوں کے ٹکڑے اڑائے جا سکتے ہیں اگر ہم ثقل اوّل اور ثقل دوم کی ان تعلیمات سے ہدایت لیتے ہوئے مختلف قسم کی شعاعیں حاصل کرنے اور اُن سے کام لینے کی کوشش کریں تو شعاعی طاقت (RAYS ENERGY) کے ذریعے سے ہمارے لئے پتھروں کو جواہرات اور قیمتی دھاتوں میں تبدیل کر لینا یا سڑکوں اور ریلوں کیلئے نہایت آسانی سے پہاڑوں کو کاٹ دینا یا کسی جگہ سے پہاڑ کو ہٹا دینا ناممکن نہیں اسی لئے قرآن مجید سورۃ رعد میں اس چیز کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ کہ قرآن مجید (کے علوم) کے ذریعے سے پہاڑوں کو چلایا جا سکتا ہے۔ زمین کو قطع کیا جا سکتا ہے۔ (چاند بھی ایک زمین ہے جس کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی انگشت شہادت کے نور کی شعاع سے دو ٹکڑے کر کے نہ صرف اپنا نوری ہونا ثابت کر دیا بلکہ قوت شعاع نور کا عملی مظاہرہ بھی دکھا دیا تاکہ عالم انسانیت کی شعاعی قوت کے بارے میں رہنمائی ہو جائے کیا اتنی زبردست قوت رفتار حاصل کی جاسکتی ہے کہ پلک جھپکنے میں ہزارہا میل کا فاصلہ طے کیا جا سکے جس کی مثال حضرت آصف بن برخیا کا واقعہ ہے کہ انہوں نے پلک جھپکنے سے بھی پہلے سینکڑوں میل سے تخت بلقیس کھینچ کر دربار سلیمانؑ میں حاضر کر دیا۔ حالانکہ جناب آصفؑ کے پاس کتاب کا جزوی علم تھا۔

سورۂ رعد کی اسی آیت میں اللہ نے یہ بھی اشارہ فرمایا ہے کہ قرآن کے علوم کے ذریعے مُردے بول سکتے ہیں یعنی زندہ ہو سکتے ہیں نور کی شعاعوں میں اللہ نے مختلف قوتیں اور اور مختلف اثرات رکھے ہیں اس لحاظ سے ممکن ہے کہ کسی خاص قسم کی شعاعوں کی قوت سے مردہ بھی زندہ کیا جا سکے جبکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نوری جسم کی شعاعوں سے مردے زندہ ہونے کا معجزہ ہوتا رہا۔ اور یہی نہیں بلکہ مختلف قسم کے امراض سے لوگوں کو شفا بھی ملتی رہی اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ شعاعوں کے مختلف اقسام دریافت کریں اور ان کو حاصل کریں تاکہ مُسلم قوم کی سربلندی و ترقی کیلئے اہم مقاصد کا حصول ممکن ہو۔

جسطرح X RAY کی شعاعی قوت سے جسم انسانی کے اندرونی حالات (جو بظاہر مخفی ہیں) معلوم کئے جا سکتے ہیں اسی طرح سے اس سے بڑی شعاعی قوت کے ذریعے سے دلوں اور ذہنوں کے اندر چھپے ہوئے خیالات اور دور دراز کے فاصلے کی چیزوں کو معلوم کیا اور دیکھا جاسکتا ہے اور اس سے ملتی جلتی مثال ٹیلویژن اور کمپیوٹر وغیرہ کی ایجاد بھی ہے۔

حضرت امام جعفرؑ صادق کا وہ ارشاد بھی قابلِ غور ہے جس میں آپؑ نے فرمایا۔ کہ جب امام قائم بالامر ہوتا ہے تو خداوند عالم اس کے لیئے ہر مقام میں نور کا منیار قائم کر دیتا ہے جس کے ذریعے سے وہ تمام مخلوقات کے اعمال کو دیکھتا ہے“۔

نور کے منیار کا ذکر انتہائی قابلِ غور ہے کیونکہ یہ بھی شعاعی قوت کی جانب رہنمائی کرتا ہے اس کی ملتی جلتی مثال راڈار بھی ہو سکتی ہے۔

شعاعوں میں جلا دینے کی بھی طاقت ہے جیسا کہ آتشی شیشے کے ذریعے

سورج کی شعاعوں کو مرکوز کر کے آگ لگائی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف چاند کی شعاعوں میں جو قوت ہے اس کا اظہار مد و جذر سے ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب ماہتاب کی شعاعیں سمندر پر زیادہ پڑتی ہیں تو پانی بلند ہونے لگتا ہے جسے مد کہتے ہیں اور جب شعاعوں میں کمی ہوتی ہے تو سمندر کا پانی نیچے ہو جاتا ہے جس کو جذر کہتے ہیں لیکن سورج کی شعاعوں کی طرح چاند کی شعاعیں پانی کو بخارات میں تبدیل نہیں کرتیں اور نہ ہی کسی چیز کو جلاتی ہیں لہذا معلوم ہوا کہ مختلف شعاعوں کے مختلف اثرات ہیں لہذا اہل اسلام کے لیئے عموماً اور پاکستان کے سائنسدانوں کے لئے خصوصاً ضروری ہے۔ کہ وہ شعاعی قوت اور مختلف شعاعوں کے متعلق نہایت توجہ اور محنت سے ریسرچ کریں

شعاعی قوت سے پہاڑوں کو کاٹا جا سکتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ امریکہ کی ایک ہوا باز کمپنی کے ماہر ڈاکٹر تھیوڈر میمان (THEODRE MIAMAN) نے برقی قوت رکھنے والا ایک ایسا قلم بنایا ہے جس کا نام انہوں نے لیسر (LASER) رکھا ہے۔ اس قلم کے دونوں سروں پر سلور کی دو ٹوپیاں چڑھائی ہوئی ہیں اور قلم کے گرد ایک پیچیدہ نلکی اس شیشے کی بنی ہوئی ہے جس سے فوٹو گرافر کے فلیش بلب بنتے ہیں اس کے آخری سرے پر ایک ٹیلی سکوپی شیشہ لگایا ہے۔ فلیش ٹیوب کے ذریعے بجلی قلم میں داخل ہوتی ہے اور راہ فرار پانے کے لئے قلم کے دونوں سروں پر لگی ہوئی ٹوپیوں سے ٹکراتی جاتی ہے اس پیہم ٹکراؤ سے لاکھوں کی تعداد میں برقی پارے (PHOTONES) پیدا ہوتے ہیں اور برقی توانائی بڑھتی ہے جب حسب خواہش یعنی مطلوبہ مقدار میں توانائی آجاتی تو اس برقی کو ٹیلی سکوپی شیشہ کی مدد سے چھوڑ دیا جاتا ہے اور یہ برقی باریک لکیر (شعاع) بن کر اپنی متعینہ منزل پر پلک جھپکنے میں پہنچ جاتی ہے اس شعاع کا نام LASER BEAM رکھا گیا ہے۔ اس کی طاقت کو آزمانے کے لیئے ایک بلیڈ ایک فٹ کے فاصلے پر رکھ کر اس پر یہ شعاع چھوڑ دی گئی تو اس شعاعی قوت نے اس بلیڈ میں جلا کر سوراخ کر دیا۔ اس کے بعد ہیرے میں بھی سوراخ کر لیا گیا۔ حالانکہ جواہرات میں ہیرا سب سے زیادہ سخت پتھر ہے۔ پس ثقلین نے تو اس شعاعی قوت کا پتہ

صدیوں قبل کوہِ طور کے واقعہ میں پہلے ہی دیدیا تھا۔ اب یہ مسلم سائنسدانوں کا کام ہے کہ وہ شعاعی قوت کے ذریعے سے قومی ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کریں۔ جس شعاع سے ہیرے جیسے سخت پتھروں میں سوراخ کیا جاسکتا ہے اسی شعاع سے جنگ کے موقع پہ دشمن کے جسموں اور ہتھیاروں کو تباہ کیا جاسکتا ہے اور کئی قسم کے تعمیری کام سنوارے جاسکتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ہمارے سائنسدان توجہ کریں گے۔

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ قرآن مجید کی آئت نور میں اللہ نے اپنی ذات کو "نور" فرمایا ہے اور حضرت محمدؐ مصطفےٰ بھی نور ہیں جیسا کہ حضورؐ کی حدیث "اوّل ما خلق اللہ نوری" مدارج النبوۃ مطبوعہ نولکشور ص۲ پر موجود ہے اور اہل حدیث کے علامہ وحیدالزماں اپنی کتاب "ہدیتہ المہدی" میں لکھتے ہیں کہ "اللہ نے خلق فرمانے کی ابتدا نورِ محمدیؐ سے کی" اور مولانا اشرف علی تھانوی اپنی کتاب "نشر الطیب فی ذکر نبی الحبیب" مطبوعہ تاج کمپنی میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرت عبدالمطلبؑ کے زمانے میں ایک دفعہ قحط پڑ گیا تھا۔ بارش نہیں ہوئی تھی لوگ اکٹھے ہو کر حضرت عبدالمطلبؑ کی خدمت میں آئے اور دُعا کی درخواست کی تو حضرت عبدالمطلبؑ کوہِ ثبیر پر تشریف لے گئے اور اللہ سے بارش کی دُعا کی دُعا ختم ہوتے ہی حضرت عبدالمطلبؑ کی پیشانی سے ایک نور چمکا جس کی شعاعیں خانہ کعبہ پر پڑیں تو حضرت عبدالمطلبؑ نے فرمایا میری پیشانی سے نور ظاہر ہونا ــــ اس امر کی دلیل ہے کہ دُعا قبول ہوگئی ہے (پھر بھی یار لوگ اُن کے ایمان پر شک کرتے ہیں!)

مولوی اشرف علی تھانوی کے تحریر کردہ واقعہ سے نورِ محمدیؐ کا پیشانی عبدالمطلبؑ سے شعاعوں کے سامنے ظاہر ہونا۔ اس امر کی دلیل ہے کہ نورِ محمدیؐ کے معنی تاویلاً علم لینا درست نہیں۔ بلکہ وہ نور حسی و مرئی تھا جس کو لوگوں نے دیکھا جس کی شعاعیں کعبہ تک پہنچیں۔ لہذا حضورؐ حقیقی معنوں میں نور ہیں۔ اور حضرت جابرؓ ابن عبداللہ کی روایت مشہور ہے کہ اُن سے رسولؐ خدا نے فرمایا "اے جابرؓ! تمام اشیاء سے پہلے اللہ نے تیرے نبیؐ کا نور خلق فرمایا" جناب جابرؓ نے پوچھا حضورؐ کیسے؟ تو حضورؐ نے فرمایا

وہ اللہ نے اپنے نور سے پیدا کیا"

اسی سلسلے میں جناب جابرؓ نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا اے فرزند رسولؐ آپؐ کے جدِ بزرگوار نے جو یہ فرمایا ہے کہ اللہ نے میرا نور اپنے نور سے پیدا کیا ہے۔ تو کیا حضورؐ کا نور اللہ کے نور کا جزو ہے! یعنی ٹکڑا جدا ہوا ہے؟ امام نے فرمایا "نہیں" بلکہ اللہ کے نور کا اثر ہے جس طرح سورج کی شعاعیں سورج کا اثر ہیں"۔

حضرت علی المرتضیٰؑ اُسی نور سے ہیں کیونکہ حضورؐ کی حدیث ہے کہ "میں اور علیؑ ایک نور سے ہیں یہ حدیث ریاض النضرۃ فی مناقب العشرہ، محب طبری، تذکرۃ الخواص الامۃ سبط ابن جوزی، ینابیع المودۃ سلیمان حنفی، فضائلِ مرتضوی علامہ کشفی اور دیگر کئی کتب میں موجود ہے پس نورِ محمدیؐ کا نورِ خدا سے براہ راست تعلق ہے اور وہ نور تمام انبیاءؑ و ملائکہ اور دیگر نوری اشیاء کے انوار سے افضل و اعلیٰ ہے اب اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب سیارگان وغیرہ کی شعاعیں اتنی عظیم قوتیں رکھتی ہیں کہ جن سے عقل انسانی متحیر ہے تو اس نورِ محمدیؐ کی شعاعوں میں کتنی زیادہ قوتیں ہوں گی۔ جو نور تمام دیگر انوار کا سببِ تخلیق ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ دونوں مقدس باپ بیٹا جب تعمیر بیت الٰہی کر رہے تھے۔ اس وقت سرکارِ خلیل رب جلیل نے ایک پتھر پر قدم مبارک رکھا تو بالکل اُسی طرح کہ جیسے حضرت داؤدؑ کے ہاتھوں کی شعاعوں سے لوہا نرم ہو جاتا تھا۔ سرزمین مکہ پر قدم خلیلؑ کی شعاعوں سے پتھر موم ہو گیا اور نشانِ قدم پتھر پر ثبت ہو گیا۔ اس واقعہ سے بھی شعاعی قوت کا اشارہ ملتا ہے۔

کافی عرصہ ہوا جب یہ بات سُنی تھی کہ امریکہ میں اٹیمی ری ایکٹر کی شعاعی قوت سے کسی غیر طلائی دھات کو سونے میں تبدیل کیا گیا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نور میں عظیم قوتیں موجود ہیں اور کسی چیز کی رفتار رفتارِ نور سے زیادہ نہیں جیسے سائنسدان اچھی طرح جان چکے ہیں۔ یہی وہ قوتِ رفتار تھی کہ سرورِ دوجہاں محمد مصطفیٰ صلے

اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اربوں میل کا سفر طے کر کے عرشِ عظیم سے واپس سرزمین مکہ پر اتنی جلدی تشریف لے آئے کہ کنڈی اسی طرح ہل رہی تھی جیسے وقت روانگی ہل رہی تھی بستر بھی گرم تھا۔ اور وضو کا پانی اسی طرح بہ رہا تھا۔ چونکہ حضرت علیؑ اور دیگر آئمہ طاہرین اہل بیت نورِ محمدی ہی سے مخلوق ہوئے ہیں اس لئے خیبر کا درنی دروازہ اُٹھا لینا، یا طویل فاصلہ پلک جھپکنے میں طے کر لینا۔ اور مٹی اور پتھروں کو سونے چاندی یا جواہرات میں تبدیل کر دینا مردوں کو زندہ کر دینا وغیرہ وغیرہ مقامات تعجب و انکار نہیں۔ اسی طرح رسولِ خدا کے دستِ مبارک پر سنگریزوں کا کلام کرنا اور کلمہ شہادت پڑھنا ناممکن نہیں۔

نسخہ کیمیا

ایک مرتبہ باب مدینۃ العلم علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا گیا کہ سونا کیسے بنایا جاسکتا ہے تو سرکارِ ناطقِ قرآن نے فرمایا "پارہ اور ابرق لو۔ اور ایک وہ چیز لو جو برق سے مشابہت رکھتی ہے۔ پس جب تم ان (تینوں چیزوں) کو ملاؤ گے تو تم شرق و غرب کے مالک (عارضی امیر) بن جاؤ گے۔

اس نسخہ کیمیا میں جو چیز مشابہ برق بتائی گئی ہے اس کا نام مولانا علیؑ نے نہیں بتایا اس میں مصلحت یہ تھی کہ ہر کس و ناکس، کفار و مشرکین و منافقین بھی سونا بنا کر اسلام کو نقصان عظیم پہنچائیں گے اور برے کاموں میں دولت خرچ کر کے معاشرتی برائیوں میں بہت اضافہ کریں گے دوسری وجہ یہ تھی کہ امیر المومنینؑ مسلمانوں کو آرام پسند سست اور غافل نہیں بنانا چاہتے تھے، بلکہ آپؑ کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں میں تحقیق و تلاش کا رجحان ترقی کرے اور وہ خود تحقیق و جستجو کر کے معلوم کریں کہ وہ مشابہ برق شئے کون سی ہے؟ اسی جستجو میں تجربات کریں گے تو ان سے کئی اور مفید انکشافات ہوں گے اور اسی کا نام سائنس ہے نیز اگر بالوضاحت کیمیا گری کی ترکیب بتا دی جاتی تو سونے کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی۔ پس ثابت ہوا کہ ثقل دوم کے قائد مسلمانوں میں

سائنسی جذبہ شوق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اُوپر بیان کردہ امریکہ کے عمل کیمیا میں سُنا گیا ہے کہ پارے کو سونا بنایا گیا تھا۔ پارے کا ذکر نسخۂ علویہؑ میں بھی موجود ہے۔ لیکن شاید امریکہ والوں نے ابرق کی بجائے ایٹمی قوت استعمال کی جس کی وجہ سے لاگت بہت زیادہ آئی اور سونا اتنا زیادہ مہنگا پڑا کہ اس طریقے سے بنانے میں نفع حاصل ہونے کی بجائے نقصان رہا۔ اگر انھوں نے ثقلین سے ہدایات لی ہوتیں اور ابرق سے کام لیا ہوتا تو شاید یہ صورت نہ ہوتی۔

بعض کتابوں میں حضرت فضہؑ کا چاندی بنانا منقول ہے اور بعض تفاسیر میں موجود ہے کہ قارون کو نسخۂ کیمیا مل گیا تھا۔ اور اس نے بڑی مقدار میں سونا بنالیا تھا۔ اسی لئے قارون کا خزانہ ضرب المثل بن گیا۔ ان تمام چیزوں سے ثابت ہو جاتا ہے۔ کہ سونا بنانا ناممکن نہیں ہے چونکہ حضرت علیؑ رسُول خدا کے علم کا دروازہ اور قرآنِ ناطق ہیں لہٰذا اُن سے کوئی علم مخفی نہ تھا۔ وہ کیمیا کے بھی عالم تھے۔ اسی طرح تمام اہلبیتؑ علم جمادات کے ایسے عالِم ہیں کہ کوئی دوسرا اُن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لہٰذا راہِ سعادت یہی ہے کہ ثقلین کے ساتھ تمسک رکھا جائے تاکہ تمام علمی مسائل کی دشواریاں آسانی میں تبدیل ہو جائیں۔

ـــ ختم شد ـــ

فصل ششم

علم نباتات

(پھول اور پودے)

علم نباتات بہت ہی وسیع علم ہے۔ عقل انسانی اس کا احاطہ کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔ صرف نباتات پر ہی غور کیا جائے تو قدرت کی بے شمار نشانیاں انسان کی ہدایت کے لئے موجود ہیں۔

نباتات کی پیدائش اور حقیقت پر غور فرمائیے کہ کس سکوت سے بنی آدمؑ کے لئے طرح طرح کے پھل پھول، اناج و سبزیاں پیش کر رہے ہیں۔ بیج و گٹھلی زمین کے اندر خاک میں ملنے کے بعد دوبارہ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ ہر پودے اور پھول کا جو مخصوص رنگ تشکل و صورت اور ذائقہ ہے۔ اسی رنگ، صورت ذائقے اور دیگر خواص کو محفوظ کئے ہوتے ہے۔ جب بھی زمین سے پیدا ہوگا اپنی ہی صفات کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ کبھی بھولے سے بھی کسی دوسری قسم کے پودے یا پھل کی خاصیتیں نہ اپنائے گا۔ جب تک بیج زمین کی خاک میں مل کر اپنی اصلی صورت کو نہیں مٹائے گا نمو حاصل نہ کر سکے گا۔ جب خاک میں مل کر فنا ہو جائے گا تو نمو کر کے دوبارہ حشر و نشر کی منزل تک پہنچ جائیگا۔ ایک بیج سے کئی دانے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح وجودِ انسانی کا خاک میں مل جانے کے بعد حشر و نشر ہوگا جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

" اور ہم ہی نے آسمان سے برکت والا پانی برسایا۔ تو اس سے ہم نے باغات

اُگلے اور کھیتی کا اناج اور لمبی کھجوریں جن کا بور آپس میں گتھا ہوا ہوتا ہے (یہ تمام) بندوں کی روزی فراہم کرنے کے لئے (پیدا کیا) ہے۔ اور پانی ہی سے مردہ شہر (ویران زمین) کو زندگی عطا کی۔ تو اسی طرح (قیامت کے دن) نکلنا ہوگا۔" سورہ ق)

اسی طرح ثقل اوّل کے سورۂ نحل میں ارشاد پروردگار ہے کہ" اور اس (اللہ) نے تمہارے لئے زمین سے رنگ برنگ کی چیزیں پیدا کی ہیں یقیناً اس میں سبق حاصل کرنے والوں کے لئے نشانی ہے۔"

کئی صدیوں سے طرح طرح کے پھل، اناج، سبزہ وغیرہ اپنی اپنی خصوصیات کو محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ ان میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آتا۔ ماہرین علم نباتات نے اب تک تقریباً دو لاکھ سے زیادہ زمین میں اُگنے والی نباتات کا پتہ چلایا ہے۔ جن میں سے ہر ایک دوسری سے مختلف ہے۔ اور کسی میں خفیف سا بھی تغیر نہیں ہے کہ اپنی خاصیت نوعیت سے علیحدہ ہوگئی ہو۔ حالانکہ یہ تمام نباتات ایک ہی زمین پر اُگتے ہیں، پانی ہی سے نشو و نما پاتے ہیں۔ ایک ہی سورج سے حرارت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود ہر پھل کی خاصیت جدا، ہر پھول کا مزاج الگ۔ کوئی سرد ہے کوئی گرم۔ کوئی خشک ہے کوئی تر۔ کسی میں سختی ہے کسی میں نرمی۔ پھر ہر پودے اور ہر پیڑ کے مختلف اجزاء اپنے اپنے خصوصیات کے حامل ہیں۔ مثلاً انگور کا چھلکا اور بیج سرد یابس ہیں۔ اس کا رس گرم و تر ہے۔ پھر بعض پھل میٹھے ہیں بعض کھٹے۔ بعض پھیکے ہیں اور کچھ کڑوے۔ کئی مفید ہیں اور کئی مضر۔ حالانکہ سارے ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

"وہی (خدا) ہے جس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی برسایا جس سے تم بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لئے چارہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہی اس پانی کے ذریعے سے کھیتیاں اُگاتا ہے۔ زیتون و کھجور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ یقیناً اس میں بڑی نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔" (سورۂ نحل)

نقلِ اوّل میں اللہ تعالیٰ بار بار ہدایت فرمارہا ہے کہ اس کی نشانیوں میں غور و فکر کریں۔ لیکن باوجود اس واضح اور تاکیدی ہدایت کے ہم مسلمانوں نے تحقیقات کی جانب سے غفلت برتی اور صرف اپنے ہی اندرونی اختلافات میں اُلجھے رہے لیکن غیروں نے اس پُر حکمت ہدایت سے فائدہ اُٹھالیا اور وہ دُنیا پر غالب آگئے۔ وہ حقائق جن کا دعویٰ آج کی سائنس اپنے آلات کے بل بوتے پر کر رہی ہے ان کی پردہ کشائی ثقلین نے قریباً چودہ سو برس پہلے کر دی تھی۔ لیکن مسلمان غفلت کی نیند میں رہا اور اس جانب اس نے کوئی عملی جدوجہد نہ کی۔ بلکہ اہلِ اسلام آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے پر کفر و شرک کے فتوے لگاتے رہے۔

سورۂ یٰسین میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ سورۂ یٰسین ۳۶ یعنی پاک ہے وہ ذات جس نے زمین سے اُگنے والی تمام چیزوں کو اور خود ان لوگوں کو اور ان چیزوں کو جنہیں یہ نہیں جانتے جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔"

قرآنِ مجید کے اس ارشاد کے مطابق اللہ نے زمین سے ہر اُگنے والی چیز کا جوڑا بنایا ہے۔ اس بات کی تصدیق آج کی سائنس نے بھی کر دی ہے۔ جوں جوں سائنسی تحقیقات کے صحیح انکشافات ظاہر ہوتے جائیں گے ثقلین کے اقوال کی تائید ہوتی جائیگی۔ جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس دَور میں جبکہ زمانے میں اتنی علمی ترقی نہ تھی اقوامِ عالم کے سامنے ایسے حقائق پیش کرنے والے، علمِ وہبی کے حامل حضرات رموزِ کائنات سے واقف تھے اور ظاہر ہے کہ اس بات میں بھی وجودِ خُدا کا ثبوت ہے۔

موجودہ تحقیقات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تمام نباتات میں نر و مادہ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ساکنانِ کراچی نے پپیتے کے نر و مادہ کو مشاہدہ اکثر کیا ہوگا کہ جب تک مادہ پودے کے ساتھ نر پودا نہیں ہوتا وہ پھل نہیں دیتا۔ اسی طرح کدو کی بیل میں نر و مادہ دو قسم کے پھول کھلتے ہیں۔ بعینہٖ عموماً پھول کے دو حصے ہوتے ہیں نر اور مادہ۔ جب تک مادہ نر سے حاملہ نہ ہو پھول یا بیج کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ پھولوں کی دو قسمیں ہیں خوبصورت پھول اور غیر خوبصورت پھول۔ جو پھول خوبصورت نہیں ہوتے تو ہوا کے جھونکوں سے

ان کی شاخیں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ جاتی ہیں جس سے نر اور مادہ کی شاخوں کے ملنے سے پھلواریاں حاملہ ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ان پھولوں کو خوبصورت ہونے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ثقل اوّل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ " وارسلنا الریاح لواقح " (الحجر) یعنی ہم نے (پودوں کو) حاملہ کرنے والی ہواؤں کو بھیجا (یعنی چلایا)۔" اور اس قرآنی حقیقت کو بھی ماہرین نے تسلیم کر لیا ہے۔

دیگر خوبصورت پھولوں کے حاملہ ہونے کا اللہ تعالیٰ نے دوسرا انتظام فرمایا ہے کہ چھوٹے چھوٹے اڑنے والے جانور پیدا کئے جو خوبصورت پھولوں کے دلدادہ ہوتے ہیں مثلاً تتلی اور شہد کی مکھی وغیرہ۔ پھول کے نر حصّے پر ایک قسم کا غبار سا ہوتا ہے۔ جسے مادہ تولید کہا جا سکتا ہے۔ اور علم نباتات میں اسے پولن (POLLON) کہتے ہیں۔ مادہ پھول کے حصّے پر چھوٹے چھوٹے بال سے ہوتے ہیں۔ جب شہد کی مکھی ایک پھول سے اڑ کر دوسرے پھول پر جاتی ہے تو اس کے جسم کے ساتھ جو نر پھول کا مادہ تولید (پولن) لگ جاتا ہے وہ اُسے مادہ پھول تک منتقل کر دیتی ہے۔ جب نر پھول کا یہ مادہ تولید مؤنث پھول پر گرتا ہے تو وہ اُس کے باریک بالوں میں ٹھہر جاتا ہے۔ اس طرح مادہ پھول حاملہ ہو جاتی ہے۔ بعض پودوں میں نر و مادہ پھول علیحدہ لیکن قریب ہوتے ہیں۔ وہاں نر نیچے کو جھکا ہوا ہوتا ہے اور مادہ اوپر کو اُٹھی ہوئی ہوتی ہے۔ تاکہ اگر مذکر کا مادہ تولید اُوپر سے گرے تو مؤنث اس سے محروم نہ رہے۔ بعض پودے اور درخت ایسے بھی ہیں جن کے نر و مادہ الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہاں حمل کا انتظام بذریعہ ہوا کیا گیا ہے۔ ہوا نر کا مادۂ تولید اُڑا کر مادہ تک پہنچا دیتی ہے۔ اس طرح سلسلۂ تولید کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہوا نباتات کی امداد کرتی ہے۔

موجودہ سائنس نے تجربات و مشاہدات کے تحت ثقل اوّل کے بیان کردہ دونوں اصولوں کی تائید و تصدیق کی ہے کہ نباتات میں بھی مذکر و مؤنث ہوتے ہیں اور ہوا نباتات کو حاملہ بنانے میں مدد کرتی ہے۔

نباتات کا ہر پودا اپنے مقام پر قدرت کا ایک عظیم کارخانہ ہے۔ نباتات فضا سے

آکسیجن گیس حاصل کرتے ہیں اور زمین سے پانی۔ پانی اور گیس کے اس امتزاج سے رس (JUICE) تیار کرتے ہیں۔ جو پھلوں کی شکل میں بنی نوع انسان کی خوراک بنتے ہیں۔ ذرا غور فرمایئے! پودوں میں اتنا کمال کہاں سے آگیا ہے کہ جو قوتِ انسان سے بھی باہر ہے؟ خالق کائنات ہی نے نباتات کی فطرت میں یہ بات ودیعت فرمائی ہے جس کے مطابق وہ عمل کر رہے ہیں۔ پودے کی ساخت و تکوین جن اجزا سے ہوتی ہے انہیں "نباتیے" کہتے ہیں۔ وہی نباتیے کہیں پتے کی شکل اختیار کرتے ہیں اور کہیں شاخیں بن جاتے ہیں۔ کہیں رنگ اور کہیں پھول کا روپ حاصل کرتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا ہے کہ "نباتیے" سازش کر کے یا احتجاج کر کے پھول کی جگہ پر پھل پیدا کر دیں۔ آخر یہ شعور نباتات کو کس نے عطا کیا؟ اسی ذات نے جس نے پیدا کرنے کے ساتھ ہی فطری ہدایت بھی فرما دی۔ کاش انسان بھی غور سے کام لیں!

سرسوں کے پھول کے باہر سبز اور اندر زرد رنگ کی پتیاں ہوتی ہیں۔ نیز کچھ باریک ریشے ہوتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں ایک گول سرے والی چھوٹی ڈنڈی ہوتی ہے۔ جب پھول پوری طرح نشو و نما پا لیتا ہے تو اس میں باریک سفوف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سفوف کو اگر خورد بین سے دیکھا جائے تو چھوٹے چھوٹے انڈے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سفوف جب اندرونی شاخ کے گول سرے پر پڑتا ہے تو اس میں جذب ہو جاتا ہے۔ تب شاخ میں تیزی سے تبدیلی شروع ہو جاتی ہے اور وہ پھل کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جس کے اندر دانے بن جاتے ہیں۔ یہ کون ہے کہ جس کے اشارے پر تخلیق کے یہ کرشمے انجام پاتے ہیں۔ ہر پودا "فطری شعور" کا حامل ہے کہ اسے کس طرح اپنی نسل کو بڑھانا ہے۔ ہزاروں سال سے افزائش نسل کے اسی طریقے کو انجام دے رہا ہے جس کو اس کے اسلاف اپناتے رہے ہیں۔ یوکا سوسن کی مانند ایک امریکی پودا ہے۔ اس کا پھول نیچے کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے۔ اور اس کا مادہ حصہ اس سے کچھ نیچے ہوتا ہے۔ مادہ پھول کا سرا زیرہ لینے کے لئے پیالہ کی شکل کا ہوتا ہے۔ اس کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ فوراً زیرے کو لے کر مقام تولید تک پہنچا دے۔ اسی پودے کا ایک خاص قسم کا کیڑا ہے جسے یوکا کیڑا کہا جاتا ہے۔ یہ

مادہ کیڑا سورج غروب ہوتے ہی اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ نر پھولوں سے زیرہ اپنے منہ میں لیکر یوکا چلتی ہے۔ اس کا منہ بھی اسی خاص مقصد کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس میں زیرہ محفوظ کر لیتی ہے۔ اس کے بعد دوسرے پھول پر جا بیٹھتی ہے۔ اس پھول کے کیسہ تخم کے نچلے حصے کی طرف رینگ کر آجاتی ہے اور وہاں وہ زیرہ بھی بھر دیتی ہے۔ اس طرح یہ پودا اپنی نسل کے سلسلے کو باقی رکھتا ہے۔

اسی طرح انجیر اور چھوٹی بھڑوں کی ایک قسم کے درمیان تعلق پایا جاتا ہے۔ انجیر میں دو قسم کے گچھے لگتے ہیں۔ ایک میں نر و مادہ دونوں قسم کے پھول لگتے ہیں۔ اور دوسرے میں صرف مادہ پھول لگتے ہیں۔ دونوں گچھوں کے مادہ پھولوں میں یہ بھڑ زیرہ چھڑکتی ہے۔ پھولوں کے گچھوں کے چھلکے ایک دوسرے پر کچھ اس طرح چڑھے ہوتے ہیں کہ ان میں داخلے کا راستہ تقریباً مسدود ہوتا ہے۔ لیکن مادہ بھڑ بدقت ان کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ اور اکثر اس کوشش میں اُسے اپنے پیروں سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ پھولوں میں داخل ہونے کے بعد انڈے دیتی ہے اور پھر وہیں مر جاتی ہے۔ پھر ان انڈوں سے بچے نکلتے ہیں۔ نر بھڑیں وہیں مر جاتی ہیں اور مادہ بھڑیں باہر نکل آتی ہیں۔ مادہ بھڑیں جب باہر نکلتی ہیں تو انکے جسم کے ساتھ نر پھول کا زیرہ لگ جاتا ہے جسے وہ دوسرے مادہ پھولوں کے گچھوں کے اندر پہنچا دیتی ہیں جس سے انجیر کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ امریکہ میں پہلی بار جب انجیر کا پودا اگایا گیا تو اس نے پھل نہیں دیا۔ بالآخر جب یہی بھڑ وہاں لائی گئی تب انجیر کا درخت ثمر آور ہوا۔

پھول کی ایک قسم ہے جسے "قید کر لینے والا پھول" کہتے ہیں۔ اس کی پنکھڑیاں نر و مادہ دونوں قسم کی ہوتی ہیں۔ افزائش نسل کا زیرہ نر حصے میں ہوتا ہے۔ یہ حصہ پھول اور ڈنڈی کے درمیان ہوتا ہے۔ اور دونوں سروں سے تنگ ہوتا ہے۔ اس میں تخم ریزی ایک ننھی سی مکھی کرتی ہے۔ جو اس تنگ حصے میں داخل ہو کر زیرے تک پہنچتی ہے۔ اندر پہنچنے کے بعد پھنس جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے باہر نکلنے کا راستہ مسدود ہو جاتا ہے۔ ایک طرف تو راستہ تنگ ہوتا ہے دوسری طرف پنکھڑیوں کا اندرونی حصہ اتنا چکنا اور چمکدار ہوتا ہے

کہ وہ اوپر چڑھ بھی نہیں سکتی۔ نتیجتہً وہ گھبرا کر اندر ہی بھنبھناتی ہے جس کی وجہ سے کافی زیرہ اس کے جسم کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پھول کا اندرونی حصّہ کناروں سے سخت ہو جاتا ہے تو مکھی وہیں سے جسم پر لگے ہوئے زیرے کے ساتھ رینگ کر باہر آجاتی ہے۔ پھر وہ مادہ پھول کے گچھے پر آ بیٹھتی ہے۔ اور پھول کے تنگ راستے سے اندر داخل ہو جاتی ہے تو پھول سے نکلنے کا راستہ مسدود ہو جاتا ہے تو بھنبھناتی ہے جس سے اس کے جسم پر لگا ہوا زیرہ جھڑ جاتا ہے۔ اور اس طرح مادہ پھول میں افزائش نسل کا سلسلہ برقرار رکھا جاتا ہے۔ اَب وہ مکھی اس مادہ پھول کے اندر ہی بھنبھنا کر مر جاتی ہے کیونکہ وہ مادہ پھول میں تخم ریزی کا مقصد حاصل کر چکی ہے۔ لہٰذا اب پودے کو اس کی ضرورت نہیں کہ مکھی پھول سے زندہ سلامت نکلے یا وہیں مر جائے۔

موجودہ سائنس کا مطالعہ ایسے نباتات تک محدود ہے جو ہمارے چاروں طرف عام پھیلے ہوئے ہیں اور ماہرین نے ان پودوں کی درجہ بندی کی ہے جو مندرجہ نقشے سے واضح ہوتی ہے۔ پودوں کو اوّلاً دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے "تخمی پودے اور غیر تخمی پودے" پھر ان کی اقسام ہیں۔
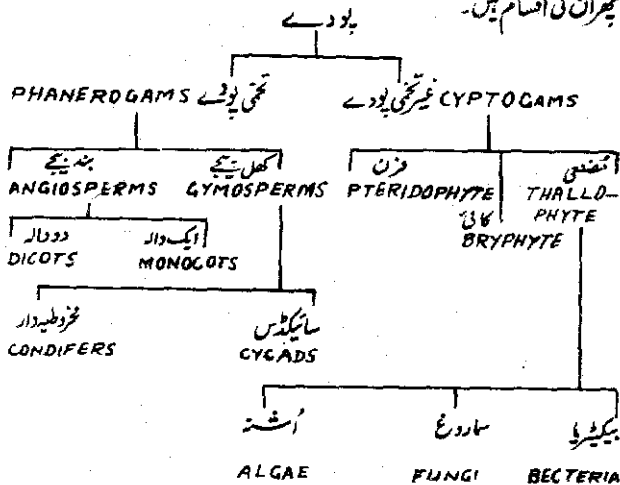
چنانچہ علم نباتات (BOTANY) مندرجہ بالا اقسام کے پودوں پر بحث کرتا ہے بلکہ علاوہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے پودوں کی کتنی قسمیں خلق فرمائی ہیں۔ لہٰذا اب ہم نباتات میں سے چند پھلوں اور سبزیوں وغیرہ کے فوائد اقوال ثقلین کی روشنی میں نقل کرتے ہیں۔

پھل (FRUIT)

ہدایت کی گئی ہے کہ ہر پھل پر ایک قسم کا زہر ہوتا ہے۔ جب تمہارے لیے پھل لایا جائے تو اس کو دھو کر کھاؤ۔ موجودہ سائنس اس حدیث کی تائید کرتی ہے۔

سیب انگریزی میں ضرب المثل ہے کہ "AN APPLE A DAY KEEPS THE DOCTOR AWAY" یعنی روزانہ ایک سیب کا کھا لینا ڈاکٹر سے دور رکھتا ہے۔

ثقل دوم کے چھٹے ہادی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ "اگر لوگ سیب کے خواص جان لیں تو اپنے مریضوں کا علاج صرف اسی سے کریں خصوصیت سے دل کے لیے زود اثر شفا دینے والا اور منہ کو خوشبودار بناتا ہے۔

سیب سے نکسیر کا علاج زیاد نامی ایک شخص اپنے بھائی سیف کے ساتھ مدینہ میں آیا۔ اس وقت مدینہ میں نکسیر کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ جسے نکسیر ہوتی لقمۂ اجل بن جاتا۔ چنانچہ سیف کو یہ عارضہ ہو گیا۔ زیاد گھبرایا ہوا امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؑ کو بتایا آپؑ نے فرمایا تم سیب سے کیوں غافل ہو اس کو سیب کھلاؤ۔ زیاد کہتا ہے کہ میں نے واپس آتے ہی اپنے بھائی سیف کو سیب کھلا دیا۔ جس سے وہ صحت یاب ہو گیا۔

حضرت امام محمد بن علی الباقر علیہما السلام ہدایت فرماتے ہیں "جب سیب کھاؤ تو اس کو سونگھ کر کھاؤ۔" چنانچہ اب یہ تسلیم کیا جاتا ہے، سیب ناک کی بیماریوں کیلئے بہت مفید پھل ہے۔ نیز اس کی خوشبو دماغ کی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ چنانچہ

حضرت امام علی نقی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ "سیب دیوانگی کے عارضے کے لئے مفید ہے اور بلغم کی زیادتی کو ردکتا ہے۔ اس سے زود اثر کوئی چیز نہیں ہے۔"

انار امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "اپنے بچوں کو انار کھلایا کرو کیونکہ وہ زبان کو جلدی صاف کرتا ہے اور جھلی کے ساتھ کھایا کرو کیونکہ وہ معدہ کو مضبوط کرتا ہے اور بوجھل پن کو دور کرتا ہے۔ کھانے کو ہضم کرتا ہے اور پیٹ کو فائدہ بخشتا ہے۔

ناشپاتی حضرت صادقؑ کا قول ہے کہ "ناشپاتی کھایا کرو۔ کیونکہ یہ دل کو جلا بخشتی ہے اور برضائے خدا پیٹ کے درد کو تسکین دلاتی ہے اور معدہ کو صاف کرنے کے ساتھ قوت بخشتی ہے۔

کھجور رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ زچہ کو چاہیئے کہ ولادت کے روز سات دانے کھائے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے بی بی مریمؑ کے لئے ولادت کے وقت کھجور ہی کا انتظام کیا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضورؐ کی خدمت میں کھجوروں کا طبق بطور ہدیہ پیش کیا گیا اس وقت آپؐ نے کھجور کے خواص بیان فرمائے کہ "کھجور پشت کو مضبوط کرتی ہے۔ قوت مردانہ میں اضافہ کرتی ہے۔ کان اور آنکھ کی قوتوں کو زیادہ کرتی ہے۔ خوراک کو ہضم اور بیماری کو دور کرتی ہے۔ دہن کو خوشبودار بناتی ہے۔"

حضرت امام جعفر صادقؑ نے عراق کی مشہور کھجور "عجوہ" کے متعلق فرمایا: جس شخص نے سوتے وقت عجوہ کھجور کے سات دانے کھالئے تو یہ اس کے پیٹ کے کیڑوں کو ختم کر دیں گے۔ نیز فرمایا کھجور بلغم کو دفع کرتی ہے۔"

زیتون نبی اکرمؐ کا فرمان ہے کہ "تمہارے لئے زیتون کا تیل مادۂ تولید کو بڑھاتا ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام کا قول ہے "ماکولات میں بہترین زیتون کا تیل ہے۔ یہ نفس کو پاکیزہ کرتا ہے۔ قاطع بلغم ہے۔ رنگ کو نکھارتا ہے اور پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے۔ جوڑوں کے درد کو دور اور غصے کو ٹھنڈا کرتا ہے۔" اہلبیتؑ اطہار کے ارشادات سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء مرسلینؑ اور آئمہ طاہرینؑ گھی کی طرح زیتون کو سالن پکانے میں

استعمال کرتے تھے اور انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جسم پر زیتون کے تیل کی مالش کرنا مفید ہے اور یہ ان کی سُنّت بھی ہے۔ زیتون کو قرآن پاک کی آیۂ نور میں مُبارک فرمایا گیا ہے۔ اور اللہ نے انجیر اور زیتون دونوں کی قسم اٹھائی ہے جو سورۃ التین میں موجود ہے۔

انجیر پیغمبرؐ اسلام فرماتے ہیں کہ "خشک و تازہ انجیر کھایا کرو۔ کیونکہ یہ قوّتِ مردانہ میں اضافہ کرتا ہے اور بواسیر کو روکتا ہے۔ نقرس کو روکتا ہے اور پیٹ میں ٹھنڈک پیدا کرتا ہے۔"

حضرت امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا، کہ انجیر سُدّوں کو نرم کرتا ہے۔ قولنج کے ریاح کے لئے مُفید ہے۔ دن کو زیادہ کھایا کرو مگر رات کو کم۔"

حضرت امام علی رضاؑ نے فرمایا "انجیر مُنہ کی بدبو دُور کرتا ہے۔ ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔ بال بڑھاتا ہے۔ مختلف قسم کے دردوں کو رفع کرتا ہے۔ اور انجیر کھانے کے بعد کسی دوسری دَوا کی ضرورت نہیں رہتی۔"

بہی رسولؐ اللہ بہی کے بارے میں ہدایت فرماتے ہیں کہ "بہی کھاؤ اور دوسروں کو بطورِ تحفہ پیش کرو۔ کیونکہ وہ آنکھوں کو روشنی بخشتا ہے۔ دل میں مُحبّت پیدا کرتا ہے۔ اور اپنی حاملہ عورتوں کو کھلاؤ کیونکہ اسکے کھانے سے بچّے خوبصورت پیدا ہوتے ہیں۔ اور سینہ کی گرانی ختم ہو جاتی ہے۔

جنابِ امیر المومنینؑ نے فرمایا "بہی کھانے سے کمزور دل کو قوّت حاصل ہوتی ہے۔ معدہ مضبوط و صاف ہوتا ہے۔ قلب کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور بزدلی میں بہادری پیدا ہوتی ہے۔"

امام محمّد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ "بہی کھانے سے مغموم آدمی کا غم جاتا رہتا ہے۔" امامؑ رضا فرماتے ہیں کہ "بہی کھایا کرو۔ کیونکہ وہ عقل کو تیز کرتا ہے۔"

انگور امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "طوفانِ نوحؑ کے بعد جب حضرت نوحؑ نے مُردوں کی ہڈیاں دیکھیں تو سخت غمگین ہوئے تب خدا نے وحی کی کہ سیاہ انگور کھاؤ تاکہ تمہارا غم رفع ہو جائے۔"

آلو بخارا امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ آلو بخارا صفرا کو رفع کرنے کیلئے مفید ہے۔ جوڑوں کو نرم کرتا ہے۔ زیادہ نہ کھاؤ۔ ورنہ جوڑوں میں ریاح پیدا کر دیگا۔

امرود حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے کہ امرود معدے کو صاف کرتا ہے۔ قوت عطا کرتا ہے۔ پیٹ بھرے پر کھانا نہار منہ کھانے سے بہتر ہے۔

سبزیاں (VEGETABLES)

پیاز سرکارِ رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ "جب تم کسی شہر میں پہنچو تو وہاں کی پیاز کھالو تاکہ وہاں کی وبا کو تم سے دور کر دے"۔

موجودہ سائنسی تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ پیاز میں کیلشیم، پوٹاشیم، سوڈیم سلفر، کاربو ہائیڈریٹس اور فولاد کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں اور اس کا رس کیڑوں کو ہلاک دیتا ہے۔ اس کے ٹیکے سے دق اور سل کے جراثیم کو ہلاک کیا جاتا ہے۔

حضرت صادقؑ فرماتے ہیں کہ پیاز منہ کی بُو کو پاکیزہ کرتا ہے۔ بلغم کو قطع کرتا ہے اور قوتِ مردانہ کو زیادہ کرتا ہے۔ پٹھوں اور پُشت کو مضبوط کرتا ہے اور بخار توڑتا ہے۔

پیازی امام جعفر صادقؑ سے پیازی کے متعلق پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا "اس میں چار صفتیں ہیں۔ سانس کو پاکیزہ کرتی ہے جسم سے ریاح کو دفع کرتی ہے۔ بواسیر کو ختم کرتی ہے اور جذام سے امان ہے اُس شخص کے لئے جو اسے مستقل استعمال کرتا ہے۔

ترہ کا ساگ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا "ترہ (گندنے) کا ساگ کھاؤ۔ کیونکہ اس میں چار فائدے ہیں۔ منہ کی بدبو دور کرتا ہے۔ زہریلی ریاح کو بدن سے خارج کرتا ہے۔ بواسیر کو دور کرتا ہے جو شخص اسے مستقل کھائے وہ بال خورہ و جذام سے محفوظ رہے گا۔

چقندر حضرت امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ قوم بنی اسرائیل میں جسم کے سفید داغ (پھلبہری) کی وبا پھیلی تھی۔ خداوند کریم نے حضرت موسیٰؑ پر وحی کی کہ انکو کہیں کہ گائے کا گوشت چقندر کے ساتھ پکا کر کھائیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے ایسا ہی

کیا اور شفایاب ہو گئے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ چقندر میں بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ ہڈی کو مضبوط کرتا ہے اور گوشت پیدا کرتا ہے۔

شلغم نقل دوم کے چھٹے ہادی حضرت جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے کہ شلجم کھایا کرو اور اکثر کھایا کرو۔ اور نااہل سے اس کے خواص محفوظ رکھو۔ ہر شخص میں جذام کی ایک رگ ہوتی ہے (یعنی جس کے جوش وغیرہ کے ذریعے سے جذام اثر انداز ہوتا ہے) پس اس کو شلجم کھا کر گھلاؤ"۔

موجودہ دور کی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ شلغم مقوی اور زود ہضم ترکاری ہے اس سے عمدہ اور تازہ خون تیار ہوتا ہے اس کے کھانے سے قبض کی شکایت دور ہوتی ہے۔ اس میں وٹامن اے، بے کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں جو جذام کی بیماری کے دفع کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔

کدو حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا۔ "جس نے کدو مسور کی دال کے ساتھ کھایا تو اس کا دل نرم ہو جائے (خصوصاً) ذکر خدا کے وقت جب تم کچھ پکاؤ تو کدو زیادہ پکایا کرو۔ کیونکہ یہ غمگین دل کو سرور عطا کرتا ہے۔

حضرت صادقؑ فرماتے ہیں کہ اپنے سالن میں کدو زیادہ استعمال کیا کرو کیونکہ یہ عقل اور دماغ کی قوت کو زیادہ کرتا ہے۔

گاجر حضرت امام علیؑ ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ گاجر قولنج اور بواسیر سے محفوظ رکھتی ہے اور قوت مردانہ میں اضافہ کرتی ہے۔

بینگن روایت ہے کہ جناب سرور کائناتؐ ایک مرتبہ حضرت جابرؓ کے ہاں مہمان تھے۔ حضرت جابرؓ نے آپؐ کی خدمت میں بینگن کا سالن پیش کیا جس کو آپؐ تناول فرمانے لگے۔ اس پر جابرؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ یہ گرم ہوتا ہے"! آپؐ نے فرمایا۔ "اے جابرؓ! یہ پہلا شجر ہے جو اللہ پر ایمان لایا۔ اس کو یوں کھاؤ کہ پہلے خوب تل لو۔ پھر روغن کے ساتھ اتنا پکاؤ کہ یہ نرم ہو جائے۔ اس طرح اس کو کھاؤ گے تو یہ حکمت میں

اضافہ کرے گا۔"

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "جس وقت کھجور آجائے اور انگور پک جائیں اس وقت بینگن کا ضرر جاتا رہتا ہے۔"

امام رضاؑ کا ارشاد ہے کہ "اگر خرمہ اُترنے کے وقت بینگن کھاؤ گے تو اس سے کوئی مرض پیدا نہ ہوگا۔"

امام علی نقی علیہ السلام نے اپنے باورچی سے فرمایا: میرے لئے زیادہ تر بینگن پکایا کرو کیونکہ وہ گرمیوں میں گرم اسردیوں میں سرد اور معتدل اوقات میں معتدل ہے اور ہر حالت میں نافع ہے۔

رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے کہ جو بینگن کو یہ سمجھ کر کھائے گا کہ یہ مُضر ہے تو وہ مریض ہو جائے گا۔ جو اسے دوا سمجھ کر کھائے گا وہ اس سے شفا پائے گا۔

امام زین العابدینؑ کا فرمان ہے کہ "میرے جَدّ (علیؑ) نے میرے جدّ امجد رسولؐ اللہ سے روایت کی ہے کہ بینگن روغنِ ارضی ہے

مولی امام جعفر صادقؑ نے حنان سے فرمایا: "اے حنان مولی کھایا کرو، کیونکہ اس کا پتہ جسم سے زہریلی گیس خارج کرتا ہے۔ اس کا تخم طعام کو ہضم کرتا ہے۔ اس کی جڑ بلغم دفع کرتی ہے۔ اس کے پتے پیشاب کو بآسانی و بلا زحمت خارج کرتے ہیں۔

متفرقات

اسپند اور کُندر حضرت رسولؐ خدا فرماتے ہیں کہ "اسپند کے ہر ہر درخت، ہر ہر پتے اور ہر ہر دانے پر ایک ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے اور جب تک کہ وہ درخت یا پتہ یا دانہ گل سڑ نہ جائے اس وقت تک وہ فرشتہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اسپند کے درخت کے ریشے اور شاخیں غم والم اور جادو کو دُور کرتے ہیں۔ اور اس کے دانے بہتر بیماریوں کے لئے شفا ہیں۔ لہٰذا تم اسپند اور کُندر سے علاج کیا کرو۔"

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں "جس گھر میں اسپند ہوتا ہے اس سے شیطان ستر گھر دور بھاگتا ہے اور اسپند میں بیماریوں کے لئے شفا ہے جن میں سے ادنیٰ سے ادنیٰ جذام ہے۔"

دوسری روایتوں میں منقول ہے کہ کسی پیغمبرؑ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کی بزدلی کی شکایت کی تھی تو وحی نازل ہوئی کہ تم اپنی امت کو اسپند کھانے کی ہدایت کرو کہ اس کا کھانا باعث شجاعت ہے۔"

حدیث میں آیا ہے کہ کندر کو پیغمبروں نے پسند فرمایا ہے اور کسی چیز کا دھواں اسکے دھوئیں سے جلد آسمان کی طرف نہیں جاتا۔ اسکے دھوئیں سے شیاطین دور ہوتے ہیں اور بلائیں دفع ہوتی ہیں۔"

نوٹ:۔ اس ارشاد سے اندازہ ہوتا ہے کہ کندر کا دھواں بُرے جراثیم کو بھی دور کرتا ہوگا۔

مرجان | قرآن مجید پ۲۷ سورۂ رحمٰن میں پروردگار عالمین نے اپنی خاص خاص نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ وہیں پھر آیت ۲۲ میں مرجان (یعنی مونگے) کا ذکر فرما کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اللہ کی خاص نعمت ہے۔ یہ سمندری درخت کی سرخ رنگ کی لکڑی ہے جس کی جڑ اور شاخ دونوں سے فوائد حاصل کئے جاتے ہیں۔

علم طب میں تسلیم کیا گیا ہے کہ مرجان بہت ہی مفید چیز اور واقعی نعمت الٰہی ہے اس میں بہت سی بیماریوں کے لئے شفا ہے اور اس کا کشتہ بھی بہت مفید ہے نقل اوّل نے اسے نعمت قرار دے کر لوگوں کو اس کے فوائد کی طرف متوجہ کیا ہے کتاب "کرشمۂ قدرت" میں جناب ہمایوں مرزا صاحب نے اپنی تحقیق لکھی ہے کہ اگر مرگی کے مریض کے گلے میں مرجان لاکٹ کی طرح لٹکا دیا جائے تو کچھ عرصے میں مرض جاتا رہیگا۔ نیز اختلاج قلب اور دل کی دھڑکن میں فائدہ پہنچاتا ہے۔

باقلہ | حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ باقلہ کے کھانے سے پنڈلی کا گودا بڑھتا ہے بھیجا زیادہ ہوتا ہے۔ خون تازہ پیدا ہوتا ہے لعد معدہ کو مضبوط کرتا ہے

کاسنی | حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ "تمہیں کاسنی کھانی چاہئے کیونکہ

یہ مادہ تولید میں اضافہ کرتی ہے۔ اور (پیدا ہونے والی) اولاد کو خوبصورت بناتی ہے۔

ستو حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ جو کے ستو زیتون کے تیل کے ساتھ استعمال کئے جائیں تو گوشت بڑھتا ہے۔ ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں۔ چہرے کی ملائمت و لطافت زیادہ ہوتی ہے۔ قوت و طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ مسور کے ستو پیاس بجھاتے ہیں۔ معدہ کو قوت بخشتے ہیں۔ اس میں ستر بیماریوں کے لئے شفا کی صلاحیت ہے۔ صفرا کے غلبہ کو کم کرتا ہے۔ پیٹ میں ٹھنڈک پیدا کرتا ہے۔"

کشمش پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں کہ تم کشمش کھایا کرو۔ کیونکہ یہ صفرا کے زور کو کم کرتا ہے۔ بلغم کو دور اور پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے۔ کمزوری کو دفع اور خلق میں حسن پیدا کرتا ہے۔

بیری کے پتے حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ ہر جمعہ کو بیری کے پتوں سے سر دھونا برص اور پاگل پن سے محفوظ رکھتا ہے۔

درخت اور خزاں حضرت صادقؑ نے مفضل سے فرمایا "درختوں پر غور و فکر کرو۔ ان میں ایک دفعہ موسم خزاں آتا ہے تو درختوں کی حرارت غریزیہ ان کی شاخوں میں بند ہو جاتی ہے۔ جس سے درختوں کے اندر پھلوں کے مادے تیار ہوتے ہیں پھر ان درختوں پر جب بہار آتی ہے تو پتیاں نکل آتی ہیں۔" موجودہ سائنس اس کی تائید کرتی ہے۔

رات کو درخت تلے سونا رسول اکرمؐ نے رات کو درخت کے نیچے سونے سے منع فرمایا ہے اور وجہ یہ بتائی ہے کہ "درخت سانس لیتے ہیں۔" اور آج کی سائنس حضورؐ کی تائید کرتی ہے۔ موجودہ دور کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ درخت بھی سانس لیتے ہیں۔ درخت دن میں آکسیجن گیس حاصل کرتے ہیں اور رات کو اسی گیس کو زہریلی گیس میں تبدیل کر کے چھوڑتے ہیں جسے کاربن ڈائی آکسائڈ کہتے ہیں۔ اگر انسان رات کو درخت کے نیچے سوئے گا تو اسی گیس کے اثرات جسم انسانی پر اثر انداز ہونگے۔

اس مادی دُنیا کی دل کشی زیادہ تر سرسبز و شاداب پیڑ پودوں اور لہلہاتی کھیتیوں پر منحصر ہے ویسے تو رواں دریا، آبشاریں، برف پوش چوٹیاں، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر اور فلک بوس عمارات و مقبرے بھی کافی دلچسپی کا باعث ہیں لیکن پودوں پر لدے ہوئے رنگ برنگ پھول پتے، طرح طرح کے خوش ذائقہ و خوشنما پھل اور خوبصورت سبزیاں انسان کو نظارہ کرنے میں نہ صرف بھلے معلوم ہوتے ہیں بلکہ اس کی بھوک و پیاس کو بھی تسکین دیتے ہیں۔ ان کی خوش رنگی اور خوشبو ہمارے دل و دماغ کو فرحت بخشتی ہے انسان کا سیر و تفریح کا رجحان اسے دُور دراز ممالک میں لے جاتا ہے جہاں قسم قسم کے سرسبز و شاداب جنگلات، باغات، چراگاہیں اور پارک اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان تمام مناظر فطرت میں گھاس اور سبزہ، پودے اور جھاڑیاں، درخت و پیڑ ضروری عناصر ہیں۔ اس تمام مادی دُنیا کو حکمائے نے دو بڑے حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) جان دار چیزیں جن میں انسان، حیوان اور نباتات شامل ہیں اور (۲) بے جان چیزیں۔ پتھر اور دھاتیں وغیرہ۔ اس لحاظ سے نباتات میں زندگی تسلیم کی گئی ہے۔

ایسا علم جو ہمیں جانداروں سے متعلق مطالعہ اور تحقیق میں مدد دیتا ہے اُسے علم حیاتیات BIOLOGY کہتے ہیں۔ اس علم کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی ایک زوالوجی ZOOLOGY یعنی حیوانات اور دوسرا BOTONY یعنی نباتیات۔ علم نباتیات کی مدد سے ہم نباتات کا مطالعہ و تحقیق کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسان نے کافی حد تک ترقی کر لی۔ ایسی مشینیں ایجاد کر لی ہیں جو چلتی ہیں۔ بولتی ہیں۔ انواع و اقسام انجام دیتی ہیں لیکن سائنس کی اس قدر ترقی کے باوجود اب تک کوئی جاندار شے نہیں بنائی جا سکی۔ حتیٰ کہ ایک معمولی پتہ بھی کسی مشین یا انسانی علم کسبی کے ذریعے خلق نہیں کیا جا سکا۔ بلکہ جوں جوں حقائق دریافت ہو رہے ہیں توں توں نئی نئی اُلجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں اور کسی میدان میں بھی تسلی و تشفی نصیب نہیں ہو رہی۔ اس اضطراب کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ انسان علم وہبی سے محروم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک گتھی سلجھاتا ہے تو کئی دوسری اُلجھنوں میں گرفتار ہو جاتا ہے صاحبانِ علم وہبی نے بغیر کسی سائنسی سہولت و آلات و تجربات کے زمانۂ قدیم میں

جو ہدایات فرمائیں وہی باتیں دوسرے لوگوں نے کئی سو سال بعد متعدد تجربات اور لاتعداد آلات کی بدولت دریافت کیں پس اگر مسلم قوم اپنے نبیؐ کے فرمان کے مطابق قرآن مجید اور عترتِ اہلِ بیتؑ سے سائنسی علوم حاصل کرنے میں غفلت نہ کرتی تو مسلمانوں پر آج جو زوال ہے وہ نہ ہوتا۔ اور موجودہ زوال کا علاج اَب بھی ثقلین ہی کی پیروی سے کیا جاسکتا ہے۔

ثقلین مکمل طور پر انسانی فلاح و بہبود و حفاظتِ انسانیت کی ضمانت دیتے ہیں۔ عترتِ رسولؐ کی زندگیاں اسی مقصد کے مطابق بسر ہوئیں۔ یہی گروہ محافظِ انسانیت ہے۔ انہی ہادیانِ برحق نے دین کی حفاظت فرمائی۔ انبیاء و صالحین ماسبق کا دین اکمل نہیں تھا۔ تکمیلِ دین حضرت محمد مصطفٰےؐ پر ہوئی۔ لہٰذا حضور پیغمبرِ اسلام اور ان کے دین و علوم وہبی کے وارث (عترتِ اہلبیتؑ رسالتؐ) دیگر انبیاءؑ و صالحین سے افضل و اعلٰی ہیں۔ اور یہ فضیلت محض عقیدہ کی خوش فہمی نہیں بلکہ اس کی اصل علم ہے۔ عترتِ رسولؐ کے علمی احسانات ایک غیر جانبدار شخص کو مجبور کر دیتے ہیں کہ ان کا ممنون ہو۔ قدریہ ہے کہ ان میں سے جو ذواتِ مقدسہ اس دُنیا سے بظاہر رُخصت ہو چکی ہیں۔ بحکم و لطفِ الٰہی ان کے علمی ہدایات و فیوض اَب بھی جاری ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ ہستیاں ہیں جو اس دُنیا میں تشریف لانے سے قبل بھی اہلِ دُنیا کی مشکل کشائی فرماتی رہی ہیں۔ اس مشکل کشائی کی ایک مثال ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔

بشارتِ حضرت فاطمہ زہراؑ اور "خشیتہ البتولؑ"

"خشیتہ البتولؑ" ایک عجیب الصفات پودا ہے جو امریکہ اور کینیڈا کے عبادت خانوں اور مقبروں میں برکت و زینت کے لئے رکھا جاتا ہے۔ یہ قدیم امریکیوں کی وہ مقدس بوٹی ہے جسے حصولِ اولاد اور دفعیہ امراض کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

ادارہ معارفِ اسلام لاہور نے "خشیتہ البتول" نامی ایک رسالہ شائع کیا ہے جسے حکیم محمود گیلانی صاحب سابق اہلِ حدیث نے مرتب فرمایا ہے۔ چنانچہ حکیم صاحب موصوف تحریر کرتے ہیں کہ "آج سے دو ہزار سال پیشتر کی بات ہے۔ امریکہ کے قدیم سُرخ رُو

(RED FACED) باشندے ایک "راہبہ" عورت کی بزرگی و کمال کے بہت گرویدہ تھے تاریخ اس راہبہ کا نام "دِل گیوی" (WILGAVY) بتاتی ہے۔

جب اس راہبہ کے "عارفانہ کمالات" اور "زاہدانہ اعمال" کا بہت چرچا ہوا تو لوگ حصول اولاد کے لئے بھی اس کے پاس آنے لگے۔ اسنے ہر چند نفی میں سر ہلایا کہ "میں کسی کو فرزند عطا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ مگر لوگوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ راہبہ ان کے اصرار سے بہت تنگ آئی اور دُعائیں مانگنے لگی کہ "خداوندا! یا تو مجھے بچے تفویض کرنے کی طاقت دے یا مجھے ہلاک کردے"۔

ایک رات ۔ چودھویں کا چاند اپنے پورے جوبن سے جگمگا رہا تھا۔ راہبہ "دل گیوی" اپنی کٹیا میں گھاس پھونس کی بنی ہوئی ایک چٹائی پر بیٹھی عبادت کررہی تھی کہ دو بانجھ عورتیں اس کے پاس آکر آہ و زاری کرنے لگیں اور عرض گزار ہوئیں کہ ہم دونوں اولاد سے محروم ہیں۔ اگر جلدی ہمیں آبستگی نہ ہوئی تو ہمارے شوہر ہمیں چھوڑدیں گے یا جان سے ماردیں گے۔ راہبہ اُن کے رونے، چلّانے اور فریاد کرنے سے متاثر بھی ہوئی اور پریشان بھی۔۔ آخر اس نے یہ کہہ کر انہیں ٹال دیا کہ تم چار دن کے بعد آنا۔ میں تمہیں ایک بہت عجیب طریقہ بتاؤں گی۔ اس کے بعد وہ اسی چٹائی پر سو گئی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی کہ راہبہ نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ بڑا ہی سُہانا۔ ایمان افروز اور مقدس خواب !۔۔ وہ کیا دیکھتی ہے کہ ایک نہایت ہی بزرگ و محترم خاتون، سیاہ برقعہ میں ملبوس اس کے قریب کھڑی ہے اس کے بدن اور اس کے لباس سے جنت کے پھولوں کی خوشبو آرہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک سنہری روپہلی کتاب ہے جس کی سونے کے حروف میں لکھی ہوئی عبارت آفتاب و ماہتاب کی چمک کو شرمارہی ہے طاہرہ طیبہ خاتون نے راہبہ سے کہا۔

"اے راہبہ! میں بہت خوش ہوں کہ تو وحشی اور جنگلی انسانوں میں رہ کر خدائے واحد کی عبادت کرتی ہے۔ اور ہمارے ذکر میں معروف رہتی ہے۔ سُن! میرا نام فاطمہؑ بتولؑ ہے۔ مجھے میرے مقدس باپؐ نے اللہ کے حکم سے تیرے پاس بھیجا ہے۔ ہم نے اس جنگل

میں ایک بُوٹی اُگائی ہے۔ اس سے ملتی جلتی اور بھی کئی بوٹیاں ہیں لیکن جس بوٹی کے لئے تجھے آگاہ کیا جارہا ہے۔ اس کے ہر پودے میں پانچ شاخیں پھوٹتی ہیں اس کی ہر شاخ پر چودہ پتے ہوتے ہیں۔ اس کے ہر پتے میں چودہ دندانے یا کنگرے ہوتے ہیں۔ اس کی ہر ٹہنی میں چودہ کلیاں نکلتی ہیں اور جب اسکے پھول کھلتے ہیں تو ہر پھول میں چودہ پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ اکتیس روز کے بعد پھول جھڑ جاتے ہیں تو چودہ باریک باریک پھلیاں نمودار ہوتی ہیں اور ہر پھلی سے چودہ ننھے ننھے بیج نکلتے ہیں۔ یاد رکھ اے راہبہ! اس بوٹی کا نام "گل طاہرہ" ہے۔ اگر کوئی بانجھ اور عقیمہ عورت اس بوٹی کے پتوں یا پھولوں یا جڑوں کو شہد میں ملا کر کھائے اور رحم میں اس کا حمول کرے تو باذن اللہ تعالیٰ وہ چند ہی روز میں حاملہ ہوگی اور وقت معیّن پر خالق اس کو فرزند عطا فرمائے گا۔ دیکھ اے راہبہ! ہم نے تجھے بے اولادوں کا علاج کرنے کا راز بتا دیا ہے۔ خدا کی مخلوق سے بھلائی کیجیو۔ اللہ سے ہر وقت ڈریو، گناہ اور بُرائی سے ہمیشہ دُور رہیو۔ اور کسی سائل کو دُھتکاریو نہیں۔"

راہبہ نے صبح اس بوٹی کو تلاش کرنا شروع کیا۔ چنانچہ "گل طاہرہ" کے پودے اس کو مل گئے۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک ہاتھ سے پتے کو توڑا اور دوسرے ہاتھ سے پھول کو۔ باری باری سونگھا۔ عجیب قسم کی بھینی بھینی لطیف خوشبو نے اس کے دل و دماغ پر خوش گوار اثر ڈالا۔ اس نے بڑی محبت و عقیدت سے چند پودے اکھاڑے اور انہیں اپنی رہائش گاہ پر لے آئی۔ خاتونِ اقدس بنتِ محمدؐ کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق راہبہ نے اس بوٹی کو خوراکی (ORAL) طور پر اور حمول (SPOSITORY) کے طور پر برتنا شروع کر دیا۔ وہ جس بانجھ عورت کو استعمال کراتی۔ وہ حاملہ ہو جاتی اور مقررہ وقت کے بعد بے اولاد مستورات صاحبِ اولاد ہو جاتی تھیں۔ تھوڑی ہی مدت بعد راہبہ کا علاقہ بھر میں ہی نہیں ملک بھر میں خوب شہرہ ہوا۔ اور امریکہ کے تمام باشندوں میں مشہور ہو گیا کہ "ول گیوی" راہبہ عقیمہ و عاقرہ عورتوں کو دولتِ اولاد بخشتی ہے چنانچہ اس راہبہ کے علاج معالجے سے ان کی

زندگی میں ایک ہزار سے زائد بانجھ مستورات نے بچے جنے۔

حکیم محمود گیلانی صاحب کی تحقیق کے مطابق مذکورہ بوٹی "گل طاہرہ" پر مزید تجربات کئے گئے اور اسے بہت سے دیگر امراض میں مفید پایا۔ چنانچہ گنٹھیا کا علاج اس بوٹی سے کیا گیا۔ پٹھوں کے درد، ایّام کی بے قاعدگی، بدہضمی، کمزوری رحم، ناک و منہ کی بدبو، ہیضہ، فساد خون، ضعف قلب، نزلہ و زکام، خرابی جگر، ورم معدہ، کھانسی اور گردہ و مثانہ کی خراش وغیرہ کے امراض میں اس بوٹی کے فوائد تسلیم کئے گئے۔

جناب سیدہ طاہرہؑ کی ہدایت کردہ بوٹی "گل طاہرہ" کے نام ہر زمانہ میں تبدیل ہوتے رہے۔ چنانچہ اس کو "گل طاہرہ" کی بجائے "گیل تھیرا" GALTHERA کہا جانے لگا۔

بعض نام اس کی صفات اور اس کی شکل و صورت کی مناسبت سے وضع کئے گئے۔ چونکہ اس کے ہر پتہ میں چودہ۱۴ دندانے ہیں اسلئے اس کو "فورٹین ہکڈ" (FOURTEEN HOOKED) کہا گیا ہے۔ چونکہ ہر شاخ پر یہ چودہ۱۴ پتے رکھتی ہے لہٰذا اس کو "فورٹین لیور" (FOURTEEN LEAVER) کا نام دیا گیا۔ چونکہ اس کی ٹہنی پر چودہ۱۴ پھول کھلتے ہیں اس واسطے اس کو "فورٹین فلاورز" (FOURTEEN FLOWERS) بھی کہنے لگے۔ لیکن اس کے اصلی اور قدرتی نام "گل طاہرہ" کو بگاڑ کر اس کا جو نام "گیل تھیرا" GALTHERA رکھا گیا تھا وہ اور بھی بگڑتا چلا گیا اور آخر کار اس بگاڑ نے "گال تھیریا" (GAULTHERIA) کے نام پر جاکر دم لیا۔ بوٹی "گل طاہرہ" یا "گال تھیریا" کے متعدد اقسام ہیں جن میں سے بعض انواع کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ وائلڈ گال تھیریا (WILD GAULTHERIA) یہ بوٹی امریکہ اور کینیڈا کے جنگلوں میں عام ہوتی ہے۔

۲۔ گارڈن گال تھیریا (GARDEN GAULTHERIA) اس کو باغوں میں نمائش و زیبائش کے لئے لگایا جاتا ہے۔

۳۔ سینڈک گال تھیریا (SANDIC GAULTHERIA) یہ قسم ریتیلے مقامات پر اگتی ہے۔

۴۔ کمپاؤنڈ گال تھیریا (COMPOUND GAULTHERIA) اس نوع کے ایک پودے میں تین چار رنگوں کے پھول لگتے ہیں۔

۵۔ لائٹ گال تھیریا (LIGHT GAULTHERIA) دراصل یہی وہ بوٹی ہے جو حقیقی "گل طاہرہ" ہے۔ مگر یہ قسم آج کل بہت نایاب ہے۔ امریکہ اور کینیڈا کے بعض جنگلوں میں بہت تھوڑی مقدار میں ملتی ہے۔

باقی اقسام کو دوا کے طور پر آج کل کام میں لایا جارہا ہے۔ پہلے تو ان سے "ایکسٹریکٹس" "ٹنکچر" بھی تیار کئے جاتے تھے لیکن اب وہ متروک ہو چکے ہیں۔ اور ایلوپیتھی میں آئل آف گال تھیریا (OIL OF GAULTHERIA) دوا مستعمل ہے جس کو برطانیہ میں (OIL OF WINTER GREEN) بھی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام جیلانی لاہوری نے "گال تھیریا آئل" کا ذکر کیا ہے ملاحظہ ہو میٹیریا میڈیکا یا مخزن الادویہ ڈاکٹری مؤلفہ ڈاکٹر غلام جیلانی جلد ۲ طبع سوم ص۵۹۴۔ لیکن ڈاکٹر ایم۔ کے ہارون، ڈاکٹر بیورک، ڈاکٹر فلگر، ڈاکٹر کاوڈن اور ڈاکٹر سیتارام نے اپنی کتابوں میں تمام اقسام اور ان کے مرکبات کا بیان لکھا ہے۔

لیکن جب یورپ اور امریکہ کی ڈاکٹری کتابوں کے عربی ترجمے ہونے لگے۔ تو عرب اطباء نے "لائٹ گال تھیریا" یعنی گل طاہرہ کی نسبت تاریخی حالات اور "ول گیومی" زاہبہ کے واقعات معلوم کرکے اس بوٹی کا نام "حشیشۃ البتول" تجویز کیا۔ ڈاکٹر غلام جیلانی، ڈاکٹر سیتارام اور ڈاکٹر سانڈر نے بھی اپنی مخازن الادویہ میں "گال تھیریا" کا عربی نام "حشیشۃ البتول" ہی درج کیا ہے۔

حشیشۃ کے معنی گھاس یا بوٹی اور بتول جناب سیدہ دو عالم کا لقب ہے۔ یعنی وہ بوٹی جس کا علم فاطمہ بتول بنت رسول کے ذریعے دیا گیا۔

گال تھیریا (گل طاہرہ یا حشیشۃ البتول) کے بعض دوسرے اقسام کو اہل عرب "خضرۃ الشتا" کہتے ہیں۔ اس کی چند انواع ہندوستان میں بھی ملتی ہیں۔ جہاں اس کو "سری بھری" کہا جاتا ہے۔ "بھوج پتر" بھی اسی نبات کی ایک نوع کہی جاتی ہے۔ ان اقسام کو بھی عورتوں کے بعض مخصوص امراض میں استعمال کیا جاتا ہے۔

برطانیہ کے ڈاکٹر سی گلیوٹ نے اعتراف کیا ہے کہ حشیشۃ البتول ایک "الہامی بوٹی" ہے جس کے خواص کشف کے ذریعے بتائے گئے۔

بھارتی ڈاکٹر ست پال رتیدیا نے تسلیم کیا ہے کہ لائٹ گال تھیریا کے فوائد کسی خدائی اشارہ سے منکشف ہوئے۔

ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ لوگ مذکورہ بوٹی کو کام میں لائیں یا نہ لائیں اس سے فائدہ اٹھائیں یا نہ اٹھائیں۔ ہمیں تو صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ نے اپنے محبوب پیغمبر اعظمؐ کی محبوب بیٹی کی جلالتِ شان ایسے عجیب رنگ میں دکھائی ہے کہ دُنیا کے ایک ایک گوشے میں کسی نہ کسی صورت اسکے جلوے اور اس کے معجزے نظر آتے رہتے ہیں۔ دیکھ لیجئے! آج بھی امریکہ اور کینیڈا کے عبادت خانوں اور مغرب میں جناب بی بی پاک دخترِ شاہِ لولاکؐ کی نشان زدہ بوٹی۔ گلِ طاہرہ یا حشیشۃ البتول۔ کو حصولِ برکات۔ دفعیہ آفات۔ تحصیلِ بخشش و معرفت وغیرہ کے لئے رکھا جاتا ہے۔ کرسمس اور ایسٹر کے ایام میں مسیحی معبدوں کو اس بوٹی کے پھولوں اور پتوں سے سجایا جاتا ہے شادی وغمی کی تقریبات میں بھی اس کو تزئین و تسکین، راحت و فرحت اور عزو برکت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ امریکہ کی جنگلی اقوام "لائٹ گال تھیریا" یعنی اصلی گلِ طاہرہ کے پودے اپنے خاص تہواروں پر اپنے مکانوں میں لٹکاتی ہیں۔ اور دروازوں کے درمیان معلق کرتی ہیں۔ سُرخ جنگلی امریکن ہر سال موسم بہار میں اپنی ایک مذہبی تحریک مناتے ہیں جس کو سالڈر ڈے (SAWLDER DAY) کہتے ہیں۔ اس تقریب میں وہ اپنی زبان میں چند الفاظ ادا کرتے ہیں۔ آپ بھی سُن لیجئے۔

"WELDON DETT NAHIE SCHENO PHATEM DESOCHRYSE ONTIS BLATTO SHINO GOIDAN."

(ANNUAL . THE LIGHT 1918)

ترجمہ:- "اس متبرک تقریب کو ہم بڑے احترام کے ساتھ "فاطمہؑ" کے نام سے شروع کرتے ہیں۔ اے خدا! تو اس نام کی بدولت ہر حاجت مند کی مُراد پوری کر۔"

(سالنامہ "دی لائٹ" واشنگٹن ۱۹۱۸ء)

کناڈین باشندوں کا ایک فرقہ جو بوٹالک (BOTALIC) کہلاتا ہے اپنے نوزائیدہ بچّوں کے گلے میں گل طاہرہ یعنی خشیشۃ البتول کے پھول ڈالتا ہے اور اُس بوٹی کو پانی میں ابال کر وہ پانی اپنے بچّوں کے جسموں پر چھڑکتا ہے۔ ان کا مذہبی رہنما جب بچّوں پر مذکورہ بوٹی کا پانی چھڑکتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ چند الفاظ بولتا جاتا ہے جس کا انگریزی ترجمہ پادری جیمز آف بسٹل نے یوں کیا ہے۔ "BY THE HOLY NAME OF "BETOUL"

AVERY HONOURABLE AND BIGGEST QUEEN OF BOTH WORLDS."

ترجمہ:۔ اس "بتول" کے مقدّس نام سے جو دونوں جہانوں کی نہایت عزت اور عظمت والی ملکہ ہے۔"

(ماخوذ از کتاب "HOLY PRAYERS" مؤلفہ جیمز مطبوعہ انگلینڈ)

یہ حالات ہر صاحب ہوش، ہر دانا و بینا انسان کو دعوت فکر و نظر دے رہے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب معصومین کے فضائل پر نگاہ کرے۔ اپنے دل کو نور ایمان سے منوّر کرے۔ ان کی مدّاحی و حمادی میں مصروف رہے تاکہ وہ دین و دُنیا میں شادکام و فائز المرام ہو اور جنّت کی بہاریں لوٹے۔" (ماخوذ از "خشیشۃ البتول" سلسلہ معارف اسلام ۶۱)

ثابت ہوا کہ یہ معصومین دُنیا میں ظہور سے پہلے بھی مُشکل کُشائی کرتے رہے ہیں اور ان کا فیض ہدایت جاری ہے جو اصل میں حضورؐ ہی کا فیض ہے۔ پس یہ اس امر کی دلیل ہے کہ کسی نئے نبی کی قطعاً ضرورت نہیں ہو سکتی۔ حضورؐ آخری نبی ہیں۔ ثقلین کے ارشادات سے "ختم نبوّت" بالکل واضح اور ثابت ہے۔

علم نباتات (باٹنی) پر ثقل دوم کی ہادیہ حضرت سیّدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی رہنمائی کے بعد اس بات کی قطعی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ اس بارے میں کچھ مزید لکھا جائے۔

ہم نے اقوال ثقلین نقل کر کے فیصلہ ناظرین کے انصاف پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ہدایت رسولؐ کو ذہن میں رکھتے ہوئے رائے قائم فرمائیں کہ صرف ثقلین ہی دُنیا کے تمام مسائل کا واحد حل ہیں۔ کسی بھی شعبۂ حیات میں ان سے ہدایت طلب کریں۔ کماحقہ رہنمائی ہوگی۔ دونوں ثقلین

کسی بھی مقام پر ایک دوسرے سے جدا نظر نہ آئیں گے یہی صداقتِ رسالت کی دلیل ہے۔

دُنیائے اسلام نے بڑے بڑے سپوتوں کو جنم دیا ہے لیکن عترتِ اہل بیتؑ رسالتؐ جیسا ایک بھی پیدا نہیں ہوا جن لوگوں کو عترتِ رسولؐ کے ہم پلہ یا برابر ثابت کرنے کی بے کار کوشش کی جاتی ہے اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی عترتِ مصطفےٰؐ جیسا علم نہیں رکھتا تھا اور وہ لوگ تمام مشکل علمی مسائل کو پوچھنے میں عترتِ اہلِ بیتؑ کے بار بار محتاج ہوتے تھے۔ آج بھی عترتِ رسولؐ کے چشمے پوری انسانیت کو دعوتِ فیض دیتے ہوئے رواں دواں ہیں۔

پس علم نباتات ہو یا کوئی دوسرا علم، ہر میدان میں ثقلین کے قدموں کے درخشندہ نشانات ملتے ہیں اور مشکلات زمانہ کا واحد حل صرف تمسک بالثقلین ہے۔

کتاب ہذا کی فصلِ نباتات ختم ہوئی۔ اس فصل کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:۔

۱۔ نباتات کی بے شمار نشانیاں انسانی ہدایت کے لئے کافی ہیں۔ علم نباتات بہت وسیع ہے کہ انسانی عقل اس کا مکمل احاطہ نہیں کرسکتی۔ نباتات فطری خاصیتوں پر قائم رہتے ہوئے پھلتے پھولتے ہیں۔

۲۔ جس طرح ایک دانہ مٹی میں مل کر گل، گلزار بن جاتا ہے۔ اسی طرح انسان کا حشر و نشر ہوگا۔

۳۔ نباتات سے متعلقہ حقائق جو انسان نے متعدد تجربات و آلات کی مدد سے معلوم کئے ہیں۔ ثقلین نے ان کی نشاندہی آلات و تجربات کے بغیر ہی کر دی تھی۔

۴۔ قدرت نے ہر نبات کا جوڑا پیدا کیا ہے اور فطری اصولوں سے مادہ پودے حاملہ ہوتے ہیں اور اپنی نسل کو قائم رکھتے ہیں۔

۵۔ ہوا نباتات کو حاملہ کرنے میں مدد دیتی ہے۔

۶۔ موجودہ باٹنی کا مطالعہ ان پودوں سے متعلق ہے جو ہمارے چاروں طرف ملتے ہیں اور ماہرین نے ان کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ تخمی پودے اور غیر تخمی پودے پھر آگے ان کے اقسام ہیں۔

۷۔ ثقلین نے پھلوں اور سبزیوں کے بارے میں نہایت شاندار اور مفید ہدایات فرمائی ہیں۔

۸۔ دیگر نباتات کے بارے میں اقوالِ ثقلین کی روشنی میں تحقیقات کی جا سکتی ہیں۔

۹۔ انسانی ترقی نے کئی خود کار مشینیں ایجاد کر لی ہیں لیکن اُسے ایک پتہ پیدا کرنے کی بھی دسترس حاصل نہ ہو سکی۔ بلکہ جوں جوں کسی علم میں ترقی ہوتی چلی گئی نئے نئے مسائل پیدا ہوتے گئے اور ان کا تسلی بخش حل دریافت نہ ہو سکا۔

۱۰۔ اس اضطراب کی وجہ علم وہبی سے محرومی ہے۔

۱۱۔ صاحبانِ علم وہبی کی ہدایات کی اساس تجربات و آلات پر نہیں ہے۔

۱۲۔ ثقلین تحفظِ انسانیت کی ضمانت دیتے ہیں۔ ثقلِ دوم کی زندگیاں اسی مقصد کے عین مطابق بسر ہوئیں۔

۱۳۔ ان ہادیانِ برحق نے حیاتِ ظاہری میں بھی ہدایت فرمائی اور حیاتِ غیر ظاہری میں بھی ہدایت فرماتے رہے ہیں اور یہ فیض اب بھی جاری و ساری ہے۔

۱۴۔ "حشیشۃ البتول" نامی بوٹی کی بشارت حضرتِ سیدۂ عالم فاطمہؑ بنتِ رسولؐ اللہ نے دو ہزار سال قبل ایک راہبہ کو دی۔

۱۵۔ سائنس کی دُنیا نے اس نبات سے فائدے حاصل کئے۔

۱۶۔ عیسائی علماء عظمتِ جنابِ فاطمہؑ بتول کے قائل ہیں۔ میدانِ مباہلہ میں بھی اس کو تسلیم کیا تھا۔

۱۷۔ مسلمانوں میں کئی شخصیتیں پیدا ہوئیں لیکن "ثقل دوم" کے مصداق حضرات کا ہم پلّہ نہ کوئی ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔

۱۸۔ آج بھی عترتِ رسولؐ کے علمی چشمے جاری ہیں اور زمانے کو فیض پہنچا رہے ہیں۔

۱۹۔ علم کے ہر میدان میں ثقلین کے قدموں کے درخشندہ نشانات مشعل راہ عروج و کامیابی ہیں اور تمام مسائلِ دُنیا و آخرت کا واحد حل صرف یہ ہے کہ فرمانِ رسولؐ پر عمل کرتے ہوئے قرآنِ مجید اور عترتِ اہل بیتِ رسالتؐ کا دامن مضبوطی سے تھام لیا جائے اور ان سے علم وہبی کی روشنی حاصل کی جائے۔

فصل ہفتم

علمِ حیوانات

ZOOLOGY

علمِ حیاتیات (BIOLOGY) اس علم کو کہا جاتا ہے جو ہمیں جانداروں کے متعلق مطالعے اور علمی تحقیق میں مدد دیتا ہے۔ اس علم کو دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱۔ علم نباتات (BOTANY) ۲۔ علم حیوانات (ZOOLOGY)

علم حیوانات وہ سائنس ہے جو ہمیں حیوانات کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ علم نباتات کی طرح علمِ حیوانات بھی اسقدر وسیع ہے کہ عقلِ انسانی اس علم پر مکمل عبور حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ حتیٰ کہ انسان ابھی تک حیوانات کے تمام اقسام سے بھی واقف نہیں ہو سکا۔

ثقلِ اوّل میں ارشادِ الٰہی ہے کہ :-

" اور زمین میں جو بھی چلنے پھرنے والا جاندار ہے یا اپنے دو پروں سے اُڑنے والا پرندہ ہے اُن کی بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ ہم نے کتاب میں کوئی بات فروگذاشت نہیں کی ہے۔ پھر اپنے پروردگار کے حضور لائے جائیں گے (سورۂ انعام)

حضرت امام زین العابدینؑ کا ارشاد ہے کہ ۱۔ اپنے رب کو ۲۔ موت کو۔ ۳۔ مذکر و مونث کو ۴۔ اپنی خوراک کو ہر جانور جانتا ہے [1]

ایک غیر معتبر اندازے کے مطابق کرۂ ارض پر جانوروں کے دس لاکھ سے زائد

---

[1] یہ قاعدہ فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان فرمایا جو لوگ خدا کے منکر ہو گئے ہیں وہ اصل میں فطرت کے منکر ہیں۔

اقسام موجود ہیں۔ ہر قسم کی علیحدہ علیحدہ شکل وصورت اور خصوصیات ہیں۔ ان جانوروں کو انسان جیسا شعور عطا نہیں ہوا۔ اگر ہوتا تو وہ انسان کے مطیع نہ ہوتے۔ بلکہ انسان کو زمین پر زندہ نہ چھوڑتے۔ قدرت نے جانوروں کی تخلیق جغرافیائی مناسبت کے مطابق فرمائی ہے۔ کیونکہ بعض خشکی پر رہتے ہیں بعض پانی میں اور کچھ ہوا میں خشکی پر مقیم جانوروں کی ساخت ان جانوروں سے مختلف ہے جو پانی میں رہتے ہیں۔ اسی طرح ہوا میں رہنے والے جانور اپنی جدا ہیئت رکھتے ہیں۔ مچھلیوں کے لئے سانس لینے کے واسطے گلپھڑے ہوتے ہیں۔ جنکی مدد سے وہ پانی میں آسانی سے سانس لیتی ہیں۔ پرندوں کی ہڈیاں ہلکی ہوتی ہیں۔ اور ان پر گوشت بہت کم ہوتا ہے ہڈیوں میں گودے کی جگہ ہوا بھری ہوتی ہے۔ اور صرف سینے کی ہڈی پر گوشت زیادہ ہوتا ہے تاکہ پرواز کرنے میں تکلیف نہ ہو۔ تیرنے والے جانوروں کا بدن کشتی نما ہوتا ہے۔ اور ان کے پنجوں پر جھلی کا غلاف چڑھا ہوتا ہے جو چپو کا کام دیتے ہیں۔ ان سے تیرنے میں انھیں مدد ملتی ہے۔ الغرض جس جاندار کو اپنی ضروریات کے لحاظ سے جیسے اعضاء کی ضرورت تھی۔ خالق نے انھیں ویسے ہی اعضاء عطا فرمائے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان اعضا کو صحیح مصرف میں لانے کے طریقے بھی فطری طور پر سکھائے۔ کسی آبی جانور کو تیرنے کی مشق کرانے یا سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کسی پرندے کو آداب پرواز سکھانے نہیں پڑتے۔ فطری طور پر ہر جاندار اپنی زندگی کے حصول وطریقوں کی تعلیم لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ بغیر سمجھائے ہر جاندار اپنے دشمن کو پہچانتا ہے۔ دوست کی شناخت رکھتا ہے۔ اپنی خوراک سے واقف ہوتا ہے۔ یہ تمام امور بے شعور مادے کے کرشمے نہیں ہیں بلکہ یہ اس خدائے علیم وحکیم مطلق کی صناعی کے جلوے ہیں جو تمام کائنات کا خالق ومالک ہے۔

بھڑ کی تخلیق پر غور وفکر کیجئے کہ خالق فطرت نے اسے اپنی بقا کے لئے جو خوراک حاصل کرنے کا طریقہ تعلیم فرمادیا ہے ہزاروں سال سے اسی پر عمل کرتی چلی آرہی ہے۔ کبھی بھولے سے بھی اپنا طریقہ تبدیل نہیں کرتی۔ جب کبھی کسی ٹڈے کا شکار کرتی ہے تو

اُسے اس طرح کاٹتی ہے کہ وہ بیہوش ہو جاتا ہے۔ پھر زمین کھود کر اس بیہوش ٹڈے کو اس میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے بعد بچے دیتی ہے اس سوراخ میں ٹڈا اُس وقت تک بے ہوشی کے عالم میں محفوظ گوشت کی طرح زندہ رہتا ہے۔ جب تک وہ اس کے بچوں کی خوراک نہیں بن جاتا۔ پھر وہ مناسب جگہ پر انڈے دیتی ہے جہاں اس کے بچے انڈوں سے نکل کر اسی بیہوش ٹڈے کے گوشت پر پلتے ہیں اور بڑھتے ہیں اس وقت تک ٹڈے میں زندگی کی رمق باقی رہتی ہے کیونکہ اگر وہ مر جائے تو اُس کا گوشت زہریلا ہو جائے گا؛ اور کھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ پھر اپنی خلقت کی ابتدا ہی سے اسی طرح عمل کرتی آرہی ہے۔ یہ احساس و شعور کہ ٹڈے کو بیہوش کر کے رکھنے سے اس کا گوشت محفوظ رہے گا۔ ورنہ زہریلا ہو جائے گا۔ اور کھانے کے قابل نہ رہے گا۔ آخر اُسے یہ طریقہ کس طرح حاصل ہوا۔ یقیناً یہ احساس و شعور مادّے نے نہیں دیا بلکہ رب العالمین کی دی ہوئی فطری تعلیم ہے۔

امریکہ میں ایک خاص قسم کی ٹڈی پائی جاتی ہے۔ جو "سترہ سالہ ٹڈی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ٹڈی متواتر سولہ سال زمین کی تاریک پناہ گاہوں میں دبی رہتی ہے۔ ان پناہ گاہوں اور سرد خانوں کا درجہ حرارت یکساں ہوتا ہے۔ سولہ سال گزرنے کے بعد سترھویں سال مئی کی چوبیس تاریخ کو یکایک ان تہ خانوں سے باہر آتی ہے ان تاریک تہ خانوں میں بظاہر نہ تو کوئی الارم ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی کلینڈر جو اُسے یہ بتاتا ہو کہ سولہ سال پورے ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود مقررہ وقت میں ایک دن کا بھی فرق نہیں ہوتا۔ آخر اُسے یہ شعور کس نے عطا کیا؟ چنانچہ نقل اوّل میں رب العزّت نے مختصر الفاظ میں یوں بیان فرما کر تمام اشیاء کے فطری احساس و شعور کی وضاحت فرمادی کہ:۔

"خدا وہی ہے کہ جس نے پیدا کرتے ہو ہی ہدایت (فطری) فرمادی ہے۔"

انسانی زندگی سے حیوانات کا گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا اسلام جو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ علم حیوانات کے بارے میں مکمل رہنمائی کرتا ہے اور ثقلین نے

اس علم کے بارے میں سینکڑوں سال قبل ایسے حقائق سے پردے اٹھائے ہیں جو آج کی سائنس کو حیرت میں ڈال رہے ہیں۔ ثقلِ اوّل میں بعض سورتوں کے نام ہی حیوانوں پر رکھے گئے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ النمل۔ نمل چیونٹیوں کو کہتے ہیں۔

چیونٹی سورۂ نمل میں ارشاد ہے "حتیٰ کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی میں آئے تو ایک چیونٹی نے کہا۔ اے چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ! ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور ان کا لشکر تمھیں روند ڈالے اور انھیں اس کی خبر بھی نہ ہو۔ سلیمان اس کی اس بات سے مسکرا کر ہنس پڑے۔"

چیونٹی کی تخلیق اور فہم و فراست پر غور کیجیے کہ اس کے وجود میں خالق نے کتنی صلاحیتیں اور حکمتیں پوشیدہ فرمائی ہیں۔ عقلِ انسانی نے اگرچہ اب اتنی ترقی کرلی ہے کہ اب وہ سائنسی آلات کے ذریعے چیونٹی کے چلنے کی آواز کو سن لیتا ہے اور ممکن ہے اس آواز کو ریکارڈ بھی کرلیا گیا ہو۔ لیکن ابھی تک یہ بات انسانی دسترس سے باہر ہے کہ وہ چیونٹی کی گفتگو کو سمجھ سکے۔ ثقلِ اوّل میں ہزاروں برس پہلے کے ایک واقعہ کو بیان کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ اللہ کا نمائندہ، ہادیٔ برحق بغیر کسی مادی آلے کے چیونٹی جیسی چھوٹی مخلوق کی گفتگو کو نہ صرف سن سکتا ہے بلکہ سمجھ بھی سکتا ہے۔ چیونٹی اگرچہ جسمانی لحاظ سے انتہائی غیر اہم مخلوق نظر آتی ہے لیکن دراصل یہ خلاقِ عالم کی تخلیق و صنعت کا عظیم شاہکار ہے۔ اس کی قوتِ احساس اس قدر تیز ہوتی ہے کہ بارش آنے سے قبل اس کی آمد کو محسوس کر لیتی ہے۔

ایک دفعہ حضرت سلیمانؑ لوگوں کے ساتھ طلبِ باراں کے لئے شہر سے باہر نکلے تو راستے میں آپؑ نے ایک چیونٹی کو چت لیٹے ہوئے دیکھا جو دعا مانگ رہی تھی کہ :۔ "اے ہمارے پروردگار! ہم کمزور چیونٹیاں تیری حقیر مخلوق ہیں اور تیرے رزق سے مستغنی نہیں ہیں۔ اپنے بندوں کے گناہوں کی وجہ سے ہمیں بارش سے محروم نہ فرما۔ یا تو ہمیں سیراب فرما دے یا پھر ہلاک کر دے۔"

حضرت سلیمانؑ نے جب چیونٹی کی یہ دعا سنی تو لوگوں کو فرمایا کہ واپس لوٹ جاؤ

اللہ نے اس چیونٹی کی دُعا قبول فرمائی ہے۔ لہٰذا تم اس کی وجہ سے سیراب ہو گئے۔

چیونٹیاں گرمیوں میں سردیوں کے لئے اپنی خوراک کا ذخیرہ کر لیتی ہیں اور اُونچی جگہ پر اپنے بِل بناتی ہیں تاکہ سیلاب سے محفوظ رہیں۔ جو دانے ذخیرہ کرتی ہیں ان کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیتی ہیں۔ تاکہ وہ دانے پھوٹ نہ نکلیں (اُگ نہ جائیں) اور یوں اُن کی خوراک کے قابل نہ رہیں۔

اگر ان کے جمع شدہ دانوں تک تری آ پہنچے تو وہ ان کو باہر دھوپ میں سکھا لیتی ہیں۔ چیونٹی کے چھوٹے سے جسم میں حواسِ خمسہ مکمل طور پر موجود ہیں۔ اس کے جسم میں چار جبڑے، انتڑیاں اور دُم بھی ہے۔ دُم میں ایک چھوٹا سا ڈنگ بھی ہوتا ہے اس کے پاس زہر کی تھیلی ہوتی ہے۔ اور پہلو میں سانس لینے کے لئے دو سوراخ ہوتے ہیں۔ یہ اپنے بلوں میں کئی قسم کے کمرے بناتی ہیں۔ آرام کرنے کے کمرے علیحدہ ہوتے ہیں۔ اور مشاورتی ہال بھی ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھ کی روشنی بہت تیز ہوتی ہے جو کہ دو سَو آنکھوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ تقسیمِ کار کے لحاظ سے اس میں چند طبقے ہوتے ہیں۔ ملکہ، مزدور، سپاہی۔ مزدوروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی چیونٹی زخمی ہو جائے تو فوراً دوسری چیونٹی کسی کیمیاوی عمل سے اپنے تھوک کو دھاگے کی شکل میں بدل لیتی ہے۔ اور اس کے زخم کو سی دیتی ہے۔

یہ مختصر معلومات محققین نے برس ہا برس کی کوششوں کے بعد حاصل کی ہیں۔ لیکن ثقلِ دوم نے چودہ سو سال قبل ان حقائق پر روشنی ڈال دی ہے۔ چنانچہ قائدِ ثقلِ دوم حضرت امیر المومنین علیہ السلام اثباتِ توحید کے بیان میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"ذرا اس چیونٹی کی طرف اس کی جسامت کے اختصار اور اس کی شکل و صورت کی لطافت و خوبی پر غور کرو۔ وہ اتنی چھوٹی ہے کہ بآسانی نظر نہیں آتی اور نہ فکروں میں سماتی ہے۔ وہ کس خوبی سے زمین پر آہستہ آہستہ چلتی ہے۔ کس طرح اپنے رزق پر جھپٹتی ہے۔ دانہ کو کھینچ کر اپنے بل میں لے جاتی ہے اور انبار

میں جمع کرلیتی ہے۔ وہ گرمی کے زمانے میں جاڑے کے لئے اور اطمینان کے زمانے میں عہدِ بے اطمینانی کے لئے دانہ دانہ پس انداز کرتی ہے۔ خدا اس کی روزی کا ضامن ہے۔ خدائے رحمان و رحیم اس سے غافل نہیں ہے اور خداوندِ جزا دہندہ اسے محروم و بے بہرہ ہونے نہیں دیتا۔ خواہ وہ سنگ خشک پر ہوں (جس میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی) یا سنگ سخت پر (کہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا۔) اگر تم اس کے جسم میں اس کی غذا کے گزرنے کی جگہوں میں ان کی بلندیوں اور پستیوں میں اور پسلیوں کے کناروں میں جو اس کے معدے پر محیط ہیں۔ اور اس کے مختصر سر میں جو اعضاء آنکھ، کان، ناک وغیرہ ہیں۔ غور و تامل سے کام لو۔ تو اس کی شگفتگی آفرینش پر دنگ رہ جاؤ گے۔ اور اس کی کیفیت بیان کرنے میں تم کو تکلف سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پس بزرگ ہے وہ خدا جس نے اس کے پیروں پر اُسے کھڑا کیا۔ اور اس کے جسم کو چھوٹے چھوٹے ستونوں پر استوار کیا۔ اور کوئی کاریگر اس کے بنانے میں شریک نہ تھا۔ نہ کسی صاحب قدرت نے اس کی خلقت میں اس کا ہاتھ بٹایا۔"

(نہج البلاغہ)

میراثِ علم نبوّت کے وارث حضرت صادق آل محمدؐ علیہ السلام مزید وضاحت فرماتے ہیں:۔

"چیونٹیوں کو دیکھو کہ اپنی غذا کو جمع کرنے کے لئے کس طرح اکٹھا ہوتی ہیں۔ تم دیکھو گے کہ چیونٹیاں کسی دانے کو اپنے سوراخ میں پہنچانا چاہتی ہیں تو اس طرح ہوتی ہیں جیسے چند آدمی مل کر غلہ اُٹھائے لے جاتے ہیں۔ بلکہ چیونٹی کو تو اس میں اتنی کوشش و تندہی سے محنت کرنا پڑتی ہے کہ آدمی ویسی نہیں کرپاتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ دانے کو اٹھالے جانے میں آدمیوں کی طرح ایک دوسرے کی کیسے مدد کرتی ہیں۔ پھر دانے کو کاٹنے کا ارادہ کرتی ہیں تو اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دانے اُگ آئیں اور ان کے کام کے نہ رہیں۔ اور جب ان دانوں تک تری پہنچ جاتی ہے تو انھیں باہر نکال کر پھیلا دیتی ہیں تاکہ

خشک ہو جائیں ۔ نیز یہ کہ بلند مقام پر اپنا سوراخ بناتی ہیں تاکہ پانی کی رَو پہنچ کر انھیں غرق نہ کر دے ۔ مگر یہ تمام باتیں بغیر عقل وفہم کے فطری و قدرتی باتیں ہیں جو ان کی مصلحت کے واسطے خداوند عالم کی مہربانی سے ان کی خلقت میں ودیعت کر دی گئی ہیں ۔

مسلمان غور کریں کہ کیا دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا سائنسدان یا ماہر علم حیوانات چیونٹیوں کی تعداد جانتا ہے ؟ مگر حضرت علیؑ نے فرمایا تھا کہ میں چیونٹیوں کی تعداد بھی جانتا ہوں ، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اُن میں نر کتنے ہیں ؟ اور مادہ کتنی ہیں ؟ ۔
(کوکب دُرّی)

لہٰذا مقام غور ہے کہ کیا ایسا علم اُن لوگوں کو بھی حاصل تھا جنھیں حضرت علیؑ کے برابر کہا جاتا ہے ؟ اگر تھا تو ثبوت دیا جائے اور اگر نہیں تو علیؑ کو اُن کا ہمسر نہ بنائیں ۔

شہد کی مکھی

" اور (اے رسولؐ) آپؐ کے رب نے شہد کی مکھی کی جانب وحی فرمائی کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو اونچی اونچی ٹٹیاں بناتے ہیں اُن میں اپنے چھتے بنا ۔ پھر ہر طرح کے پھلوں (کے بور) سے (اُن کا عرق) چوس پھر اپنے پروردگار کی راہوں میں تابعداری کے ساتھ چلی جا ۔ مکھیوں کے پیٹ سے ایک چیز پینے کی نکلتی ہے (شہد) جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں ۔ اس میں لوگوں کے لئے (بیماریوں سے) شفا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے واسطے (قدرت خدا کی) بہت بڑی نشانی ہے ۔"

شہد کی مکھیوں کی تخلیق اور اس کے افعال مظہر قدرت خداوندی ہیں کتاب " ہمارے جانور " سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکھی حواس خمسہ رکھتی ہے ۔ اور عموماً اس کی عمر پانچ سال ہوتی ہے خلاقِ عالم نے اسے پانچ آنکھیں عطا کی ہیں اور ماہرین کی تحقیق کے مطابق اس کی ایک آنکھ پینتیس ہزار آنکھوں کے برابر ہوتی ہے ۔

چیونٹی کی طرح یہ بھی بہت حساس ہوتی ہے۔ آنے والے موسمی تغیر و تبدل کا قبل از وقت احساس کر لیتی ہے۔ شہد کی مکھیوں کی ملکہ کے انڈوں سے کارندہ مکھیاں پیدا ہوتی ہیں اور انہی انڈوں سے شاہی نسل پیدا ہوتی ہے۔ شاہی نسل کی تربیت علیحدہ کمروں میں ہوتی ہے ملکہ ایک مہینے میں اتنے انڈے دیتی ہے کہ چھتے کے تمام خانے بھر جاتے ہیں۔ ان خانوں کی تعداد تقریباً پچاس ساٹھ ہزار ہوتی ہے ماہرین کے مطابق ان کی آنکھیں اتنی چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں جو خوردبین کا کام دیتی ہیں۔ ان کے پسندیدہ رنگ گلابی اور نیلا ہیں۔ ان کی صلاحیتِ باطنی اور تعمیراتی فن کی مہارت کا نمونہ ان کا مسدس چھتہ ہے۔ نہ ہی ان کے پاس مادی آلات ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی انسانی ادراک لیکن اس کے باوجود اپنا مسدس چھتہ اس انداز سے بناتی ہیں کہ ہر خانہ دوسرے خانے کے بالکل برابر ہوتا ہے۔ ہزارہا برس سے ان مکھیوں کے اسلاف اسی طرح چھتے بناتے رہے اور آج بھی ایسا ہی کیا جا رہا ہے۔ نہ ہی کسی سے سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی آلے کی۔ شہد کی مکھی کو جس طرح فطری تعلیم دی گئی ہے اُسی کے زیر اثر تمام کام انتہائی خوش اسلوبی سے سر انجام دے رہی ہے۔ باوجودیکہ چھتے کے پچاس ساٹھ ہزار خانے ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک برابر سائز کا ہوتا ہے ہر مکھی اپنے خانے کو پہچانتی ہے کبھی بھولے سے بھی ایک مکھی دوسرے خانے میں نہیں جاتی خواہ تاریک ترین رات ہی کیوں نہ ہو۔ آخر یہ عقل و شعور مادے کا عطا کیا ہوا کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ احساس خالقِ فطرت کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

شہد کی مکھی کو قدرت نے قوتِ بصارت بہت تیز عطا کی ہے۔ جب بھی کسی پودے یا سبزے پر بیٹھتی ہے فوراً بھانپ لیتی ہے کہ کس پھول یا پودے کے رس میں شہد بننے کی صلاحیت ہے اور کون سے پودے کے رس ہیں سے چھتے کے لئے موم حاصل کی جا سکتی ہے خواہ انسان بڑی سے بڑی دوربین یا کوئی اور آلہ لگا کر دیکھے تب بھی وہ ایسی چیز نہیں دیکھ سکتا جو یہ ننھی منی مکھی اپنی

انتہائی چھوٹی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے۔

شہد کی مکھی بہت نفاست پسند واقع ہوئی ہے۔ کسی بدبودار یا گندی چیز پر نہیں بیٹھتی۔ نجاست سے پرہیز کرتی ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے کسی مکھی کے ساتھ ذرا سی بھی نجاست لگ جائے تو اُسے چھتے میں گھسنے نہیں دیا جاتا۔ اور وہ اگر اندر گھسنے کی کوشش کرے تو اُسے قتل کردیا جاتا ہے۔

تمام مکھیاں اپنے سردار کے حکم کی تابع ہوتی ہیں۔ اُسے "یعسوب" کہا جاتا ہے۔ یہ مکھیاں آواز کی خاص مہارت رکھتی ہیں۔ جب اپنے سردار کی قیادت میں کسی گلستان میں جاتی ہیں تو جاتے ہوئے وہی مخصوص آواز بلند کرتی ہیں جسے سن کر تمام مکھیاں اکٹھی ہوجاتی ہیں۔ اور باغ میں سے رس حاصل کرنے کے بعد واپسی پر پھر اُسی آواز کے کمال کا اظہار کرتی ہیں۔ اگر راستے میں ان کے سردار کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو اسے دوش پر اُٹھا کرلے جاتی ہیں۔ اگر ان کے سردار کی موت واقع ہوجائے تو پہلے اس کے غم میں سوگ مناتی ہیں۔ اس کے بعد سردار کی نسل میں سے ہی کوئی نیا سردار مقرر ہوتا ہے۔ ان کے ہاں کوئی جمہوری الیکشن برپا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس تقرر کے لئے وحی کی ہدایت ہوتی ہے قرآن مجید سے شہد کی مکھی کو وحی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ پس اُن کے سردار کا تقرر بھی بذریعہ نص ہے نہ کہ جمہوری۔

جیسا کہ رب العالمین نے قرآن مجید میں مکھی کا تذکرہ کچھ خصوصیات کے ساتھ فرمایا ہے مثلاً اُسے وحی و الہام سے نوازا ہے جو مقربین الٰہی کی صفت خاص ہے جس سے دلیل قائم ہوتی ہے کہ یہ اللہ کی مطیع اور فرمانبردار ہے۔ اُس کا تیار کردہ شربت ایک ٹانک ہے اور اس میں شفائے امراض ہے اور قدرت نے اسے اپنی خاص نشانی قرار دیا ہے۔

حضرت صادق آلِ محمدؑ نحل کا تذکرہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"شہد کی مکھیوں پر نظر کرو۔ اگر تم باہمی سعی سے شہد اور اُس کے مسدس

چھتوں کے بنانے پر غور کرو گے تو تم اُس میں ذہانت کی باریکیاں پاؤ گے۔ جب تم اس کے عمل پر سوچو گے تو اسے انتہائی عجیب و لطیف پاؤ گے اور جب اُس کی بنائی ہوئی چیز کو دیکھو تو بہت ہی عظیم و شریف پاؤ گے۔ جو لوگوں کے لئے بہت کارآمد شے ہے لیکن جب تم اُسے دیکھو گے تو نہایت ہی غبی پاؤ گے جو اپنی ذات کو بھی نہیں سمجھ سکتی۔ چہ جائے کہ دوسری چیز کو سمجھ سکے۔ پس اس میں اس بات کی صاف و واضح دلیل موجود ہے کہ اُس کی بناوٹ اور صنعت کی درستی اُس کی اپنی طرف سے نہیں ہے بلکہ یہ تمام حکمتیں اور کرشمے اُس ذات کے ہیں جس نے اُسے اس فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اور لوگوں کے لئے اس کام پر معمور کر دیا ہے۔"

مکڑی مکڑی بھی خداوند حکیم کا ایک خاص شاہکار ہے۔ مکڑی کی کئی قسمیں خلق کی گئی ہیں۔ دور حاضر کی تحقیقات کے مطابق مکڑی کیڑے مکوڑوں کا خاتمہ کرتی ہے۔ اگر مکڑی نہ ہو تو ان کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے انسانی حیات دشوار ہو جائے۔ یہ بلندیوں اور پستیوں پر پائی جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

"جن لوگوں نے خدا کے علاوہ دوسروں کو کارساز بنا رکھا ہے، ان کی مثال اس مکڑی کی طرح ہے جس نے ایک گھر بنایا۔ بیشک تمام گھروں سے کمزور مکڑی کا گھر ہے۔ اگر یہ لوگ جانتے ہیں۔" (العنکبوت)

مکڑی میں فن تعمیر کی مہارت پائی جاتی ہے۔ اس کا جالا اس کی پوشیدہ صلاحیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اپنے منہ سے ایک خاص قسم کا لیس دار مادہ خارج کرتی ہے جس سے جالا بنتی ہے۔ اس جالے کا ایک تار ایک انچ کے دس لاکھویں حصے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس میں اس قدر لچک ہوتی ہے کہ اپنی لمبائی سے تقریباً پانچ گنا زیادہ کھینچ سکتا ہے۔ جالا بننے کے بعد اپنی جائے رہائش تک ایک تار لے جاتی ہے جو کہ ٹیلیگراف کا کام دیتا ہے جب کوئی شکار جالے میں پھنس جاتا

ہے تو جال کی حرکت سے سگنل کے تار میں حرکت پیدا ہوتی ہے جس سے شکار کی آمد سے وہ مطلع ہو جاتی ہے۔ اگر شکار اس کے منشا کے مطابق ہو تو پکڑ لیتی ہے بصورتِ دیگر چھوڑ دیتی ہے۔ مکڑی کئی قسم کے جالے بن لیتی ہے ایسے باریک سوراخ کا جالا بھی بن سکتی ہے جس کے سوراخوں سے مٹی اور ریت کے ذرات سے بڑی کوئی شے نہیں گزر سکتی۔ ضرورت کے مطابق رنگ بھی بدلتی ہے۔ کبھی ہرا، کبھی پیلا اور کبھی سفید۔

مکڑی کی ایک قسم ایسی ہے جو جمع شدہ پانی میں رہتی ہے۔ یہ غبارے کی شکل کا جالا بنتی ہے جسے پانی کے اندر سطح زمین سے چپکا دیتی ہے۔ یہ جالا بند غبارے جیسا ہوتا ہے پھر یہ پانی سے نکل کر اپنے جسم کے نچلے حصے کے بالوں میں نہایت ہوشیاری سے ہوا کا ایک بلبلہ اسیر کر کے پانی کے اندر لے جاتی ہے اور اس بلبلے کو اس غبارے کے نیچے چھوڑ دیتی ہے تو ہوا غبارے کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ اس طرح کئی بار اس عمل کو اس وقت تک جاری رکھتی ہے جب تک کہ اس کا غبارہ ہوا سے بھر نہ جائے۔ پھر اس عجیب و غریب مکان میں انڈے دیتی ہے۔ جو ہر خطرے سے محفوظ رہتے ہیں۔ اسی جگہ اپنے بچوں کی پرورش و تربیت کرتی ہے پانی میں غبارے کی تعمیر و تشکیل میں فنی مہارت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جانور کو یہ تعلیم اسی نے عطا فرمائی ہے جو اس کی فطرت کا خالق اور فاطر السموات والارض ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "اس جاندار کو دیکھو جسے لیث (شیر) کہتے ہیں اور عام لوگ اسے مکھیوں کا شیر کہتے ہیں۔ اسے اپنے معاش کی تحصیل کے لئے تدبیر و حیلہ سازی اور رفق و ملائمت عطا کی گئی ہے۔ تم دیکھو گے کہ اسے مکھی کی موجودگی کا احساس ہو جاتا ہے۔ تو اس کے قریب آ کر کچھ دیر تک اس سے تعرض نہیں کرتی ہے گویا کہ خود ایک مری ہوئی چیز ہے جس میں کچھ حس نہیں ہے جب دیکھ لیتی ہے کہ اب مکھی مطمئن ہے اور اب اس سے بالکل غافل ہے تو نہایت آہستہ آہستہ اس کی طرف چلتی ہے۔ اور جب اس کے اتنا قریب پہنچ جاتی ہے کہ لمسے پکڑ

تب اس پر جھپٹ کر پکڑ لیتی ہے۔ اور اس سے اپنا سارا جسم چمٹا لیتی ہے تاکہ کہیں وہ اس سے چھوٹ نہ جائے اور اتنی دیر تک اسے مضبوطی سے پکڑے رہتی ہے جب اسے محسوس ہو جاتا ہے کہ اب مکھی کمزور ہو گئی ہے اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر اسے پھاڑ کھاتی ہے اور اس کے ذریعے اس کی زندگی ہے لیکن باقی عام مکڑی جالا بنتی ہے جسے وہ مکھیوں کے شکار کا پھندہ بناتی ہے اور خود اندر چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ جیسے ہی مکھی اس جالے میں پھنستی ہے فوراً لپک کر اسے مسلسل کاٹنا شروع کر دیتی ہے۔ پس اسی طرح یہ زندگی بسر کرتی ہے۔"

ٹڈی ٹڈی، جو فصلوں کا صفایا کر جاتی ہے۔ اہلبیتؑ نے اس جانور کی خصوصیات بھی زمانۂ سائنس سے صدیوں قبل بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ قائدِ ثقل دوم حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ایک مقام پر توحید کے بیان میں وضاحت فرمائی "اگر چاہو تو ٹڈی کے بارے میں بھی گفتگو کرو کہ خداوندِ سبحان نے اس کے لئے لال لال آنکھیں پیدا کیں۔ اور دو ڈھیلے بنائے جو چمکدار و نور پاش ہیں۔ اور اس کے لئے کانوں کو چھپا دیا۔ خوبصورت دہن کو کھول دیا۔ ذہن مناسب عطا فرمایا۔ اسے حسِ توانا (جس سے راہِ معاش اور اپنے سود و زیاں کو دیکھ سکے) بخشی دو دانت بھی دیئے کہ جن سے (پتوں) کو کاٹ سکے۔ اور دو (پاؤں کی طرح) پہنچے بنائے کہ جن سے وہ (گھاس وغیرہ کو) پکڑ لیتی ہے جو شکار کے بارے میں اس سے ترساں رہتے ہیں۔ اور خواہ کتنے ہی متفقہ طور پر اس کو دور کرنا چاہیں نہیں کر پاتے یہاں تک کہ وہ پرواز کناں کشتِ زار میں اتر آتی ہیں اور وہاں اپنی خواہش پوری کرتی ہیں۔ حالانکہ جسم کے اعتبار سے وہ انگلی بھر بھی باریک نہیں۔ پس منزہ ہے وہ ذاتِ معبود کہ اس کے آسمان و زمین میں (فرشتے اور خلق) جو کچھ ہے، اختیاراً و اضطراراً اس کے حضور سجدہ کناں ہیں اور (اظہار خضوع و فروتنی کیلئے) اپنے رخساروں اور چہرے کو خاک پر ملتے ہیں اور ازروئے

بے اختیاری و ناتوانی اس کے احکام و فرمان کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور انھوں نے اپنی مہار اس کے جلال و قدرت کی وجہ سے اسی کے ہاتھ میں دے رکھی ہے۔"

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ٹڈی کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

" اس ٹڈی کو دیکھو۔ کس قدر کمزور اور پھر کتنی طاقتور ہے۔ جب تم اس کی خلقت اور ساخت کی طرف جاؤ گے تو تم اسے بہت چیزوں سے کمزور پاؤ گے۔ اور اگر اس کا لشکر کسی شہر پر حملہ آور ہو جائے تو کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ اپنے کو بچا سکے۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ روئے زمین کے بادشاہوں میں سے اگر کوئی بادشاہ ان سے بچنے کے لیئے پیدل اور سواروں کا لشکر جمع کرے تو بھی اس پر قادر نہ ہوگا۔ کیا یہ خدا کی قدرت کی دلیل نہیں ہے کہ وہ اتنی کمزور ترین مخلوق کو قوی ترین مخلوق پر بھیج دے اور قوی اس کے دفع کرنے پر قادر نہ ہو، اور اسے دیکھو کہ روئے زمین پر کیسے سیل کی طرح آتی ہے۔ تو کوہ و صحرا اور تمام شہر کو گھیر لیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی کثرت کی وجہ سے سورج کی روشنی بھی چھپ جاتی ہے۔ تو بتاؤ کہ اتنی کثیر ٹڈیاں ہاتھ سے بنائی جائیں تو اتنی زیادتی کے ساتھ جمع ہو سکتی تھیں ؟ اور اس میں کتنے سال صرف ہوتے۔ اس سے بھی پروردگارِ عالم نے قدرتِ کاملہ کا ثبوت دیا ہے جس کی قدرت کو کوئی شے عاجز نہیں کر سکتی۔

چمگادڑ

سورۂ آل عمران میں ارشادِ خداوندی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے فرمایا :-

" میں تمہارے پروردگار کی جانب سے یہ نشانی لایا ہوں کہ میں گندھی ہوئی مٹی سے ایک پرندے کی صورت بناؤں گا۔ تو وہ خدا کے حکم سے اڑنے لگے گا۔ اور میں خدا ہی کے حکم سے اندھے اور مبروص کو اچھا کروں گا۔ اور مردوں کو زندہ کروں گا۔ اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ جمع رکھتے ہو تمھیں بتادوں گا۔ اگر تم مومن ہو تو یقیناً تمہارے لئے ان باتوں میں (میری نبوت

کی) بڑی نشانی ہے"۔

بنی اسرائیل کے سامنے حضرت عیسیٰؑ نے اپنی نبوّت کے اثبات میں جو دلائل پیش کئے تھے اُن میں سے حکمِ خُدا سے چمگادڑ کو خلق فرمانا بھی تھا۔!!

چمگادڑ عموماً پندرہ برس زندہ رہتا ہے یہ بہت تیز رفتاری سے اُڑتا ہے اور فوراً اِدھر اُدھر مڑ سکتا ہے۔ یہ اپنی آواز سے ریڈار کا کام لیتا ہے۔ دورانِ پرواز جب آواز نکالتا ہے تو اگر آگے کوئی شے حائل ہوتی ہے تو اس سے اس کی آواز ٹکرا کر واپس اس تک پہنچ جاتی ہے جس سے وہ رکاوٹ کو محسوس کر لیتا ہے اور پھر راستہ تبدیل کر لیتا ہے۔ یورپ میں اس پر اس کی آواز پہچاننے کے متعلق تجربہ کیا گیا۔ ایک بند کمرے میں ستر لاؤڈ سپیکر نصب کئے گئے۔ اور ان سے اس کی مصنوعی آوازیں پیدا کی گئیں۔ اور کمرے میں ایسے اٹھائیس تار لگائے گئے کہ جن سے اس کی آواز کی دو ہزار مرتبہ بازگشت ہوتی تھی۔ اس کے بعد اسے اس تاریک کمرے میں چھوڑا گیا تو پرواز کے دوران ان تاروں کے درمیان سے گزر گیا۔ اور ان سے نہیں ٹکرایا۔ حالانکہ ان تاروں سے بھی اس کی مصنوعی آواز کی بازگشت ہو رہی تھی لیکن اس نے اپنی آواز اور مصنوعی آوازوں میں امتیاز کر لیا اور تاروں سے نہیں ٹکرایا۔

حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے ایک خطبۂ توحید میں وجودِ باری تعالیٰ پر استدلال کرتے ہوئے چمگادڑ کی تخلیق کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔

"خدائے بزرگ و برتر کی لطیف صنعتوں اور عجیب حکمتوں میں سے ایک وُہ ہے جو اس نے ہمیں چمگادڑوں کی صورت میں دکھائی ہے۔ (دوسرے تمام حیوانات کے برعکس) کہ دن کی روشنی جو ہر آنکھ کو کھول دیتی ہے اس کی آنکھ بند کر دیتی ہے۔ اور تاریکیٔ شب کہ ہر زندہ کی آنکھ بند کر دیتی ہے۔ اس کی آنکھیں نیّرِ تاباں کے نور کی مدد لینے سے معذور ہیں۔ جس سے راستہ دیکھیں اور اپنے

نفع کے مقامات تک پہنچیں ۔ خدا نے اسے نورِ خورشید کی روشنی میں چلنے سے روک دیا اور اس کی روشنی پھیلنے کے وقت اسے اس کے مسکن میں پنہاں کر دیا۔ دن میں اپنی آنکھوں پر پلکوں کا پردہ ڈالے رہتا ہے اور شب (کی تاریکی کو) چراغ قرار دیتا ہے کہ اسی کی مدد سے روزی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ رات کی گہری سیاہی اس کے دیکھنے میں مانع نہیں ہوتی (ہر چیز صاف اور روشن نظر آتی ہے) اور تاریکیٔ شب کی شدت میں رہروی سے کوئی چیز اسے باز نہیں رکھتی پس جب خورشید اپنے رخ سے تاریکیٔ شب کا پردہ اٹھاتا ہے اور دن کی روشنی ہویدا ہوتی ہے۔ اور اس کی روشنی خانۂ سوسمار تک جا پہنچتی ہے تو یہ اپنی آنکھوں پر پلکوں کا پردہ ڈال لیتا ہے اور تاریکی شب میں جو کچھ اندوختہ کیا تھا اس پر قناعت کرتا ہے۔

پس پاک ہے وہ خدا جس نے رات کو اس کے لئے دن اور وسیلۂ معاش بنایا اور دن کو سبب استراحت و آرام قرار دیا۔ خدا نے اسے گوشت کے بازو عطا کئے۔ اڑتے وقت وہ انہی کے سہارے بلند ہو جاتا ہے۔ یہ بازو اتنے نرم ہیں جیسے (انسان کے) کان کی لو۔ جن میں نہ ہڈی ہے نہ پر۔ مگر رگوں کے مقامات صاف دیکھوگے۔ اس کے دو بازو ہیں۔ نہ اتنے نازک کہ پھڑ پھڑاتے وقت شگافتہ ہو جائیں۔ نہ اتنے سنگین اور وزنی کہ مانع پرواز ہوں۔ جب اس کی مادہ پرواز کرتی ہے تو اس کا بچہ اس سے چمٹا رہتا ہے۔ اور اس کی پناہ میں رہتا ہے جب ماں بیٹھتی ہے تو وہ بھی بیٹھ جاتا ہے اور جب ماں پرواز کرتی ہے تو وہ بھی اڑنے لگتا ہے۔ وہ ماں سے جدا نہیں ہوتا۔ تاآنکہ اس کے اعضاء قوت پکڑ لیں۔ اور اس کے بازو اڑنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ اور زندگی کے راستے سے وہ واقف ہو جائے اور اپنی بھلائی پہچاننے لگے۔

پس پاک ہے وہ اللہ، تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا کہ اس کی تخلیق بغیر کسی نمونے کے ہے جسے اس سے پہلے کسی نے بنایا ہو۔ (یعنی کسی کی بنائی شے

نمونہ بناکر تخلیق نہیں فرمائی)

حضرت امام جعفر صادق شپرہ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "خداوند عالم نے ایک عجیب الخلقت جانور پیدا کیا ہے جو کہ پرندے اور چوپائے کے درمیان ہے بلکہ چوپائے سے زیادہ مشابہ ہے اس کیلئے اس کے دو کان اوپر کو نکلے ہوئے ہیں۔ اس کے دانت باریک ہیں۔ اس کی مادہ بچے دیتی ہے اور دودھ پلاتی ہے... چمگادڑ بول و براز کرتا ہے۔ جب چلنا چاہتا ہے تو چار پاؤں پر چلتا ہے۔ یہ صفات پرندوں سے مختلف ہیں۔ پھر یہ رات ہی کو نکلتا ہے اور ان کیڑے پتنگوں کو اپنی غذا بناتا ہے جو فضا میں منتشر ہیں۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ چمگادڑ کچھ کھاتا ہی نہیں۔ اس کی غذا ٹھنڈی ہوا ہے۔ حالانکہ یہ دو وجہوں سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ دودھ پلاتا ہے اور بول و براز کرتا ہے اور یہ سب بغیر غذا کے ممکن نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ اس کے دانت ہوتے ہیں۔ اگر یہ کچھ نہ کھاتا تو اس کے دانت بیکار تھے۔ حالانکہ تخلیق میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے کوئی فائدہ نہ ہو۔ اور اس جانور کے وجود کے فوائد بھی مشہور ہیں۔ اس کی بیٹ بعض عملی چیزوں میں داخل کی جاتی ہے۔ ایک غرض تو اس کی عجیب و غریب ساخت اور خلقت بھی ہے کہ جو خداوند عالم کی قدرت قاہرہ پر دال ہے اور اس جانور کا آنا جانا ہے اس کی اپنی مصلحت اور اس کے اپنے فائدے کے لیے ہے کہ جہاں چاہے آجا سکتا ہے۔"

مور

کہتے ہیں کہ سانپ اور مور بہت قدیم جانور ہیں۔ یہ بھی خلد میں رہا کرتے تھے اور کبھی کبھار سیر و تفریح کی خاطر جنت سے باہر بھی آجایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یہ دونوں جب جنت سے باہر نکلے تو ابلیس کو جنت کے اندر جانے کا موقع مل گیا۔ وہ سانپ کے منہ میں بیٹھ گیا۔ سانپ مور کی پشت پر سوار ہوتا تھا، یہ جنت میں داخل ہوئے۔ شیطان کو اندر لے جانے کا ذریعہ بنے۔ چنانچہ جب آدمؑ و حواؑ کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا گیا۔ اس وقت سانپ اور

مور کو بھی نکال دیا گیا۔ سانپ کو چلنے کے لئے جو چار پاؤں دیئے گئے تھے۔ سلب کر لئے گئے اور مور کی ٹانگوں کا حسن چھین لیا گیا۔

مور مختلف قسم کی آوازیں نکالتا ہے۔ کبھی بچّے کے رونے کی سی، کبھی ساز کی طرح کبھی الارم جیسی آواز نکالتا ہے۔ مور کا رقص مشہور ہے۔ سانپ کا دشمن ہے۔ جہاں سانپ ملتا ہے اُسے مار کر کھاتا ہے اس طرح اُسے سخت پیاس لگتی ہے لیکن پانی نہیں پیتا کیونکہ اُسے یہ علم ہے کہ پانی پینے سے زہر سارے جسم میں پھیل جائے گا لہٰذا جب تک زہر کا اثر ختم نہیں ہوتا اس وقت تک پانی نہیں پیتا۔ حضرت امیر علیہ السلام مور کی تخلیق کا بیان یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

" اور اِن پرندوں میں سب سے زیادہ عجیب چیز طاؤس (مور) ہے۔ جسے پروردگار نے نہایت ہی مضبوط، اعتدال و مساوات اعضاء کے ساتھ خلق فرمایا ہے اور اس کے رنگوں کو بڑے حسن کے ساتھ ایک دوسرے سے ترتیب دیا ہے اسے ایسے پَر دیئے ہیں جن کی جڑیں ایک دوسرے میں داخل ہیں۔ ایسی دُم سے مزین کیا ہے جو لمبی ہے اور جب وہ مورنی کے پاس جاتا ہے تو اس کی لپٹی ہوئی تہیں کھل جاتی ہیں۔ اور پھر اُسے اس طرح اونچا کرتا ہے کہ وہ اس کے سر پر سایہ فگن ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہ کشتی کا بادبان ہے اور کوئی ملّاح اُسے حرکت دے رہا ہے۔ وہ اپنے گوناگوں رنگوں پر اتراتا ہے۔ وہ خوش خرامی کا منظر دکھاتا ہے۔ وہ مرغ کی طرح جماع کرتا ہے اور بہت زیادہ جوڑا کھانے والے نروں کی طرح اپنی مادّہ سے جفت ہوتا ہے۔ میں تمہیں مشاہدے اور نظارے کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ اس آدمی کی مانند نہیں جو کسی سندِ ضعیف کا حوالہ دے رہا ہو۔ جس کا یہ خیال ہو کہ "مور اپنی مادّہ کو اپنے قطرہ اشک سے حاملہ کرتا ہے جو اس کے گوشۂ چشم سے جاری ہوتا ہے اور پلکوں کے کنارے آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ پھر مادّہ اسے کھا لیتی ہے اور انڈا دیتی ہے۔" تو یہ گمان اس سے عجیب تر نہیں جو کوّے کے بارے میں (جیسا کہ) مشہور ہے

کہ وہ اپنی مادہ کی چونچ میں سے چونچ ملا کر اپنے سنگدانہ کا پانی اس کے منہ میں ٹپکا دیتا ہے اور وہ انڈے دینے لگتی ہے)۔

تم موروں کے پروں کی جڑوں کو چاندی کی سلائی گمان کرو گے اور ان پر جو عجیب و غریب ہالے اور آفتاب اگائے گئے ہیں انھیں تم خالص سونا اور زمرد کے ٹکڑے تصور کرو گے۔ اور اگر تم ان چیزوں سے تشبیہ دینا چاہو جن سے زمین کی روئیدگی ہوتی ہے تو یوں کہو کہ ایک گلدستہ ہے کہ ہر بہار شگوفے اس میں موجود ہیں۔ اور اگر اس کا لباس سے مقابلہ کرو گے تو ایسا حلہ نظر آئے گا جس پر نقش و نگار بنے ہوتے ہیں۔ یا ایسا جامۂ خوش رنگ ہے جیسے یمن کا بنا ہوا ہو۔ اور اگر اسے زیور سے تشبیہ دو تو یوں کہو گے کہ وہ ایک رنگ برنگ نگینہ ہے۔ جس کے بیچ میں جواہرے مُزیّن چاندی موجود ہے۔ وہ ناز و انداز اور دل شاد شخص کی طرح چلتا ہے۔ اپنے پروں اور دم کی طرف جب دیکھتا ہے تو اپنی زیبائی پر اور جب اپنے بدرنگ پاؤں پر نگاہ ڈالتا ہے تو فریاد کرتا ہے اور روتا ہے۔ جیسے وہ عنقریب کسی فریادرس کے سامنے دردِ دل کا اظہار کرے گا۔!! اور اپنے سچے درد کی گواہی دے گا کیونکہ اس کے پاؤں باریک (اور بدنما) ہوتے ہیں۔ جیسے ملی جلی نسل کے مرغوں کے پاؤں (بدصورت ہوتے ہیں) اس کا حال یہ ہے کہ اس کی پنڈلی کی ہڈی سے ایک خار ابھرا ہوا ہے۔ جو اس کے پیں پا چھپا ہوا ہے اور سر کے بالوں کی جگہ پر سبز رنگ کی منقش چوٹی ہے۔ اس کی گردن کی برآمدگی کا مقام صراحی کی گردن کی طرح (کشیدہ و بلند) ہے۔ اس کی گردن کے جوڑ سے پیٹ تک ایسا رنگ ہے جیسے یمنی وسمے کا رنگ، یا پہنے ہوئے ریشمی کپڑے کی طرح۔ گویا وہ ایک صیقل شدہ آئینہ ہے اور گویا ایک سیاہ چادر کو اپنے اوپر لپیٹ لیا ہے۔ لیکن اس کی آب و تاب کی زیادتی اور چمک کی جگمگاہٹ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ تر و تازہ ہریالی اس میں ملی ہوئی ہے اس کے کانوں کے سوراخ سے ملی ہوئی ایک لکیر ہے۔ جو سفید بابونہ[1] کے رنگ میں قلم کی باریک نوک سے مشابہت

[1] ایک پھول کا نام ہے

رکھتی ہے اور یہ لکیر اپنی سفیدی کے ساتھ سیاہی کی جگہ کو چمکا دیتی ہے۔ بہت کم رنگوں کو الگ کرتے ہوئے ہر رنگ سے اس نے پورا پورا حصہ لیا ہے۔ بلکہ اپنی آب و تاب کی زیادتی اور جامۂ خوش رنگ کی رونق میں اس سے گویا سبقت لے گیا ہے۔

وہ ان بکھری کلیوں کی مانند ہے۔ جنھیں موسم بہار کی بارشوں اور سورج کی گرمیوں نے پرورش نہیں کیا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے بال و پر سے برہنہ اور اپنے جامۂ رنگ سے عریاں ہو جاتا ہے۔ اس کے پر جھڑ جاتے ہیں۔ پھر دوبارہ اُگتے ہیں۔ یہ شاخوں کے پتوں کی طرح اس کے بازو کی ہڈی سے جھڑتے ہیں اور دوبارہ پھر نمایاں ہو کر ایک دوسرے سے پیوست ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ پروں کے جھڑنے سے پہلے جو شکل تھی وہ پھر واپس آجاتی ہے۔ اب وہ اپنے سابقہ رنگوں سے ذرا بھی متجاوز نہیں ہوتا۔ جو رنگ جس جگہ تھا وہیں اب بھی ہے۔ اس کے بازو کے بالوں میں سے کسی بال کو غور سے دیکھو تو کبھی وہ سرخ، گلرنگ، اور کبھی سبز، زبرجدرنگ، کبھی زرد طلائی رنگ دکھائی دیں گے۔

پس کیسی عجیب و عمیق زیرکی اور عجائب تخلیق کا جلوہ اس حیوان میں دکھائی دیتا ہے۔ ایسے خوش رنگ طائر کی مدح تک عقل کی رسائی کا کہاں گزر؟ توصیف کرنے والوں کے اقوال اس کے اوصاف کے موتیوں کو کیونکر سلکِ گفتگو میں پرو سکتے ہیں۔ اگرچہ اس کے اجزا بہت کم ہیں۔ پھر بھی فہم و ادراک اس کے بیان سے عاجز ہے۔ پس پاک و پاکیزہ ہے۔ وہ خدا جس نے اپنی مخلوق کے اوصاف سے عقل کو مغلوب کر دیا ہے۔ حالانکہ اس مخلوق کو آنکھوں کے سامنے جلوہ گر کر دیا ہے۔ جو محدود اجزا سے مرکب اور رنگین ہے۔ وہ ایسا معبود ہے جس نے زبان کو اس کی توصیف کرنے سے قاصر کر دیا اور اس کی مدح سرائی سے روک دیا۔"

مچھلی

سورۂ نحل میں ارشادِ پروردگار ہے کہ۔

" اور وہی ذاتِ خداوندی ہے جس نے دریا (یا سمندر) کو (تمہارے لئے)

مسخر کر دیا ہے تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ۔ اور اس میں سے زیورات نکالو جنھیں تم پہنا کرتے ہو۔ اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ دریا میں (پانی کو) چیرتی آجاتی ہیں۔ اور (دریا و سمندر کو تمہارے تابع) اس لئے کر دیا کہ تم لوگ اس کے فضل کو تلاش کر سکو تاکہ تم شکر کرو۔"

مچھلی کی تخلیق اور اس کے افعال پر غور و فکر کیجیے۔ کس طرح ان کی ضروریات کی تکمیل کیلئے ان کے جسم کی تخلیق کی گئی۔ اور کس طرح بقائے نسل کے طریقے سکھائے گئے۔ سالمن مچھلی جو وزن کے لحاظ سے دو پونڈ سے ساٹھ پونڈ تک ہوتی ہے۔ اس کی ولادت دریا کے محفوظ کناروں میں ہوتی ہے۔ ولادت کے بعد جب طویل سفر کرنے کی ان میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ تو سمندر کا رخ کرتی ہیں۔ سمندر میں سالہا سال بسر کرنے کے بعد کہ جب اپنے مقام پر واپس آنے کا وقت آتا ہے۔ تو دریا کے دہانے کا رخ کرتی ہے اور دریا کے تیز پانی کا مقابلہ کرتے ہوئے مسلسل اپنی جائے پیدائش کی جانب بڑھتی جاتی ہے۔ کئی میل کا سفر طے کر کے اسی ندی کی طرف مڑ جاتی ہے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی اپنے مقامِ پیدائش پر پہنچنے کے بعد ایک کنارے کی مچھلی دوسرے کنارے کی طرف نہیں جاتی اپنے اس سفر کے دوران

اگر غلطی سے مچھلی گمراہ ہو جاتی ہے تو غلطی کا احساس ہوتے ہی فوراً صحیح راستہ تلاش کر کے اس پر گامزن ہو کر اپنی منزل پر آپہنچتی ہے۔ اپنے مقامِ ولادت پر پہنچنے کے بعد مادہ سالمن اپنی دُم سے بیس انچ تک زمین میں سوراخ بنا کر اس میں انڈے دیتی ہے۔ جب ایک سوراخ بھر جاتا ہے تو اس کو ریت سے ڈھانپ کر دوسرا سوراخ بناتی ہے۔ پھر اسے بھی انڈوں سے بھر کر ریت سے پاٹ دیتی ہے۔ یہ سلسلہ پانچ دن تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصے میں بیس بیس ہزار تک انڈے دیتی ہے۔ اور نر ان انڈوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ پھر ان انڈوں سے بچے نکلتے ہیں۔ جب ان میں طویل سفر کرنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے تو ان کا لشکر کثیر سمندر کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ اور سمندر میں پہنچنے

کے بعد سالہاسال رہ کر پھر اپنے آبائی وطن اور مقام ولادت کی طرف واپس آجاتا ہے یہ شعور اُن کو قدرت نے فطری طور پر عطا کیا ہے۔

ایل مچھلی کا معاملہ ان سے بھی حیرت ناک ہے۔ یہ مچھلی دریاؤں اور جھیلوں میں عہدِ شباب کو پہنچتی ہے اور پھر دنیا کے ہر مقام سے ایک ہی جانب یعنی جنوبی برمودا کی طرف رُخ کرتی ہے۔ یورپ سے جنوبی برمودا کے جزائر ہزاروں میل دور ہیں، لیکن یہ مچھلی یہ طویل سفر ضرور سطے کرے گی۔ اور شمالی ملکوں سے جنوبی سمندروں کی لاانتہا گہرائیوں میں پہنچ جائیں گی۔ یہ مچھلیاں سمندر کی گہرائیوں میں پہنچ کر پہلے بچے دیتی ہیں۔ اور پھر مر جاتی ہیں۔ ان کے بچے اپنے گرد وسیع سمندر کے علاوہ کچھ نہیں پاتے اور نہ ہی انہوں نے اپنے والدین کا مسکن دیکھا ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی جب ان ساحلوں کا رُخ کرتی ہیں کہ جہاں سے اُن کے آباد اجداد آئے تھے تو دور دراز کا سفر طے کرتے ہوئے اور دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے اپنے اصلی وطن تک آ پہنچتے ہیں۔ حالانکہ یہ جگہ انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی ہوتی۔ صرف ایک غیبی اشارہ ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ ان جھیلوں اور دریاؤں میں وہ اپنا عہدِ شباب گزارتے ہیں۔ اور پھر سمندر کے سفر کو روانہ ہو جاتے ہیں اور وہاں انڈے دیکر مر جاتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام بیانِ توحید میں مچھلی کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"مچھلی کی خلقت اور اس کی مناسبتوں کو دیکھو کہ جس حالت میں اس کا ہونا اور رہنا مقدر ہو چکا ہے۔ وہ اس میں کس طرح موجود ہے۔ اُسے ٹانگیں نہیں دی گئی ہیں کیونکہ اُسے چلنے کی ضرورت اور احتیاج نہیں۔ جبکہ اس کا مقام پانی قرار دیا گیا ہے اور نہ ہی اس کے پھیپھڑے پیدا کئے گئے کیونکہ ان سے سانس لینا ممکن نہ ہوتا۔ (یعنی پھیپھڑوں کی وجہ سے پیٹ میں پانی بھر جاتا جس سے وہ فوراً مر جاتی) جبکہ وہ سمندر میں ڈوبی ہوتی ہے اُسے ٹانگوں کے بدلے میں سخت پر دیئے گئے ہیں جن سے وہ دونوں طرف پانی کو کاٹتی ہے جیسے ملاح چپوؤں کے ذریعے سے کشتی

کے دونوں طرف پانی کاٹتا ہے اور اس کے جسم کو موٹے موٹے چھلکوں کا لباس پہنایا گیا ہے۔ جو ایک دوسرے کے اندر داخل ہیں۔ جیسے درع یا جوشن کی کڑیاں تاکہ خود کو آفتوں سے بچا سکے۔ اُسے قوتِ شامہ بہت تیز عطا کی گئی ہے اس لئے اس کی نظر بہت کمزور ہے۔ اور پانی اسے روکتا ہے تو یہ کھانے کی چیز کو دور سے سونگھ لیتی ہے۔ اور پھر اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ورنہ وہ کھانے کی شئے کو کیونکر محسوس کر سکتی ہے نیز اس جانور کے دہانے سے لے کر دونوں کانوں تک سوراخ بنائے گئے ہیں۔ منہ سے پانی پیتی ہے اور ان سوراخوں سے نکال دیتی ہے۔ اس طرح روح کی تفریح اور آسائش کرتی ہے۔ تم مچھلی کی نسل کی زیادتی اور اس کی خصوصیات پر غور کرو تو تم ایک مچھلی کے اندر بے شمار انڈے پاؤ گے جس کا سبب یہ ہے کہ دیگر جانوروں کی خوراک میں اس کی وجہ سے زیادتی ہو جائے کیونکہ بہت سے حیوان مچھلیوں کو کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ درندے بھی پانی کے کنارے جھاڑیوں میں مچھلیوں کی گھات میں بیٹھے رہتے ہیں۔ جہاں کہیں ان کو کوئی مچھلی ہاتھ چڑھی اُسے اُچک لیا۔ پس چونکہ درندے، پرندے، جانور اور خود مچھلیاں بھی مچھلیوں کو کھاتی ہیں تو اس میں یہی حکمت قرار پائی کہ جس کثرت میں اس وقت ہیں اُسی کثرت میں ہوں۔"

حضرتِ صادقؑ ہدایت فرماتے ہیں کہ:۔

"جس مچھلی پر چھلکے ہوں وہ کھاؤ۔ اور جس پر نہ ہوں وہ مت کھاؤ۔"

نیز ارشاد فرمایا:۔

"مچھلی کا زیادہ کھانا جسم کو گھلاتا ہے۔"

انڈے اور بچے حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ کون کون سے جانور انڈے دیتے ہیں اور کون کون سے بچے۔؟

حضرت نے برجستہ فرمایا:۔

"جن جانوروں کے کان ظاہر ہیں وہ بچے دیتے ہیں اور جن کے کان چھپے ہوئے

ہیں وہ انڈے دیتے ہیں۔

حضرت امیرالمومنینؑ کا یہ جواب حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی غور طلب ہے۔ چودہ سو سال پیشتر جب کہ زمانہ میں مادّی علوم و فنون کا چرچا نہ تھا زولوجی کی بنیادی گرہ کھولنا کسی اعجاز سے کم نہ تھا۔ اس وقت نہ ہی کوئی سائنسی ایجادات تھیں اور نہ ہی علم حیوانات کی درسگاہیں۔ پھر صحرائے عرب میں مولائے کائناتؑ کا یہ فرمانا یقیناً علم وہبی کی دلیل ہے۔ آج جبکہ دس لاکھ سے بھی زیادہ جانوروں کا علم منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ کسی بھی صورت میں حضرت امیرؑ کے بیان کردہ کلیئے سے اختلاف نہیں پایا گیا۔ حضرت علیؑ کے اس ارشاد سے آپؑ کا علم وہبی روزِ روشن سے بھی زیادہ واضح اور ثابت ہو جاتا ہے۔ جن کو حضرت علیؑ کے ہم پلّہ ثابت کرنے کی لوگ کوشش کرتے رہتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی ایسا علم حاصل نہ تھا۔

اب ہمارے لئے یہ بات انتہائی قابل غور اور قابل تحقیق و ریسرچ ہے کہ آخر "کانوں" سے انڈوں اور بچوں کے تولیدی و تناسلی فرق کا کیا تعلق ہے ؟

ہرن کے دانت

اہلبیتؑ کے علاوہ جن دوسرے لوگوں کو دُنیا والوں نے امام بنا لیا ہے ان کا علم ایسا ہے کہ حیٰوۃ الحیوان علامہ دمیری جلد ۲ صفحہ ۹۰-۸۹ میں ہے کہ " ابن خلکان ترجمہ جعفر صادقؑ میں لکھا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ابو حنیفہ سے سوال کیا کہ تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو، جس نے حالتِ احرام میں ہرن کے چوتھے دانت "رباعیہ" کو توڑا ہو۔ ؟"

ابو حنیفہ کہنے لگے کہ " اے فرزندِ دُختر رسولؐ ! مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔"

پس حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ " ہرن کے رُباعی (چوگ) کے دانت کبھی ہوتے ہی نہیں بلکہ ہرن ہمیشہ ثنائی (دُندَ) کے دانتوں والا ہوتا ہے۔"

اس واقعے سے ظاہر ہے کہ ابو حنیفہ کا "علم حیوانات" اتنا تھا کہ انھیں ہرن

کے دانتوں کا بھی پتہ نہ تھا۔ پھر آئمہ اہلبیتؑ سے ان کا کیا مقابلہ؟ تبھی تو مولوی شبلی نعمانی "سیرۃ النعمان" میں لکھتے ہیں کہ ابوحنیفہ کو امام جعفر صادقؑ سے کیا نسبت علوم تو سارے اہلِ بیت کے گھرانے سے نکلتے ہیں۔

آسمانی مچھلی علمِ حیوانات کے سلسلے میں ہادیانِ برحق (عترت اہلبیتؑ رسالتؐ) نے صرف کرۂ ارض کے جانوروں کے متعلق علمی ارشادات فرمائے بلکہ فضائی جانوروں کے بارے میں بھی آگاہ فرمایا۔ چنانچہ ابن حجر مکی حضرت امام جوادؑ (محمد تقیؑ) علیہ السلام کے حالات میں اپنی کتاب "صواعق محرقہ" میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔

"ایک دن آپؑ بغداد کی گلی میں کھڑے تھے۔ لڑکے کھیل رہے تھے۔ مامون کی سواری آئی اور لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے۔ آپؑ کھڑے رہے اس وقت آپؑ کی عمر نو برس کی تھی۔ مامون نے جناب امامؑ کو دیکھا تو اس کے دل میں امامؑ کی محبت پیدا ہوئی۔ اور آپؑ سے پوچھنے لگا۔ "اے لڑکے تو کیوں نہیں بھاگا؟" آپؑ نے جواب دیا "راستہ تنگ نہیں تھا کہ میرے ہٹ جانے سے تمہارا راستہ کشادہ ہو جاتا۔ اور تمہاری نسبت میرا گمان بھی نیک تھا۔" مامون کو یہ کلام انتہائی پسند آیا اور آپؑ کی صورت بھی بھلی معلوم ہوئی۔ پوچھا۔ "تمہارا اور تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟" آپؑ نے فرمایا۔ "محمد بن علی الرضاؑ"۔ مامون کو آپؑ پر اور آپؑ کے والدِ ماجد پر بہت ترس آیا۔ اور اپنا گھوڑا بڑھا دیا۔ مامون اس وقت شکار کھیلنے کے لئے نکلا تھا۔ اس کے ساتھ چند باز تھے۔ جب آبادی سے دور نکل گیا تو ایک باز کو تیتر پر چھوڑا۔ وہ غائب ہو گیا۔ جب لوٹ آیا تو اس کی چونچ میں ننھی سی ایک مچھلی تھی۔ مامون دیکھ کر نہایت متعجب ہوا۔ اور وہاں سے لوٹا۔ لڑکے کھیل رہے تھے۔ جناب امامؑ کے سوا سب بھاگ گئے۔ مامون نے قریب ہو کر پوچھا "یا محمدؑ! میرے ہاتھ میں کیا ہے؟" آپؑ نے فرمایا۔ "خدائے تعالیٰ نے اپنے دریائے قدرت میں ایک ننھی سی مچھلی پیدا کی ہے جس کو بادشاہوں کے باز شکار کرتے ہیں۔ اور

اہلبیتؑ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ (وآلہٖ) وسلم کے فرزند اس سے خبر دیتے ہیں۔" مامون نے کہا۔" بے شک آپؑ امام علی الرّضا کے فرزند ہیں۔"

(بحوالہ ارجح المطالب ص۴۶۵، ۴۶۶)

یہ تھیں چند مثالیں جن سے ثقلین کے علم حیوانات (ZOOLOGY) کے بارے میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اس شعبہ پر بھی کافی ہدایات دی ہیں۔ اور اگر تحقیقِ مزید کی جائے تو لا تعداد گتھیاں ان اقوال کی روشنی میں آسانی سے کھل سکتی ہیں۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اقوالِ ثقلین کو مشعلِ راہ بنائیں۔ اور تجسس و تحقیق کر کے دنیا کو اُن کے علوم وہبی سے روشناس کرائیں۔ تاکہ یہ دعویٰ عملاً صحیح ثابت ہو سکے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور تمام مادّی و روحانی مشکلات کا حل پیش کرتا ہے بشرطیکہ تمسک بالثقلین کا صرف ایک راستہ ہماری گزر گاہ بنے۔

فصل ہشتم

علم الرّیاضی

(اعداد و ہندسہ جات وغیرہ)

اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ تو حقیقت پوری طرح سے نمایاں ہو جاتی ہے کہ جیسے جیسے سائنس ترقی کرتی جارہی ہے۔ اسلام کا چہرہ نکھرتا جارہا ہے۔ اسلامی ہدایات کا وہ مرکز جو پیغمبرِ اسلامؐ نے "ثقلین" کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اسکی تعلیمات میں حیاتِ انسانی کے تمام پہلو موجود ہیں۔ اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ انسانی زندگی کو ہمہ جہتی کامیاب بنایا جائے۔ اسی لئے اسکے تمام قوانین عقلِ سلیم پر مبنی ہیں مشاہدات پر علمی بنیاد رکھنا کسی شئے کو سوچنے سمجھنے کے بعد سُلجھا ہوا درست فیصلہ کرنا ہی "سائنس" کہلاتا ہے جس طرح سائنس حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح اسلام سچّائی اور حقیقت تک رسائی کا راستہ ہے۔ اس معاملے میں دونوں کی منزل ایک لیکن سائنسدانوں کو چونکہ خدا کی رہنمائی حاصل نہیں ہے۔ اسلئے سائنسی تجربات و نظریات غلط بھی ہو جاتے ہیں لیکن اسلام ہدایاتِ الٰہی کا نام ہے جن میں غلطی کا امکان نہیں اور اسکی ہر بات درست و اٹل ہے۔ پس اسلام کے مطابق حقیقت تک رسائی کیلئے ضروری ہے۔ کہ صرف تجربات و مشاہدات کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے وہ راستہ اختیار کیا جائے۔ جیسے قرآن مجید نے فرمایا" کہ وہ نوحؑ کا راستہ ہے۔ ابراہیم و موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا راستہ ہے اور حضرت سرکارِ دو عالم محمد مصطفےٰؐ کا راستہ ہے اور یہ راستہ اسوقت تک نہیں مل سکتا، جبتک فرمانِ رسولؐ کے مطابق قرآن مجید اور عترت اہلبیتؑ سے تمسک نہ رکھا جائے۔ یعنی ضروری ہے۔ کہ

اِن دونوں گراں قدر و عالیشان چیزوں کا دامن کسی حالت میں بھی نہ چھوڑا جائے۔

ہمارا یہ دعویٰ محض عقیدت و خوش فہمی پر محمول نہ کیا جائے بلکہ اسے علمی کسوٹی پر جانچ لیا جائے اور وہ کسوٹی یہ ہے کہ قرآن مجید اور عترت اہل بیت رسالت کی تعلیمات پر غور فرمائیے۔ دونوں کو ملا کر دیکھئے۔ انکی بتائی ہوئی ہر تصویری آزمائیے۔ تجربات و مشاہدات سے پرکھیئے۔ جب آپ اس میدان تحقیق و تجسس میں قدم رکھیں گے تو آپ کو اطمینان حاصل ہو جائیگا اور آپ یہ تسلیم کرینگے کہ اگر اسلامی تہذیب و تمدن، اسکے علوم و فنون اور ہدایات و تعلیمات نہ ہوتے تو مغربی اقوامِ عالم بھی موجودہ ترقی یافتہ شکل میں نظر نہ آتیں۔ تمام علوم کا مخزن صحیح بعد از رسولِ ثقلین کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آئے گا۔

جب ہم علوم اسلامیہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے سب سے پہلے ایسے علوم و فنون کی تعلیم دی۔ جو انسان کی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں سہارا اور انکے دینی فرائض کی انجام دہی میں مددیں کیونکہ دین اسلام میں مذہب و زندگی جدا جدا نہیں ہیں بلکہ مذہب کی بنیاد ہی پہ زندگی کی پوری عمارت بنتی ہے۔

چنانچہ مسلمانوں نے علم حساب، قانونِ اسلام کے مطابق میراث و حصص کی تقسیم کی خاطر علم ہندسہ، سمت کعبہ اور حج کے راستے معلوم کرنے کی خاطر سیکھنا ضروری خیال کیا اور اسلام کے مدبرین نے علم ریاضی میں ناقابلِ فراموش فنی سرگرمیاں جاری رکھیں، چنانچہ ڈاکٹر عمر فرخ اپنی کتاب "عبقریۃ العرب" میں لکھتے ہیں: کہ

دنیائے علم و فن کو علم حساب کے سلسلے میں محمد ابن موسیٰ خوارزمی[1] کا احسانمند ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اسمیں بہترین تحقیقات اور اضافے کئے۔ قبل از اسلام دنیا صرف کسر اعشاری تک حساب جانتی تھی مسلمانوں نے علم حساب کو ترقی دی کہ کلمۂ صفر تک انہوں نے ایجاد کیا۔ تمام تو موں نے یہ لفظ مسلمانوں سے سیکھا ہے علم جبر کا وجود قبل از اسلام کسی اور نام سے تھا۔ جبکہ مسلمانوں نے اس علم کو ترقی دی اور محمد ابن موسیٰ خوارزمی نے اس علم کا نام "الجبر" رکھا اور اس علم پر کتاب لکھی۔ اس کتاب کی بدولت نشو و ارتقا کا ایک عظیم مرحلہ طے ہوا۔ مسلمانوں نے پہلے معادلات درجہ دوم کو حل کر لیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے معادلات مجہولہ دو مجہولہ کو بھی حل کر لیا اور ڈاکٹر عمر فرخ کا خیال ہے کہ یہ علم جبر کے کمال کا آخری مرتبہ ہے کیونکہ جن معادلات میں مجہولات زیادہ ہوں وہ الجبرا سے حل نہیں کئے جا سکتے بلکہ انہیں دوسرے راستوں سے

---

[1] امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں میں سے تھے۔

حل کرنا چاہیئے۔ اسی طرح ڈاکٹر کا خیال ہے۔ جبر و ہندسہ کی آمیزش سے "ڈکارٹ" کے ہندسہ تحلیلی کے اُصول کو پیدا کرنا مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔

مسلمانوں کی سربلندی کیلئے یہ کافی ہے کہ اہل یورپ نے علم ہندسہ کی کتابوں سے سیکھا۔ "مثلثات" کو بھی اِسلامی علم قرار دینا چاہیئے۔ مسلمانوں سے پہلے یونانیوں نے اسکی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی علم فلکیات میں بہت تھوڑا سا فائدہ یونانیوں نے مثلثات سے اٹھایا لیکن مسلمانوں کی بدولت اسے ایک علیحدہ علم کا مستقل مقام حاصل ہو گیا۔

اسلامی علوم کی تاریخ کا یہ بھی عجیب نکتہ ہے کہ متمسک بالثقلین افراد ہی ہیں ہر علم میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور اسکی وجہ بہت واضح ہے کہ دیگر مکاتیب فکر کا سلسلہ براہ راست ان لوگوں سے نہیں ہے، جو اس زمین پر خدا کے علوم کے وارث ہیں۔ اسی لئے جو لوگ ایسے خدا ساز علماء سے وابستہ رہے انہیں ہر علم میں تقدم حاصل ہو گیا۔

علم ریاضی کی ایجاد قبل از اسلام ہوئی لیکن زمانۂ حضرت امام جعفر صادقؑ میں یونانی علوم کے تراجم عربی میں شروع ہو گئے لہٰذا حضرتؑ کے زمانے میں علم ریاضی کو بھی ترقی ہوئی اور آپ ہی کے شاگردوں نے اس علم کو باقاعدہ تشکیل دیا چونکہ اکثر لوگ علم ریاضی کو ایک خشک علم خیال کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر اس سے طبائع نازک جلد اکتاہٹ محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اِس لئے ہم نے اس فصل میں حتی المقدور اختصار سے کام لیا ہے چنانچہ یہ بات ہم نے اُوپر بیان کر دی ہے کہ علم ریاضی مسلمانوں کا کافی حد تک احسانمند ہے اور ان ریاضی دانوں میں جنھوں نے اس علم کی تشکیل نو کی زیادہ تر نقل دوم کے چھٹے ہادی حضرت صادق آلِ محمدؐ کے شاگرد یا پیرو کار تھے تاہم آپکے دور سے پہلے حضرت امیرالمومنینؑ اور دیگر آئمہ طاہرینؑ نے بھی حساب کے علم میں ہدایات دی ہیں لیکن چونکہ وہ دقیق ہیں عام فہم نہیں لہٰذا ہم انکا تذکرہ نہیں کر رہے البتہ اس سلسلہ میں ہم حضرت امیرؑ کی ریاضی دانی کے بارے میں چند مثالیں نقل کرتے ہیں، تاکہ ثابت ہو جائے کہ اہلبیتؑ کے پاس تمام علوم موجود تھے۔

نو پر برابر تقسیم ہونے والا عدد

ایک شخص نے حضرت علیؑ سے پوچھا، ایسا عدد بتایئے جو نو پر برابر تقسیم ہو سکتا ہو۔ آپؑ نے بلا کسی تامل و سوچ بچار کے فوراً فرمایا کہ "ہفتے" کے دنوں کو "سال" کے دنوں سے ضرب دیدو، حاصل ضرب وہ عدد ہوگا (۷ × ۳۶۰ = ۲۵۲۰) جو نو پر برابر تقسیم ہو جائے۔

اِس سوال کا جواب دینے میں حضرت علیؑ کو غور و فکر کی کوئی ضرورت نہ پڑی جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ آپؑ ریاضی کے پورے عالم و ماہر تھے۔ حالانکہ آپؑ نے کسی اسکول و کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑتا

ہے کہ حضرت علیؑ علم وہبی رکھتے تھے۔

سترہ اُونٹوں کی تقسیم

تین آدمیوں کے درمیان سترہ اونٹوں کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا کیونکہ ان میں سے ایک کا (کل میں) آدھا حصّہ تھا، دوسری کا تہائی اور تیسری کا نواں حصّہ تھا اور ہر ایک صحیح و مکمل اُونٹ لینا چاہتا تھا۔ لیکن سترہ کا عدد ان مذکورہ حصّوں پر بغیر کسر کے صحیح طور پر تقسیم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ معاملہ حضرت علیؑ کی خدمت میں پیش ہوا۔ آپ نے ان تینوں آدمیوں سے فرمایا، اگر تم اجازت دو تو میں بغیر اُونٹ ذبح کئے صحیح فیصلہ کر دوں، اور فیصلہ میں آسانی کیلئے تمہارے اونٹوں میں اپنا ایک اونٹ شامل کر دوں۔ ان لوگوں نے کہا کوئی حرج نہیں، چنانچہ آپ نے اپنا ایک اُونٹ ان سترہ اونٹوں میں ملا دیا تو اُونٹ اٹھارہ ہو گئے۔ تب آپ نے اُنہیں سے آدھے حصّے کے مالک کو کہا، تم اسمیں سے اپنا نصف حصّہ الگ کر لو۔ اُسنے نو اُونٹ علیحدہ کر لیے پھر آپ نے تہائی حصّے والے سے فرمایا، تم اپنا تہائی حصّہ یعنی چھ اُونٹ لے لو۔ اُسنے اپنے چھ اُونٹ الگ کر لئے۔ اسکے بعد آپ نے نویں حصّے والے سے فرمایا تم اٹھارہ کا نواں حصّہ یعنی دو اُونٹ لے لو۔ اُسنے اپنے دو اُونٹ لے لئے۔ اِسطرح یہ سب سترہ اونٹ پورے ہو گئے اور آپ نے اپنا اُونٹ واپس لے لیا۔ تینوں حصّہ داروں نے اِس تقسیم کو پسند کیا اور فیصلہ درست تسلیم کر لیا۔

آٹھ روٹیوں اور آٹھ درہم کی تقسیم

دو شخص ایک سفر پر اکٹھے روانہ ہوئے۔ کسی مقام پر کھانا کھانے بیٹھے تو ایک نے پانچ روٹیاں نکالیں اور دوسرے نے تین روٹیاں نکالیں۔ اِس دَوران میں ایک شخص اور آ گیا۔ اُسنے سلام کیا۔ ان دونوں نے اُسے کھانے کی دعوت دی چنانچہ وہ بھی انکے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ جب یہ سب کھانے سے فارغ ہو گئے تو اِس تیسرے شخص نے آٹھ درہم ان دونوں کو پیش کئے۔ اب دونوں کے درمیان اِس رقم کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا۔

جس کی تین روٹیاں تھیں۔ وہ اصرار کر رہا تھا کہ یہ رقم برابر تقسیم کی جائے۔ دوسرا کہتا تھا کہ میری پانچ روٹیاں تھیں۔ اِس لئے میں پانچ درہم کا حق دار ہوں، اور تین درہم کے تم۔ جب یہ معاملہ حضرت علیؑ کے سامنے پیش ہوا۔ تو آپ نے اُن سے فرمایا۔

"تم آپس میں صلح کر لو۔ ایسی معمولی بات پر جھگڑا بھلا معلوم نہیں ہوتا"

اُنہوں نے فیصلہ پر اصرار کیا۔ تو آپ نے تین روٹی والے سے فرمایا۔

اگر واقعی حق کا فیصلہ چاہتا ہے تو تجھے صرف ایک دِرہم ملے گا۔ اور باقی ساتؐ دِرہم تیرے دوسرے ساتھی کو ملیں گے۔

یہ سنا، تو اُس نے حیران ہو کر کہا۔ یہ کیسے؟۔

آپؑ نے فرمایا، کیا تیری تینؐ روٹیاں نہیں تھیں؟ جبکہ تیرے ساتھی کی پانچ روٹیاں تھیں۔

اُس نے کہا، جی ہاں۔

آپؑ نے کہا۔ اِن ساری روٹیوں کو تینؐ سے ضرب دو۔ تو چوبیسؐ ہوئے (یعنی ہر روٹی کے تین حصّے کیے گئے تو آٹھ کے چوبیسؐ ہوئے) اور تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ کس نے زیادہ کھایا ہے اور کس نے کم۔ لہٰذا تمہیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ سب نے برابر کھایا۔ اِسطرح تم نے بھی تہائی یعنی آٹھ حصّے کھائے اور تیرے نے بھی تہائی حصّہ کھایا۔ تیسری تینؐ روٹیوں کے نوؐ حصّے تھے، اُنمیں سے آٹھؐ تو تم نے خود کھائے۔ اور باقی ایک حصّہ بچا، تیرے ساتھی کی روٹیوں کے بھی پندرہؐ حصّے ہوئے۔ اُنمیں سے آٹھ حصّے خود کھالئے اور باقی ساتؐ حصّے بچے۔ اُسکے سات حصّے اور تیرا ایک حصّہ تیسرے آدمی نے کھایا۔ پس چونکہ تیرا ایک حصّہ کھایا اور تیرے ساتھی کے ساتؐ حصّے کھائے اِسلئے تجھے ایک درہم اور اُسے ساتؐ درہم ملنے چاہئیں۔

یہ سن کر اُس نے کہا، یا حضرت! مَیں راضی ہو گیا۔

اِن مثالوں سے ثابت ہوا کہ حضرت امیر علیہ السّلام کو علمِ حساب پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اور حضرت امام جعفر صادقؑ حضرت علیؑ کے علم کے وارث تھے جن سے تعلیم حاصل کر کے انکے شاگردوں نے علم ریاضی کے میدان میں نمایاں رہنمائی کی جسکی وجہ سے مسلمانوں نے اس علم میں اِتنی ترقی کی کہ ...... ابن سفندی لکھتے ہیں۔

"پانچویں صدی ہجری میں قاہرہ کے کتب خانہ میں علم ریاضی سے متعلق چھ ہزار کتابیں تھیں۔"

یہ سب ترقی ثقلین ہی کے فیض کا نتیجہ تھی۔

ایک دینار اور سارے حقوں کا حساب

محمد بن طلحہ شافعی کتاب مطالب السئول میں لکھتے ہیں کہ ایک عورت جناب امیرؑ کے پاس آئی، آپ اُسوقت اپنے گھر سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہو رہے تھے۔ ایک پاؤں رکاب میں ڈالا کہ وہ عورت بولی، یا امیرالمومنین! میرا بھائی چھ سوؐ دینار چھوڑ کر مرا ہے مگر لوگوں نے مجھے ایک دینار دیا ہے۔ میں آپ سے اپنا اِنصاف چاہتی ہوں۔ حضرت نے بلا تامّل جواب دیا کہ تیرے بھائی کی

دو بیٹیاں بھی ہوں گی۔ اُسنے کہا ہاں! آپ نے فرمایا۔ دو ثلث (۲/۳) یعنی چار سو دینار اُن کیلئے ہوئے، اور فرمایا تیری بھائی کی ماں بھی ہوگی جسکو سدس (۱/۶) یعنی سو دینار پہنچے اور زوجہ بھی ہوگی جسکو ثمن (۱/۸) یعنی پچھتر دینار ملے پھر حضرتؑ نے پوچھا تیرے بارہ بھائی ہیں، عورت نے تسلیم کیا حضرتؑ نے فرمایا "دو، دو دینار بھائیوں کو ملے۔ ایک دینار تیرا حق ہے پس تُو اپنا حق پا چکی ہے، جا لوٹ جا"

تصویری مُدّت کا حساب

روایت ہے کہ ایکدفعہ لوگ جناب امیرؑ کے سامنے اہرام مصری کی تاریخ بنیاد کے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور کوئی ٹھیک وقت بیان نہیں کر سکتا تھا آپ نے پوچھا کیا اس پر کوئی تصویر بھی بنی ہوئی ہے کسی شخص نے عرض کیا کہ ان پر ایک چیل کی تصویر ہے جس کے پنجہ میں خرچنگ پڑا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ بنی الھرمان النسر فی السرطان یعنی مصر کے مثلث نما مینار کی اُسوقت تعمیر ہوئی تھی جبکہ نسر طائر برج سرطان میں تھا۔ اور دو ہزار (۲۰۰۰) برس میں ایک برج کو طے کرتا ہے اور آجکل جدّی میں ہے۔ اس حساب سے بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) برس انکی بنیاد کو ہوئے (ارجح المطالب ص۱۷۸)

اِس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کو یہ علم تھا کہ کون سا ستارہ کتنی مدّت میں ایک برج کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ اس بات سے آپکا علم رفتار گردشِ سیّارگان ثابت ہے اور اہرام مصر پر جن لوگوں نے تصویر کے ذریعے وقت لکھا تھا اُسے ہر شخص نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن حضرت علیؑ نے اُنکے پوشیدہ حساب کو بتا دیا حالانکہ نہ تو آپؑ ان لوگوں سے ملے تھے کہ ان سے حساب سیکھ لیا ہو۔ اور نہ ہی کسی دنیوی درسگاہ میں اس علم کو حاصل کیا تھا پس یہ واقعہ جناب امیر المومنینؑ کے علمِ وہبی کا شاندار ثبوت ہے اگر اُمتِ محمدیہ علیؑ کے در پر سرِ نیاز خم کر کے سائل علم ہو تو بڑے بڑے پوشیدہ علوم حاصل کر سکتی ہے کیونکہ علیؑ علمِ رسولؐ کا دروازہ ہیں۔

چاند کا حساب

مشہور سیّاح و حکیم محمود قزوینی کوفی نے لکھا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جب تم پر ماہِ رمضان کی پہلی مقرر کرنے میں مشکل پڑے تو گذشتہ سال ماہِ رمضان کی پانچویں تاریخ کو جو دِن تھا، اِس ماہِ رمضان کی پہلی تاریخ اُسی روز ہوگی، پھر علّامہ قزوینی نے لکھا ہے کہ لوگوں نے اِس ارشادِ امام کا پچاس (۵۰) برس امتحان کیا اور صحیح پایا۔ (دیکھئے کتاب عجائب المخلوقات و غرائب الموجودات برحاشیہ حیواۃ الحیوان دمیری جلد اوّل ص۱۲۷ مطبوعہ مصر اور زندگانی جعفر بن محمد ترجمہ حسن وجدانی ص۶۵ مطبوعہ ایران)

فصل نہم

علم امورِ خانہ داری

اب ہم حسب ترتیب نواں باب "علم امور خانہ داری" شروع کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس میں ہم خانگی مسائل اور دین میں عورت کا مقام زیر بحث لائیں گے کیونکہ خانہ داری کا تاج اسی ملکہ کے سر ہے۔ امور خانہ داری کو ہم نے فہرست علوم میں اس لئے داخل کیا ہے کہ انسان کے نصف سے زائد مسائل اسی شعبہ سے وابستہ ہیں۔ اور ان امور کی نگہداشت کی ذمہ داری صنف نازک کے سپرد کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک حاکمیت کی سب سے بڑی شرط "علم" ہے۔ کیونکہ اگر نظم ونسق عامل علم ہستی کے ہاتھ میں ہو تو معاشرہ جنت نظیر ہوگا۔ بصورت دیگر اگر جاہل حکومت کا در رہو گا تو زندگی جہنم کی طرح ہوگی۔

اسی قاعدے کے مطابق گھر کی حاکم کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ امور خانہ داری کی عالمہ ہو۔ ہم امور خانہ داری کی یوں تعریف کرتے ہیں کہ انسان کے وہ تمام امور جو گھر کی چار دیواری سے متعلق ہیں، خواہ وہ کسی بھی فرد خانہ سے تعلق رکھتے ہوں اسی زمرہ میں آجائیں گے۔ اور اس ہست و بود کے عالم میں انسان کے بیشتر معاملات اپنے گھر سے وابستہ ہوتے ہیں۔

"علم امور خانہ داری" کے حدود اس طرح متعین کر لیتے ہیں کہ وقت پیدائش سے تا وقت وفات وہ تمام مسائل جو کسی فرد خانہ کے گھر سے متعلقہ ہوں گے ان کے مناسب حل کے طریقوں کو امور خانہ داری کہتے ہیں۔ اس علم کے شعبوں کو ہم حقوق کی تقسیم کے تحت بانٹ دیتے ہیں۔ (ا) عورت کے حقوق کیونکہ وہ ملکہ خانہ ہے۔ (ب) عورت کے فرائض (ج) اہل خانہ کے حقوق (د) اللہ کے حقوق، آئندہ ہم ان ہی عنوانات کو زیر بحث لائیں گے۔ قبل اس کے کہ ہم اصل مضمون

پر اظہار خیال کریں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ "عورت" کے متعلق کچھ ابتدائی گفتگو ہو جائے۔
تاکہ آئندہ کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔

عورت اس صنف نازک کے بارے میں یہ شکایت رہتی ہے کہ اس کا جائز مقام
اسے محض مردوں کے استحصال کی وجہ سے نہیں مل سکا۔ اور اسی
مقام کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں آج بھی خواتین سرگرم عمل ہیں۔ دیگر ادیان عالم
اور مذاہب نے عورت کے اس حق کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ عورت کے احتجاج کو یا تو
طاقت سے دبا دیا گیا یا پھر تھوڑی بہت مراعات دے کر مطالبہ سرد کرنے کی
کوشش کی گئی۔ لیکن عورتوں کی تحریک زندہ رہی۔ مغرب میں عیسائی مذہب کا تسلط
ہے۔ مگر اور نظریات تو رہے ایک طرف اس نام نہاد ترقی یافتہ طبقے کے مذہب
نے عورت کو بڑے ہی قابل نفرت اور بھیانک روپ میں پیش کیا۔ عیسائیوں
نے یہ عقیدے گھڑے کہ عورت میں تعلیم دینے کی روح ہی نہیں ہوتی"۔ "یہ جنت میں
جانے کے قابل نہیں"۔ "یہ بدی کا مجسمہ ہے"۔ "ابلیسی سانپ کی ساتھی ہے"۔ "عباد
کے لئے زہر قاتل ہے" (بائبل پرانا عہد نامہ، کتاب پیدائش بٹ) وغیرہ وغیرہ
حالانکہ ان نظریات کو باطل ثابت کرنے کے لئے عظمت و تقدس بی بی مریمؑ
بھی ایک واضح دلیل ہے۔ المختصر یہ وہ غلط نظریے تھے جن سے عورت مسلسل ہی
دل میں جلتی رہی۔ لیکن اس کی بنیادی حقوق حاصل کرنے کی تحریک اندر ہی اندر
پروان چڑھتی رہی۔ چنانچہ مغرب میں انقلاب آیا اور لوگوں نے مذہب کا
ساتھ چھوڑا۔ یہ چیز عورت کے لئے سہارا بنی۔ چنانچہ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔
اور اپنا نام نہاد "مقام" (جو اعتدال سے تجاوز ہے) حاصل کر لیا۔ لیکن حرص اقتدار
مزید نے ابھی تک تشنگی نہیں پائی۔ عورت اپنے اصلی مقام سے بہت آگے نکل گئی
جس کا نتیجہ معاشرے میں بد اخلاقی اور تباہی کے سوا اور کوئی نظر نہ آیا۔
جب اسلام اکملیت و جامعیت کا دعویٰ لے کر نمودار ہوا تو اس نے عورت پر
ظلم کرنے سے منع کیا۔ مظلوم عورت کی حمایت کی۔ ہندوؤں کی رسم "ستی" کی مخالفت

کی۔ بیوہ عورت کو دوسری شادی کی اجازت دی۔ دورِ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ
دفن کر دیا جاتا تھا اُسے ختم کیا۔ اُس دور میں بیوہ عورت پر جو شخص کپڑا ڈال دیتا تھا وہ
اسی کی زوجہ سمجھ لی جاتی تھی (بخاری) اسلام نے اس کو بھی ختم کیا۔ اور اس طرح دنیا سے
مسیحیت کے اس عقیدے کو کہ "عورت میں تعلیم کی روح نہیں" غلط قرار دے کر اس پر ضرب
کاری لگائی۔ خود پیغمبر اسلام نے بحکم خدا واقعۂ مباہلہ میں ایک خاتونِ عصمت وطہارت
(حضرت فاطمہ زہراؑ) کو بحیثیت گواہ حق پیش کیا۔ چادرِ تطہیر میں حضرت خاتونِ جنّت کو
بلا کر یہ ثابت کر دیا کہ عورت جنت کی مالک ہے۔ اور اس طرح مسیحیت کے اس عقیدے
کو باطل قرار دیا "کہ عورت جنت میں نہ جائیگی" حضرت زہراؑ کو نفس دوم میں شامل کر کے
عصمت کاملہ کی مہر ثبت کر دی۔ اور اس نظریہ کو مردود قرار دیا کہ "عورت بدی کا مجسمہ ہے"۔
داروغۂ جنت حضرت رضوان نے درزی بن کر گواہی دی کہ حضرت زہراؑ مالکۂ فردوس
ہیں۔ "ابلیسی سانپ" والی بے ہودہ کہاوت پر صواعق محرقہ گرا دیں۔ حضرت رسولِ خدا
نے جناب زہراؑ کو تسبیح فاطمہ کا ہار پہنا کر دنیا پر ثابت کر دیا کہ عورتوں کی سردار حضرت
فاطمہ زہراؑ کا ذکر بھی عبادت ہے۔ اس طرح اس خیال کو کہ "عورت عبادت کے لئے زہر قاتل
ہے"۔ بالکل غلط ثابت کر دیا۔ ان اعزازات سے عورت کو نواز کر اسلام نے دنیا میں اس
مقام پر فائز کیا جس پر کہ اس کا فطری حق تھا۔ اسے نیکی کا فرشتہ۔ بلکہ جنت کے فرشتوں
کی مالکہ قرار دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اُسے کارِ رسالت میں شریک کیا اور تعارف کرا دیا کہ
عورت اُمت کی ہادی بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن افسوس کہ مسلمانوں میں بعد از رسولؐ ان اعزازات کی وہ قدر و قیمت نہ رہی جو
چاہیئے تھی۔ کیونکہ ثقلین کا دامن چھوڑ دیا گیا۔ عورتوں کے حقوق پامال کئے گئے۔ لہذا
عورتوں میں انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا۔ جو دن بدن بڑھتا رہا۔ اور نئی روشنی کی مغرب
نواز عورت نے ضد میں آکر مذہب دشمنی کا راستہ اختیار کر لیا۔ دیگر مذاہب کی خواتین
ایسا کرنے میں حق بجانب ہوں تو ہوں لیکن کوئی مسلمان عورت اگر اللہ کے واضح احکام
کے باوجود ضد پر ڈٹی رہے تو مقامِ افسوس ہے۔ اس مقام پر مسلم عورت کہہ سکتی ہے

کہ اسلام میں حقوق نسواں کا قانون تو موجود ہے لیکن اس کا نفاذ کہاں ہے؟" اس عدم نفاذ قانون اسلام کی وجہ یہ ہے کہ رسولؐ خدا کی واضح ہدایت کے باوجود اُمّتِ مُسلمہ تفریق کا شکار ہو گئی اور عورتوں کو حقوق نہ ملے تو پھر عورت کو ایک مرتبہ دوبارہ اپنے حقوق کا مطالبہ دُہرانا پڑا لیکن اعتدال سے ہٹ کر کچھ مسلمان عورتوں نے بھی تقلید مغرب کرتے ہوئے اپنے حقوق سے زیادہ مطالبات شروع کر دیئے۔ فرقہ دارانہ اختلافات کی وجہ سے اصل قوانین اسلام کی تشریحات مختلف ہیں اس لئے عورت سے متعلقہ قوانین بھی تفریق و اختلاف کا شکار ہونے سے نہ بچ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب دشمنی کو مزید تقویت مل گئی۔ مغرب زدہ مسلم عورتوں نے اہل مذہب کی ایک نہ سنی، اپنا پردہ پھینک دیا۔ نیم برہنگی اختیار کر لی اور الحادی راہوں پر چل پڑیں۔ ان کی اس روش کے نتائج ہرگز اچھے نہیں ہو سکتے۔ معاشرہ میں زہر و فساد پھیلتا جا رہا ہے مگر ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لئے کہ "ثقلین" کا دامن چھوڑ دیا گیا۔ اب جب کہ ہم اس بحران کے شکار ہیں ہمیں چاہئے کہ اس کا علاج "ثقلین" ہی سے دریافت کر لیں۔

عورت کا مقام

اگر ہم انسانی گھر کو "برقی آلہ" سے تشبیہ دیں تو بے جا نہ ہو گا کہ اگر اسے فائدہ مند صورتوں کے لئے استعمال میں لایا جائے تو "نعمت" ہے۔ لیکن اگر اُسے خطرناک اور ضرر رساں طریقوں سے کام میں لایا جائے تو "عذاب" ہے۔ جس طرح بجلی کا دارومدار دو تاروں، مثبت (+) اور منفی (—) پر ہے اور ان دونوں کا سرگرم عمل رہنا ضروری ہے اسی طرح زندگانی انسان کی دو صنفوں، "مرد" اور "عورت" کا باہمی اشتراک عمل ضروری ہے۔ جیسے بجلی کو مفید طریقوں سے استعمال کرنے پر فوائد حاصل ہوتے ہیں اور مہلک طریقوں سے استعمال پر نقصان ہوتا ہے۔ بعینہٖ اگر مرد و عورت کی زندگی مصالحانہ ہو گی تو وہ گویا ایک طرح سے "جنت" ہو گی اور اگر سیاہ کاریوں میں گزرے تو وہ "جہنم" کا نمونہ ہو گی۔ مثلاً اگر بجلی کے دونوں تار خوش اسلوبی سے کام سرانجام دیتے ہیں تو مراد حاصل ہوتی ہے اسی طرح مرد و عورت کی شان ہے کہ دونوں بطریق احسن زندگی بسر کریں تو مرادیں حاصل ہو جاتی ہیں اور جس

طرح دونوں تاروں کے الگ الگ کام ہیں کہ مثبت (+) تار برقی رَو کو جنریٹر سے اُٹھا کر مذکورہ بلب تک لے جاتی ہے اور منفی (-) تار اُسے پھر واپس مرکز تک پہنچا دیتی ہے (یعنی آسائش و آرام پہنچاتی ہے) تاکہ مثبت (+) آئے کے لئے دوبارہ قوت لائے۔ اسی طرح مرد اور عورت ہیں کہ مرد کو مثبت (+) تار تصور کریں اور عورت کو منفی (-) تار۔ مرد کا فرض ہے باہر سے قوت حاصل کرنا اور اندر پہنچا دینا جبکہ عورت کا کام وہی ہے جو منفی تار کا کہ وہ اس ذمہ داری سے مستثنیٰ ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ جس طرح منفی تار کا یہ FUNCTION نہیں ہے کہ وہ باہر سے بجلی کا کرنٹ لائے اسی طرح عورت کا بھی یہ فرض نہیں ہے کہ وہ بیرونی معاملات میں دخل اندازی کرے اور اپنی اصلی ڈیوٹی کو چھوڑ دے۔ اب اگر مستورات میری اس توضیح پر یہ اعتراض وارد کریں کہ "آخر ہم بے چاریوں سے اس موئے کو اتنی عداوت کیوں ہے کہ ہمیں تو اس نے منفی (-) تار بنا دیا اور مردوں کو مثبت (+) تار سے تشبیہ دے دی کہ وہ باہر کے امور کے متولی بن جائیں"۔ تو جواباً عرض کروں گا کہ بجلی والوں نے ان دونوں تاروں کی یکساں اہمیت بیان کی ہے۔ پس انہوں نے ان دونوں کی شناخت میں معمولی فرق کر دیا ہے مثبت پر کچھ ساخت میں امتیاز کر دیا ہے کہ مثبت لائن مضبوط و توانا ہوگی کیونکہ وہ LOAD لے جائے گی یعنی بوجھ اٹھائے گی اور منفی ذرا کمزور کہ وہ اس کا ہاتھ بٹا سکے اور سانس دلوا دے تاکہ تازہ دم ہو جائے کہ اگر خدانخواستہ دونوں تاروں میں یہ جھگڑا ہو جائے کہ منفی بی بی یہ اصرار کر بیٹھے کہ اب مثبت صاحب تھک گئے ہیں لہٰذا ان کی اعانت کے لئے میں باہر سے LOAD لے آتی ہوں تو آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ پس اے خواتین! اللہ آپ کا بھلا کرے۔ چونکہ آپ کی ساخت جسمانی میں ذرا نازک پن ہے اس لئے آپ کے بارے میں منفی تار ہی کی مثال دینا ہی موزوں تھا ویسے اگر کسی عورت کا مزاج تند ہو تو وہ دوسری بات ہے خیر مختصراً یہ کہ مرد اور عورت دونوں زندگی کی گاڑی کے دو پہیئے ہیں اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے دونوں پہیوں کا صحیح و سالم ہونا از بس ضروری ہے۔ لیکن

دونوں کی راہ عمل میں فاصلہ ہے گو کہ عمل ایک ہے بھلا ہم عورت کے مرتبے سے کیسے منکر ہو سکتے ہیں ؛ اگر ایسا ہوتا تو ہم امور خانہ داری کو موضوع سخن ہی نہ بناتے۔ ہم تو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ امور خانہ داری کی سلطنت میں اختیار اعلیٰ عورت کا ہے۔

اسلام دین فطرت و شعور ہے۔ اُس نے امور خانہ داری کی باگ ڈور مکمل طور پر عورت کے ہاتھ میں دے کر اُسے "ملکۂ خانہ" کا تاج پہنایا۔ لہٰذا ہم اولاً اسلام کے عطا کردہ اس مقام عورت کے بارے میں یہ دعوے کرتے ہیں کہ ایسا اعزاز باوقار کسی دوسرے مسلک نے عورت کے سپرد نہیں کیا۔ کچھ لوگ مغرب کے گیت گاتے ہیں لیکن مغرب نے عورت کو اُس حیثیت سے نہیں نوازا جس پر اُسے اسلام نے سرفراز کیا ہے۔ بلکہ صنف نازک کے متعلق اہل مغرب نے جو زہر اگلا اُسے ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے۔ موجودہ دور میں مغرب والے عورت کو جو سبز باغ دکھلا رہے ہیں اُس کی مثال "بے وقوفوں کی جنت" کی سی ہے اور اس حیلے میں پس پردہ بہت سی شیطانی قوتیں سرگرم عمل ہیں۔ مغرب میں عورت سے جو اخلاق سوز کھیل کھیلے جاتے ہیں وہ اتنے قابل نفرت ہیں کہ ہم انہیں بیان کرنا پسند نہیں کرتے البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ یہ نام نہاد "آزادی" جو مغرب میں پائی جاتی ہے اس میں سیاسی سازشیں بھی موجود ہیں اور ہولناک تباہیاں بھی۔ وقت آگیا ہے کہ مغربی معاشرہ از خود اپنی غلطی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اور اس آوارگی کو اپنے لئے وبال سمجھنے لگا ہے۔ عورت کو اس کے اصل مقام سے غافل کر کے غلط میدان میں لانے کی مغربی مردوں نے سعی تعیش کے لئے کی ہے صنف نازک کو دھوکہ دے کر اس کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جنسی خواہشات کی تسکین کے لئے کھلی راہ پیدا کر لی ہے جس پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔

اسلام نے عورت کو جس انعام و اکرام سے نوازا ہے اور اس کی جو سرفرازی فرمائی ہے اُسے ہم ثقلین کے اقوال کی روشنی میں تحریر کرتے ہیں اور سب سے پہلے ثقل اوّل (قرآن مجید) کے ارشادات نقل کر کے سعادت پاتے ہیں۔ اگر اسلام میں عورت کو صحیح مقام نہ دیا جاتا تو تعلیم اسلام نامکمل رہتی۔ اسی لئے فہرست ہادیان برحق (یعنی اہل علم

وہی ایں سے جناب مریمؑ بنت عمران والدۂ گرامی قدر حضرت عیسٰے علیہ السلام کو مصطفٰے فرمایا لیکن ان کی حیات انؑ کے علم جزئی کے مطابق رہی اور عورت کے لئے نمونۂ کامل نہ بن سکی کیونکہ جناب مریمؑ کی زندگی عورتوں کے لئے ازدواجی زندگی میں رہنما نہیں ہو سکتی لیکن جب دین کو مکمل کرنا چاہا تو اللہ نے ثقل دوم کی ایک فرد یعنی وارث علم کلی محذرۂ معظمہ حضرت فاطمہ زہراؑ کو نمونۂ کامل بنایا۔ اس بارے میں ہم اسی فصل میں آئندہ تفصیلاً روشنی ڈالیں گے۔

قرآن مجید اور عورت

ثقل اوّل کتاب اللہ میں ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ سورۂ بقرۃ ۲۲۸ "یعنی عورتوں کے لئے مردوں پر ویسا ہی حق ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے اور خدا زبردست حکمت والا ہے"۔

منقولہ آیت بالکل صاف ہے اور اس اصول کی تائید کرتی ہے کہ اسلام مرد و عورت کو مساوی حقوق کی ضمانت دیتا ہے بشرطیکہ حقوق عادلانہ ہوں لیکن اس ضمانت کے ساتھ اسلام عورتوں پر مردوں کو ایک درجہ کی فضیلت بھی دیتا ہے اور اس کی وجہ بھی ہم اسی ثقل سے دریافت کرتے ہیں کہ جب حقوق میں برابری ہے تو پھر امتیاز درجہ کیوں ہے؟ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ سورۂ نساء ۳۴

یعنی "مردوں کا عورتوں پر قابو ہے کیونکہ خدا نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور چونکہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں پس نیک بخت بیبیاں تابعداری کرتی ہیں اور ان کے پس پشت جس طرح خدا نے حفاظت کی وہ بھی حفاظت کرتی ہیں۔ اور وہ عورتیں جن کے سرکش ہونے کا اندیشہ ہو تو انہیں سمجھاؤ اور (اگر اس پر بھی اثر قبول نہ کریں) تم ان (بغرض تنبیہ) سے کچھ وقت کے لئے مقاربت چھوڑ دو (اور اگر پھر بھی نہ مانیں) تو مارو۔ (کہ کوئی عضو نہ ٹوٹے اور خون نہ نکلے) پس اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں

تو تم بھی ان کو نقصان نہ دو۔ خدا ضرور سب سے برتر و بزرگ ہے۔"

لہٰذا درجہ اولیٰ کی وجۂ اوّل یہ معلوم ہوئی کہ مرد کو عورت پر اس لئے فضیلت ہے۔ کہ یہ قدرت کا اپنا حق ہے کہ جسے چاہے افضل قرار دے۔ اس لئے اصولاً مخلوق کو یہ اختیار ہی نہیں کہ وہ خالق پر ایسا سوال کرے کیونکہ اس نے جسے جو بنایا عین موزوں خلق کیا، اور جس مقصد کے لئے بھی کسی کی تخلیق فرمائی اس سے بہتر اور کوئی متبادل صورت خلق ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ سوال کرنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی بکری صدائے احتجاج بلند کرے کہ اُسے شیر کیوں نہ بنا دیا گیا؟ یا موجودہ زمانے کی سائنسی ایجاد "برقی پنکھا" ریفریجریٹر کے آرام و آسائش کو دیکھ کر کام کرنا چھوڑ دے کہ میں کیا ہر وقت چکروں میں رہتا ہوں اور یہ کیسی آرام سے ایک جگہ ٹکی ہوئی ٹھنڈی ہوا کا مزہ اڑاتی ہے اور ہر ایک کی مرکز نگاہ ہے لیکن اگر ہم ایسی خود سرانہ صورت معاشرے پر منطبق کریں اور فرق مراتب نہ ہو تو کاروبار ہستی کا کیا حشر ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر مخلوق وہی امور متعلقہ بجا لائے جن کے لئے اُسے بنایا گیا ہے کیونکہ وہی اس کی فضیلت ہے۔ پس اوّل فضیلت و درجہ مرد کو عورت پر فطری ہے اس سے آگے قدرت یہ وضاحت کرتی ہے کہ مرد کو اس لئے بھی فوقیت کا استحقاق ہے کہ وہ عورت پر مال خرچ کرتا ہے یعنی کسب معاش کر کے اُسے گھر بیٹھے ضروریات زندگی مہیا کرتا ہے، نیز مہر ادا کرتا ہے تو یہ فضیلت اس کو بلا قیمت نہیں ملتی اب جب کہ عورت ایک خاص رقم کے عوض مرد کی حاکمیت بذریعہ معاہدۂ نکاح (AGREEMENT) منظور کر لیتی ہے تو اس کے لئے ایفائے عہد ضروری ہو جاتا ہے کہ معاہدہ کے مطابق اپنے خاوند کو حاکم تسلیم کرے اور اس کی تابعداری کرے۔ اس کی عطا کردہ ریاست خانہ کا نظم و نسق پُرخلوص طریقے سے چلائے اور متعلقہ امور کی نگرانی نگہداشت اور حفاظت کرے۔ اس مقام پر پھر ایک اور سوال جنم لیتا ہے کہ "قدرتی فضیلت کو طوعاً کرہاً تسلیم کئے لیتے ہیں لیکن یہ انفاق (یعنی خرچ کرنا) والی بات تو کوئی خاص نہیں ہے ..... کہ ہم عورتیں بھی معاشرہ میں کسب معاش کر کے اپنی بسر اوقات کے لئے پونجی کما سکتی ہیں بلکہ چلئے اگر آپ ہمیں بیرون خانہ دیکھنا گوارہ

نہیں کرتے تو ہم گھر ہی میں دستکاری کرلیا کریں گے اور اپنے نان و نفقہ کا بندوبست کرلیں گی لیکن یہ غلامی کا طوق بڑا گراں ہے" تو محترم خواتین جواباً عرض ہے کہ آپ کو مرد کا غلام کس نے کہہ دیا؟ آپ کی حیثیت تو فطری طور پر مساوی ہے کہ آپ ایک صوبہ کی گورنر ہیں اور مرد جو ہے وہ سربراہ مملکت زندگی۔ یہ تو محض کسر نفسی یا طنز ہے کہ آپ خود کو غلام فرما رہی ہیں حالانکہ اصل حقیقت اس سے مختلف ہے باقی رہا کہ آپ خود اپنا روزگار مہیا کرلیں گی تو یہ ایک غیر فطری فعل ہوگا بلکہ معاشرے کے ساتھ ایک ظلم ہوگا۔ کہ وہ صوبہ (گھر) جو آپ کی نگرانی میں دیا گیا ہے اس کی مثال "اندھیر نگری چوپٹ راج" والی ہو جائے گی۔ کارخانۂ حیات کے نصف سے زیادہ امور لاوارث ہو جائیں گے اور زندگی کی گاڑی صحیح رفتار سے رواں دواں نہ ہو سکے گی۔ اگر آپ نے اپنا صوبائی دارالحکومت (گھر) چھوڑ دیا اور ریاست کو اپنے رحم و کرم پر رہنے دیا تو پھر مرکز بھی کمزور ہو جائے گا۔ صوبے کا تو خدا ہی حافظ! لیکن باہر آئیں گی تو آپ کا مقام غلط ہو جائے گا۔ آپ کا حشر مغربی عورت کا سا ہوگا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ اگر آپ اپنے اصلی فرائض سے کوتاہی کرتے ہوئے محض مردوں کی ضد میں آکر اندرون خانہ کسب معاش کی سعی فرمائیں گی تو پھر اصل امور جن پر آپ متولیہ ہیں ان کی نگہبانی میں خلل واقع ہوگا۔ اور نظم و نسق درست نہ رہ پائے گا۔ جس کے نتائج دور رس ہوں گے۔ ذرا غور کیجئے! کہ مہینے کے کچھ دن عورت پر ایسے بھی آتے ہیں کہ ان ایام میں اُسے جو سہولتیں اپنی ریاست کے اندر مہیا ہو سکتی ہیں باہر نہیں اور اگر ولادت کا دور ہو تو بات دنوں سے مہینوں تک پہنچ جاتی ہے اور اس وقت تو آپ بہ نفس نفیس اپنے بوجھ سے شرماتی ہیں اس فطری کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے خلاق عالم نے آپ کو ان صعوبتوں سے محفوظ قرار دے دیا اور بالکل ریفریجریٹر کا سا مقام آپ کو مل گیا۔ کہ جنکا سرگرداں ہے آپ ٹھاٹھ سے ایک لذائذ و رنگینیوں کی دنیا میں عیش و عشرت فرمائیں سب آپ کے محتاج ہوں۔ ننھے منے بچے آپ کا دروازہ کھولیں اور من پسند چیز دل کو چن چن کر آپ کے گیت گائیں بڑے آپ کے مشروبات سے فرحت حاصل کرتے ہوئے

بلند اقبالی کے لئے دعاگو ہوں۔

اور دیکھئے جب آپ نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے ہیں تو اس کی پاس داری بھی آپ پر لازم ہے مرکز کو اگر کسی سرکشی کی اطلاع پہنچے تو سربراہ حکومت کا اولین فرض ہے کہ اس کی سرزنش کرے بالکل اصول و قواعد زمانہ کے مطابق پہلے زبانی WARN (متنبہ) کرے پھر چارج شیٹ کرے کہ جواب طلبی کے لئے آپ کو الگ چھوڑ دے اور اپنا دباؤ ہٹائے تاکہ جواب بلا تشدد و دباؤ دیا جا سکیں۔ اگر آپ اپنی صفائی پر معقول دلائل پیش کر کے فہرست الزامات کی تردید کر دیں۔ تو مرکز کا فرض ہے کہ وہ جملہ الزامات واپس لے لیکن اگر آپ کی بغاوت اس حد تک تجاوز کر جائے کہ آپ مرکز کی کوئی پرواہ نہ کریں تو حکومت کو اختیار ہو گا کہ فتنے کی سرکوبی کے لئے طاقت کا استعمال کرے۔ لیکن پھر بھی وہ طاقت محض خوف و ہراس تک محدود ہو گی کہ جس سے نہ تو کوئی کشت و خون ہو اور نہ ہی کوئی تباہی و نقصان اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اقتدار اعلیٰ خدائے بزرگ و برتر کا ہے اور اس کا قانون واجب العمل ہے۔

اب یہ سوال بھی ممکن ہے کہ آخر عورت کو مرکز کا نظم و نسق کیوں نہ سونپا گیا؟ یعنی اس کو بیرونی امور سے علیحدہ کر کے خانگی امور سے وابستہ کیوں کیا گیا۔ تو اس ضمن میں اوّلاً تو اس بات کا اعادہ ہے کہ عورت کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ گھریلو معاملات کی دیکھ بھال کرے اور اسے بیرونی مداخلت کا حق اس وجہ سے نہیں دیا گیا کہ وہ باوجود انسان ہونے کے اپنی کمزوری کی وجہ سے صنف نازک کہلاتی ہے اور مرد کے مقابلے میں فطرتاً کمزور ہے اور گھر سے باہر کی وہ ذمہ داریاں جن کو مرد بحسن و خوبی اٹھاتا ہے عورت اس بہتر طریقے سے نہیں اٹھا سکتی جیسا کہ عورت کی اسی کمزور کیفیت کو خداوند عالم نے ثقل اوّل (قرآن مجید) سورہ زخرف پ۲۵ آیات ۱۶ تا ۱۸ میں یوں بیان فرمایا ہے "کیا اس نے اپنی مخلوقات میں سے بیٹیاں خود لے لیں ہیں اور تم کو چن کر بیٹے دے دیئے ہیں حالانکہ جب ان میں سے کسی شخص کو اس چیز (بیٹیا) کی خوشخبری دی جاتی ہے جس کی مثال اس شخص نے رحمان کے لئے بیان کی ہے تو اس کا

چہرہ مارے غصے کے سیاہ ہو جاتا ہے اور تاؤ پیچ کھانے لگتا ہے (بیٹی کا ہونا اپنے لئے پسند نہیں کرتا) کیا وہ عورت جو زیوروں میں پالی پوسی جائے اور جھگڑے میں بات تک نہ کر سکے (خدا کی بیٹی ہو سکتی ہے؟) دوسری جگہ پ۲۰ سورہ قصص میں ہے کہ شہر مدین میں حضرت موسیٰ کا حضرت شعیبؑ کی بیٹیوں سے ملاقات کرنے کا جو واقعہ ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی فطرت میں شرم و حیا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ عورت میں جفاکشی فطرتاً اس حد تک نہیں ہے کہ جس حد تک مرد میں ہوتی ہے۔ اس لئے اس سے یہ بار گراں نہ اٹھوایا گیا، بلکہ اس کی شرم و لحاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس کی نزاکت نسوانی کو سمجھتے ہوئے اُسے عین فرحت بخش نازک، شرم و حیا سے پُر ماحول میں معقول امور کی نگہداشت سونپی گئی اور ساخت جسم کے مطابق اس کو ذمہ داریاں بھی ہلکی مگر حسین اور انتہائی اہم ملیں کیونکہ قانون فطرت ہے کہ کسی کی استعداد سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں لادا جاتا۔

لیکن ایک اور اہم سوال اٹھ سکتا ہے، کہ ہمیں دنیا میں کئی مثالیں ایسی مل جاتی ہیں کہ عورتوں نے بیرونی نظم و ضبط مردوں سے بھی زیادہ خوب صورتی سے چلایا۔ لہٰذا یہ کلیہ بظاہر فرسودہ نظر آتا ہے کہ عورت فطری لحاظ سے کمزور ہے اس لئے اس پر بیرونی نظام کے چلانے کا اعتماد نہیں کیا جا سکتا، تو جواباً عرض ہے کہ رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی وغیرہ کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ انھوں نے سخت مجبوری کی حالت میں یہ بوجھ اٹھایا اور حسب استطاعت اُسے برداشت بھی کیا۔ اور انہوں نے اپنی پوری طاقت سے نظم و نسق کو چلایا لیکن جن جن مصائب سے ان کو دوچار ہونا پڑا تاریخ میں ان کا تذکرہ موجود ہے کہ نتیجہ خرابی کے سوا اور کچھ نہ ہوا۔ لہٰذا یہ دعویٰ غلط ہے کہ عورتوں نے بیرونی نظم و نسق کو کبھی مردوں سے بھی زیادہ خوبصورتی سے چلایا۔

اگر طاقت (CAPACITY) سے زیادہ بوجھ (LOAD) ہوگا تو کام تو چل سکتا ہے لیکن "خطرہ" کے خدشہ کا احتمال برقرار رہیگا، یہی حساب موجودہ زمانے کا ہے۔ کہ عورتیں اپنی ذہنی قوتیں اور جسمانی طاقتیں آزما رہی ہیں لیکن یہ بات قانون

فطرت کے خلاف ہے۔ لہٰذا نتائج اچھے برآمد ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہے اور پھر یہ کہ ایسے حالات میں مردوں کی اعانت ازبس ناگزیر ہے۔ اکیلی عورت یہ ذمہ داری نہیں نبھا سکتی۔ اگر کہیں اچھے نتائج بھی نکل آتے ہیں تو وہاں مردوں کی مشاورت کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ مسز گولڈا میئر اسرائیل کی سابقہ وزیر اعظم کے دور کا مطالعہ کیجئے مسز اندرا گاندھی کی شدید الجھنوں کو ذہن میں رکھئے اور مسز بندرا نائیکے کے ملکی بحران کو بھی مدنظر رکھیں، نیز یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھیں کہ ان غیر مسلم عورتوں کو بھی سخت مجبوری کے تحت ہی یہ منصب سونپے گئے ہیں۔ لہٰذا انفرادی مثالوں سے اس وقت تک اجتماعی کلیہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا جب تک اس میں تخصیص کا پہلو موجود ہے۔ محض کسی کرتب یا کسی کارنامہ کا انعقاد کسی کی تبدیلیٔ فطرت کا باعث نہیں ہو سکتا ورنہ پھر بولنے والے طوطے کو انسان ماننا پڑے گا۔ اس لئے کلیہ مذکورہ بالا قوی و مستحکم ہے کیونکہ وہ فطری ہے۔

عورت کی مرد پر فضیلت باوجودیکہ اللہ نے مرد کو عورت پر فوقیت بخشی ہے۔ لیکن پھر بھی عورت کو کچھ خصوصیات عطا فرمائی ہیں، تاکہ عدل قائم رہے اور مساوی حقوق کے ساتھ عورت پر پابندیٔ اطاعتِ مرد کے بدلہ میں انعام و اکرام کر دیا جائے۔ وہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ مشاہدۂ فطرت سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً مذکر کو مؤنث سے خوبصورت بنایا گیا ہے۔ جیسے مُرغ مرغی سے حسین ہوتا ہے۔ مور مورنی سے خوشنما ہے۔ کبوتر کبوتری سے خوش شکل ہے۔ طوطا طوطی سے خوبصورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے برعکس عورت کو مرد سے زیادہ شکیل و خوبصورت بنایا، کہ اگر مرد درجۂ اُولیٰ پر فخر کرے تو عورت اپنے حسن و جمال پر ناز کرے۔ اگر مرد اپنی حکومت کے بل پر اس پر قابو پانے کی کوشش کرے تو عورت نزاکت و حسن کے جال میں اُسے گرفتار کرے چنانچہ اس طرح قدرت نے عورت کو بھی خصوصیات سے نوازا ہے۔

ب۔ اگر عورت کو خاوند کے تابع قرار دیتے ہوئے اسے شوہر کے قدموں میں جنت کی بشارت دی تو اُدھر مرد کی پوری اولاد کو عورت کا مطیع و فرمانبردار قرار دے کر ماں کے قدموں کو جنت بنا دیا۔ یعنی باپ کا قرضہ اس کی ساری اولاد نے اتار دیا۔

ج۔ فکر معاش، رنج حوادث اور تنازعات بیرونی کے تفکرات میں مرد کو جکڑ دیا گیا۔ لیکن پُر آسائش گھر، تقسیم طعام اور محدود گھریلو تفکرات عورت کے حصے میں آئے۔

د۔ مرد کی پریشانیوں کا علاج عورت کو قرار دیا۔ جبکہ دیگر مذاہب نے عورت کو پریشانیوں کا سبب ٹھہرایا۔

لہٰذا مندرجہ بالا چند مثالوں سے ثابت ہوا کہ اللہ نے عورت کو مردوں کے مقابلے میں چند خاص امتیازات عطا فرمائے ہیں۔

اندرونِ خانہ مرد کا مقام

اسلام ایک ایسا باضابطہ دین ہے کہ جس میں تمام فرائض حقوق پر مبنی ہیں۔ کوئی حق ایسا نہیں کہ جس کی ادائیگی کو فرض نہ کیا گیا ہو۔ اور کوئی فرض ایسا نہیں جو کسی کے حق پر مبنی نہ ہو۔ یہی تقاضائے فطرت ہے۔ اگر سارے حقوق ایک طرف ہوتے اور فرائض دوسری جانب تو دونوں میں کشمکش ہوتی رہتی اور جیت طاقتور ہی کی ہوتی۔ اسی کے تحت عورت کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے خاوند کے سپرد کر دے لیکن اس کے برعکس مرد کا فرض یہ ہے کہ وہ مقررہ مہر ادا کرے جو کہ عورت کا حق ہے عورت کے علیحدہ حقوق و فرائض اس کی ازدواجی زندگی سے شروع ہوتے ہیں، اور اوّل حق عورت کا یہ ہے کہ اس کا خاوند اُسے رہائش کے لئے ایک گھر مہیا کرے جس گھر کی وہ ملکہ ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ گھر اس کی ذاتی جائداد یعنی خود بنایا ہوا یا خریدا ہوا ہو یا وراثت میں پایا ہو۔ اگر کوئی شخص غریب ہے تو وہ گھر کرائے کا بھی ہو تو حرج نہیں بس وہ گھر ہونا چاہیئے۔ اور اس گھر میں خاوند کے علاوہ اس پر کوئی

دوسرا حاکم نہ ہو۔ شوہر پر لازم ہے کہ وہ "امور خانہ داری" کا قلمدان اس حاکمہ خانہ کے حوالے کر دے اور معموباتی خود مختاری دے دے۔ اس کی استعداد سے زیادہ فرائض نہ سونپے۔ اور حدود معینہ کے تحت اس کے نفاذ احکام کی نگرانی کرے کہ حقوق و فرائض کا امتزاج برقرار رہ سکے۔ گھریلو معاملات میں دخل اندازی سے اجتناب کرے مگر بغاوت و سرکشی کے فتنہ کی سرکوبی اس کے فرائض میں داخل ہے۔

ملکۂ خانہ کے حقوق و فرائض

اگر خاوند کے علاوہ عورت پر کوئی دوسرا فرد بحیثیت جواب طلب اتھارٹی متعین کیا جائے گا۔ تو اس کی مثال ایک اقلیم میں دو بادشاہوں کی سی ہوگی۔ لہٰذا نظم و ضبط میں خلل واقع ہو جائے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ عورت پر کوئی دوسرا تادیب کرنے والا نہ ہو۔ لیکن ہماری روزمرہ زندگی میں اس حق کو کچل کر رکھ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ایسی مثالیں گھر گھر ملتی ہیں اور نوے فیصد گھرانے محض اس اصول کی مخالفت کی وجہ سے سکون سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، ساس و بہو کی کشمکش نند و بھاوج کی طبع آزمائی وغیرہ وغیرہ۔ اگر عورت کے اس شرعی حق کو چھینا جائے تو اس کے نتائج ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ مثلاً اولاد کی تربیت بطریق احسن نہیں ہوتی کیونکہ ضروری ہے اکثر اوقات ماں کو دوران تربیت اولاد پر سختی بھی کرنا پڑتی ہے۔ اور بچے عموماً فریاد لے کر وہاں جاتے ہیں جہاں سے ماں کو ڈانٹ ڈپٹ ہوتی ہے لہٰذا ایسے حالات میں ماں خوف کے مارے اپنی صلاحیت پوری طرح بروئے کار نہ لا پائیگی، مشاہدہ گواہ ہے کہ اکثر بچے محض دادیوں پھوپھیوں اور دیگر بزرگوں کے لاڈ پیار سے صحیح تعلیم و تربیت سے محروم رہ جاتے ہیں، دوم یہ کہ اس دوہری حکومت کی وجہ سے عورت کو اپنے گھر سے دلچسپی نہیں رہتی اور گھر کو زندان تصور کرنے لگتی ہے۔ کہ اس پر آمریت مسلط ہے۔ لہٰذا اس کی محبت معدوم ہو جائے گی، ایسی صورت میں اکثر عورتوں پر بلاوجہ نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ جس سے وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اور نتیجۃً اس کے جواہر حسن تدبیر و حسن انتظام ماند پڑ جاتے ہیں نوبت یہاں تک آ جاتی ہے کہ گھر والے اس کا کوئی مقام ہی نہیں سمجھتے۔ اس کی ہر حرکت پر اعتراض ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کھانے، پینے اور پہننے تک پر بے معنی تنقید کی

جاتی ہے اور یہ چرچا اندرون خانہ سے ہمسایوں اور قرابت داروں کے گھروں سے ہوتا ہوا میاں کے کانوں تک بھی آن پہنچتا ہے، اور وہ اپنی قوت کا ناجائز استعمال کرتے ہیں، بھلا صنف نازک کہاں یہ دکھ اٹھا سکتی ہے، دل ہی دل میں موت کی دعائیں کرتی رہتی ہے اور یہ رواج ہم نے ہندوؤں سے لیا ہے۔ اسلام میں اس قسم کے آزار قطعاً نہیں ہیں۔ لہٰذا اس روش کی اصلاح ہونی چاہیئے۔

حتی الامکان خاوند کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ بیوی کو گھر کا ایسا ہی ماحول مہیا کرنے کا بندوبست کرے جس کی وہ اپنے میکے گھر میں عادی ہے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ان حالات کو بتدریج اعتدال تبدیل کیا جائے۔ بہتر صورت یہی ہے کہ کوشش کی جائے کہ رشتہ ہم پلہ سے ہو تاکہ اس قسم کے جھگڑے شادی خانہ آبادی کو خانہ بربادی نہ بنائیں۔ جناب سرور کائنات نے سیدہ کی رخصتی پر حضرت علیؑ سے فرمایا تھا کہ "اے علیؑ! فاطمہؑ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ محبت اور شفقت کے ساتھ ملی ہے۔ تم بھی اس کی دل جوئی کرنا" یہ بات حضورؐ نے امت کو تعلیم دینے کے لئے ہی ارشاد فرمائی تھی۔

مرد کے لئے لازم ہے کہ عورت کی آسائش کا اہتمام کرے، اُسے مناسب خوراک و پوشاک مہیا کرے اور حدود کے اندر اس کے لئے حسب استطاعت زیورات سامان زیبائش وغیرہ کا انتظام کرے۔ یہی زوجہ کے حقوق ہیں اور شوہر کے فرائض ہیں۔

اسی طرح اب زوجہ کے فرائض بھی ہیں جو خاوند کے حقوق ہیں چنانچہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی لخت جگر کو یوں تعلیم فرمائی "اپنے خاوند سے سلوک کرنا ان کے ہر حکم کی اطاعت کرنا۔ دیکھو ایسا نہ ہو کہ علیؑ کبھی تمہاری شکایت کریں۔ ان سے ایسی بات کی فرمائش نہ کرنا جو وہ پوری نہ کر سکتے ہوں، اپنے دکھ درد سنا کر رنجیدہ نہ کرنا اور سادہ زندگی گزارنا" نیز حدیث رسولؐ ہے کہ "اگر خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ ہوتا تو میں حکم دیتا کہ اولاد والدین کو سجدہ کرے اور زوجہ اپنے شوہر کو"۔ الغرض بیوی یہ ہمیشہ مدنظر رکھے کہ خاوند کی صحت و زندگی کے ساتھ ہی اس کی زندگی ہے کبھی گھر کی غریبی بیان کر کے اپنے خاوند کو تکلیف نہ دے۔ اپنا وقت اپنے گھر کے کام کاج کی دیکھ بھال میں صرف

کرے اور حقوق اللہ کی اندرون خانہ پابندی کرے۔
نقل اول کے سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ اور اپنی آئندہ کی بھلائی کے واسطے (اعمال صالح) پیشگی بھیجو۔ اور خدا سے ڈرتے رہو۔ اور یہ بھی سمجھ رکھو کہ (ایک نہ ایک دن) تمہیں اس کے حضور جانا ہے۔ اور (اے رسول!) ایماندار کو (نجات کی) خوشخبری سنادو"۔
لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی کھیتیوں کی حفاظت کریں اور ان کی فصل سے فائدہ اٹھائیں۔

اہل خانہ کے حقوق افراد خانہ کا یہ فرض ہے کہ مالکۂ خانہ کے نظم و ضبط کی پابندی کریں اور عورت کا فرض ہے کہ اُن کو اندرون خانہ کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے اور درجہ بدرجہ ان کی ضروریات پوری کی جائیں جن کی ذمہ داری اس پر عائد ہے یعنی وقت پر کھانا تیار ہو جائے، صفائی وغیرہ ہو، گھریلو اخراجات میں کفایت شعاری ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

اللہ کے حقوق ایک گھر میں اللہ کا حق یہ ہے کہ منتظمۂ خانہ گھر میں قانون خداوندی کا نفاذ کرے۔ اور گھر کے ماحول کو خالص اسلامی ماحول بنانے کی کوشش کرے۔ خرافات سے پاک رکھے اور دینی تربیت کا مرکز بنائے تاکہ بچوں کی تربیت صحیح خطوط پر ہو سکے اور دیگر افراد خانہ صالح رہیں۔

میراث میں حصہ محررکردہ بیان میں ہم نے ثابت کیا ہے کہ مرد اور عورت کارخانۂ حیات میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلام نے دونوں کو یکساں حقوق عطا کر کے برابری کی بنیاد پر فرائض عاید کیے ہیں۔ اگر ساخت کی بنیاد پر مرد کو عورت پر فوقیت بخشی ہے تو حسن و جمال کی دولت عورت کا افتخار ٹھہرایا ہے اگر دونوں فریق اپنے حقوق و فرائض کے دائرے میں سرگرم عمل رہیں تو معاشرہ رشک جنت بن جائے گا۔
لیکن ایک اور ضمنی سوال بھی غور طلب ہے کہ اللہ نے لڑکے کو دو لڑکیوں کے

برابر وارث ٹھہرایا ہے حالانکہ حقوق مساوی ہیں تو اس اصول میں بھی جو بظاہر مردوں کے حق میں فائدہ مند نظر آتا ہے اللہ نے عورت کو اس کے بقیہ حصے سے کہیں زیادہ دوسرے طریقے سے ادا کر دیا ہے کہ اُس کو اپنی ضروریات کے لئے روزی کمانے کی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دیا ہے اور مرد کو دُہرا حصہ ملنے کا یہی سبب ہے کہ اُسے اپنا پیٹ بھرنے کے علاوہ عورت کے لئے بھی روٹی کپڑے اور دیگر ضروریات کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس طرح اگر ماں باپ کے مال کے حصے سے اُسے کچھ کم ملا تو مہر اور ضروریات زندگی کے اخراجات نہ صرف وہ کمی پوری کر دیتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ منفعت ہوتی ہے اور ایسا صرف انتظام کو خلل سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا گیا ہے ورنہ مالی لحاظ سے مرد اور عورت مساوی ہی رہتے ہیں۔

چار نکاح[1] اب طبقۂ نسوانی کی جانب سے جس سوال کا شدید زور رہے وہ یہ ہے، کہ مرد کو ایک ہی وقت میں زوجہ کی موجودگی میں زاید شادیوں کی اجازت ہے۔ بلکہ وہ تصرف مال سے لونڈی بھی خرید سکتا ہے لیکن عورت کو ایک وقت میں صرف ایک نکاح کی اجازت ہے کیا یہ عورت کی حق تلفی نہیں ہے ؟

کیونکہ یہ اعتراض بہت اہم ہے اور مخالفین اسلام نے اس پہ کثری نکتہ چینی کی ہے لہٰذا بہتر ہوگا کہ نقل اوّل کی ایک آیت کا ترجمہ کر دیا جائے۔ یہ سورۂ نساء کی دوسری آیت ہے۔
"اور اگر تم کو خوف ہو کہ تم یتیم لڑکیوں (کی دیکھ بھال) میں انصاف (قسط) نہ کر سکو گے تو عورتوں سے اپنی مرضی کے موافق دو دو تین تین اور چار چار نکاح کر دو۔ پھر اگر تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم (متعدد بیویوں میں) انصاف (عدل) نہ کر سکو گے تو ایک پر اکتفا کرو۔ یا جو تمہاری زر خرید ہو (اسی پر قناعت کرو)"۔

---

[1] ہمارے معاشرے میں نکاح کرنے کا طریقہ ذرا اصلاح طلب ہے کہ بعض اوقات عورت کو اس کی مرضی کے خلاف ایک جانور کی طرح ہانک دیا جاتا ہے حالانکہ لڑکی کی رضامندی لازمی ہے، باوجودیکہ جناب سیدہ کا نکاح اللہ نے عرش پہ کر دیا تھا لیکن پھر بھی حضورؐ نے جناب سیدہ کی مرضی حاصل کی تاکہ امت کو اس کی تعلیم حاصل ہو۔

نقل کردہ آیت سے اوّلاً جوازِ نکاح کا باعث زیرِ بحث آتا ہے جو یہ کہ اگر قوم کے حالات ایسے ہوں کہ لاوارث عورتوں کی تعداد زیادہ ہو اور ان سے عدل کرنا ممکن نہ رہے تو پھر یہ حکم ہے کہ باہمی رضامندی سے نکاح کر لیا جائے، اس مقصدِ کفالت کی خاطر اگر کوئی صاحبِ استطاعت یہ تعداد چار تک بھی کرے تو یہ بات غیر مستحسن نہ ہوگی۔ مگر شرط یہ ہے کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو اُسے "عدل" کرنا ہوگا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ حکم ضروریاتِ انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیا گیا ہے۔ مثلاً زمانۂ جنگ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مرد محاذوں پر کام آجاتے ہیں، عورتیں ایک تو پیدائش کی نسبت سے زیادہ ہوتی ہیں، دوسرے مردوں کا سایہ سر سے اٹھ جانے سے وہ لاوارث بھی ہو جاتی ہیں اب اگر ان کی دیکھ بھال انصاف و قسط کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہو پاتی تو پھر ایسی اجازت کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے جو بالکل اصولی اور مطابقِ شعور ہے۔ ورنہ اس کا متبادل حل مخالفین بتا دیں، اگر قوم کی ایسی مصیبت زدہ عورتوں کا نشین بنا کر انہیں قیدیوں کی طرح بند کر دیں اور صرف روٹی کپڑا وغیرہ دے دیں تو ان سے انصاف ہوگا یا ظلم؟ کیا ایسی صورت میں اُن کے مکمل حقوق کی پاس داری ہو سکے گی اور پھر ان کی فطری خواہشات کا علاج کیا ہوگا؟۔ ابھی چند سال قبل دنیا میں جنگِ عظیم ہوئی اور جرمنی کو کافی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ باوجودیکہ ربع صدی سے زاید وقت گزر گیا ہے لیکن جرمنی میں اب تک عورتوں کے کثیر تعداد مسائل لاحل ہیں۔

دوم یہ کہ اسلام ایک عالمی (UNIVERSAL) نظام ہے اور اس کی اساس "علم" پر ہے اس لئے یہ جو حد چار تک کی لگائی گئی ہے انتہائی معقول ہے۔ عالیہ مردم شماری سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ عورتوں کی افزائشِ نسل مردوں کی نسبت چار گنا ہے، اگر یہ چار نکاح جائز نہ کیے جاتے تو پھر باقی تین کا کیا بنتا، کیا ان کو بے رحمی کے ساتھ انہی کے حال پر چھوڑ دیا جاتا؟ کہ وہ معاشرے کے لئے ناسور بن جائیں۔

انگریزی طبقہ کی طرف سے یہ بے بنیاد خیال کیا جاتا ہے کہ عورتوں میں جنسی

خواہش مردوں سے زیادہ ہوتی ہے لیکن یہ محض مفروضہ ہے جسے علم طب میں بالکل مردود قرار دیا جاچکا ہے اور موجودہ ڈاکٹروں نے بھی اس کی سختی سے تردید کی ہے کیونکہ یہ بات تو بالکل سیدھی سی ہے کہ جنسی خواہش کا دارومدار قوت پر ہوتا ہے اور عورت کو فطرتاً کمزور پیدا کیا گیا ہے تو پھر اس میں جنسی خواہش کا مرد سے زیادہ قوی ہونا کیونکر ممکن ہے حقیقت یہ ہے کہ عورتوں میں مردوں کی نسبت جنسی طاقت ایک چوتھائی ہوا ہے اور اکثر اطباء نے اس کو تجربتہً بھی ثابت کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ عورت مہینے کا چوتھا حصہ تو مخصوص ایام[2] کی وجہ سے بے خواہش ہو جاتی ہے اور اگر حاملہ ہو تو نو مہینے تک محروم رہتی ہے زمانۂ حمل میں بعض اوقات عورت کو جنسی مقاربت سے نفرت تک ہو جاتی ہے۔ اور رضاعت میں بچہ کو نقصان پہنچنے کا خدشہ آڑے آجاتا ہے۔ عورت کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی ہے۔ لیکن مرد پر یہ کیفیات وارد ہی نہیں ہوتی ہیں اگر وہ صحت مند ہے تو ممکنات میں ہے کہ ایسی صورت حال میں مردانہ جوہر اُسے بے قرار کرے لہٰذا وہ دوسری عورت کی ضرورت محسوس کرے گا اور اگر وہ دو عورتیں رکھتا ہے تو دونوں کے حالات یکساں بھی ہو سکتے ہیں۔ تو پھر اس کا فطری جوش کیا راہ تلاش کرے گا؟ لیکن مشاہدہ گواہ ہے کہ جب چار عورتیں ہوں گی تو ایک نہ ایک ضرور خالی مل جائے گی۔ جو اس کی ضرورت پوری کر سکے کیونکہ خالق کائنات کو مرد اور عورت دونوں کی ضروریات کا احساس ہے لہٰذا اس نے یہ حکم دے کر مردوں کی ایک مشکل کا حل دے دیا تاکہ حدود شرعی قائم رہیں اور معاشرہ بداعمالیوں سے محفوظ و پاک ہو جائے۔ اس کے بعد پھر عدل کی کڑی شرط کا باندھنا عورتوں کو اور بھی زیادہ تحفظ مہیا کرتا ہے۔ تعداد ازدواج

---

[1] حرص، ہوس اور جنسی خواہش تینوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

[2] ان عوارض سے عورتوں کی نصف قوت ازخود ساکت ہو جاتی ہے۔ دو دو میں بھی ودیعتِ قدرت کے مطابق مرد عورت سے دگنا حصہ پاتا ہے اس طرح مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوا اور نسبت ۱ : ۴ منطبق ٹھہری۔

یعنی چار منکوحہ عورتوں کی اجازت اور اس کے ساتھ ساتھ لونڈیوں کی اجازت جو اسلام نے دی ہے اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کثرت سے بڑھے کیونکہ کثرتِ تعداد ہی سے قوم کو قوت حاصل ہوا کرتی ہے جیساکہ افرادی قوت پر چین فخر کرتا ہے۔ آبادی کے اضافے اور خاندانی منصوبہ بندی کی بحث ہم نے فصل اقتصادیات و معاشیات میں پیش کر دی ہے اب زرخرید لونڈی اور متعہ کے بارے میں کچھ اعتراضات ہیں تو ان کے بیان کے لئے علیحدہ باب کی ضرورت ہے۔

آپ روزمرہ زندگی میں ملاحظہ فرماتے ہیں کہ عموماً جانوروں میں "نر" نوع کی نسبت "مادہ" نوع کی تعداد کہیں زیادہ پیدا ہوتی ہے نیز آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مثلاً اگر کسی نے ایک گھر میں چار پانچ مرغیاں پال رکھی ہیں تو جوڑا کرانے کے لئے وہ ایک ہی مُرغ رکھتا ہے اسی طرح گوالے گائے بھینسوں کے احاطے میں متعدد مادینہ کیلئے ایک ہی سانڈ یا بیل کا بندوبست کرتے ہیں جو کہ ان کی ضرورت کے لئے کافی ہوتا ہے۔ آج کل نسل کشی عام ہے۔ ہمارے خیال میں اسی لئے نر جانوروں کا خصی کرانا رواج پاگیا ہے کہ افزائش نسل کی ضرورت کے تحت نروں کی قلیل تعداد ہی کافی ہے لہٰذا فاضل نروں کو ان کی اس قوت سے محروم کر دیا جاتا ہے تاکہ انہیں دیگر مقاصد کے لئے کام میں لایا جائے حالانکہ پیدائش کا تناسب بالکل وہی ہے کہ مذکر جانور کم اور مونث زیادہ پیدا ہوتے ہیں، اس کے باوجود نرینہ قوت کو زائد تصور کرتے ہوئے اس کی کثرت کو قلت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ مفروضہ کہ عورت میں قوتِ جنسی مرد سے زیادہ ہوتی ہے فطرت کے خلاف ہے اور اس کی کوئی اساس نہیں ہے۔

واضح ہو کہ اسلام میں تعداد ازدواج کا قانون مشروط بضرورت و عدل ہے۔ اگر لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں تو اس سے قانون کی افادیت پر کوئی حرف نہیں آسکتا حالانکہ اس پر ابتدا و انتہا میں ایسے کڑی شرائط ہیں کہ انکا لحاظ رکھا جائے تو کوئی بھی شخص اس قانون کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر معاشرہ

کے حالات پر سکون رہیں اور نظام ربانی کا دور دورہ ہو تو ایک ہی نکاح کافی ہے۔ نقل دوم کی سیرت ملاحظہ فرمائیں کہ خود رسول کریمؐ نے جناب ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ کی حیات کے دوران کوئی دوسرا نکاح نہ فرمایا۔ اسی طرح قائد نقل دوم سرکار امیرالمومنینؑ نے جناب سیدہ طاہرہ کی زندگی میں کوئی دوسری شادی نہ کی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کو اس وقت ایسی کوئی ضرورت نہ تھی۔

جب زمانہ آگے بڑھا۔ لوگوں نے فتوحات کیں۔ مہمات میں حصہ لیا۔ اور مرد جنگوں میں کام آئے تو ان کے پس ماندگان کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں نے اس قانون پر عمل کیا۔ صالحین کے حالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہ نکاح کسی جنسی تسکین کے لئے نہ تھے بلکہ بالکل قرآنی ضروریات کے مطابق تھے۔ اسی لئے اکثر و بیشتر حضرات نے زیادہ تر بیوگان، لاوارث اور قابل امداد عورتوں سے نکاح کئے اسلام نے جو اس بارے میں شرط عائد کی ہے اس کی سختی خود اللہ نے نقل اول میں یوں بیان فرمائی ہے کہ "تم لاکھ چاہو لیکن تم میں اتنی استطاعت تو ہرگز نہیں ہے کہ متعدد بیویوں کے درمیان عدل کر سکو (اور اگر عدل کر سکو) تو ایسا نہ کرنا کہ (ایک کی طرف) ہمہ تن اتنے مائل ہو جاؤ کہ دوسری کو لٹکی ہوئی چھوڑ دو اور اگر باہم میل کر لو اور (زیادتی سے) بچے رہو تو خدا یقیناً بخشنے والا مہربان ہے" النساء آیت ۱۲۹۔ تو اندریں حالات یہ کیسے ممکن سمجھ لیا جائے کہ یہ حکم محض مردوں کو کھلی چھٹی دینے کے مترادف ہے کہ وہ اپنی عیش پسندی کی راہ ہموار کر سکیں۔ یہ بھی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ حکم میں سب عورتوں کو محض ان کی بنیادی ضروریات روٹی کپڑا وغیرہ دینا یا باری باری شب بسری کرنا ہی عدل نہیں ہے بلکہ طبیعت کا ہر عورت کی جانب برابر رہنا مقصود ہے مگر چونکہ ایسا کرنا عام انسان کی طاقت میں نہیں ہے اسی وجہ سے اس سلسلے میں سہو و لغزش کو اللہ نے درگزر فرمایا اور فرمایا کہ اللہ ایسی غلطی معاف کر دے گا مگر کوشش مخلصانہ ہونی چاہئے کہ عدل قائم ہو اور کم از کم ظاہری امور میں تو قطعی فرق کی گنجائش نہیں ہے اور اسلام اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ کسی ایک عورت پر تو نظر عنایت و کرم رہے اور دوسری

جاتا تو یہ اس کے ساتھ سنگین زیادتی ہوتی۔ یا تو وہ صحت سے ہاتھ دھو بیٹھتی، درلقمۂ اجل بن جاتی یا پھر چلتی پھرتی لاش نظر آتی۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسی مصیبت کو وہ مجبوراً برداشت کرلیتی لیکن حقیقی لذائذ سے محروم ہو جاتی، بس بازاری عورتوں کی طرح ایک مشین بن کر زندگی کے دن پورے کرتی، مگر ایک پاک باز معاشرہ ایسی خرافات کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

۱۰۔ عورت جسے کمزور پیدا کیا گیا ہے اس کی ذمہ داریاں بھی ہلکی تجویز ہوئی ہیں۔ اگر اس کی قوت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈال دیا جاتا تو یہ عدل و انصاف کے منافی ہوتا جب کہ ایک عورت کے لئے ایک گھر کا انتظام سنبھالنا ہی بہت گراں ہوتا ہے تو اگر اسے دو گھروں کا نظام سپرد کر دیا جاتا تو اسے قطعاً بخوبی سرانجام نہ دے پاتی۔

۱۱۔ دو حاکموں کی حکومت ہمیشہ خرابی پیدا کرتی ہے اور ڈسپلن قائم نہیں رہ سکتا لہٰذا اگر عورت پر دو حاکم متعین کر دیئے جاتے تو اس کا احساس ہی اسے احساس کمتری کا شکار بنا دیتا اور خود اعتمادی کھو بیٹھتی، لہٰذا نظام ہستی میں خلل پیدا ہوتا۔

۱۲۔ ایسی صورت میں عورت کی مثال بالکل دھوبی کے کتے ایسی ہوتی کہ نہ گھر کی نہ گھاٹ کی۔ ایک گھر والا اسے کسی انداز کا ملتا اور دوسرا کسی اور مزاج کا۔ اس طرح عورت کی عقل خراب ہو جاتی اور اس کی اپنی صلاحیتیں ختم ہو جائیں۔ نزاع و فساد بڑھ جاتا۔ ذمہ داری کا احساس ختم ہو جاتا۔ معاشرہ تاریک کنویں سے بھی زیادہ بدترین ہوتا۔

پس مندرجہ بالا وجوہات اور کئی دوسرے اسباب کی بنا پر یہ ماننا پڑتا ہے، کہ ایک عورت کو ایک وقت میں ایک ہی نکاح کی ضرورت ہے اور اس سے تجاوز قطعاً حرام ہے جو حدود عدل کو پامال کرتا ہے جس سے متعدد نقصانات کا خدشہ ہے اور معاشرے کی ہم آہنگی کی تباہی کا اندیشہ۔

طلاق اسلام جبر و اکراہ کی تعلیم نہیں دیتا اس نے تقاضائے فطرت کے عین مطابق ایسے اصول متعین کر دیئے ہیں جن میں ہر فرد معاشرہ کو اس کے بنیادی حقوق میسر آ سکیں۔ اسی طرح جب اللہ نے مرد و عورت کو مساوی حقوق بخشے تو نہ ہی مرد پر

کوئی جبر کیا گیا اور نہ ہی عورت پر کوئی اکراہ چنانچہ اگر دونوں فریق کسی جائز و قانونی وجہ
کی اساس پر آپس میں علیحدگی پر آمادہ ہیں تو اسلام اس میں رکاوٹ نہیں بنے گا لیکن "ظلم"
کو (جو "عدل" کی ضد ہے) ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا، اور تعلیمات اسلامی کی روح
رواں بھی شرط ہے۔ اسلام انتشار و تفرقہ مٹانے کی خاطر آیا ہے لہذا بنیادی طور پر
اس کے اصول اللہ نے ایسے بنائے ہیں جن سے نزاع و فساد کی ہر صورت کو روکا جا
سکے۔ لہٰذا اسلام انصاف کا مطالبہ کرتے ہوئے حق کا ساتھ دیتا ہے چنانچہ ان ہی
خطوط پر طلاق کے احکامات جاری کئے گئے ہیں۔

آج کل اکثر لوگوں نے "ثقلین" سے تمسک کرنے کی بجائے خود سری
اختیار کر رکھی ہے۔ اسی لئے ایسے ایسے کمزور نظریات جنم لے رہے ہیں۔ جو
لوگوں کو مذہب سے بد دل کرتے جا رہے ہیں۔ اور کچھ لوگ اعلانیہ مذہب
کے خلاف ہو کر مختلف ازموں کے پرستار بن گئے ہیں اور اگر کچھ لوگ مذہب
سے وابستہ بھی ہیں تو ان میں سے بھی کئی تو محض آبائی روایات کے تحت ایسا
کر رہے ہیں اور دل سے اس بات پر مطمئن نہیں کہ دین اسلام میں مسائل حاضرہ
کا حل موجود ہے اسی لئے انہوں نے دنیا کو "دین" سے الگ شے مان لیا ہے۔
کئی دوست ایسے ہیں جنہوں نے مجموعہ قوانین کو تسلیم کیا ہے لیکن ان کی تشریحات
و توضیحات اپنی محدود سمجھ کے مطابق از خود متعین کرنے کے قائل ہیں۔ لیکن یہ سب
صورتیں یکسر ناقابل عمل ہیں حقیقت یہ ہے کہ نہ تو کوئی نیا ازم سفینۂ حیات کو موجودہ
بھنور سے نکال سکتا ہے اور نہ ہی دین کی تقسیم و بٹوارہ اس نزاع کا حل پیش
کر سکتا ہے۔ اسی طرح اپنی بنائی ہوئی تعبیریں بھی عالمگیر ثابت نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ مفسر
کے لئے ضروری ہے کہ اس کی علمی حیثیت علم کتاب کے بارے میں جامع و مکمل ہو۔
بلکہ اس سے زیادہ ہو اور ایسا دعویٰ سوائے "منبر ثقلین" کے کسی جگہ سے نہیں سنا
گیا۔ کہ ثقل اول نے کیا وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا
(الفرقان ۳۳) یعنی "یہ کیسی ہی مثل بیان کریں مگر ہم تمہارے

پاس اس کی بالحق اور احسن تفسیر بھیجیں گے۔" نیز ثقل دوم ؑ کے قائد نے اعلان کیا کہ" مجھ سے جو چاہو پوچھو میں جانتا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر ایسی کردوں کہ ۷۰ اونٹوں کا بوجھ ہو جائے" یہ بھی فرمایا کہ میرے واسطے مسند بچھائی جائے اور میں اس پر بیٹھوں تو اہل توریت کے فیصلے توریت سے دوں اور اہل انجیل کے فیصلے انجیل سے کردوں، اہل زبور کے معاملے زبور سے سلجھاؤں اور اہل قرآن کے مسائل قرآن سے حل کردوں۔ اللہ کی قسم کوئی ایسی آیت نہیں جو جنگل میں یا بحر میں، میدان میں یا پہاڑ و چٹان پر، زمین میں یا آسمان پر رات میں یا دن میں اُتری ہو اور میں نہ جانتا ہوں کہ کہاں نازل ہوئی اور اس کی شان نزول کیا ہے؟" پس یہ صورت زوال اُمت اس لئے درپیش ہے کہ باوجود روشن ہدایت کے اُمت نے علیم وہبی کی ضرورت کو نظر انداز کر دیا۔ اس بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہے کہ معقول قوانین قابل جرح و بحث متصور ہو رہے ہیں۔ اور ہٹ دھرمی اس قدر ہے کہ اصل منبع روشنی کی جانب پھر بھی توجہ نہیں دی جاتی۔ بلکہ اپنے قیاس کے مطابق کبھی تو قانون کو یہ کہکر جان بچائی جاتی ہے کہ یہ فی زمانہ منسوخ ہے کیونکہ یہ پرانے وقت کے تقاضوں کے تحت بنایا گیا تھا اور کبھی اس کا استعمال اپنی ذاتی ضرورت و خواہشات کے لئے عمل میں آتا ہے۔

ان خرافات کا ایک پیدا شدہ نتیجہ یہ ہے کہ آج نکاح کی اہمیت کچے دھاگے کی لڑی جتنی بھی نہیں رہی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ محض تین مرتبہ طلاق، طلاق، طلاق، کہنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی سہل ہے کہ کسی فرقہ کے افراد کا جلوس دیکھ کر یا ان کے کسی ذاکر کا بیان و ذکر سن کر بیوی شوہر کے لئے حرام قرار پا جاتی ہے۔ ان صورتوں میں بھلا عوام الناس مذہب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہ کریں گے، کہ جہاں اس قدر عظیم معاہدۂ حیات کو بھی کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ لیکن قارئین گرامی قدر! حقیقت یہ ہے کہ ایسے غلط نظریات کا نہ تو دین سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی کوئی ایسی تعلیم مذہب نے دی

ہے۔ یہ سب قیاس کی پیداوار ہے۔ نکاح جیسے اہم عہد کو اسلام نے مکمل حفاظت میں لے لیا ہے۔ اور حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ اس کا نفاذ قائم رہے۔ لیکن اگر صورت حال ایسی نازک شکل اختیار کر جائے کہ عہد دونوں فریقوں کے لئے وبال جان بن جائے (جس کا امکان اسلامی معاشرہ میں بہت ہی کم ہوتا ہے) تو دونوں کی پریشانی کا حل پیش کرنا اسلام نے ضروری سمجھا اور اسی "حل" کو "طلاق" کہتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم نقل اوّل سے وہ عبارت ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس میں طلاق کا بیان آیا ہے سورہ بقرہ ۲۲۹ تا ۲۳۲۔

"طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے۔ اس کے بعد شریعت کے مطابق روک ہی لینا چاہئے۔ یا حسن سلوک سے (تیسری مرتبہ) بالکل رخصت۔ اور تم کو یہ جائز نہیں کہ جو کچھ (عورتوں کو) دے چکے ہو۔ ان میں سے پھر کچھ واپس لو۔ مگر جب دونوں کو اس کا خوف ہو کہ جو حدیں مقرر کر دی ہیں۔ ان کو دونوں میاں بیوی قائم نہ رکھ سکیں گے۔ پھر اگر تمہیں (اے مسلمانو) یہ خوف ہو کہ دونوں خدا کی (مقرر کردہ) حدود پر قائم نہ رہیں گے اور (عورت مرد کو کچھ دے کر پیچھا چھڑا ئے تو اس میں ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔ یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ پس ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو خدا کی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھتے ہیں وہی لوگ ظالم ہیں۔ پھر اگر تیسری بار عورت کو طلاق (بائن) دے تو اس کے بعد جب تک دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے اس کے لئے حلال نہیں۔ ہاں اگر دوسرا (شوہر (نکاح کے بعد) اس کو طلاق دے دے تب البتہ ان میاں بیوی پر باہم میل کر لینے میں کچھ گناہ نہیں ہے اگر ان دونوں کو یہ گمان ہو کہ خدا کی حدوں کو قائم رکھیں گے۔ اور یہ خدا کی حدیں ہیں۔ جو علم والی قوم کے لئے صاف صاف بیان کرتا ہے۔ اور جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو۔ اور ان کی مدت پوری ہونے کو آئے تو اچھے عنوان سے ان کو روک لو۔ یا پھر حسن سلوک سے بالکل ہی رخصت کر دو۔ اور انہیں تکلیف پہنچانے کے لئے مت روکو۔ تاکہ (پھر ان پر) زیادتی کرنے لگو جو ایسا کرے گا یقیناً اپنے ہی پر ظلم کرے گا۔ اور خدا کے احکام کو ہنسی مذاق نہ سمجھو۔ اور

جو تمہیں نعمتیں دی ہیں انہیں یاد کرو۔ اور اس نے جو کتاب اور حکمت کی باتیں تم پر نازل کی ہیں ان سے تمہاری نصیحت کرتا ہے۔ اور خدا سے ڈرتے رہو۔ اور سمجھ رکھو کہ خدا ہر شئے کا علیم ہے۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت (عدت) پوری کرلیں تو انہیں شوہروں سے نکاح کرنے سے مت روکو۔ کہ جب آپس میں دونوں میاں بیوی شریعت کے مطابق اچھی طرح مل جل جائیں۔ یہ اسی شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے خدا اور روز آخرت پر ایمان لاچکا ہے۔ یہی تمہارے حق میں پاکیزہ و صاف ہے۔ اور خدا کو خوب علم ہے اور تم نہیں جانتے۔ اور (بعد از طلاق) جو شخص اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلوانا چاہئے تو اس کی خاطر سے مائیں اپنی اولاد کو پورے دو برس دودھ پلائیں اور جس کا وہ لڑکا ہے۔ (باپ) اس پر ماؤں کا کھانا کپڑا دستور لازم ہے۔ کسی شخص کو زحمت نہیں دی جاتی مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔ نہ ماں کا اس بچے کی وجہ سے نقصان گوارہ کیا جائے اور نہ جس کا لڑکا ہے (باپ) اس کا (دستور کے مطابق دیا جائے۔ (اگر باپ نہ ہو تو دودھ پلانے کا حق) اسی طرح وارث پر لازم ہے۔ پھر اگر (دو برس سے پہلے) ماں باپ دونوں اپنی مرضی سے دودھ بڑھائی کرنا چاہیں۔ تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم اپنی اولاد کو (کسی انا سے) دودھ پلوانا چاہو تو (اس میں بھی) تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ جو تم نے دستور کے مطابق مقرر کیا ہے ان کے حوالے کردو۔ اور خدا سے ڈرتے رہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا ضرور دیکھتا ہے"

منقولہ آیات سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اسلام نے اگرچہ طلاق کو جائز کردیا ہے لیکن اس کو روکنے کی تاکید بھی ہے تاہم اگر ایسا کرنا یعنی طلاق دینا ضروری ہو تو پھر حدود خدا کی پابندی لازم ہوگی۔ احادیث میں طلاق کو قبیح مباحات کہا گیا ہے۔ اگر واقعی اسے جائز قرار نہ دیا جاتا، تو بڑے بڑے فساد پیدا ہوتے اسی وجہ سے دوسری قوموں میں جن کے مذہب میں طلاق نہیں ہے جیسے عیسائی وغیرہ اب اسلام کے اس اصول کی جانب مجبوراً رجوع کرتے ہیں۔ مگر اسلام نے اس کے ساتھ

کے حالات پرسکون رہیں اور نظام ربانی کا دور دورہ ہو تو ایک ہی نکاح کافی ہے۔
نقل دوم کی سیرت ملاحظہ فرمائیں کہ خود رسول کریمؐ نے جناب ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ کی حیات کے دوران کوئی دوسرا نکاح نہ فرمایا۔ اسی طرح قائد نقل دوم سرکار امیرالمومنین نے جناب سیدہ طاہرہؑ کی زندگی میں کوئی دوسری شادی نہ کی اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کو اس وقت ایسی کوئی ضرورت نہ تھی۔

جب زمانہ آگے بڑھا۔ لوگوں نے فتوحات کیں۔ مہمات میں حصہ لیا۔ اور مرد جنگوں میں کام آئے تو ان کے پس ماندگان کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں نے اس قانون پر عمل کیا۔ صالحین کے حالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہ نکاح کسی جنسی تسکین کے لئے نہ تھے بلکہ بالکل قرآنی ضروریات کے مطابق تھے۔ اسی لئے اکثر و بیشتر حضرات نے زیادہ تر بیگان، لاوارث اور قابل امداد عورتوں سے نکاح کئے
اسلام نے جو اس بارے میں شرط عائد کی ہے اس کی سختی خود اللہ نے نقل اول میں یوں بیان فرمائی ہے کہ "تم لاکھ چاہو لیکن تم میں اتنی استطاعت تو ہرگز نہیں ہے کہ متعدد بیویوں کے درمیان عدل کر سکو (اور اگر عدل کر سکو) تو ایسا نہ کرنا کہ (ایک کی طرف) ہمہ تن اتنے مائل ہو جاؤ کہ دوسری کو شکی ہوئی چھوڑ دو اور اگر باہم میل کر لو اور (زیادتی سے) بچے رہو تو خدا یقیناً بخشنے والا مہربان ہے" النساء آیت ۱۲۹۔ تو اندریں حالات یہ کیسے ممکن سمجھ لیا جائے کہ یہ حکم محض مردوں کو کھلی چھٹی دینے کے مترادف ہے کہ وہ اپنی عیش پسندی کی راہ ہموار کر سکیں۔ یہ بھی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ حکم میں سب عورتوں کو محض ان کی بنیادی ضروریات روٹی کپڑا وغیرہ دینا یا باری باری شب بسری کرنا ہی عدل نہیں ہے بلکہ طبیعت کا ہر عورت کی جانب برابر رہنا مقصود ہے مگر چونکہ ایسا کرنا عام انسان کی طاقت میں نہیں ہے اسی وجہ سے اس سلسلے میں سہو اللغزش کو اللہ نے درگزر فرمایا اور فرمایا کہ اللہ ایسی غلطی معاف کر دے گا مگر کوشش مخلصانہ ہونی چاہئے کہ عدل قائم ہو اور کم از کم ظاہری امور میں تو قطعی فرق کی گنجائش نہیں ہے اور اسلام اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ کسی ایک عورت پر تو نظر عنایت و کرم رہے اور دوسری

بے چاری اس حسد میں جلتی رہے اور درمیان میں معلق رہے کہ جیسے وہ بیوی ہی نہیں ہے اور میکے سے سسرال آئی ہی نہیں ہے، اسی وجہ سے حضرت رسول اکرمؐ جب کبھی بیمار ہو جاتے تو بھی آپ ایک بیوی کے گھر نہ رہتے بلکہ باری کا لحاظ فرماتے اور نقل دوم کے قائد حضرت علیؑ کا تو یہ قاعدہ تھا کہ جس بی بی کی باری ہوتی تو آپؑ اس کی غیر کے گھر میں وضو تک نہ کرتے تھے اور حضرت معاذ بن جبلؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ کی دو بیویاں وبا میں فوت ہو گئیں تو انہوں نے قرعہ ڈالا کہ پہلے غسل کس کو دیا جائے۔ یہ تھی احتیاط اور حکم عدل کی پاس داری۔ اب اگر لوگ خود عملی طور پر اس حکم کی پرواہ نہ کریں اور بے راہ روی اختیار کر لیں تو اس میں قانون کا کیا قصور؟ پس تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر مرد کو چار نکاح کرنے کی اجازت دی ہے تو یہ فطری تقاضہ تھا اور یہ حکم مشروط بھی ہے کہ اگر ایسی ضرورت پیش آجائے تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔

بیک وقت عورت کے دو نکاح

اب اس مسئلے کا اشارہ سمجھئے کہ چلیے یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ حالات کے تقاضے کے تحت مرد کے لئے تو ایک وقت میں چار عورتوں کو نکاح میں رکھنا جائز ہے لیکن عورت کو ایک وقت میں دو مردوں کے ساتھ نکاح کرنا یا نکاح میں رہنا جائز نہیں۔ یہ فرق کیوں ہے؟ یہ سوال ایک مرتبہ کچھ عورتوں نے حضرت علیؑ سے کیا تھا۔ تو جناب امیرؑ نے پانی سے بھرا ہوا ایک ٹب منگوایا اور کچھ شیشیاں بھی طلب فرمائیں ایک ایک شیشی (خالی) ایک ایک عورت کو دی اور فرمایا کہ اپنی اپنی شیشی اس ٹب میں سے بھر لو۔ انہوں نے شیشیاں ٹب میں سے بھر لیں۔ تو حضرتؑ نے فرمایا کہ تمہاری شیشیوں میں جو پانی ہے اس کو پھر ٹب میں ڈال دو۔ انہوں نے اپنی اپنی شیشیوں کا پانی ٹب میں واپس انڈیل دیا۔ تب حضرت علیؑ نے ان سے فرمایا کہ جس جس کی شیشی میں جون سا پانی تھا وہی پہچان کر اپنی اپنی شیشیوں میں دوبارہ بھر دو تو وہ کہنے لگیں کہ جب سب پانی مل کر ایک ہو گیا ہے تو پہچانیں کیونکر؟ پس حضرت علیؑ نے فرمایا بس تمہارا جواب ہو گیا۔ یعنی ایک عورت کو بیک وقت کئی مردوں سے

تزویج کی اجازت ہو تو نسل کی پہچان نہیں ہو سکتی اور قانون وراثت بھی ختم ہو جائے
(دیکھئے قضایائے امیر المومنین ؑ)

اسی سلسلے میں یہ بھی عرض کریں گے کہ عورت کو فطرتاً کسی بھی حالت میں ایسی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کیونکہ ایک مرد بھی اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ ہر ماہ کچھ دن کے لئے ایک ہی مرد کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے عورت کو انکار کرنا پڑتا ہے اور بلا ضرورت کسی چیز کی خواہش کرنا کبھی بھی مستحسن قرار نہیں پا سکتا۔ اگر زبردستی ایسا کیا جائے تو بے شمار مسائل ایسے پیدا ہو جائیں گے جن کو سلجھانا محال ہو جائے گا۔ دوم یہ کہ عورت پر استطاعت سے زیادہ بوجھ ہو جائے گا۔ جسے برداشت نہ کر سکے گی لہٰذا ہم چند نقائص فرداً فرداً تحریر کرتے ہیں

۱۔ عورتوں کی پیدائش کا تناسب مردوں سے زیادہ ہے۔ اگر عورتوں کو دو شوہروں یا اس سے زائد کی اجازت دے دی جاتی تو اتنے مرد کہاں سے آتے لہٰذا ایسا کرنا عملاً ناممکن ہوتا اور کئی بلا مرد لاوارث قرار پاتیں۔ معاشرہ طرح طرح کی اخلاقی برائیوں کا شکار ہو جاتا۔

ب۔ اگر ایک عورت ایک ہی وقت میں دو شوہر رکھے تو شناخت نسل محال ہو جاتی ہے لہٰذا قانون میراث کو نقصان پہنچتا۔ معاشرے میں وہ ہم آہنگی نہ رہتی جو والد اور اولاد کی محبت کے باعث ہوتی ہے۔

ج۔ تخلیق عورت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ ملکۂ خانہ کے فرائض سرانجام دے اور بیرونی معاملات میں دخل اندازی سے گریز کرے لہٰذا دو یا دو سے زیادہ نکاحوں کی صورت میں اُسے دو گھروں کا نظم و نسق سنبھالنا دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا۔ اور یہ دونوں گھر معاشرے کے لئے بدترین مثال ہوتے جہاں کوئی امر بھی معتدل و موافق نہ مل پاتا، کیونکہ ایک گورنر ایک ہی ریاست یا صوبے کا انتظام بخوبی چلا سکتا ہے

د۔ ہم نے بیان کیا ہے کہ عورت میں مرد کے مقابل فطری خواہش کی قوت بہت کم ہے۔ اور ایک مرد سے بھی اکثر تنگ رہتی ہے۔ اگر اُسے دو مردوں کے سپرد کر دیا

جاتا تو یہ اس کے ساتھ سنگین زیادتی ہوتی۔ یا تو وہ صحت سے ہاتھ دھو بیٹھتی اور لقمۂ اجل بن جاتی یا پھر چلتی پھرتی لاش نظر آتی۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسی مصیبت کو وہ مجبوراً برداشت کرلیتی۔ لیکن حقیقی لذائذ سے محروم ہو جاتی۔ بس بازاری عورتوں کی طرح ایک مشین بن کر زندگی کے دن پورے کرتی۔ مگر ایک پاک باز معاشرہ ایسی خرافات کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

۲۔ عورت بشے کمزور پیدا کیا گیا ہے اس کی ذمہ داریاں بھی ہلکی تجویز ہوئی ہیں۔ اگر اس کی قوت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈال دیا جاتا تو یہ عدل و انصاف کے منافی ہوتا جب کہ ایک عورت کے لئے ایک گھر کا انتظام سنبھالنا ہی بہت گراں ہوتا ہے تو اگر اُسے دو گھروں کا نظام سپرد کر دیا جاتا تو اُسے قطعاً بخوبی سرانجام نہ دے پاتی۔

۳۔ دو حاکموں کی حکومت ہمیشہ خرابی پیدا کرتی ہے اور ڈسپلن قائم نہیں رہ سکتا لہٰذا اگر عورت پر دو حاکم متعین کر دیئے جاتے تو اس کا احساس ہی اُسے احساس کمتری کا شکار بنا دیتا اور خود اعتمادی کھو بیٹھتی۔ لہٰذا نظام ہستی میں خلل پیدا ہوتا۔

۴۔ ایسی صورت میں عورت کی مثال بالکل دھوبی کے کتے ایسی ہوتی کہ نہ گھر کی نہ گھاٹ کی۔ ایک گھر والا اُسے کسی انداز کا ملتا اور دوسرا کسی اور مزاج کا۔ اس طرح عورت کی عقل خراب ہو جاتی اور اس کی اپنی صلاحیتیں ختم ہو جائیں۔ نزاع دنیا بڑھ جاتا۔ ذمہ داری کا احساس ختم ہو جاتا۔ معاشرہ تاریک کنوئیں سے بھی زیادہ بدترین ہوتا۔

پس مندرجہ بالا وجوہات اور کئی دوسرے اسباب کی بنا پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ ایک عورت کو ایک وقت میں ایک ہی نکاح کی ضرورت ہے اور اس سے تجاوز قطعاً حرام ہے جو حدود عدل کو پامال کرتا ہے۔ جس سے متعدد نقصانات کا خدشہ ہے اور معاشرے کی ہم آہنگی کی تباہی کا اندیشہ۔

طلاق اسلام جبر و اکراہ کی تعلیم نہیں دیتا اس نے تقاضائے فطرت کے عین مطابق ایسے اصول متعین کر دیئے ہیں جن میں ہر فرد معاشرہ کو اس کے بنیادی حقوق میسر آ سکیں۔ اسی طرح جب اللہ نے مرد و عورت کو مساوی حقوق بخشے تو نہ ہی مرد پر

کوئی جبر کیا گیا اور نہ ہی عورت پر کوئی اکراہ چنانچہ اگر دونوں فریق کسی جائز و قانونی وجہ
کی اساس پر آپس میں علیحدگی پر آمادہ ہیں تو اسلام اس میں رکاوٹ نہیں بنے گا لیکن "ظلم"
کو (جو "عدل" کی ضد ہے) ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا، اور تعلیمات اسلامی کی رو سے
روان بھی شرط ہے۔ اسلام انتشار و تفرقہ مٹانے کی خاطر آیا ہے لہذا بنیادی طور پر
اس کے اصول اللہ نے ایسے بنائے ہیں جن سے نزاع و فساد کی ہر صورت کو رد کیا جا
سکے۔ لہذا اسلام انصاف کا مطالبہ کرتے ہوئے حق کا ساتھ دیتا ہے چنانچہ ان ہی
خطوط پر طلاق کے احکامات جاری کئے گئے ہیں۔

آج کل اکثر لوگوں نے "ثقلین" سے تمسک کرنے کی بجائے خودسری
اختیار کر رکھی ہے۔ اسی لئے ایسے ایسے کمزور نظریات جنم لے رہے ہیں۔ جو
لوگوں کو مذہب سے بد دل کرتے جا رہے ہیں۔ اور کچھ لوگ اعلانیہ مذہب
کے خلاف ہو کر مختلف ازموں کے پرستار بن گئے ہیں اور اگر کچھ لوگ مذہب
سے وابستہ بھی ہیں تو ان میں سے بھی کئی تو محض آبائی روایات کے تحت ایسا
کر رہے ہیں اور دل سے اس بات پر مطمئن نہیں کہ دین اسلام میں مسائل حاضرہ
کا حل موجود ہے اسی لئے انہوں نے "دنیا کو" دین" سے الگ شے مان لیا ہے۔
کئی دوست ایسے ہیں جنہوں نے مجموعہ قوانین کو تسلیم کیا ہے لیکن ان کی تشریحات
و توضیحات اپنی محدود سمجھ کے مطابق از خود متعین کرنے کے قائل ہیں۔ لیکن یہ سب
صورتیں یکسر ناقابل عمل ہیں حقیقت یہ ہے کہ نہ تو کوئی نیا ازم سفینۂ حیات کو موجودہ
بھنور سے نکال سکتا ہے اور نہ ہی دین کی تقسیم و بٹوارہ اس نزاع کا حل پیش
کر سکتا ہے۔ اسی طرح اپنی بنائی ہوئی تعابیر بھی عالمگیر ثابت نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ مفسر
کے لئے ضروری ہے کہ اس کی علمی حیثیت علم کتاب کے بارے میں جامع و مکمل ہو۔
بلکہ اس سے زیادہ ہو۔ اور ایسا دعویٰ سوائے "مفسر ثقلین" کے کسی جگہ سے نہیں سنا
گیا۔ کہ ثقل اول نے کہا وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا
(الفرقان ۳۳) یعنی "یہ کیسی ہی مثل بیان کریں مگر ہم تمہارے

پاس اس کی بالحق اور احسن تفسیر بھیجیں گے۔" نیز ثقل دوم کے قائد نے اعلان کیا کہ"
مجھ سے جو چاہو پوچھو میں جانتا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر
ایسی کروں کہ ۷۰ اونٹوں کا بوجھ ہو جائے" یہ بھی فرمایا کہ میرے واسطے مسند بچھائی
جائے اور میں اس پر بیٹھوں تو اہل توریت کے فیصلے توریت سے دوں اور اہل انجیل کے فیصلے انجیل
سے کروں۔ اہل زبور کے معاملے زبور سے سلجھاؤں اور اہل قرآن کے مسائل قرآن سے حل
کروں۔ اللہ کی قسم کوئی ایسی آیت نہیں جو جنگل میں یا بحر میں، میدان میں یا پہاڑ و
چٹان پر، زمین میں یا آسمان پر رات میں یا دن میں اتری ہو اور میں نہ جانتا ہوں کہ
کہاں نازل ہوئی اور اس کی شان نزول کیا ہے؟" پس یہ صورت زوال اُمت
اس لئے درپیش ہے کہ باوجود روشن ہدایت کے اُمت نے علم وہبی کی ضرورت
کو نظرانداز کر دیا۔ اس بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہے کہ معقول قوانین قابل جرح و بحث
متصور ہو رہے ہیں۔ اور ہٹ دھرمی اس قدر ہے کہ اصل منبع روشنی کی جانب پھر بھی
توجہ نہیں دی جاتی۔ بلکہ اپنے قیاس کے مطابق کبھی تو قانون کو یہ کہہ کر جان بچائی جاتی
ہے کہ یہ فی زمانہ منسوخ ہے کیونکہ یہ پرانے وقت کے تقاضوں کے تحت بنایا گیا
تھا اور کبھی اس کا استعمال اپنی ذاتی ضرورت و خواہشات کے لئے عمل میں
آتا ہے۔

ان خرافات کا ایک پیدا شدہ نتیجہ یہ ہے کہ آج نکاح کی اہمیت کچے
دھاگے کی لڑی جتنی بھی نہیں رہی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ محض تین
مرتبہ طلاق، طلاق، طلاق، کہنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی سہل
ہے کہ کسی فرقہ کے افراد کا جلوس دیکھ کر یا ان کے کسی ذاکر کا بیان و ذکر سن کر بیوی
شوہر کے لئے حرام قرار پا جاتی ہے۔ ان صورتوں میں بھلا عوام الناس مذہب سے
چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہ کریں گے؟ کہ جہاں اس قدر عظیم معاہدۂ حیات
کو بھی کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ لیکن قارئین گرامی قدر! حقیقت یہ ہے کہ ایسے
غلط نظریات کا نہ تو دین سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی کوئی ایسی تعلیم مذہب نے دی

ہے۔ یہ سب قیاس کی پیداوار ہے۔ نکاح جیسے اہم عہد کو اسلام نے مکمل حفاظت میں لے لیا ہے۔ اور حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ اس کا نفاذ قائم رہے۔ لیکن اگر صورت حال ایسی نازک شکل اختیار کر جائے کہ عہد دونوں فریقوں کے لئے وبال جان بن جائے (جس کا امکان اسلامی معاشرہ میں بہت ہی کم ہوتا ہے) تو دونوں کی پریشانی کا حل پیش کرنا اسلام نے ضروری سمجھا اور اسی "حل" کو "طلاق" کہتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم نقل اوّل سے وہ عبارت ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس میں طلاق کا بیان ہے

سورہ بقرہ ۲۲۹ تا ۲۳۳

" طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے۔ اس کے بعد شریعت کے مطابق روک ہی لینا چاہیئے۔ یا حسن سلوک سے (تیسری مرتبہ) بالکل رخصت۔ اور تم کو یہ جائز نہیں کہ جو کچھ (عورتوں کو) دے چکے ہو۔ ان میں سے پھر کچھ واپس لو۔ مگر جب دونوں کو اس کا خوف ہو کہ جو حدیں مقرر کر دی ہیں۔ ان کو دونوں میاں بیوی قائم نہ رکھ سکیں گے۔ پھر اگر تمہیں (اے مسلمانو) یہ خوف ہو کہ دونوں خدا کی (مقرر کردہ) حدود پر قائم نہ رہیں گے اور عورت مرد کو کچھ دے کر چھٹکارا اٹھائے تو اس میں ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔ یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ پس ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو خدا کی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھتے ہیں وہی لوگ ظالم ہیں۔ پھر اگر تیسری بار عورت کو طلاق (بائن) دے تو اس کے بعد جب تک دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے اس کے لئے حلال نہیں۔ ہاں اگر دوسرا شوہر (نکاح کے بعد) اس کو طلاق دے دے تب البتہ ان میاں بیوی پر باہم میل کر لینے میں کچھ گناہ نہیں ہے اگر ان دونوں کو یہ گمان ہو کہ خدا کی حدوں کو قائم رکھیں گے۔ اور یہ خدا کی حدیں ہیں۔ جو علم والی قوم کے لئے صاف صاف بیان کرتا ہے۔ اور جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو۔ اور ان کی عدت پوری ہونے کو آئے تو اچھے عنوان سے ان کو روک لو۔ یا پھر حسن سلوک سے بالکل ہی رخصت کر دو۔ اور انہیں تکلیف پہنچانے کے لئے مت روکو۔ تاکہ (پھر ان پر) زیادتی کرنے لگو جو ایسا کرے گا یقیناً اپنے ہی پر ظلم کرے گا۔ اور خدا کے احکام کو ہنسی مذاق نہ سمجھو۔ اور

جو تمہیں نعمتیں دی ہیں انہیں یاد کرو۔ اور اس نے جو کتاب اور حکمت کی باتیں تم پر نازل کی ہیں ان سے تمہاری نصیحت کرتا ہے۔ اور خدا سے ڈرتے رہو۔ اور سمجھ رکھو کہ خدا ہر شے کا علیم ہے۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت (عدت) پوری کرلیں تو انہیں شوہروں سے نکاح کرنے سے مت روکو۔ کہ جب آپس میں دونوں میاں بیوی شریعت کے مطابق اچھی طرح مل جل جائیں۔ یہ اسی شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے خدا اور روز آخرت پر ایمان لا چکا ہے۔ یہی تمہارے حق میں پاکیزہ وصاف ہے۔ اور خدا کو خوب علم ہے اور تم نہیں جانتے۔ اور (بعد از طلاق) جو شخص اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلوانا چاہئے تو اس کی خاطر سے مائیں اپنی اولاد کو پورے دو برس دودھ پلائیں اور جس کا وہ لڑکا ہے۔ (باپ) اس پر ماؤں کا کھانا کپڑا دستور لازم ہے۔ کسی شخص کو زحمت نہیں دی جاتی مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔ نہ ماں کا اس بچے کی وجہ سے نقصان گوارہ کیا جائے اور نہ جس کا لڑکا ہے (باپ) اس کا دستور کے مطابق دیا جائے۔ (اگر باپ نہ ہو تو دودھ پلانے کا حق) اسی طرح وارث پر لازم ہے۔ پھر اگر (دو برس سے پہلے) ماں باپ دونوں اپنی مرضی سے دودھ بڑھائی کرنا چاہیں۔ تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم اپنی اولاد کو (کسی انا سے) دودھ پلوانا چاہو تو (اس میں بھی) تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ جو تم نے دستور کے مطابق مقرر کیا ہے ان کے حوالے کردو۔ اور خدا سے ڈرتے رہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا ضرور دیکھتا ہے"

منقولہ آیات سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اسلام نے اگرچہ طلاق کو جائز کردیا ہے لیکن اس کو روکنے کی تاکید بھی ہے تاہم اگر ایسا کرنا یعنی طلاق دینا ضروری ہو تو پھر حدود خدا کی پابندی لازم ہوگی۔ احادیث میں طلاق کو قبیح مباحات کہا گیا ہے۔ اگر واقعی اسے جائز قرار نہ دیا جاتا۔ تو بڑے بڑے فساد پیدا ہوتے اسی وجہ سے دوسری قوموں میں جن کے مذہب میں طلاق نہیں ہے جیسے عیسائی وغیرہ اب اسلام کے اس اصول کی جانب مجبوراً رجوع کرتے ہیں۔ مگر اسلام نے اس کے ساتھ

اس قدر کڑی شرائط چسپاں کر دی ہیں کہ حتی الامکان اس کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ مثلاً یہ کہ مرد بالغ و عاقل ہو، اپنے ارادہ و اختیار سے طلاق دے اور کسی دباؤ کے تحت ایسا نہ کرے اور سنگین پابندی یہ کہ دو عادل گواہوں کے سامنے ایسا کرے اور مذہب جعفری کی رُو سے صیغۂ طلاق صرف عربی زبان میں جاری کیا جائے کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو طلاق نہ ہوگی، زوجہ حیض و نفاس سے پاک ہو۔ اور اگر ان منازل کے بعد بھی کوئی صورت حال پیدا نہ ہو تو سوچ بچار کے لئے لمبی مدت دی اور حاملہ کی مدت عدت وضع حمل قرار پائی۔ چنانچہ سورہ طلاق میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اے رسولؐ (مسلمانوں سے کہہ دیجئے) جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو۔ تو ان کی عدت (پاکی) کے وقت دو۔ اور عدہ کا شمار رکھو۔ اور خدا سے ڈرو۔ اور (ان کے گھر سے انہیں مت نکالو۔ اور وہ خود بھی گھر سے نہ نکلیں۔ الایہ کہ جب کوئی صریحی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں اور یہ خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں۔ اور جو اللہ کی ان حدوں سے تجاوز کر گیا۔ اس نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا۔ تو کیا تو نہیں جانتا شاید خدا بعد میں کوئی بات پیدا کردے (جس سے مرد پچھتائے اور میل ہو جائے) تو جب اپنا عدہ پورا کرنے کے قریب پہنچیں تو یا ان کو عنوان شائستہ سے روک لو۔ یا اچھی طرح سے رخصت کردو اور بوقت طلاق اپنے لوگوں میں سے دو عادلوں کو گواہ قرار دو۔ اور رہے (گواہ) تم خدا کے واسطے ٹھیک ٹھاک گواہی دینا۔ ان باتوں سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو خدا و آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ اور جو خدا سے ڈرے گا۔ تو خدا اس کیلئے نجات کی صورت پیدا کردے گا۔

قابل غور بات

حلالہ کے لئے اکثر طلاق دینے والا شخص اپنے کسی معتمد دوست سے جاکر کہتا ہے کہ ایک دن کے لئے تم میری مطلقہ سے نکاح کرلو۔ دوسرے دن طلاق دے دینا۔ اور عورت کو بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ایک دن کے لئے نکاح ہوگا۔ پس جب ان دونوں کا نکاح ہوتا ہے تو نیت اور ذہن میں مدت کا تعین ہوتا ہے۔ پھر ایسے نکاح حلالہ میں اور متعہ میں کیا

فرق رہا۔ جب تعین مدت پر رضامندی ہو گئی اور حلالہ میں یہ خطرہ موجود ہے۔ بلکہ ایسا اکثر ہو بھی جاتا ہے کہ وہی معتمد شخص طلاق دینے سے انکار کر دیتا ہے اور طلاق دینے والا پہلا شخص اور وہ عورت دونوں مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ متعہ میں مدت کا تعین واضح طور پر ہوتا ہے۔ اس لئے مدت ختم ہوتے ہی وہ دونوں خود ہی الگ ہو جاتے ہیں۔ طلاق کی احتیاج ہی نہیں ہوتی۔ پس حلالہ سے متعہ بہتر ہے۔

آمدم برسر مطلب۔ اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ قرآن کے مطابق "طلاق" دینے کے لئے کیا کیا کرنا پڑے گا۔ کہ اوّلاً حدود خدا کو ملحوظ رکھتے ہوئے "صریحی بے حیائی" کا جواز پیدا کرنا ہوگا۔ پھر دو عادلوں کا بندوبست ہوگا۔ جن کو خود خدا نے اپنا واسطہ دے کر تاکید کی ہے کہ وہ گواہی سچی دیں۔ پھر اوّل رجعی طلاق ہوگی۔ اس دوران گواہان (عادل) پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ مفاہمت و مصالحت کرانے کی کوشش کریں۔ اگر مفاہمت و مصالحت ہو جائے تو پہلا ہی نکاح برقرار ہے کا نئے سرے سے نکاح پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن عدت گزر جائے اس کے بعد مفاہمت ہو تو نیا نکاح پڑھنا واجب ہوگا پھر اس کے بعد اگر ناکح اپنی منکوحہ کو دوسری دفعہ طلاق دے اور دوران عدت مصالحت نہ ہو سکے اور بعد میں ہو تو تیسری دفعہ نیا نکاح پڑھنا واجب ہوگا پھر اگر وہ شخص تیسری دفعہ طلاق دے اور دوران عدت رجوع نہ ہو سکے تو عدت گزر جانے کے بعد اس ناکح کا پھر سے نکاح اس مطلقہ بائنہ سے اس وقت تک نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ عورت کسی دوسرے سے نکاح کے بعد اس دوسرے کی زوجیت سے طلاق یا موت کے ذریعے خارج نہ ہو جائے یعنی طلاق بائن ان تین طلاقوں میں سے تیسری ہوتی ہے۔ جس میں تین الگ الگ موقعے ہوں اور تو طہر گزرے ہوں یا تین عدتیں گزری ہوں۔ ایک ہی وقت میں تین مرتبہ شرائط مطلقہ سے ساتھ طلاق دینے سے ایک ہی ہو سکتی ہے تین نہیں۔ ایک ہی مجلس میں تین دفعہ "طلاق" کہنے کو تین طلاقیں شمار کرنا درست نہیں۔ پاکستان میں جو پچھلے دنوں شادی کمیشن بیٹھا تھا۔ علماء نے اس کی رپورٹ (شادی کمیشن رپورٹ)

میں ایسی طلاق کو "طلاق بدعت" تسلیم کیا تھا۔

جناب رسالت مآبؐ کو طلاق ناپسند تھی، اسی لئے آپؐ نے اپنی کسی بیوی کو عملاً طلاق نہ دی اور اسی طرح باوجود تلخ حقائق کے ائمۂ اہلبیت نے بھی اس سے گریز ہی کیا۔

اب اگر کوئی ان آیات بینات کو معنی کے اپنے سانچے میں ڈھال کر "طلاق، طلاق، طلاق" کے صیغے سے نکاح کا ناقابل تنسیخ بندھن توڑتا ہے تو اس کی ذمہ داری اسی شخص پر ہے۔ وہ شخص خود ظلم کا ارتکاب کر رہا ہے، ورنہ شرع میں ایسی کوئی آزادی نہیں ہے۔ چنانچہ اب تک کی تحریر میں ہم نے بات کو یہاں تک پہنچایا کہ دیگر مذاہب و نظریات کے مقابلے میں جو مقام عورت کو اسلام نے بخشا ہے کسی اور نے نہیں، چنانچہ ہم نے اس بارے میں کئی اعتراضات کا جواب پیش کرتے ہوئے یہ امر بھی بیان کیا کہ عورت کا صحیح مقام اس کا گھر ہے۔ جہاں وہ حدود خدا کے اندر رہ کر سیاہ و سفید کی مالکہ ہے اس کی تخلیق کا مقصد اولیٰ یہی ہے۔ کہ وہ امور خانہ داری کی متولیہ ہو۔ اس دنیا میں بھی اس کو اسی بارے میں باز پرس ہے۔ اور آخرت میں بھی اسے اس کا حساب دینا ہے۔ اسی لئے اسلام نے اسے پردے میں ڈھانپ کر تحفظ یقینی عطا کر دیا ہے۔

پردہ اسلام شرم و حیا و حجاب کی ایسی تعلیم دیتا ہے کہ اس کی نظیر کوئی دوسرا مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ اسلام اتنا پاکیزہ و باحیا مذہب ہے کہ جس میں یہاں تک حکم دیا گیا ہے کہ جب تم اپنی کنواری لڑکیوں کو قرآن مجید کی تعلیم دو تو سورۂ یوسف اور سورۂ نساء کی تعلیم نہ دو۔ وہ دو سورتیں چھوڑ کر باقی سارا قرآن پڑھاؤ، پھر جب ان کی شادی ہو جائے تو وہ باقی ماندہ دونوں سورتیں پڑھ کر اپنی تعلیم قرآن کو پورا کریں۔ اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ سورہ یوسف میں زلیخا کا حضرت یوسفؑ کو پکڑنا اور سورۂ نساء میں مرد و عورت کے ازدواجی تعلقات پر بھی سوچے گی کنواری غیر عربی دان لڑکی با ترجمہ پڑھے گی تو سوچے گی کہ زلیخا نے کیوں پکڑا تھا،

اور سورۂ نساء کے ازدواجی تعلقات پر بھی سوچے گی تو اس کے خیالات پر اثر پڑے گا۔ اور عرب کی لڑکی تو اس زبان کو سمجھتی ہی ہے وہ سوچے گی۔ لہذا یہ حکم دیا گیا لیکن اگر ترجمہ، مفہوم نہیں سمجھتی تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ لہذا تعلیم و تربیتِ اولاد کے سلسلے میں لڑکیوں کے والدین کو اس حکم کا خیال رکھنا چاہیئے۔

آجکل جہاں دیگر قوانینِ اسلامیہ سے بے پرواہی برتی جارہی ہے اسی طرح نئی روشنی کے حامی افراد نے بے پردگی کو اپنا اصول و شعار بنالیا ہے اور یہ اختراع بھی کرلی ہے کہ پردے کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک طرزِ بود و باش ہے۔ اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کے زمانے میں عورتیں باہر پھرا کرتی تھیں۔ خرید و فروخت کیا کرتی تھیں۔ نامحرموں سے بات چیت بھی کرلیا کرتی تھیں۔ اب یہ کیا نیا راستہ ہے کہ عورتوں کو گھر میں بند کردیا جائے؟

اس خیالِ خام کی تردید اولاً تو نقلِ اوّل کے حکم سے ہوتی ہے کہ سورۃ النور کی آیت ۳۰ اور ۳۱ میں ارشاد ہوا۔

"اے رسولؐ! آپ ایمانداروں سے فرمادیں کہ اپنی نظروں کو نیچی رکھیں۔ اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہی ان کے واسطے زیادہ صفائی کی بات ہے یہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں خدا اس کا یقیناً خوب واقف ہے۔ اور (اے رسولؐ!) آپ ایماندار عورتوں سے فرمادیں کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ اور اپنے بناؤ سنگھار کے مقامات کو کسی پر بھی ظاہر نہ ہونے دیں۔ مگر جو خود بخود ظاہر ہوجاتا ہے (یعنی چھپ نہیں سکتا) اس کا کوئی گناہ نہیں۔ اور اپنی اوڑھنیوں کو (گھونگھٹ مار کر) اپنے گریبانوں (سینوں) پر ڈالے رہیں۔ اور اپنے شوہروں یا اپنے باپ دادوں یا اپنے بیٹوں اور بھائیوں یا اپنے بھتیجوں اور بھانجوں یا اپنے (قسم کی) عورتوں یا اپنی لونڈیوں یا گھر کے وہ نوکر چاکر جو مرد صورت ہیں مگر (بڑی عمر ہونے کی وجہ سے) عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے، یا وہ کمسن لڑکے جو عورتوں کے پردے کی بات سے آگاہ نہیں ہیں۔ ان کے سوا کسی پر بھی اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ ہونے دیا کریں اور چلتے چلتے اپنے پاؤں زمین پر اس طرح

نہ رکھیں کہ لوگوں کو ان کے پوشیدہ بناؤ و سنگار کی خبر ہو جائے۔ اور اے اہل ایمان! تم سب کے سب خدا کی بارگاہ میں توبہ کرو۔ تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

یہ اتنا واضح حکم ہے کہ مزید کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا اگر قرآن کریم کے حکم ہی کو مذہب نہ سمجھا جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم ثقلِ دوم سے حضرت مخدومۂ کونین سیدہ فاطمۃ الزہرا کی جانب رجوع کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا۔

"عورت کے لئے بہترین خصلت یہ ہے کہ وہ کسی مردِ غیر کو نہ دیکھے اور نہ ہی کسی مردِ غیر کی نگاہ اس پہ پڑے۔"

اب معلوم نہیں کہ لوگ کن عورتوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ "آنحضرتؐ کے دور میں پردہ نہیں کرتی تھیں"۔ حالانکہ آپ کی لختِ جگر نے اس کی پابندی کو اعلیٰ ترین خصلت قرار دیا ہے۔ لہٰذا مذہبی یا دینی پہلو سے تو پردے کا انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی دن کو رات کہنے کی ضد کرے۔

مذہب دشمن طبقے کے اعتراضات اور نام نہاد "فطری و عقلی دلائل" بڑے عجیب ہیں۔ چنانچہ پردے کی نفی کرتے ہوئے یہ لوگ کہتے ہیں کہ "عورتوں کو پردے میں بٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ نصف افراد نوعِ انسانی کو بے کار کر دیا جائے انکو باہر نکالو۔ تاکہ مردوں کے دوش بدوش رہ کر وہ بھی دولت کمائیں۔ اور گھر میں آسودہ حالی قائم ہو۔"

پس ہم ان مخالفینِ پردہ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ آپ کو نصف افرادِ نوعِ انسانی کی بیکاری کا احساس محض گھر کی آسودہ حالی قائم کرنے کی حرص و ہوس کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اور آپ نے اپنی گھر بلو خستہ حالی کو آسودہ حالی میں تبدیل کرنے کا طریقہ یہ وضع فرمایا کہ گھر کی ملکہ کو گھر کے امور سے بے دخل کر کے اس کو منظرِ عام پر لائیں اور اس کی کمائی حاصل کر کے آسودگی پائیں لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس طریقہ کار میں لینے کے دینے پڑ جائیں گے جب آپ محافظ گھر کو گھر سے باہر لائیں گے تو پھر آپ کے گھر کا بندوبست کون کرے گا؟ جس میں آپ آسودگی لانا چاہتے ہیں۔ یعنی صورت یہ پیدا ہوگی

کہ آسودگی کے لئے مال تو آپ عورت کی کمائی سے حاصل کریں گے لیکن پھر آپکو گھر کا انتظام قربان کرنا پڑے گا جبکہ بغیر نظم وضبط حصول آسودگی ناممکن ہے۔ یا دوسری صورت میں اس حرص بے جا کو رفع کرنا ہوگا۔ اور قناعت کرنی ہوگی۔ انسانی زندگی کے نصف سے زیادہ مسائل کا تعلق گھر سے ہے جیسے رنج وراحت، مسرت وغم، خوراک وپوشاک بچوں کی پرورش وغیرہ۔ آخر ان ساری چیزوں کا انحصار گھر ہی پر تو ہے اگر آپ ان تمام اہم مسائل سے چشم پوشی کر کے محض اپنے ذاتی اغراض کے لئے آسودگی کی وہ تدبیر کریں گے تو آپ کے گھر کا کوئی نظم ونسق نہ ہوگا۔ اور جب نظم ونسق ہی نہیں تو پھر آسودگی کس طرح ہو سکتی ہے۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ گھر کے نظم وضبط کے لئے عورت کا نگرانی کرنا از بس ضروری ہے یا پھر ہمیں اس کا کوئی متبادل حل بتا دیں۔ حالانکہ قدرت نے مرد اور عورت کو دو جدا جدا مخلوق بنا کر ان کا دائرۂ عمل الگ الگ معین فرما دیا ہے کہ عورت کو گھر کی ذمہ داری سونپ دی اور مرد کو باہر کی۔ اگر دونوں کے فرائض ایک ہوتے تو قدرت مرد اور عورت کی کم از کم طاقت ایک سی رکھتی۔ ایک کو دوسرے پر قوی نہ بناتی۔ ان دونوں صنفوں کا تخلیقی فرق اس کا ثبوت ہے کہ دونوں کی ڈیوٹی علیحدہ علیحدہ ہے۔

تو ایسی صورت میں بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس خرابی کی وجہ بھی یہی ہے کہ "ثقلین" کا دامن ہاتھ میں نہ رہا۔ مذہبی ٹھیکیداروں کی سختی نے عورت کے ذہن میں بغاوت پیدا کی، تنگدستی کی بناء پر مرد بھی اس پر راضی ہو گئے کہ عورت بے پردہ ہو جائے کچھ مشہور عورتوں نے احکام خدا ورسول کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جنگوں میں عملی حصہ لیا۔ اور پھر انگریزی تہذیب نے اس بغاوت کو تقویت پہنچائی۔ چونکہ احتیاط ملحوظ ہے اس لئے ہم زیادہ تشریح نہیں کرتے، لیکن عاقل را اشارہ کافی است۔ البتہ پردہ کے عقلی دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ مسلمہ اصول ہے کہ "ہر قابل حفاظت چیز کا تحفظ کیا جائے"۔ اور امکانی حد تک خطرے سے بچاؤ کی تدابیر اختیار کرنا عقلاً ضروری ہے"۔ عزت وناموس، دولت سے بھی زیادہ قابل حفاظت چیز ہے۔ عورت ناموس ہے [illegible] انی جذبہ اور مردانہ

خواہش نہیں وہ آتش ہیں۔ لہٰذا تحفظ لازم ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا۔

اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے   جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی

چونکہ موجودہ معاشرے میں اس نظریئے کے لوگ بھی موجود ہیں کہ جو خوبصورت چہرہ دیکھ کر دلدادہ نہ ہو تو وہ آدمی نہیں۔ بلکہ جانور سے بدتر ہے۔ ایسے ہوس پرست لوگ موجود رہے ہیں پس خطرہ ثابت ہے لہٰذا حفظِ ماتقدم لازم۔ اسلئے پردہ ضروری ہے۔

۲۔ تمام زیورات، دولت، ضروری دستاویزات مقفل کیے جاتے ہیں۔ گھروں کے دروازے بند کیے جاتے ہیں۔ چوکیداروں کو تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں۔ سیف یا لاکرز سے حفاظت کی جاتی ہے اور جب مادی دولت کی اس قدر حفاظت کا اہتمام ہے تو غیرت ناموس جیسی انمول متاع کو بلا تحفظ کیونکر چھوڑا جا سکتا ہے؟

۳۔ مشاہدہ گواہ ہے کہ عریانیت سے اخلاقی انتشار پیدا ہوتا ہے۔ بالعموم بے حجاب عورتوں کو دیکھ کر غیر مرد اپنے خیالات کو پاکیزہ نہیں رکھ سکتے اسطرح معاشرہ میں گندے رجحانات جنم لیتے ہیں موجودہ زمانے میں کلب، فلمیں اور بے پردگی جو گل کھلا رہی ہے سب کے سامنے ہیں۔

۴۔ جس چیز سے روکا جائے ادھر رجحانات زیادہ ہوتا ہے عورت و مرد کے ناجائز تعلقات پہ پابندی عائد کی گئی ہے، لہٰذا اس مقولے کے تحت لوگوں کے رجحانات ناجائز تعلقات کی جانب بڑھیں گے۔ اس لئے اس کے تدارک کا پہلا زینہ پردہ ہے نہ ہی رخِ زیبا نظر آئیگا اور نہ ہی اگلا قدم بڑھنے کی خواہش جنم لے گی بے ہودہ خیالات جنم لیتے ہی پردہ پوش ہو جائیں گے۔

۵۔ جن قوموں میں پردہ نہیں ہوتا۔ وہاں بہت زیادہ اخلاق سوز واقعات رونما ہوتے ہیں۔ یورپ کے حالات و واقعات سب کے سامنے ہیں کیونکہ وہ اخبارات میں کم و بیش چھپتے رہتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ملک میں اگر کوئی ایسی حیاسوز حرکت ہو جائے تو چرچا عام ہوتا ہے اس لئے کہ یہاں ایسے واقعات بہت کم ہوتے ہیں کیونکہ انکی نوعیت حیران کن ہوتی ہے لہٰذا اخبار کی سرخی بن جاتے ہیں لیکن یورپ میں خبریں معمولی حیثیت سے

شائع ہوتی ہیں۔

مندرجہ بالا اور ایسی کئی تصریحات اس کا مکمل ثبوت ہیں کہ اسلام کا قانونِ پردہ کوئی قید خانہ نہیں ہے بلکہ حفاظتی قلعہ ہے۔ عورت کی ایک معقول حفاظت ہے۔ پردہ حضرت فاطمۂ زہراؑ کا طریقہ اور اسلامی اصول ہے۔ پردے کی مخالفت کرنا اصل میں حضرت سیدہؑ اور اسلام کی مخالفت ہے۔

عورت کی حیثیت

اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام یہ ہے کہ وہ ملکۂ خانہ ہے جو دو نمایاں حیثیتیں رکھتی ہے، اور ان دونوں حیثیتوں کے مدار پر اس کے سارے فرائض کا دار و مدار ہے۔ تمام امورِ خانہ داری کو بھی اگر ہم ان دو شعبوں میں تقسیم کرلیں، تو غلط نہ ہوگا۔ چنانچہ عورت یا تو ماں ہے یا بیوی اس کے علاوہ جو بھی ہے اسی کے تحت ہے۔

اگر عورت "ماں" ہو تو اس کا مرتبہ یہ ہے کہ جنت اس کے قدموں کے نیچے ہے اور حکماء کا قول ہے کہ بچے کی پہلی درسگاہ "ماں" کی آغوش ہوتی ہے لہٰذا ماں کا فرض ہے کہ بچوں کو خالص اسلامی سانچہ میں پروان چڑھائے۔ عورت کی سب سے اہم اور مشکل ڈیوٹی یہی ہے کیونکہ اس کے نظامِ پرورش کے اثرات آئندہ زمانے تک پہنچتے ہیں۔ لہٰذا عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس شعبہ تربیت اطفال پر مہارت رکھے اور اپنی اس عظیم قومی و ملکی ذمہ داری کو بطریقِ احسن سرانجام دے۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ انسان کی زندگی میں اس کی ابتدائی تعلیم کا بہت اثر ہوا کرتا ہے۔ اور اس کی یہ تعلیم شکمِ مادری سے شروع ہوجاتی ہے۔ ماں کے خیالات کا اثر اس کے شکم میں موجود بچے پر بھی ہوتا ہے۔ جس طرح وہ ماں کے جسم میں غذا حاصل کرتا ہے اسی طرح ماں کے خیالات و عادات کا اثر بھی یقیناً لیتا رہتا ہے اس کی دلیل یہ مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی ناگوار بات دیکھی یا سن لی جائے تو چہرہ متغیر ہوجاتا ہے اور عموماً چہرے سے آدمی کے جذبات مسرت و رنج کا اندازہ ہوجاتا ہے یعنی خیالات کا اثر انسان کے اعضاء پر پڑتا ہے۔ ماں کے خیالات کا اثر بچے پر پڑنا لازمی ہے کیونکہ شکمِ مادر میں بچے کا جسمانی

و اعصابی نظام ماں کے جسمانی اور اعصابی نظام سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اگر عورت میں جذباتی
تحریکات زیادہ ہیں تو ویسا ہی اثر بچے پر پڑے گا۔ اگر عورت ہر وقت حقوق اللہ کی حفاظت
کے فکر میں محوِ عبادت رہتی ہے تو بھی اس کا اثر بچے پر ہوگا یعنی بچے کی پیدائش سے
قبل شکمِ مادر ہی میں اس کی تعلیم و تربیت شروع ہو جاتی ہے۔

بعد از پیدائش اس کا طریقہ بدل جاتا ہے یہ تعلیم بھی محض ماں کی ہوتی ہے اور اس
کا اثر بہت ہی گہرا ہوتا ہے دوسرے کو تعلیم دینے کی شرط اوّل یہ ہے کہ خود بھی اس
تعلیم کا ماہر ہو۔ اور عالم باعمل ہو کیونکہ بے عمل کی تعلیم بھی بے اثر ہوگی۔ لہٰذا اس احساس
سے ضروری ہے کہ عورت اگر مثالی ماں کہلانا چاہتی ہے تو اچھے معیارِ علم و عمل پہ
فائز ہونا چاہیئے۔

اب جبکہ اسلام محض تصوری مکمل ضابطۂ حیات نہیں بلکہ اس کی تعلیمات میں ہر بات
کا پریکٹیکل (تجربہ) ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسلام ہمیں وہ نمونہ مہیا کرے جس کی روشنی
میں ہم ایک "ماں" کے مثالی ہونے کی شناخت کر سکیں۔ چنانچہ ثقلِ دوم میں ہمیں ایک
ایسی ماں ملتی ہے جس نے دو ایسے پاک اور عظیم فرزند پروان چڑھائے جن کے
کردار کی عظمت و پاکیزگی پہ آج تک نہ صرف مسلم قوم فخر کرتی ہے بلکہ انکی عظمت کردار کے
غیر مسلم بھی معترف ہیں لوگوں نے اپنی کج فہمی کی وجہ سے سیاسی قسم کے اعتراضات
تو کئے لیکن ان کے اخلاق پر کوئی حرف گیری کر سکے کسی کو جرأت نہیں ہو سکی۔ اسلام میں کئی عظیم
خواتین پیدا ہوئیں لیکن ایسی مثالی "ماں" کی نظیر پیدا نہ ہو سکی۔ یہ ہستی جناب سیدہ نساء
عالمین، حضرت خاتونِ جنت فاطمہ بنتِ محمدؐ ہیں۔ یہ خاتون پاک "بیٹی" کی حیثیت میں
بھی اتنی عظیم تھیں کہ جب بھی آپؑ سرکارِ رسالت مآب کے پاس تشریف لاتی تھیں
حضورؐ ایستادہ ہو کر استقبال فرماتے تھے۔ حالانکہ کسی باپ پر یہ لازم نہیں کہ اولاد کی تعظیم
کے لئے اُٹھے۔ تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ و معصومینؑ کے سردار حضرتِ احمدِ مختارؐ کا حضرت فاطمہؑ
کی تعظیم میں اُٹھنا اس لئے تھا کہ امت کو عظمتِ زہراؑ کا علم ہو جائے اور معلوم ہو جائے
کہ آپ تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار ہیں حضرت سیدہؑ کی سیرت طیبہ کے مطالعہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نے بڑی عسرت کے دن کاٹے۔ بادشاہ کون و مکان حضرت سرکار دو جہاںؐ کی بیٹی ہونے کے باوجود آپؑ نے اپنی گھریلو ذمہ داریاں اپنے ہاتھوں سے پوری فرمائیں اور جناب فضہؓ کے خادمہ بن جانے کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ گھر کا سارا کام ایک دن میں خود کرتی تھیں اور ایک دن خادمہ کرتی تھیں۔ بس دنیا جہان کی عورتوں کی تاریخ دیکھ ڈالیے اگر کوئی "ماں" ایسی مل جائے جیسی ثقلین نے پیش کی ہے تو بلاشبہ اسے نمونہ بنا لیجئے ورنہ اسی آستانۂ عالیہ پہ جھک جائیے۔ کیونکہ کائنات کی تمام بلندیاں اور سرفرازیاں اسی آستانہ پاک پر ملیں گی۔

عورت کی دوسری حیثیت "بیوی" کی ہے کہ "بیوی کی جنت شوہر کے قدموں میں ہے" اسی حیثیت کے متعلق ہم نے بیوی کے حقوق و فرائض اوپر بیان کر دیئے ہیں۔ یہاں ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ بیوی کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لئے راحت مہیا کرے اُسے آرام و سکون دے اور کوئی سبب پیدا نہ کرے جو خاوند کی پریشانی کا باعث ہو تاکہ وہ گھریلو پریشانیوں سے محفوظ رہ کر اپنے بیرونی معاملات کو پوری توجہ سے سلجھا سکے چنانچہ اس کے لئے بھی اسلام نے ایک "مثالی بیوی" کو بطور رہادی پیش کر کے انسانیت پہ گراں قدر احسان کیا۔ ثقل دوم نے اس گھر کی بیوی کا انتخاب کیا ہے کہ جسے ہر وقت ہر جگہ ہر طبقے کیلئے ہادی اور نمونۂ عمل قرار دیا ہے۔ اور جب ہم اس خاتون پاک کی سیرت منورہ پڑھتے ہیں تو مخدومہؑ کونین کی عظمت کی کوئی انتہا نظر نہیں آتی۔ اس بات سے رسالتؐ محمدیہ کی ناقابل تردید تصدیق ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلام کی بیٹی نے حضرت علیؑ کے گھر میں آ کر بیوی کے فرائض کو جس خوش اسلوبی سے سر انجام دیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے چنانچہ حضرت فاطمہ زہراؑ کو دفن کرتے وقت رسولؐ کریم کو یوں سلام کہا کہ "آپ پر سلام ہو اے اللہ کے رسولؐ! میرے اور اپنے اس بیٹی کی طرف سے سلام قبول فرما لیجئے آپ کی یہ بیٹی جو آپ کے جوار میں آ گئی ہے اور بہت جلد آپ سے آملی ہے۔ اے رسولؐ خدا! فاطمہؑ کی وفات سے میرے صبر کا امتحان لیا گیا ہے انکی جدائی سے میری طاقت صبر جواب دے رہی ہے۔ اس حالت مصیبت میں بھی میرے صبر کے لئے یہ کافی ہے کہ میں

نے آپکی جدائی پر صبر سے کام لیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے آپؐ کو لحد میں اتارا میرے ہی حلقوم
و گلے کے درمیان آپکی جان تن سے جدا ہوئی ہر چیز اللہ کی ہے اور اسکی طرف لوٹ جانیوالی ہے
آپکی بیٹی ایک ودیعت تھی جو واپس لے لی گئی یہ ایک نشانی تھی جو اٹھالی گئی۔ اب میرا حزن و ملال
دائمی ہے اب میرے لئے آرام کی نیند کہاں؟ جب تک خدائے عالم میرے لئے اس مقام (آخرت)
کا ارادہ کرے۔ جہاں آپؐ مقیم ہیں۔

عنقریب آپکی صاحبزادی آپؐ کو آگاہ کریں گی۔ آپؐ ان سے اچھی طرح معلوم کیجئے آپؐ
میرے حالات کو اُن سے دریافت کیجئے حالانکہ آپؐ کی وفات کو کوئی زیادہ مدت نہیں گزری
اور زمانہ آپؐ کی یاد سے خالی نہیں ہوا۔ آپؐ پر اور آپؐ کی دختر پر اس طرح سلام پہنچے
جیسے کوئی دوست سلام محبت پیش کرتا ہے۔ دل تنگ خشمگیں اور رنجیدہ ہو کر نہیں پس
اگر میں یہاں سے واپس جاؤں تو یہ بے تعلقی کی وجہ سے نہیں ہوگا بلکہ حقوق و
فرائض کی ادائیگی کے لئے ہوگا، اور اگر آپؐ کی زیارت کیلئے ٹھہرا رہوں تو یہ اس
اجر کے متعلق بدگمانی کے سبب نہ ہوگا جس کا خدا تعالیٰ نے صابرین سے وعدہ فرمایا ہے"
یعنی مجھے یہ بدگمانی نہیں ہے کہ اگر میں زیادہ دیر نہ ٹھہرا تو اللہ اور رسولؐ مجھے اجر
و زیارت سے محروم کر دیں گے (بلکہ مجھے ہر حال میں یقین ہے کہ اجر زیارت قبر رسولؐ و
قبر زہراؑ ضرور ملے گا)۔

یہ کلمات سرکار امیر المومنینؑ نے جناب سیدہؑ کے دفن کے موقع پر فرمائے ہیں
جن کا ایک ایک نقطہ بی بی پاکؑ کی فضیلتوں کا سمندر ہے۔

بی بی پاکؑ کا گھر باوجودیکہ دنیاوی لحاظ سے آسودہ نہ تھا لیکن ازدواجی راحت
اطمینان کا ایسا نمونہ تھا کہ اس کی مثال ملنا محال مطلق ہے۔ آپ نے اپنے گھر بار کے
کام کاج میں کبھی شرم محسوس نہیں کی۔ بلکہ پورے ذوق و شوق سے اپنا فرض سمجھ کر رضائے
الٰہی کے تحت کیا۔ تقسیم کار وہی فطری تھا کہ باہر کا کام حضرت امیرؑ کرتے تھے یعنی صبح
کی نماز کے بعد ہی آپؐ کسب معاش کے لئے گھر سے نکل آتے تھے اور جو کچھ ہو سکتا تھا کما
کر لاتے اور جناب سیدہؑ کے حوالے کر دیتے تھے حضرت خاتون جنت گھر کا کام کرتیں بچوں کو

نہلانا، کپڑے دھونا، بچوں کی تربیت، خوراک کا انتظام، گھر کی صفائی، چکی پہ آٹا پیسنا، کوئیں سے پانی بھرنا وغیرہ وغیرہ آپؑ کے ذمے تھا۔ انتہائی خوش اسلوبی سے سرانجام فرماتیں، بسر اوقات عسرت میں ہوا کرتی تھی۔ اس قدر چکی پیستی تھیں کہ ہاتھوں میں آبلے پڑجاتے تھے۔ اور فرشتے اعانت کے لئے بیتاب ہوجاتے تھے لیکن جناب سیدہ کبھی اپنے خاوند کے سامنے تنگی یا تکلیف کی شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر نہ لاتیں جب حضرت علیؑ واپس گھر میں تشریف لاتے تو خندہ پیشانی سے ان کا استقبال فرماتی تھیں باوجود فاقوں کے آپؑ نے اپنے شوہر نامدار حیدر کرارؑ کو خوش و خرم رکھا۔ انکی خدمت و دلجوئی حضرت زہراؑ کا شعار رہا۔ اور باوجودیکہ آپؑ کے والد حضرت محمد مصطفیٰ بادشاہ تھے لیکن ان سے کبھی اپنی تنگدستی و تکالیف کی شکایت نہیں فرمائی۔

جناب سیدہ طاہرہ کی سیرت کا مطالعہ کرلینے سے یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ مردوں میں تو ہمیشہ مصلح اور ریفارمر پیدا ہوتے رہے لیکن صنف نازک کو بھی ایک ہم صنف ہادیہ کی ضرورت تھی کہ جس کا اسوہ حسنہ قابل تقلید ہو۔ چنانچہ جناب سیدہ کی نقش دوام میں موجودگی سے اسلام نے اس ضرورت کو پورا کردیا اور دنیا کو بتادیا کہ صنف نازک کے فرائض کیا ہیں اور انکو اپنے اقوال و افعال کس طرح ادا کرنے چاہئیں۔ اب ہر عورت کا فرض ہے کہ اپنے تمام مسائل کا حل ان معظمہ سے حاصل کرے۔ ان ہی اوصاف کی بناء پر رسول اللہ نے فرمایا کہ جب میں فاطمہؑ کو سونگھتا ہوں تو مجھے جنت کی خوشبو آتی ہے۔ خداوند علیم و حکیم نے صرف اور صرف جناب سیدہ کے ہی گھر کو نمونہ قرار دیا۔ اور اسی کی پاکیزگی کی ضمانت دی۔ اور قرآن میں اعلان فرمادیا۔ "اللہ تو بس چاہتا ہی یہ ہے کہ اے اہلبیتؑ! تمہیں ہر طرح رجس یعنی نجاست، عیب، نقص، گناہ و خطا سے محفوظ رکھے اور ایسا پاک رکھے جیسا کہ پاک رکھنے کا حق ہے۔" اور خود پیغمبرؐ نے اس گھر کا تعارف کرایا یہ وہ گھر ہے جس میں ہدایت موجود ہے۔ جتنے خانگی مسائل ممکن ہوسکتے ہیں سب کا حل اسی خانۂ تطہیر سے مل جاتا ہے۔ خوشحال گھرانے کی مشکلات ہوں یا غریب گھرانوں کے مسائل متوسط طبقہ کے عقدے ہوں یا عوامی گتھیاں سب کا حل حضرت زہراؑ کے گھر سے اور علیؑ کے

در سے مل سکتا ہے۔ غرضیکہ یہ تطہیر کا گھرانہ حیاتِ انسانی کے لئے ہدایت کا وہ نمونۂ اکمل ہے کہ آپ جس جہت سے بھی اس نمونے کو دیکھیں گے کہیں شمہ بھر بھی انحطاط نہ ملے گا۔ ہم ببانگ دُہل کہہ سکتے ہیں کہ سارے عالم میں اگر کوئی اس سے بہتر گھرانہ ہے تو بتایئے۔ زمانے نے اس گھرانے کو آزمانے اور پرکھنے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار نہ کئے۔ مگر ہر امتحان میں، ہر سختی میں، ہر تنگی میں۔ امن میں جنگ میں۔ افلاس میں خوشحالی میں۔ وطن میں حالت غربت میں۔ عظمت میں شرافت میں۔ غیرت میں حیا میں۔ کرامت میں سخاوت میں۔ شجاعت میں طہارت میں۔ عبادت میں، علم میں حلم میں، وفا میں۔ صبر و اختیار میں۔ توکل میں، روحانیت میں غرضیکہ جہاں بھی جس پہلو سے بھی اور جس شعبے میں بھی دیکھا اس گھرانے کا کوئی ثانی نہیں ملا۔ تاریخ نے کسی بھی پہلو کو نہ چھوڑا۔ حکومتوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا کہ کسی طرح بھی کوئی ایسی راہ نکالی جائے کہ اس گھرانے پر کسی انگشت نمائی کا موقع مل جائے۔ لیکن ایسا حربہ اُلٹا سونے پر سہاگہ بنتا گیا۔ ظلم و جور سے اس گھرانے کے انوار مزید نمایاں ہوتے گئے۔ اور دشمن اپنی ہی تدابیر سے اپنے حسد کی آگ میں خود بخود بھسم ہوتے چلے گئے۔ رسولِ خدا نے اسی گھرانے کے پاک افراد کے متعلق فرمایا تھا کہ:۔

۱۔ یہ مخزن حکمت ہیں ۲۔ اُمت کے لئے امان ہیں ۳۔ بنی اسرائیل کے بابِ حطہ کی طرح بخشش کا دروازہ ہیں ۴۔ سفینۂ نوح کی طرح ذریعہ نجات ہیں ۵۔ ان پر کسی دوسرے کا قیاس ممکن نہیں۔ ۶۔ یہ شفیع اُمّت ہیں ۷۔ ان کی محبت وہ دولت ہے جو سات جگہ کام آئے گی۔ ۸۔ ان کی اطاعت فرض ہے۔ ۹۔ ان کا محب جنتی ہے۔ ۱۰۔ ان کا دشمن جہنمی ہے۔

یہ احادیثِ رسولؐ بلا لحاظِ فرقہ کتب حدیث و تفسیر میں موجود ہیں۔ اور علماء نے ان احادیث کو تسلیم کیا ہے لیکن افسوس یہ زبانی جمع خرچ ہے۔ تمسک سے پھر بھی تخلف ہی برتا گیا۔ خود خالق نے اس گھر کو فرشتوں کی درسگاہ بنایا۔ اور ہم

کتابوں میں دیکھتے ہیں کہ اس پاک گھر میں فرشتے چکی پیستے تھے اور درزی بن کر آتے تھے ۔ قابل غور مقام ہے کہ آخر یہ سارا ماجرا کیا ہے ؟ اس گھر کے لئے تو جنّت سے جوڑے آئے کسی دوسرے گھرانے کے لئے کوئی بنیان تک نہ آئی ۔ یہ ہر حالت میں مسجد نبویؐ میں تشریف لا سکتے تھے ۔ اور ٹھہر سکتے تھے ۔ لیکن رسولؐ خدا نے دوسروں کے مسجد کی طرف کھلنے والے دروازے بند کرا دیئے تھے ۔ لیکن فاطمہؑ اور علیؑ کے گھرانے کا دروازہ جو مسجد کی طرف کھلتا تھا اس کو بند نہیں کروایا واضح رہے کہ یہ سب لطف و اکرام یونہی عطا نہیں ہوتے بلکہ یہ انعامات ایمان کے امتحانات میں کامیابی کی وجہ سے ملے اور ان امتحانوں کی تفصیل سے تمام لوگ واقف ہیں ۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے ۔

اگر اس گھرانے کو سفینۂ نوحؑ کہا گیا تو ان گھر والوں نے اپنے آپ کو ایسا سفینہ ثابت کیا کہ سفینۂ نوحؑ بھی ان کی عظمت کے سامنے شرما کر پانی پانی ہو گیا ۔ جب اس گھرانے کے افراد کی حکمت پر نظر جاتی ہے تو حکمتِ خدا و رسولؐ دکھائی دیتی ہے ۔ ان کی امان ایسی ہے کہ ان کے نام لیتے ہی خطرے ٹل جاتے ہیں ۔ ان کی شفاعت ایسی ہے کہ ان کی محبّت میں بہا ہوا ایک آنسو جنت کی ضمانت بن جاتا ہے ۔ ان کی محبّت ایسی ہے کہ ان سے محبّت کرنے والوں کو خدا اپنا محبوب بنا لیتا ہے ۔ ان کی اطاعت خود خدا کی اطاعت ہے ان کی محبّت عبادت ہے اور ان سے بغض منافقت اور موجب لعنت بے شمار ہے ۔

شہزادیٔ کائناتؑ کا جہیز

باوجود اس کے کہ جناب فاطمہ زہرہ سلام اللہ علیہا حضرتِ مختارِ کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی صاحبزادی تھیں پھر بھی حضورؐ نے جہیز میں بی بی پاک کو مندرجہ ذیل اشیاء دیں ۔ ۱۔ ایک قمیص ۲۔ نقاب ۳۔ سر ڈھانپنے کا کپڑا ۴۔ قطیفہ کمبل ۵۔ موٹے ٹاٹ کے دو فرش ۶۔ چار چھوٹے تکیے ۷۔ ایک سفید چادر ۸۔ سریر مزمل (کھجور کے پتوں کا بستر) ۹۔ تانبے کا ایک لگن ۱۰۔ لکڑی کا پانی پینے والا برتن ۔

۱۱۔ مٹی کی صراحی ۱۲۔ لوٹا ۱۳۔ دو آب خورے ۱۴۔ ایک چکی ۱۵۔ چمڑے کا مشکیزہ
۱۶۔ جائے نماز۔

حضورؐ نے نہ ہی سونے چاندی کے زیورات اور نہ ہی کوئی قیمتی دھات کا برتن وغیرہ دیا۔ حضرت علیؑ کی جانب سے بھی جہیز کا کوئی مطالبہ نہ تھا۔ بلکہ حضورؐ نے اپنی مرضی سے یہ عنایت فرمائی۔ (شاید اس لیے کہ حضورؐ ہی تو حضرت علیؑ کے مربی تھے اور آپؑ حضورؐ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ لہٰذا علیحدہ گھر بسانے کی غرض سے بحیثیت والد و سرپرست آپؐ نے یہ اعانت فرمائی پس اسلام نے اس رسم کو واجب قرار نہیں دیا ہے)۔ پس اس طرح محمدؐ و آلِ محمدؐ نے اُمت کو تعلیم دی کہ جہیز کے لئے قرض وغیرہ کا بوجھ نہ اُٹھایا جائے اور نہ ہی جہیز کا مطالبہ کیا جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اکثر مسلمانوں نے اس تعلیمِ سادگی کو فراموش کر دیا ہے۔ اور لالچ دکھا دے کو گویا "دین" بنا لیا کر لڑکا یا لڑکے والے بڑے بڑے قیمتی جہیز کا مطالبہ کرنے لگے۔ اور بعض لڑکی والے اپنی "ناک رکھنے" کی خاطر لڑکیوں کو غیر شادی شدہ بٹھائے رکھتے ہیں یا نکاح کے بعد رُخصت نہیں کرتے۔ یہ صریحاً ظلم ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سی لڑکیاں غیر شادی شدہ بیٹھی رہتی ہیں۔ اور بہت سی شادی شدہ لڑکیاں میکے ہی میں رہتی ہیں۔ رخصتی نہیں ہوتی۔ تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ متحد ہو کر اس ظلم کو بند کرائیں۔ اور سرکار دو عالم اور حضرت علیؑ مرتضیٰ کے نقش قدم پر چلیں۔ اور لڑکیاں سیرتِ زہراؑ سے صبر و قناعت سیکھیں۔

مہر کتنا ہونا چاہیے یہ طریقہ معقول معلوم نہیں ہوتا کہ جب ایک روپے کی ایک من گندم ملتی تھی اس وقت بھی ۳۲ بتیس روپے کچھ آنے مہر تھا اور اب جبکہ ایک روپے سیر بھی مہنگا آٹا فروخت ہو رہا ہے۔ شدید مہنگائی کا دور ہے تب بھی ۳۲ بتیس روپے مہر ہو۔ ایسا غیر معقول طریقہ حضورؐ کا تعلیم فرمایا ہوا ہرگز نہیں ہے۔ جبکہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چار سو مثقال چاندی رسولِ خدا نے حضرت فاطمہؑ کا مہر مقرر کیا تھا۔ جو ہمارے حساب سے ایک سو تولہ

چاندی ہے۔ پس اگر اُسی سنّت کے مطابق مہر رکھنا ہو تو ایک سو تولہ چاندی یا اس کی قیمت (وقت کے بھاؤ کے مطابق مہر رکھنا چاہیے)۔ اگرچہ مہر کی رقم کی کمی بیشی کی پابندی اسلام میں نہیں لگائی گئی البتہ دولہا کی مالی حیثیت سے زیادہ مہر رکھنے کی مذمّت کی گئی ہے۔ پس اس بات کا لڑکی والوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ ادائیگی مہر انتہائی ضروری ہے۔

تمام کائنات کے لیے ہدایت کے اس نمونۂ کاملہ گھرانے نے نہ صرف اندرونِ خانہ امورِ خانہ داری کی بہترین مثال قائم کی اور دنیا کو بہترین خانگی زندگی کے اصول تعلیم فرمائے بلکہ اگر ضرورت پڑی تو ہدایت خلق کی خاطر بیرونِ خانہ بھی اپنے فرائض عمدگی سے سرانجام دیئے۔ اور ایسے مواقع عموماً وہی تھے جہاں حق و باطل کا مقابلہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک وقت جب مخالفینِ اسلام نے اسلام کی صداقت کا ثبوت طلب کیا۔ نصرانیوں سے مباہلہ ہوا۔ حکمِ خدا کے مطابق آپؐ نے عیسائیوں سے فرمایا کہ آؤ بلائیں ہم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے۔ اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اپنی جانیں اور تمہاری جانیں پھر جھوٹوں پر خدا کی لعنت ڈالیں۔ اس وقت اسلام کو حق ثابت کرنے کے لیے سچے گواہوں کی ضرورت رسولِ خدا کو پیش آئی۔ لہٰذا حضورؐ نے کائنات کا سب سے سچا گھرانہ منتخب فرمایا۔ اور اس کے سارے افراد کو اس مہم میں ساتھ لیا۔ کہ خود سرکارِ ختمِ نبوتؐ آگے امام حسینؑ کو گود میں لیے اور امام حسنؑ کو انگلی سے لگائے ہوئے میدانِ مباہلہ میں تشریف لائے۔ ملکۂ خانۂ طہارت و عصمت اپنے بابا کالی کملی والے شہنشاہ کے پیچھے اور بعد میں حضرت زہراءؑ کے شوہر نامدار سرکارِ ولایت علیؑ مرتضیٰ۔ یعنی فخرِ عصمت و عفت و طہارت فاطمہ زہراءؑ میدانِ مباہلہ میں اس شان سے تشریف لائیں کہ آگے رسالت نے پردہ بنایا تھا۔ پیچھے امامت محافظ بن کر چل رہی تھی۔ اس پانچ رکنی جماعتِ صدیقین طاہرین میں آگے کون تھا؟ بلکہ یوں کہو کہ کس کا چہرہ آگے تھا۔؟ اُسی حسینؑ کا جسے ایسے میدانوں کی تربیت دینا ضروری تھا۔ سبحان اللہ بحمدہٖ۔ جب عیسائیوں نے دیکھا

کہ یہ واقعی ایسا گھرانہ ہے جس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تو مقابلے سے دست بردار ہوگئے۔ وہ دشمنانِ اسلام تو ضرور تھے لیکن کچھ عقل و انصاف رکھتے تھے۔ جان گئے کہ اگر یہ رسولؐ جھوٹا ہوتا تو کبھی بھی اپنے گھر والوں کو ساتھ نہ لاتا۔ بلکہ اِدھر اُدھر سے گروہ اکٹھا کر کے لے آتا۔ کیونکہ عقل اس بات کی متقاضی ہے کہ انسان محلِ خطرات میں اپنے اعزہ و اقربا کو لے جانے سے گریز کرتا ہے۔ تاکہ انھیں بچا سکے۔ مگر رسولؐ نے ایسے افراد کا چناؤ فرمایا کہ اُن سے زیادہ سچا کوئی نہ تھا۔ کیونکہ اگر کوئی معمولی جھوٹا بھی شامل ہو جاتا تو لعنت کی زد سے محفوظ نہ رہ سکتا اور عذاب میں مبتلا ہو جاتا[1]

لہٰذا معلوم ہوا کہ جب کبھی نصرتِ دین کا سوال ہو اور دشمنانِ اسلام کا مقابلہ ہو تو حمایتِ حق اور نصرتِ دین جس طرح مردوں کا فریضہ ہے۔ اسی طرح عورتوں کا بھی ہے مگر طریقِ کار دونوں کا مختلف ہے کہ اہتمامِ پردہ قائم رہے مگر جیسا کہ ہم بار بار یہ بات دُہرا رہے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر ضابطۂ حیات ہے اس نے کوئی ایسا ممکن پہلو نہیں چھوڑا کہ جسے ادھورا رہنے دیا ہو" اور ثقلین "نے اس کی صورت و تشریح لفظی (تھیوری) اور صورتِ عملی (پریکٹیکل) کو پیش نہ کیا ہو۔ لہٰذا اسلام جانتا ہے کہ جس طرح مرد نصرتِ حق کی خاطر میدان میں آتا ہے شاید ایسا وقت بھی آئے گا کہ یہ فرض عورتوں کو بھی پکارے خصوصاً ایسی صورت میں کہ مردوں کی تعداد اتنی کافی نہ ہو کہ مخالفین کی افرادی طاقت کا مقابلہ کر سکیں تو اس صورت میں عورت کا عمل کیا ہوگا؟ کیا ثقلین اس کا حل پیش کرتے ہیں۔؟

کیوں نہیں۔ مبینہ حالت میں موجودہ حالات کے تحت تو ہو سکتا ہے کہ مرد و عورت کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا صحیح نہ ہو۔ مگر ثقلین نے تجربے سے اسے حقیقت ثابت کر دکھایا ہے ثقلِ دوم کے تیسرے قائد سید الشہداء امام حسین علیہ السلام جو اپنے دورِ امامت میں جانشین مصطفیؐ ہونے کی وجہ سے اسلامی اقدار کے تحفظ کے ذمہ دار تھے جنھیں حضرت معین الدین چشتی اور علامہ اقبال نے بنائے کلمۂ اسلام تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے میدان کربلا میں

---

[1] عیسائیوں نے ان ہستیوں کی صداقت تسلیم کر لی مگر بعد از رسولؐ امت ایسا نہ کر سکی۔

پردہ اور مخصوص نسوانی نظامِ تمدّن کی وہ اہمیت تعلیم فرمائی ہے کہ جو یورپ زدہ لوگوں اور مذہب دشمنوں کے وہم و خیال میں بھی نہ آسکے۔

تاریخ پر نظر کیجیے کہ ایک جانب ہزاروں کا لشکر ہے اور ایک طرف چند مجاہدین جن میں ضعیف العمر اور صغیر السن بچے بھی شامل ہیں۔ یہاں بوڑھے جہاد بالسیف سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ قاسمؑ اور عونؑ و محمدؑ جیسے بچّوں نے جہاد کیا۔ مگر عورتیں تا وقتِ تکمیل پردہ میں رہیں۔ اور انھیں میدان میں آنے کی اجازت نہیں ملی۔ اگر کوئی بہادر مستور فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر شوقِ شہادت میں برسرِ میدان آ بھی گئی تو امامِ پاک نے فرما کر اُسے واپس کر دیا کہ جہاد عورتوں سے ساقط ہے بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ حیدرِ کرّار کی شیر دل صاحبزادیاں جرأت و شجاعت میں کسی مرد سے کم تھیں۔ مگر کسی ضعیف روایت میں بھی یہ نہیں مل سکتا کہ کسی مقدس خاتون نے ایسا اقدام فرمایا ہو۔ اور اس کی وجہ نہ تو کوئی خوف تھا اور نہ ہی کوئی بزدلی بلکہ تربیتِ مطہرہ نے ان کے دلوں اور دماغوں میں نظامِ اسلامی راسخ کر دیا تھا۔ یہ ایسا ارادہ کر ہی نہیں سکتی تھیں جس سے شریع کی راہ جُدا ہوجاتی جناب سیّدہ طاہرہؑ کی صاحبزادیوں کی بات تو رہی ایک طرف ایسی خواتین جن کا کوئی بھی دوسرا واسطہ اس گھر سے تھا انھوں نے بھی ایسا نہ کیا حالانکہ نصرتِ اسلام کا ولولہ اور جوش ان میں بھی موجزن تھا۔ لیکن انھوں نے حدود اللہ کی پاسداری کو مقدّم رکھا۔ بہت سخت امتحانِ صبر تھا۔ بڑے کڑے مواقع تھے۔ بھلا تصوّر تو کیجیے کہ کوئی اٹھارہ برس کا کڑیل جوان میدان میں مصروفِ جہاد ہے کوئی چھ ماہ کا شیر خوار قربان ہو رہا ہے کوئی جان سے عزیز بھائی کے بازو کٹوا کے دشمنوں کے نرغے میں حقِ وفا ادا کر رہا ہے۔ اُس وقت مامتا رکھنے والی ماؤں نے دل و جان سے صدقے ہونے والی بہنوں نے اپنی زندگی سے عزیز رکھنے والی ازواج نے صبر کی کیسی کیسی کٹھن منزلیں طے کیں۔ اور پھر صبر کر کے پردہ کی پابندی کی۔ اس مقام پر انسانی عقل متحیر ہوجاتی ہے لیکن کتنے ہی اوراقِ تاریخ پلٹ کر دیکھ لیجیے صرف یہی ثابت ہوگا کہ کربلا میں کوئی مخدّرہ اپنے فرائض شرعیہ سے غافل نہ ہوئی اور تمام خواتینِ کربلا نے پردے کی سخت پابندی کی۔

اے خانوادۂ رسولؐ! ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ وہ کیا سخت ترین گھڑی آئی تھی کہ جب تمام عزیز و انصار جامِ شہادت نوش فرما چکے تھے اور سیدہؑ کے لال حسینؑ تنہا نرغۂ ملاعین میں تھے۔ جسم زخموں سے چور تھا۔ جھلسا دینے والی گرم ریت پر کمر خمیدہ کھڑے تھے۔ دشمن چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اسلامِ مجسّم کا سر تن سے جُدا کرنے کی ذلیل ترین کوشش کر رہے تھے۔ استغاثۂ امامِ مظلوم بلند ہوا۔ اس وقت نصرتِ امام فرض تھی۔ اگر عورتوں کے لئے جنگ کرنا جائز ہوتا تو مستورات کے لئے جوازِ جنگ کا اس سے بڑھ کر کون سا موقع ہو سکتا تھا۔ مگر کیا خواتینِ کربلا نے جنگ کی؟ کیا ایسا ہوا؟ نہیں ہوا۔ بالکل نہیں ہوا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ عورتوں کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ وہ میدانِ کارزار میں جنگ کریں۔ ذرا حیدری خون کے جوش و جراَت و قوت کا تصور فرمائیں جو ابوالفضل عباسؑ کی رگوں میں تھا۔ انگڑائی لے کر زرہ ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔ آخر وہی خون حضرتِ زینبؑ و حضرت اُم کلثومؑ میں تھا۔ مگر اُنھوں نے جنگ نہ کی۔ صبر کیا۔ پس ان کا صبر کرنا ہی جہادِ اکبر ہے اور اسلامی فرض شناسی کی زنجیر نے اُن مقدس بیبیوں کو روکے رکھا۔ بڑے صبر و تشکر سے اپنے شہیدوں کے غم برداشت کرتی رہیں۔ لیکن جب امام حسین علیہ السلام نے راہِ خدا میں سجدے میں جان قربان کر دی تو پھر عورتوں کا بے ہتھیار و بے جنگ جہاد شروع ہوا۔ اس جہادِ اکبر میں ان خواتین کو جو سب سے بڑا صدمہ برداشت کرنا پڑا وہ بے ردائی کا یعنی سروں کی چادر لُٹ جانے کا تھا۔ چنانچہ ثانیٔ زہرہ حضرت زینبؑ کبریٰ کا یہ خطبہ اہمیت پردہ کا ابدی ثبوت ہے۔ جس میں آپ نے یزید سے فرمایا تھا۔ "کیا یہ انصاف ہے کہ تو نے اپنی عورتوں اور کنیزوں کو پردہ میں بٹھا رکھا ہے اور نبیؐ کی بیٹیوں کو قید کر کے بے پردہ پھرایا۔ اور چہروں کو بے نقاب کیا۔ غضب ہے کہ نزدیک و دور کے لوگ اور پست و بلند ہر طرح کے آدمی اُن کے چہروں پر نظر ڈالتے ہیں۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ جناب زینبؑ کبریٰ اپنی سب سے بڑی مصیبت اس بے پردگی کو سمجھتی تھیں۔ اور اس کا خصوصی طور پر آپؑ نے تذکرہ فرمایا۔ آلِ رسولؐ

کے اس اہتمام کا نتیجہ یہ ہے کہ پردے کا قانون تمام مسلمانوں میں محفوظ مسلّم رہا۔

لہٰذا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کبھی عورت کو نصرتِ دین کی خاطر گھر کی چار دیواری سے باہر آنا پڑے تو اُسے حتی الامکان پردے کی حفاظت کرنا ہوگی اور اس کا جہاد اسلحہ اور ہتھیاروں سے نہیں ہوگا بلکہ زبان سے بذریعہ خطابت ہوگا۔

چنانچہ خطابت زینبیہؑ کا فیض ہے کہ اسلام بھی زندہ ہے اور اس کو زندہ کرنے والوں کا ذکر بھی۔ آپؑ کے خطبات کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت اُجاگر ہوجاتی ہے کہ یہ آپ ہی کی ہمت و جرأت تھی اور آپ کا جوشِ ایمانی تھا کہ دشمن کے ملک میں دشمن کے دارالحکومت میں، دشمن کے لشکر کے سامنے بھرے دربار میں اسیری و پابندی کی حالت میں کلماتِ حق کہہ کر بہترین جہاد کیا۔ کوفہ و شام کے درباروں کو لرزا دیا۔ بھرے مجمعوں میں ایسی فصاحت و بلاغت سے تقاریر فرمائیں جن کو سن کر دشمن مبہوت ہو گئے اور ندامت کے مارے آب آب ہوتے رہے۔ جابر حکومت کا غرور خاک میں مل گیا اور حسینؑ کی ظاہری (نام نہاد) شکست حقیقی معنوں میں فتح ثابت ہوگئی۔ جس مشن کی ابتداء آپؑ کے برادرِ محترم حسین علیہ السلام نے کی تھی۔ آپؑ نے اس کی انتہا کی بلکہ اُسے معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔

یہ ساری خوبیاں آخر جنابِ سیّدۃ النساء فاطمہ زہراؑ ہی کی تربیت کا تو نتیجہ تھیں جن کے گھر کو اللہ نے مرکزِ ہدایت قرار دیا ہے پس حضرتِ فاطمہ زہراؑ تمام عالمین کی عورتوں کی سیّدہ اور رہنما ہیں۔ آپ کی سیرت تمام خواتین کے لئے نمونۂ عمل ہے لہٰذا تمام مسلمان عورتوں کو چاہیئے کہ یورپ کے غیر مسلم لوگوں کی پیروی۔ بے حجابی اور غیر اسلامی آزادی کی راہ کی بجائے حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم کے ارشادِ حدیث ثقلین پر عمل کریں اور امورِ خانہ داری اور دیگر امورِ حیاتِ نسوانی میں جنابِ سیدۂ طاہرہؑ کی سیرت اور قرآنِ مجید سے ہدایات حاصل کریں۔ بحمداللہ تعالیٰ بتفضلِ جنابِ باری عزاسمہ، کتاب ہذا کی نویں فصل امورِ خانہ داری ختم ہوئی۔

بِعَوْنِ اللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

فصل دہم

علم جفر و اسرار الحروف

عربی زبان میں "جفر" بکری کے اُس بچے کو کہتے ہیں جو اپنی ماں کے دودھ سے بے پرواہ ہو چکا ہو اور گھاس وغیرہ چرنے لگا ہو۔ جب علوم جفر کو ارشاداتِ رسولِ خدا کے مطابق حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ نے تحریر فرمایا تو اس وقت کاغذ کے فقدان کی وجہ سے بکری کے بچے "جفر" کی کھال پر لکھا۔ اس لئے "علم جفر" نام ہوا۔ کتاب "مجمع البحرین" میں محقق طریحی نے لغتِ جفر میں تحریر کیا ہے کہ جفر و جامع وہ دو کتابیں ہیں جو پیغمبرِ خدا نے حضرت علیؑ سے لکھوائی تھیں۔ جن میں تمام علوم موجود ہیں یہاں تک کہ جزئیات تک کے احکام اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی موجود ہیں۔ علامہ شریف جرجانی نے "شرح مواقف" میں لکھا ہے کہ جفر علم الحروف کے طریقے پر ہے۔ اور قیامت تک کے حوادث پر حاوی ہے۔ مگر اُسے حضرت علی علیہ السّلام کی اولاد ہی سمجھ سکتی ہے۔ اور اسی کی مدد سے حکم دیتی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کا یہ قول بھی اس بات پر شاہد ہے کہ "میرے پاس جفر ابیض ہے تو زید بن ابی العلا نے عرض کیا کہ فرزند رسولؐ اس میں کیا ہے؟ حضرت صادقؑ نے فرمایا کہ اس میں زبور داؤدؑ ہے۔ توریت موسیٰؑ ہے۔ انجیل عیسیٰؑ ہے۔ ابراہیمؑ کے صحیفے ہیں۔ احکام حلال و حرام ہیں مصحفِ فاطمہؑ ہے اور اس میں وہ سب کچھ ہے جس کے لئے لوگوں کو ہمارے پاس آنے کی ضرورت و احتیاج ہوتی ہے۔ اور ہمیں کسی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت و احتیاج نہیں ہے۔"

فہرستِ مکتبہ خدیو مصر طبع ۱۳۰۸ھ جلد پنجم ص۳۳۳ میں ہے کہ ایک مخطوطہ "جفر الجامع" منسوب بامیر المومنین علیؑ محفوظ ہے۔ اور اسی فہرست کی اسی جلد کے ص۳۳۴ اور ص۲۵۶ میں ہے کہ جفر سیدنا جعفر الصادقؑ کے نام سے دو نسخے موجود ہیں۔ پس علم جفر کا وجود ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی تفصیل کا ایک مختصر سا خاکہ بھی معلوم ہو گیا۔ اور اس کے مجموعوں کا موجود ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ پس یہ حقیقت منکشف ہو گئی

کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کا وہ علم خاص جو تمام علوم پر حاوی ہے اور جسے خود حضورؐ نے لکھوایا اور علیؑ نے لکھا اُسے علم جفر کہتے ہیں۔ اور وہ وہبی علم ہے۔ علامہ عبدالوہاب شعرانی کی کتاب "الیواقیت والجواہر" کے ص۱۱۸ سے ثابت ہے کہ رسولِ خدا کو اہلِ بہشت اور اہلِ جہنم کے تمام نام معلوم تھے۔ علم جفر ہی کی وجہ سے رسولِ خدا اور آئمہ اہلبیت نے سینکڑوں برس بعد وقوع میں آنے والے واقعات کی پہلے ہی اطلاع دے دی تھی۔ جن میں سے چند پیشینگوئیاں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں۔

عبدالکریم قاسم کا قتل

کتاب "ربیع الابرار" میں علامہ زمخشری نے رسولِ خدا کی یہ پیشنگوئی نقل کی ہے کہ:-

"اے اہلِ عراق! آگاہ رہو اور یاد رکھنا کہ ماہِ رمضان المبارک کے نصف میں اس وقت اپنے دروازے بند کر لینا جب کہ سرکشِ عراق عبدالکریم قتل کیا جائیگا۔"

دنیا نے دیکھ لیا کہ حضورؐ کی یہ اطلاع حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور عین وسط رمضان میں عبدالکریم قاسم کا قتل واقع ہوا جسے چند ہی برس گذرے ہیں۔ اور یہ سب کو معلوم ہے کہ "ربیع الابرار" بہت طویل عرصہ پیشتر لکھی گئی تھی۔ اس میں اس پیشگوئی کے موجود ہونے سے حضورؐ کی صداقت اور آپ کے علم وہبی (جفر) کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

ٹرانسسٹر وغیرہ

"بحار الانوار" میں علامہ مجلسیؒ نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی یہ پیشگوئی نقل کی ہے کہ "ظہورِ امام مہدی علیہ السلام کا زمانہ جب قریب آجائے گا تو لوگ آلاتِ غِنا (آلاتِ موسیقی) کو اپنی جیبوں میں لے کر گھوما کرینگے گرمی و سردی کے زمانے میں اونی لباس پہنا کریں گے اور گلے میں رنگین رومال باندھنے کا رواج ہو جائے گا۔"

مختلف مشینوں کی ایجاد

"ربیع الابرار" میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ آخری زمانے میں ایسے آلات (مشینیں) لوگ بنالیں گے جو انسانوں کا کام دیں۔ اس وقت کمپیوٹر، ٹریکٹر، پاور لومز، روٹیوں کی مشینیں وغیرہ موجود ہیں بلکہ قریباً ہر قسم کے کام کی مشینیں موجود ہیں جو ایسے کام کر رہی ہیں جن کو پرانے

زمانے میں انسان کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ سُنا ہے کہ مشینی انسان بھی بن گئے ہیں۔

جزیرے میں ترکوں کا داخلہ

کتاب مجالس السّنیہ" میں السیّد محسن الامین الحسینی العاملی لکھتے ہیں کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے ظہورِ امام مہدیؑ کی علامات بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "ترک جزیرے میں اور روم والے رملہ میں داخل ہو جائیں گے۔ کُل زمین پر ـــــ یہاں تک کہ شام برباد ہو جائے گا اور اس کی بربادی کا سبب تین جھنڈوں کا شام میں اجتماع ہو گا۔ اس سال تمام کرۂ ارض پر عرب کی زمین کی وجہ سے اہلِ مغرب کے سبب سے اختلافات پیدا ہو جائیں گے تو سب سے پہلے شام تباہ ہو گا۔ کیونکہ وہاں تین جھنڈے باعثِ اختلاف ہوں گے (۱) سیدِ حسنی کا جھنڈا (۲) بنی اُمیّہ کا جھنڈا (۳) قیسی جھنڈا۔"

نوٹ :۔ جزیرے سے مراد غالباً قبرص ہے۔ جس کے واقعات مخفی نہیں یا پھر جزیرۂ عرب ہے واللہ اعلم۔ اور رملہ فلسطین کے علاقے کا ایک مقام ہے جو آج کل اسرائیل کے قبضے میں ہے۔ اہلِ روم سے مراد اہلِ یورپ و امریکہ وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ حسنی جھنڈا ایران کے سید حسنی کا ہو گا اور بنی اُمیّہ کا جھنڈا شامیوں کا یا لیبیا کا ہو گا۔ کیونکہ لیبیا اسپین کے بچے کھچے بنی امیّہ کا ملک ہے۔ اور قیسی جھنڈا مصر کی جانب سے قبیلہ قیس کے افراد کا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ترکوں سے مراد روسی ترکستان کے باشندے ہوں۔ کیونکہ دوسری روایت میں ہے کہ ترکوں کی لامذہب قوم (یعنی دہریئے جو روسی ہو سکتے ہیں) جزیرے میں داخل ہو گی۔

ہاشمی سلطنت

حضرت امیر المومنینؑ نے ایک منظوم کلام میں فرمایا کہ " دنیا میں بنی ہاشم کی ایک ہی حکومت رہ جائے گی۔ جہاں آخر میں ایک ناتجربہ کار، بے عمل اور دوسروں کے رحم و کرم و مشورے پر زندگی بسر کرنے والا لڑکا حکمران ہو گا۔ جس پر اس ہاشمی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد دنیا میں کسی بھی جگہ ہاشمی حکومت نہ رہے گی۔"

یہ حضرت علیؑ کی پیشگوئی ہے۔ اس وقت سوائے اردن کے کوئی ہاشمی حکومت

دنیا میں موجود نہیں ہے۔ لیکن فی الحال وہاں پر حالات ایسے نہیں ہیں۔ لیکن موجودہ شاہ حسین کے بعد کسی وقت ایسا منحوس موقع آجائے تو ناممکن نہیں۔ اللہ اردن پر رحم کرے۔

سواریوں کے حادثات ACCIDENTS

"بحار الانوار" علامہ مجلسیؒ میں ہے کہ "آخری دور میں لوگ سواریوں کے ٹکرا جانے سے مرجایا کریں گے۔"

گذشتہ زمانے میں جب یہ پیشگوئی کی گئی اس وقت ٹکرانے والی سواریاں موجود نہ تھیں۔ اور نہ ہی ایسے ایکسیڈنٹوں کا تصور کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ پیشگوئی لوگوں کے سامنے روزِ روشن کی طرح واضح اور سچی ثابت ہو چکی ہے۔ ریلوں کا ٹکرا جانا، بسوں اور موٹر کاریوں کی ٹکریں ہو جانا سب کے سامنے ہے۔ یہ پیشگوئیاں اہلبیتؑ اطہار کے علم وہبی اور خاص طور پر علم جفر کی صداقت کے لئے مضبوط دلیل ہے۔

عورتوں کی حالت

"روضہ کافی" میں اہلبیتؑ کی یہ پیشگوئی ہے کہ "آخری زمانے میں عورتیں منبر پر جائیں گی۔ تقریریں کریں گی۔ مختلف مقامات پر عورتوں کی حکومت ہوگی" (جیسا کہ آجکل ہندوستان، برطانیہ، سری لنکا، تھائی لینڈ وغیرہ میں ہے) پھر فرمایا "عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ روزی کمانے میں شریک ہوں گی۔ اور سواریوں پر سوار ہونے لگیں گی" (عورتیں گاڑیاں چلاتی ہیں اور گھوڑا سواری کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ) پھر فرمایا "عورتیں مردوں کی طرح انجمن سازی کریں گی" (کلب وغیرہ بنائیں گی) اور ان کے سروں کے بال اونٹ کے کوہان کی طرح ہوں گے۔" (یعنی جوڑے وغیرہ اور بالوں کے اوپر ابھرے ہوئے اسٹائل و فیشن) پس یہ تمام پیشگوئیاں سچی ثابت ہو چکی ہیں۔

چست لباس اور عریانی

"بحار الانوار" میں یہ پیشگوئی ہے کہ "آخر کے زمانے میں عورتیں کپڑے پہنے ہوئے تو نظر آئیں گی مگر وہ پھر بھی عریاں ہی ہوں گی۔ انتہائی زیب و زینت کرکے باہر نکلیں گی۔

اور لباس بہت ہی تھوڑا پہنیں گی۔ (یعنی برائے نام) موجودہ ٹیڈی ازم اور دیگر ممالک کی مسلمان عورتیں جو اب سگریٹ نوشی بھی کرتی ہیں اس پیشگوئی کا ثبوت ہیں۔

بصرے کا غرق ہونا

"نہج البلاغۃ" میں حضرت علیؑ کا اہلِ بصرہ سے خطاب نقل ہوا ہے۔ جس میں آپؑ نے فرمایا۔

"خدا کی قسم تمہارا شہر ضرور غرق ہوگا۔ گویا میں اس کی مسجد کو دیکھ رہا ہوں جیسے سفینے کا ابھرا ہوا سینہ ہو یا کوئی شتر مرغ زمین پر بیٹھا ہو۔ تمہارے شہر کی زمین پانی سے قریب اور آسمان سے دور ہے۔ شرارت کے دس حصّوں میں سے نو حصّے اس کے پاس ہیں۔ جو اس میں آگیا وہ اپنے گناہوں میں قید ہوگیا۔ اور جو اس زمین سے نکل گیا اس کو اللہ نے معافی دے دی۔ گویا میں تمہاری اس بستی (شہر) کو دیکھ رہا ہوں کہ اس پر پانی یہاں تک چھا گیا ہے کہ مسجد کی عمارت کے اونچے حصّے (یعنی مینار وغیرہ) کے سوا کوئی چیز اس بستی کی دکھائی نہیں دیتی اور وہ اونچے حصّے یا مینارے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے دریا کی موجوں میں کسی پرندے کا سینہ ہو۔" بصرہ سمندر کے ساحل پر ہے اور غرق ہونے کی پیشگوئی ہے۔

مصر کے متعلق

"محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار" میں محی الدین ابنِ عربی نے بروائت حضرت حذیفہؓ یمانی حضرت رسولِ خدا کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ جس میں حضورؐ نے فرمایا "کہ جب تک بصرہ برباد نہ ہو جائے اس وقت تک مصر برباد ہونے سے بچا رہے گا۔ پھر فرمایا کہ بصرہ عراق کی وجہ سے برباد ہوگا۔ اور مصر دریا کے سبب سے برباد ہوگا۔ مکّہ حبشہ کے ہاتھوں اور ایلا کا محاصرہ کیا جائے گا۔

مختلف ملکوں اور شہروں کے متعلق پیشگوئی

مناقب ابن شہر آشوب میں حضرت علی علیہ السلام کی ایک طویل پیشگوئی موجود ہے جس میں فرمایا کہ "دورِ آخر میں سمرقند، چاج، خوارزم اور اصفہان و کوفہ ترکوں کے ہاتھ سے تباہ ہوں گے۔ (ترکوں سے مراد غالباً

اہل روس میں) ہمدان اور رے (ایران) اور دیلم اہل قزوین کے ہاتھوں اور طبرتہ اور مدینہ و خلیج فارس کا علاقہ قحط و بھوک کے ذریعے۔ مکہ حبشہ کے ہاتھوں اور بصرہ و بلخ غرقابی سے تباہ ہوں گے۔ سندھ کو ہندوستان تباہ کر دے گا اور ہندوستان تبت کی حمائت میں چین کے ہاتھوں تباہ ہوگا۔ بدخشان، صاعانی، کرمان اور شام کے بعض علاقے فوجوں کے پیروں تلے روندے جائیں گے۔ قتل و غارت کی زیادتی ہوگی۔ اور یمن فرمانرواؤں کے ہاتھوں اور سجستان اور شام کے بعض علاقے ہواؤں کے ذریعے (مراد گیس وغیرہ ہوسکتے ہیں) شومان طاعون کے سبب اور مرو ٹڈیوں کے ذریعے اور ہراتؔ میں سانپ مخلوق کو تباہ کریں گے۔ اور نیشاپور تباہ دریائے نیل کے انقطاع سے آذربائیجان گھوڑوں کی ٹاپوں (فوجوں کی آمد و رفت و جنگ) اور بجلیوں کے ذریعے (مراد ایٹم بم وغیرہ) بخارا غرق ہوگا اور قحط پڑے گا۔ اور یورشلم و بغداد بھی تباہ ہوں گے غرق ہونے سے۔"

بغداد کے متعلق پیشگوئی

حضرت امام جعفر صادقؑ اور حضرت علیؑ نے پیشگوئی فرمائی ہے کہ آخری دور میں ایک شہر آباد ہوگا جس کا نام بغداد ہوگا۔ (شاید اس سے مراد بغداد جدید ہو) اس شہر میں گناہوں کی اس قدر کثرت ہوگی کہ وہ شہر خداوند عالم کے عذاب کے نزول کا مرکز بن جائے گا۔ اور اس پر ایسے عجیب و غریب عذاب نازل ہوں گے جو مخلوق نے اس سے پیشتر نہ دیکھے ہوں گے یعنی طاعون، قحط، دریائے دجلہ کی طغیانی طوفان اور باد و باران وغیرہ اور اس شہر کی تباہی اس وقت ہو جائے گی جبکہ اس میں تین قسم کے جھنڈے (تین گروہ) باہمی اختلاف کے لئے جمع ہوں گے۔ ایک زرد رنگ کے جھنڈے، دوسرے مغربی سمت کے جھنڈے اور تیسرے آس پاس کے جھنڈے۔" یہ شاید باہمی قتل و غارت یا جنگ کی اطلاع ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ اوّل دن بغداد میں شدید ترین زلزلہ آجائیگا۔ جس سے کثیر آبادی ختم ہو جائے گی۔ کل اہل عراق اس حادثے سے مضطرب ہو جائینگے۔

دوپہر کو آندھی چلنے لگے گی۔ اور نئے نئے عذاب کا نزول شروع ہو جائے گا۔

نوٹ:۔ یہ تمام علامتیں ظہورِ امام مہدیؑ کے سلسلے میں بیان ہوئی ہیں۔

دریائے سادہ میں پانی کی آمد

ایران میں شہر قم کے قریب دریائے سادہ میں دوبارہ پانی نمودار ہو جائے گا۔

نوٹ:۔ یہ دریا رسولِ خداؐ کی ولادت کے وقت خشک ہو گیا تھا مگر اب دوبارہ اس میں پانی ظاہر ہو رہا ہے۔ زیارتِ معصومۂ قم سے مشرف ہونے والے اصحاب اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

مصر میں امیر الامراءٔ

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ دورِ آخر میں عربوں کے امیر الامراءٔ کا قیام مصر میں ہوگا۔ لیکن عربوں سے حکومت چھن جائے گی۔ دوسرے افراد ان پر غالب آ جائیں گے۔ اور اہلِ مصر اپنے امیر کو قتل کر دیں گے۔

مندرجہ بالا پیشنگوئیوں میں سے کئی تو پوری ہو چکی ہیں جیسے عبدالکریم قاسم کا قتل، ٹرانسسٹرز اور مشینوں کی ایجاد، عورتوں کے متعلق پیشنگوئیاں۔ باقی بھی اپنے وقت پر پوری ہو جائیں گی۔ یہ تمام پیشنگوئیاں عترتِ اہلبیتِ رسالتؐ کے علمِ وہبی کی واضح دلیل ہیں۔

علمِ جفر کی شان

اہلِ سنّت کے علامہ کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی اپنی کتاب "الدر المنظم" میں لکھتے ہیں کہ

"میں نے اس کتاب ناطق میں صحیح طور پر حضرت امام علیؑ ابن ابی طالب کے جفر کا ذکر کیا۔ جو ایک ہزار سات سو (۱۷۰۰) علوم کی کنجی ہے اور چراغِ نجوم ہے۔ اور علمِ حروف کے علماء کے نزدیک قضا و قدر کی تختی ہے۔ کہا گیا ہے کہ

لوح وقلم کی کنجی، قضا وقدر کا راز، اور علم لدنی کی کلید ہے۔ یہ علم جفر دو کتابیں ہیں جن میں سے ایک کو حضرت علیؑ نے برسرِ منبر کوفہ دورانِ خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس خطبے کا نام "البیان" ہے۔ (اس خطبہ کا بیان ابھی آنکے ہے) دوسری کتاب وہ ہے کہ رسولؐ اللہ نے صیغۂ راز میں اس علم سے حضرت علیؑ کو مطلع فرمایا تھا۔ حضورؐ نے اپنے اس قول میں اسی بات کی جانب اشارہ فرمایا تھا کہ "میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں"۔ حضورؐ نے اس پوشیدہ علم کی تدوین کا حکم حضرت علیؑ کو دیا تھا۔ حضرت امام علیؑ نے اس کو ایک جفر یعنی ورق میں حضرت آدمؑ کے صحیفوں کی طرز پر متفرق حروف کی شکل میں لکھ لیا تھا۔ اور یہ جفرِ جامع اور نور لامع کے نام سے لوگوں کے درمیان مشہور ہے۔ کہا گیا ہے کہ جفر اور جامع میں وہ تمام چیزیں تحریر ہیں جو اولین کے ساتھ گذر چکیں۔ اور آخرین کے ساتھ واقع ہونے والی ہیں۔ امام جعفر صادقؑ بابِ کبیر کے خاتمہ پر ت اور ث الی آخرھا کو قرار دیا ہے۔ اور بابِ صغیر کو ابجد سے لے کر ترشت تک قرار دیا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ ہمیں سے جفر ابیض ہے۔ اور ہمیں سے جفر احمر ہے اور ہمیں سے جفرِ جامع ہے۔ اس شانِ عظیم کے بھیدوں کو حضرت علیؑ کی اولاد کے ائمہؑ ہی جانتے ہیں جو راسخون فی العلم ہیں۔ (بحوالہ ینابیع المودۃ محمد سلیمان حنفی مفتی اعظم قسطنطنیہ باب ۶۸)

مامون عباسی نے حضرت امام علیؑ ابن موسیٰ رضاؑ کی خدمت میں خط لکھا کہ وہ آپؑ کی بیعت کرنا چاہتا ہے۔ تو امام نے جواب دیا "تم تو ہمارے حقوق کو جانتے ہو لیکن تمہارے باپ نے اُن کو نہیں جانا۔ تم کہتے ہو کہ "میں آپؑ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن جفرِ جامع یہ دلالت نہیں کرتا کہ تو میری بیعت کر پائے گا"۔

اتنا لکھنے کے بعد علامہ کمال الدین تحریر کرتے ہیں کہ "اکثر علمائے اللہ نے اس علم کو پوشیدہ رکھا ہے۔ اور بڑے بڑے عاقلوں کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ علم جفر میں سے کسی چیز کو جان سکیں۔ اگر اس کے بعض

اسرار کو جان جائیں تو اپنی خاص ترکیب کے ساتھ نتائج برآمد کریں کیونکہ علمِ جفر سے مختلف قسم کے قہر، غلبہ اور عدل امانت، زندہ کرنا اور ان کے علاوہ دوسرے فوائد و جواہر پیدا ہوتے ہیں۔ اِسی علمِ جفر میں اسمِ اعظم، حضرت آدمؑ کا تاج، حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی اور آصفؑ برخیا کا حجاب موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؑ کے دروازے پر علماء و حکماء کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ (تاکہ اُن سے اپنے علمی مسائل کا حل پوچھیں۔ (الدر المنظم بحوالہ ینابیع المودۃ باب ۶۸)

نقطہ کے اسرار

ینابیع المودۃ میں مولانا محمد سلیمان حنفی مفتی اعظم قسطنطنیہ نے باب ۱۴ میں الدر المنظم محمد بن طلحہ شافعی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ "تمہیں معلوم ہو کہ تمام آسمانی کتب کے راز قرآن میں موجود ہیں۔ اور قرآن کا علم سورہ فاتحہ میں موجود ہے۔ تمام سورہ فاتحہ کا علم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں موجود ہے۔ تمام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا علم اس کے بائے میں موجود ہے اور تمام بائے بسم اللہ کا علم نقطہ بائے میں موجود ہے اور میں وہ نقطہ ہوں جو بسم اللہ کی بائے کے نیچے موجود ہے"

متذکرہ کتاب میں اسی مقام پر حضرت علیؑ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ۔ علم ایک نقطہ ہے جس کو جاہلوں نے زیادہ کر دیا ہے" (ظاہر ہے کہ وہ نقطہ علی علیہ السلام ہیں)

الف کی اہمیت

اسی جگہ حضرت علی علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی ہے کہ "الف" وحدت پر دلالت کرتا ہے جس کو راسخون فی العلم جانتے ہیں۔

ارشادِ حسینؑ ابنِ علیؑ

ینابیع المودۃ کے باب ۶۴ میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا یہ ارشاد موجود ہے کہ "جس علم کی طرف حضرت محمد مصطفٰیؐ نے دعوت دی تھی وہ علم حروف کے "الف" کی "لام" میں تھا۔ اور "الف" کے "لام" کا علم "الف" میں ہے۔ "الف" کا علم "نقطے" میں ہے نقطے کا علم "معرفتِ حقیقیہ" میں موجود ہے۔ معرفتِ حقیقیہ کا علم "علمِ ازل" میں

موجود ہے "علمِ ازل" "مشیت" میں موجود ہے۔ اور "علمِ مشیت" "غیب ہویت" میں موجود
ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی طرف اللہ نے اپنے نبیؐ کو اپنے اِس قول کے ساتھ دعوت
دی تھی فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (پ ۲۶ سورہ محمدؐ ع ۲ ۱۹) اور اِس
ارشادِ الٰہی میں جو لفظ "اِنَّہ" ہے اس میں جو "ہ" موجود ہے وہ غیب ہویّہ
کی طرف راجع ہے۔"

حروفِ مقطعاتِ قرآنی کے اسرار

قرآن مجید میں جو حروفِ مقطعات ہیں ان کی کُل تعداد ۷۸ ہے۔ جب
ان کی تلخیص کی جائے یعنی جتنے حروف مکرّر وارد ہوئے ہیں انہیں ایک ہی دفعہ
لیا جائے تو صرف ۱۴ حروف باقی رہتے ہیں۔ جو چہاردہ معصومین کی جانب اشارہ
ہے اور جب اُن سے بامعنی عبارت بنائی جاتی ہے تو صِرَاطُ عَلِیٍّ حَقٌّ نُمْسِکُہٗ
بنتی ہے۔ جس سے حضرت علیؑ قائدِ ثقل دوم سے تمسک کی ہدایت ملتی ہے۔

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حروفِ مقطعات کا ایک ایک حرف اللہ
سبحانہٗ تعالیٰ کے ایک ایک اسم کو بتانے والا ہے۔ جن میں صرف ایک حرف "الف"
کے متعلق کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ الف ملفوظی کے اعداد ۱۱۱
ہوتے ہیں یعنی ۱+۱۰+۱۰۰ جب اس کے حروف بنائیں تو ایک کا مطلب "ا"
دس کا مطلب "ی" اور سَو کا مطلب "ق" یعنی تین حرف پیدا ہوئے۔ جب اس کو
دگنا کیا تو ۲۲۲ ہوئے یعنی ۲+۲۰+۲۰۰ جب ان تینوں اعداد کے حروف بنائے
تو ب۔ ک۔ ر پیدا ہوئے۔ اور جب تین گُنا کیا تو ۳۳۳ ہوئے یعنی ۳+۳۰+۳۰۰
جن سے ج۔ ل۔ ش پیدا ہوئے۔ اور چوگنا کرنے سے ۴۴۴ بنے یعنی ۴+۴۰+۴۰۰
جن سے د۔ م۔ ت پیدا ہوئے۔ پانچ گنا کرنے سے ۵۵۵ بنے یعنی ۵+۵۰+۵۰۰
بنے یعنی جن سے ہ۔ ن۔ ث پیدا ہوئے۔ چھ گنا کرنے سے ۶۶۶ بنے یعنی ۶+۶۰+۶۰۰
جن سے و۔ س۔ خ پیدا ہوئے۔ سات گنا کرنے سے ۷۷۷ بنے یعنی ۷+۷۰+۷۰۰
جن سے ز۔ ع۔ ذ پیدا ہوئے۔ آٹھ گنا کرنے سے ۸۸۸ بنے یعنی ۸+۸۰+۸۰۰

جن سے ح۔ ف۔ ص پیدا ہوئے نو گنا کرنے سے ۹۹۹ بنے یعنی ۹+۹۰+۹۰۰ جن سے ط۔ ص۔ اور ظ پیدا ہوئے۔ اِس طرح ۲۷ حروف پیدا ہو گئے۔ اب رہا ۲۸ واں حرف جو حروفِ ابجد میں ضظغ کا آخری حرف "غ" ہے۔ جس کے اعداد ۱۰۰۰ ہیں۔ اور ہزار کو عربی زبان میں "الف" کہتے ہیں۔ جب اس کے اعداد نکالیں تو ۱۱۱ ہوتے ہیں۔ جو حرفِ الف کے ہیں۔ اُلف اور اَلِف میں تجنیس خطی ہے۔ تو وہ بھی گویا الف ہی سے پیدا ہوا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ تمام حروف الف ہی سے نکلے۔ اور اَلِف ذاتِ خدائے واحد کا پتہ دیتا ہے۔ کیونکہ اعداد کے لحاظ سے الف کا مطلب ایک ہے۔ الف اور ایک کی شکل بھی ایک جیسی ہے۔

بہر حال ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ حروف کے اسرار کو مخلوقات میں اہلِ بیتؑ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ اہلِ بیت کو اللہ نے علم جفر اور علم اسرارِ حروف خود عطا فرمائے تھے۔ جن کی وجہ سے ان کو تمام کائنات کے راز اور واقعات اور اشیائ کے خواص معلوم تھے۔ پس سائنسی علوم میں بھی اگر ثقل دوم سے رہنمائی حاصل کی جائے تو کامیابی آسان ہو جائے۔

نقش امام جعفرؑ صادق بر نگینۂ حدید

تاثیر و اسرارِ حروف کے سلسلے میں ہم وہ چیز ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس کی سید ابنِ طاؤس نے روائت کی ہے کہ ایک شخص جناب امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں ملک جزیرہ کے حاکم سے خائف ہوں۔ دشمنوں نے اُسے میرے خلاف بھڑکا دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں قتل نہ کر دے۔ حضرتِ امام نے فرمایا تو حدید چینی کی ایک انگوٹھی بنوا لے۔ اور نگینے پر ایک طرف تین سطروں میں کلماتِ ذیل کندہ کرا لے۔ پہلی سطر میں "اَعُوْذُ بِجَلَالِ اللّٰہِ"، دوسری سطر میں "اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ" تیسری سطر میں "اَعُوْذُ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ" اور نگینے کی پشت پر دو سطروں میں یہ الفاظ کندہ کرا لے۔ پہلی سطر "اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَکُتُبِہٖ" دوسری سطر میں "اَنِیْ وَاثِقٌ"

بِاللهِ وَرُسُلِهٖ" اور نگینے کے کناروں پر گرداگرد" اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُخْلِصاً" کھدوالے۔ یہ انگوٹھی ہاتھ میں پہننے سے ہر مشکل آسان ہو جائیگی اور نظر بد کا اثر نہ ہوگا۔ اس نگینے کی حفاظت ضروری ہے۔ نجاست اس پر نہ لگنے پائے حمام اور بیت الخلا میں اس کو نہ لے جائے۔ کیونکہ اس میں اسرارِ خدا ہیں اور شیعانِ اہلبیتؑ جو اپنے دشمنوں سے ڈرتے ہیں ان کو لازم ہے کہ اس انگوٹھی کو اپنی جان کے برابر رکھیں۔ اپنے دشمنوں سے چھپائیں اور یہ اسرار سوائے معتمد اور معتبر آدمیوں کے کسی کو نہ بتائیں۔ راویٔ حدیث کا بیان ہے کہ میں نے خود اس کا تجربہ کیا اور اس کا اثر اسی طرح پایا۔ نقشِ مذکور کی شکل درج ذیل ہے۔

(اوپر کی جانب)

اَعُوْذُ بِجَلَالِ اللهِ
اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ
اَعُوْذُ بِرَسُوْلِ اللهِ

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ

(جانبِ پشت)

اٰمَنْتُ بِاللهِ وَكُتُبِهٖ
اِنِّیْ وَاثِقٌ بِاللهِ وَرُسُلِهٖ
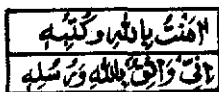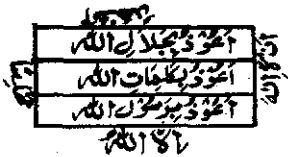
نوٹ:۔ یہ چاروں کلمات یعنی اَشْهَدُ - اَنْ لَّآ اِلٰهَ - اِلَّا اللهُ - مُخْلِصاً۔ نگینے کی دبازت (موٹائی) پر کندہ کرائے جائیں۔

تاثیرِ حروف کے دو ثبوت

اگر کوئی شخص تاثیرِ حروف دیکھنا چاہے تو اس کے لئے ہم دو خاص عمل پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک بعض باعمل بزرگوں سے اور دوسرا کتاب "جنات الخلود" سے سے معلوم ہوا ہے۔

(۱) اگر کسی کو بچھو کاٹ لے تو دوسرا شخص یہ عمل کرے کہ:۔

پانی کا ایک پیالہ بھر کر اپنے سامنے رکھ لے۔ اور کہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَا۔۔۔۔۔ اور فوراً ہی جہاں تک زہر چڑھا ہو وہاں سے پاؤں کے

انگوٹھے تک بچھو کے کاٹے ہوئے شخص کے جسم پر ہاتھ پھیر دے اور اُس پیالے میں سے پانی کا ایک گھونٹ پی کر کہے "نَعِیْن" تو بزرگوں کا قول ہے کہ زہر کا اثر اور درد فوراً دور ہو جائیں گے۔

(۲) اگر کسی کی داڑھ یا دانت میں درد ہو تو دوسرا شخص یہ عمل کرے کہ مریض کو کہے کہ وہ اپنی انگشتِ شہادت درد والی جگہ رکھے۔ اور عمل کرنے والا شہتوت کی لکڑی کا ایک ٹکڑا لے اور اس پر لکھے "نطعفف" اور ایک چھوٹی میخ لے کر "ن" میں گاڑ دے اور مریض سے پوچھے کہ "درد بند ہوا یا نہیں؟" مگر مریض انگلی نہ ہٹائے اور "ہاں" یا "نہ" میں جواب دے۔ اگر درد بند نہ ہو تو دوسرے حرف "ط" میں دوسری میخ گاڑ دے پھر بھی بند نہ ہو تو تیسرے حرف "ع" میں وعلی ہذا القیاس انشاء اللہ کتاب "جنات الخلود" کے مطابق حروف پورے نہ ہونگے درد بند ہو جائے گا۔

چونکہ اہلبیت طاہرین تمام حروف کی سب تاثیرات سے واقف تھے اس لئے دردوں اور بیماریوں کو دور کرنا ان کے لئے مشکل نہ تھا۔

پس حقیقت صرف یہ ہے کہ دنیا کی تمام مشکلات کا حل، تمام دُکھوں، دردوں اور پسماندگیوں کا علاج اور امّت کی ترقی و خوشحالی کا راستہ صرف تمسک بالثقلین ہے یعنی قرآن مجید اور عترتِ رسولؐ اہلبیتِؑ طاہرین کی پیروی ہے حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ سے بہتر کوئی پیشوا نہیں اور کوئی اُنکے برابر نہیں۔

شانِ علیؑ بزبانِ علیؑ

قائدِ ثقلِ دوم، قرآنِ ناطق، مولائے کائنات امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے مسجد کوفہ کے منبر پر یہ "خطبۃ البیان" ارشاد فرمایا۔

"میں وہ شخص ہوں کہ میرے پاس غیب کی کنجیاں ہیں کہ اُن کنجیوں کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا ــــــ میں ہر چیز کی حقیقت سے خبردار اور آگاہ ہوں ــــ میں وہ شخص ہوں جس کی شان میں رسولِ خدا نے فرمایا ہے کہ "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس (شہرِ علم) کا دروازہ ہے" ــــــ میں ذوالقرنین ہوں جس کا ذکر کتبِ سماوی میں مذکور رہے جو اس سے پہلے نازل ہوئیں ــــ میں ہوں حجرِ مکرّم (بزرگ پتھر) جس سے بارہ چشمے جاری ہوئے (یعنی دوازدہ آئمہؑ کی امامت) ــــ میں ہوں وہ شخص جس کے پاس سلیمانؑ کی انگوٹھی موجود ہے۔ (یعنی میں تمام مخلوقاتِ جن والنس وغیرہ میں متصرّف اور حاکم ہوں) ــــ میں ہوں وہ شخص جو خلائق کے حساب کا متکفل اور ذمہ دار ہوا ــــ میں لوحِ محفوظ ہوں (کہ میرے ضمیر مہر تنویر میں تمام حقائقِ کونی و الٰہی کی صورتیں ثابت اور قائم ہیں) ــــ میں لوگوں کے دلوں اور ظاہر و باطن کی آنکھوں کو خیر و شر کی طرف پھیرنے والا ہوں۔ ان کا مرجع اور بازگشت ہماری طرف ہے۔ اور اُن کا حساب ہم پر اور ہمارے ذمہ ہے ــــ میں ہوں وہ شخص جس سے رسول نے فرمایا "اے علیؑ صراطِ مستقیم تیرا راستہ ہے اور موقف تیرا موقف۔ (یعنی جس چیز پر تو ثابت اور راسخ ہے اسی پر ثابت اور قائم ہونا چاہیئے) یا یہ کہ پل صراط تیرا صراط ہے اور تو اس کا صاحب اور متصرّف ہے۔ جس کو تو چاہے برقِ خاطف (چمکنے والی بجلی) کی طرح گذار دے اور جنّاتِ نعیم میں اس کو پہنچا دے اور جس کو تو چاہے اوندھے منہ درکاتِ جہنّم میں بھیجے اور بعض کو عبور و مرور

کی سختیوں اور رنج و آلام میں گرفتار کرے۔ اس اخلاص و مراتبِ اعتقاد کے تفاوت کے موافق جو تجھ سے رکھتے ہیں اور اسی طرح قیامت کے موقف ہیں اور تجھ سے متعلق ہیں۔ جس کو چاہے اپنی حمایت کے سائے میں لے کر وہاں کی سختی اور محنت اس پر آسان کر دے۔ اور بعض کو ایامِ حساب کے (جو پچاس ہزار سال ہیں) گذرنے کے انتظار کی عقوبت اور عذاب میں مبتلا کرے") ـــــ میں ہوں وہ شخص جس کے پاس گذشتہ اور آئندہ کے موافق کتابِ خدا کا علم ہے ـــــ میں ہوں آدمِؑ اوّل، میں ہوں نوحِؑ اوّل، میں ہوں ابراہیمؑ جبکہ آگ میں ڈالے گئے۔ میں ہوں مومنوں کا مونس اور غمگسار ـــــ میں ہوں سببوں کا کھولنے والا اور سبب بنانے والا ـــــ میں ہوں بادلوں کا پیدا کرنے والا ـــ میں ہوں درختوں کو پتّے دینے والا اور ان کو سرسبز کرنے والا ـــ میں ہوں چشمے نکالنے والا۔ اور نہروں و ندیوں کو جاری کرنے والا ـــــ میں ہوں زمینوں کا بچھانے والا اور آسمانوں کا بلند کرنے والا ـــــ میں ہوں وہ شخص کہ میرے پاس فصل خطاب ہے (یعنی وہ خطاب جو حق و باطل کو جُدا جُدا کر دے اور درست و غلط میں تمیز کر دے۔ یا ایسا کلام جو حقائق کے کھولنے اور معارف کے سمجھنے اور سمجھانے میں نہائت واضح اور ظاہر ہو۔) ـــــ میں ہوں اہلِ بہشت پر بہشت کے درجات اور اہلِ جہنّم پر جہنّم کے درکات (یعنی طبقات) تقسیم کرنے والا۔ میں ہوں وحیِ خدا کی تفسیر و بیان ۔ میں (صغائر و کبائر اور خطرات و شکوک سے عمداً اور سہواً) معصوم ہوں جس کی عصمت خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہے ـــــ میں ان لوگوں پر کہ جو ملائکہ اور نفوسِ قدسی کی جنس سے آسمانوں میں ہیں اور طبقاتِ زمین کے رہنے والے انس و جن اور ملائکہ ارضی وغیرہ پر خدا کی وحدانیت اور کمالِ قدرت کی حجّتِ قاطع اور بُرہانِ ساطع ہوں ـــــ میں علمِ الٰہی کا خزانچی ہوں، میں ہوں عدل و عدالت سے موصوف اور قائم ـــــ میں ہوں دابّۃ الارض جو قیامت کے علامات و نشانات میں سے ہے ـــــ میں ہوں وہ نفخہ اولیٰ جو زمین

کو زور سے ہلانے اور جنبش میں لانے والا ہے۔ اور میں رادفہ (یعنی نفخۂ دوم اور رادف اس لئے نام رکھا گیا کہ پہلے کے بعد آنے والا ہے جو رَدْف سے لیا گیا ہے۔ اور راجفہ رجف سے بنا ہے جس کے معنی شدّتِ تحریک ہیں) ــــ میں ہوں صیحہ (چیخ) برحق جو کہ خلقت کے باہر نکلنے اور محشور ہونے کے دن ہو گا۔ وہ دن (یعنی روزِ محشر) جس سے آسمانوں اور زمین کی مخلوقات پوشیدہ نہیں۔ ــــ میں ہوں علیؑ بن ابی طالبؑ جس کی آواز جنگوں میں بجلی کی آوازوں کی طرح ہے ــــ میں وہ شخص ہوں جس کو اللہ نے اوّل اپنی حجّت پیدا کیا، اس کے اطراف پر لکھا کہ اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اور علیؑ اللہ کے ولی اور وصیّ رسول ہیں۔ پھر عرش کو پیدا کیا اور اس کے چاروں ارکان پر کلمات مذکورہ لکھے۔ پھر خدا نے طبقاتِ زمین کو پیدا کیا اور اس کے اطراف و جوانب پر کلماتِ مذکورہ تحریر فرمائے۔ اس کے بعد لوح کو پیدا کیا اور اس کے کناروں پر کلماتِ مذکورہ بالا قلمِ قدرت سے تحریر فرمائے ــــ میں وہ ساعت ہوں کہ جو شخص اس کو جھٹلائے اور اس کا منکر ہو، اس کے لئے دوزخ واجب ہے (اس ساعت سے مراد روزِ قیامت ہے) ــــ میں وہ کتاب ہوں جس میں کسی قسم کا کوئی شک و ریب نہیں ہے (یعنی قرآنِ ناطق) ــــ میں خدا کے وہ اسمائے حسنیٰ ہوں جن کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کو ان اسمائے سے پکارا جائے ــــ میں وہ نور ہوں جس سے موسیٰؑ نے روشنی طلب کی تو ہدایت پائی ــــ دنیا کے محلّوں اور عالم کی عمارتوں کو منہدم کرنے والا میں ہوں ــــ مومنوں کو ان کی قبروں سے نکالنے والا میں ہوں ــــ میں ہوں وہ شخص جس کے پاس انبیائے علیہم السّلام کی کتابوں میں سے ہزار کتابیں موجود ہیں ــــ میں ہوں وہ شخص جو دنیا کی ہر لغت و زبان میں کلام کرتا ہے ــــ میں ہوں نوحؑ کا صاحب و رفیق اور ان کا نجات دینے والا اور میں ہوں ایوبؑ کا صاحب جب وہ انواع و اقسام کے

رنج وبلا میں مبتلا تھے۔ ان کو ان بلاؤں سے نجات دینے والا اور ان کو شفاعطا کرنے والا میں ہوں۔ اور میں یونسؑ کا صاحب اور نجات دہندہ ہوں۔ میں ہوں جس نے ساتوں آسمانوں کو اپنے نور اور خدا کی قدرت سے قائم کیا ہے ــــــ میں وہ شخص ہوں کہ میرے سبب ابراہیمؑ خلیل پروردگار عالمین پر اسلام لائے اور اس کی بزرگی اور فضل کا اقرار کیا ــــــ موسیٰؑ کلیم اللہ کا عصا میں ہوں۔ اور میں اس کے ذریعے سے تمام مخلوق کی پیشانی کے بالوں کو پکڑنے والا ہوں۔ اور ان پر قابض و متصرف ہوں ــــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے عالم ملکوت میں نظر کی۔ پس اپنے سوا اور کوئی چیز نہ پائی اور وہ غیر بے شک غائب تھا[۱] ــــــ میں وہ شخص ہوں کہ خلقت کے اعداد اور گنتی کو شمار کرتا اور معلوم کرتا ہوں۔ اگرچہ وہ بہت ہیں اور یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ان کو پہنچاؤں ــــــ میں وہ شخص ہوں کہ قول اور کلام میرے پاس متغیّر اور متبدّل نہیں ہوتا اور میں بندگانِ خدا پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں ــــــ میں زمین میں خدا کا ولی ہوں اور امرِ خدا میرے سپرد کیا گیا ہے (اولی الامر کا مفہوم یہ ہے) اور میں اس کے بندوں پر حکم کرتا ہوں جیسا کہ فرمایا ہے یا جیسا میں چاہتا ہوں ــــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے ساتوں آسمانوں کو بلایا۔ انہوں نے میرا حکم قبول کیا۔ پس میں نے ان کو حکم دیا کہ اور وہ قائم ہو گئے ــــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے نبیوں اور رسولوں کو مبعوث کیا ہے ــــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے سورج اور چاند کو بلایا ان سے اطاعت طلب کی پس انہوں نے میرا کہنا قبول کیا ــــــ میں نے جملہ عوالم کو پیدا کیا ہے (بحکمِ خدا) ــــــ میں ہوں زمینوں کا بچھانے والا اور تمام ولایتوں کے حالات سے خبردار ہوں ــــــ میں ہوں امرِ خدا اور اس کی روح ــــــ میں وہ شخص ہوں کہ خدا تعالیٰ نے جس کے دشمنوں کیلئے دو فرشتوں سے فرمایا کہ تم دونوں ہر سرکش ناشکرے کو دوزخ میں ڈالو۔ میں نے پہاڑوں کو زمین کی حفاظت کے لئے

---

[۱] (یعنی میرے مخالفین (اغیار) کا کسی جگہ تصرف عالم ملکوت میں نظر نہ آیا جبکہ میرا تصرف ہے)

لنگر کیا ہے اور مخلوقات کی سکونت کے لئے میں نے زمینوں کو بچھایا ہے۔ اور میں ہوں چشموں کو نکالنے والا اور کھیتوں کو اگانے والا اور درختوں کو بلند کرنے والا اور میووں کو نکالنے والا ــــــ میں ہوں وہ شخص جو لوگوں کے لئے کھانوں کا اندازہ کرتا ہے اور بارش برساتا ہوں اور رعد و برق کی آوازیں سنواتا ہوں ــــــ میں ہوں سورج کو روشن کرنے والا اور صبح کو نکالنے والا اور کشتیوں کو سمندر میں چلانے والا ــــــ میں ہوں وہ شخص کہ قیامت کو برپا کروں گا اور میں ہوں وہ شخص کہ اگر مجھے موت دی جائے تو نہیں مروں گا اور اگر مجھے قتل کیا جائے تو میں قتل نہ ہوں گا ــــــ میں وہ شخص ہوں کہ ساعت و بر آن میں جو چیز پیدا ہوتی ہے اس کو جانتا ہوں۔ اور میں وہ شخص ہوں کہ ان چیزوں کو جو دلوں میں گذرتی ہیں جانتا ہوں۔ اور آنکھوں کے جھپکنے کا حال مجھے معلوم ہے۔ اور جو کچھ لوگوں کے سینوں میں پوشیدہ ہے اس کا مجھے علم ہے۔ میں مومنوں کی نماز ہوں اور ان کی زکوٰۃ ہوں اور ان کا حج ہوں اور ان کا جہاد ہوں ــــــ میں ہوں وہ ناقور جس کا ذکر حق تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۝ سورۂ مدثر (جب صور پھونکا جائے گا اور نشر اوّل یعنی اوّل قبر سے اٹھانے اور برانگیختہ کرنے کا حساب میں ہوں اور یہ زندہ کرنے سے کنایہ ہے) اور اسی طرح نشر آخر یعنی عرصات کی طرف زمین کے اٹھانے کا صاحب میں ہوں اور میں وہ پہلا شخص ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نور کو پیدا کیا اور میں اور علیؑ ایک نور سے ہیں[1] ــــــ میں ہوں صاحب کواکب اور دولت کا دور کرنے والا۔ میں ہوں صاحب زلزلہ و راجفہ اور میں ہوں صاحب مقاصد و مطالب اور صاحب بلایا اور وہ کلام جو حق و باطل میں تمیز اور فرق کر دیتا ہے ــــــ میں ہوں اس

---

[1] یہ حدیث رسول کا حوالہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ حقیقت کے لحاظ سے میں اور رسول خدا ایک ہی ہیں کیونکہ نور ایک ہے۔

اِرم کا صاحب اور مالک جو بڑے عمودوں اور ستونوں والا ہے۔ ایسا ارم کہ جس کی مثل کسی شہر میں پیدا نہیں ہوا۔ اور وہ میرا ہے اور جو نفیس جواہرات وغیرہ اِس اِرم میں ہیں ان کی سخاوت اور ان کو خرچ کرنے والا میں ہوں ــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے ذوالفقار کی سعی و کوشش سے پہلے سرکشوں اور جباروں کو ہلاک کیا ہے ــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے نوحؑ کو اس کشتی میں سوار کیا جو انہوں نے تیار کی تھی۔ میں وہ شخص ہوں جس نے ابراہیمؑ کو آگ سے نجات دی اور عالمِ غربت میں ان کا مونس رہا۔ میں ہوں جو کنوئیں میں یوسفؑ کا مونس تھا۔ اور میں نے ان کو کنوئیں سے نکالا۔ موسیٰؑ و خضرؑ کا صاحب اور ان کا تعلیم دینے والا میں ہوں جس نے اسرارِ الٰہی کے غوامض اور حکمتوں کی ان کو تعلیم دی ــــ ملکوت اور عالم کون کے پیدا کرنے کا باعث اور سبب میں ہوں یا ان دونوں کا پیدا کرنے والا میں ہوں ــــ میں نقصانوں سے مبرّا و منزّہ ہوں۔ رحموں میں بچوں کو صورت دینے والا میں ہوں ــــ میں وہ شخص ہوں کہ مادر زاد اندھوں کو بینا کرتا ہوں اور برص و جذام کے مرض کو دور کرتا ہوں۔ اور جو کچھ دلوں میں ہے اس سے واقف ہوں۔ اور میں وہ شخص ہوں کہ تم کو اس چیز سے آگاہ و خبردار کرتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو ــــ میں وہ بعوضہ ہوں جس کی مثال اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمائی ہے (یعنی خدا حیا نہیں کرتا اس بات سے کہ وہ مثل بیان کرے مچھر کی یا اس سے بڑی چیز کی یعنی اس کی قدرت کی ایک آیت) ــــ میں وہ شخص ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ظلمت اور تاریکی میں میری درخواست اور التماس کو قبول فرمایا ــــ میں ہوں وہ شخص کہ اللہ تعالیٰ نے میری حقیقت کو قائم و مہیا کیا جبکہ تمام مخلوقات ظلمت و ذلیتی کے بھنور میں گرفتار تھی اور اس مخلوق کو میری اطاعت کی طرف دعوت دی پس جب وہ ظلمت روشن اور ظاہر ہو گئی اور وہ مخلوقاتِ عالم

وجود میں آگئی انہوں نے میری اطاعت و فرمانبرداری سے انکار کردیا چنانچہ حق تعالیٰ خود اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے یعنی پس جس وقت وہ ان کے پاس آیا انہوں نے اس کی قدر و منزلت نہ پہچانی اور اس کے منکر و کافر ہو گئے ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنایا ہے ـــــ میں وہ شخص ہوں جو اپنی اولاد کے نیکو کاروں کے ساتھ عرش خدا کا اٹھانے والا ہے۔ میں وہ شخص ہوں جو لوائے حمد (حمد کا جھنڈا) اٹھانے والا ہے۔ میں وہ شخص ہوں جو معنیٔ قرآن اور کتب گذشتہ کی تاویل سے خوب واقف ہے میں علم میں راسخ کیا گیا ہوں ـــــ میں ہوں وہ وجہ اللہ کہ آسمانوں اور زمین میں وجہُ اللہ کے سوائے ہر چیز ہلاک اور فنا ہونے والی ہے۔ میں ہوں جبت اور طاغوت کا وہ صاحب جو ان کا ہلاک کرنے والا ہے۔ (جبت و طاغوت سے مراد شیطان اور مشرکوں کے بُت ہیں) ـــــ خدا کا وہ دروازہ ہوں جس کا ذکر آیۂ "اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا اعراف الخ" میں کیا گیا ہے یعنی "جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان سے سرکشی اور استکبار اختیار کیا ان کے لئے آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ بہشت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے (اور یہ بات محال ہے پس ان کا بہشت میں داخل ہونا بھی محال ہوگا) ہم مجرموں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں" ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ جبرئیلؑ اور میکائیلؑ نے میری خدمت کی ہے۔ میں وہ شخص ہوں کہ میرے لئے آفتاب کو دو دفعہ لوٹایا گیا۔ یعنی واپس لایا گیا۔ میں وہ شخص ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ و میکائیلؑ کو میری طاعت و فرمانبرداری کے لئے خاص کیا ـــــ میں ہوں صاحبِ طور، میں ہوں کتاب مستور، میں ہوں بیتِ معمور، میں ہی حرث و نسل ہوں اور میں وہ شخص ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میری طاعت اپنی مخلوق میں سے ہر ذی روح اور ہر متنفس پر فرض کی ہے ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ جو مخلوق کے اولین و آخرین کو

نشر اور برانگیختہ کروں گا۔ میں ذوالفقار کی کوششوں سے بدبختوں اور بدکاروں کو قتل کرنے والا ہوں اور ان کے خرمنِ حیات کو آتشِ غضب سے جلانے والا ہوں ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ مجھ کو حق تعالیٰ نے دین پر غالب کیا ہے، میں ظالموں سے بدلہ لینے والا ہوں میں ہی وہ شخص ہوں کہ جس کی طرف تمام امتوں کو دعوت دی گئی ہے اور میں وہ شخص ہوں کہ منافقوں کو حوضِ کوثر سے رد کروں گا ـــــ میں وہ دروازہ ہوں جس کو خدا نے کھولا ہے جو کوئی اس دروازے سے داخل ہوگا دونوں جہان کے ہر قسم کے مکروہات سے محفوظ اور امن میں رہے گا۔ میں وہ شخص ہوں کہ بہشت اور دوزخ کی کنجیاں جس کے ہاتھ میں ہیں ـــــ میں ہوں وہ شخص کہ جبّاروں نے نورِ خدا کے بجھانے اور اس کی حجت باطل کرنے کی کوشش کی پس اللہ تعالیٰ نے انکار کیا مگر یہ کہ اس کی ولائت اور اس کا نور کامل ہو۔ خدا نے اپنے پیغمبر کو دریائے کوثر عطا فرمایا اور مجھ کو دریائے حیات عنائت فرمایا۔ میں زمین میں رسولِ خدا کے ساتھ ہوں۔ پس جس کو چاہا میرا شناسا اور عارف بنایا اور جس کو نہ چاہا شناسا اور عارف نہ بنایا ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ سبز تتی ملکوت میں کھڑا ہوں جہاں روحیں حرکت کرتی ہیں وہاں میرے سوا کوئی سانس لینے والا نہ تھا ـــــ میں خاموشِ عالم ہوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بولنے والے عالم ہیں ـــــ میں ہوں قرنِ اولیٰ کا صاحب، موسیٰؑ سے مکالمہ اور گفتگو میں نے کی ہے اور میں نے فرعون کو غرق کیا ہے اور یومِ ظلّہ کا عذاب میں ہوں جو بنی اسرائیل پر بھیجا گیا ـــــ میں ہوں رحمتِ خدا کی آیات اور خدا کا رازدار اور میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، میں پیدا کرتا ہوں اور رزق دیتا ہوں۔ میں ہوں سننے والا اور میں ہوں دانا۔ میں ہوں بینا اشیأ کے ظاہر و باطن کا۔ میں ہوں وہ شخص جو ساتوں آسمانوں اور زمین کے ساتوں طبقوں کی ایک چشم زدن میں سیر کرتا ہے۔ میں ہوں اولیٰ یعنی نفخۂ اولیٰ اور میں ہوں ثانی یعنی نفخۂ ثانی ـــــ میں امت کا ذوالقرنین ہوں ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ صور پھونکوں گا اُس

روز جو کہ کافروں کے لئے بہت سخت ہے۔ اور جس میں بالکل آسانی احتمال نہیں ہے۔
میں ہوں اسم اعظم کہ وہ کھیعص ہے ـــــ میں ہوں وہ شخص کہ عیسیٰؑ کی
بچپن کی زبان میں گویا ہوا۔ میں ہوں یوسفؑ صدیق۔ میں ہوں وہ شخص جس کی توبہ اللہ
نے قبول کی۔ میں وہ شخص ہوں کہ آخر زمانہ میں عیسیٰؑ میرے پیچھے نماز پڑھیں گے۔
میں مختلف صورتوں میں پلٹنے والا ہوں ـــــ میں ہوں آخرت اور اولیٰ میں ہوں
چیزوں کا پیدا کرنے والا اور ان کو ظاہر کرنے والا۔ میں ہوں ان کا اعادہ کرنیوالا۔
اور ان کا حشر کرنے والا۔ میں زیتون کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہوں جس کی قسم
خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں کھائی ہے اور میں نبوّت کی قندیلوں میں سے ایک قندیل
ہوں کہ شمعِ رسالتؐ کو آفات کی ہواؤں سے محفوظ رکھتا ہوں ـــــ میں ہوں چیزوں
کا ظاہر کرنے والا اور موجودات کا پیدا کرنے والا جس طرح چاہوں ـــــ میں ہوں
وہ شخص کہ بندوں کے عملوں کو دیکھتا ہے مجھ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں نہ زمین میں نہ
آسمان میں ـــــ میں ہوں چراغ ہدایت، میں ہوں وہ مشکواۃ جس میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلّم کا نور ہے۔ میں وہ شخص ہوں کہ کسی عمل کرنے والے کا عمل میری معرفت
کے بغیر کوئی شے نہیں اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہے ـــــ میں ہوں آسمانوں اور
زمین کا خزانچی کہ سب میری قدرت کے تصرّف میں ہیں۔ میں ہوں عدل کا قائم کرنے
والا۔ میں زمانے کے ایک حال سے دوسرے حال میں تبدیل ہونے اور اس کے
حوادث سے خبردار اور آگاہ ہوں۔ میں ہوں وہ شخص کہ چیونٹیوں کی تعداد اور
ان کے وزن اور پہاڑوں کی مقدار اور ان کے وزن اور بارش کے قطروں کے
شمار کو جانتا ہوں ـــــ میں اللہ تعالیٰ کی آیاتِ کبریٰ ہوں جو اللہ نے فرعون کو
دکھائیں لیکن فرعون نے عصیان اور نافرمانی کی ـــــ میں ہوں وہ شخص جس نے
دو قبلوں یعنی بیت المقدس اور کعبہ کی طرف منہ کیا ہے۔ اور میں دو دفعہ زندہ
کرتا ہوں۔ اور میں وہ شخص ہوں کہ چیزوں کو جس طرح چاہتا ہوں ظاہر کرتا ہوں
ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے کفّار کے منہ پر خاک کی مٹھی ڈالی۔ پس وہ

واپس ہوئے اور ہلاک ہوگئے۔ اور میں ہوں وہ شخص کہ پہلی امتوں میں سے ہزار امت نے میری ولائت کا انکار کیا پس اللہ تعالیٰ نے ان کو مسخ کر دیا —— میں وہ شخص ہوں کہ زمانے سے پہلے ہوں اور خروج کرنے والا ہوں اور آخری زمانے میں ظاہر ہونے والا ہوں —— میں پہلے مشرکوں کی گردنیں توڑنے والا ہوں۔ ان کی سلطنتوں سے ان کو نکالنے والا اور قیامتِ صغریٰ میں ان کو عذاب دینے والا ہوں میں ہوں جبت اور طاغوت کو سزا دینے والا اور ان کو خانہ کعبہ سے نکالنے والا۔ اور یغوث، یعوق اور نسر کو جو مشرکوں کے بت ہیں عذاب دینے والا ہوں —— میں ہوں ستر زبانوں میں بولنے والا، ہر چیز کا ستر طور پر فتویٰ دینے والا۔ میں ہوں وہ شخص کہ جانتا ہوں ہر چیز کو جو رات اور دن میں ایک چیز کے بعد پیدا اور ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ تمام امور سے کنایہ ہے یعنی میں ہر ایک امر کو جو قیامت تک واقع ہوگا جانتا ہوں —— میں وہ شخص ہوں کہ مشرقوں اور مغربوں میں مخلوقات کے عملوں کو دیکھتا ہوں۔ اور ان کی کوئی چیز مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے —— میں وہ شخص ہوں کہ میرے پاس اسمأ اعظم الٰہی سے بہتر اسم ہیں —— میں ہوں کعبۃ الحرام اور بیت الحرام اور بیت العتیق اور میں وہ شخص ہوں کہ اللہ مجھ کو ایک چشم زدن میں مشرق اور مغرب یعنی تمام روئے زمین کا مالک کرے گا —— میں ہوں محمدؐ مصطفےٰ (یعنی نفسِ رسولؐ ہوں)۔ میں ہوں علیؑ مرتضیٰ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا علیؑ مجھ سے ظاہر ہوا ہے۔ میں وہ شخص ہوں کہ روح القدس سے میری مدح کی گئی ہے —— میں صاحب فراست ہوں کہ کوئی گناہ اور اشتباہ مجھ پر واقع نہیں ہوتا —— میں وہ شخص ہوں کہ اشیأ وجودیہ کو جس طرح چاہتا ہوں ظاہر کرتا ہوں۔"

(دیکھیئے کوکبِ دُرّی ترجمہ مناقبِ مرتضوی مصنفہ مولانا محمد صالح حنفی چشتی کشفی باب سوم صـ۱۹۶ تا صـ۲۱۲)

"الف" اور "ب" کا راز

•

حضرت امیر المومنین، امام المتقین، قائد حر المجلیین، سید العارفین، یعسوب الدین، فاتح بدر و حنین، والدِ حسنٌ و حسینٌ، زوجِ بتولٌ، وصیِ رسولٌ، امام المشارق والمغارب، اسد اللہ الغالب، حضرت علی ابن ابیطالب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی جن عظمتوں کا خطبۃ البیان میں ذکر فرمایا اُن سب کے باوجود مولائے کائنات نے کسی بھی جگہ اپنی ذات کو خدا یا اِلٰہ نہیں فرمایا۔ بلکہ اپنی تمام عظمتوں، قوتوں اور اختیارات میں علیؑ ہوتے ہوئے بھی بارگاہِ معبودِ برحق میں نہایت عجز و بندگی کے ساتھ یہ مناجات کیا کرتے تھے۔

"اِلٰهی کَفٰی بی عِزًّا اَن اَکُونَ لَكَ عَبدًا وَکَفٰی بی فَخرًا اَن تَکُونَ لی رَبًّا اَنتَ کَما اُحِبُّ فَاجعَلنی کَما تُحِبُّ"

(مفاتیح الجنان)

یعنی "اے میرے معبود! میری عزت کے لئے یہی کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں۔ اور میرے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ میرا رب تو ہے۔ تو ویسا ہی ہے جیسا (رب) میں پسند کرتا ہوں۔ پس جیسا (بندہ) تجھے پسند ہے، مجھے بنا لے۔"

پس جب قائدِ ثقل دوم حضرت علی علیہ السلام اپنے آپ کو بندہ کہتے رہے ہیں تو حضرت علیؑ کو معاذ اللہ خدا کہنا اور سمجھنا زبان و ذہن سے حضرت علیؑ کی صداقت پر حملہ کرنا ہے یعنی مولا کو معاذ اللہ جھوٹا تسلیم کرنا ہے۔ گویا یہ دعویٰ کرنا ہے کہ حضرت علیؑ علیہ السلام معاذ اللہ تھے تو خدا لیکن اپنے آپ کو بندہ کہہ کر معاذ اللہ جھوٹ بولتے اور مخلوقات کو دھوکہ دیتے رہے۔ تو ایسی صورت میں علیؑ کچھ بھی نہ رہیں گے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

حضرت علیؑ کو معاذ اللہ خدا کہنے والے جاہل لوگ اصل میں قرآن مجید کے منکر ہیں۔ کیونکہ قرآن پاک کے پارہ ۷ سورۂ انعام کی آیت ۱۰۳ میں خدا کے متعلق بتایا گیا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کہ اس کو نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ پس خدا وہ ہے کہ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن حضرت علیؑ کو لوگوں کی نگاہیں دیکھتی رہیں وہ لوگوں کے سامنے موجود رہے۔ اس لئے ان کو خدا کہنا قرآن کو جھٹلانا ہے۔ جو نہایت ہی کافرانہ طرزِ عمل ہے۔

علاوہ ازیں قرآن پاک کے سورۂ اخلاص میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی شان یہ ہے لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُولَدْ ۙ کہ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ لیکن حضرت علیؑ کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ آپ صاحبِ اولاد تھے اور ابوطالبؑ کے فرزند تھے۔ اس لئے حضرت علیؑ ہرگز خدا نہیں ہو سکتے کیا کوئی باعقل و ہوش اور باادب انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت غازی عباسؑ علمدار حضرت علیؑ کے فرزند نہیں؟ نعوذ باللہ من ذالک۔ کیا کوئی عقلمند و باادب شخص یہ گستاخی کر سکتا ہے کہ ثانیٔ زہراؑ، وارثِ چادرِ تطہیر، شریکۃ الحسینؑ، مسافرہ شام، زینبؑ حزیں و غمگین کے دخترِ علیؑ ہونے ہی سے انکار کر بیٹھے؟ نعوذ باللہ من ذالک۔ نہیں۔ کوئی محبِ علیؑ ایسا نہیں کر سکتا۔ کوئی شریف النفس انسان اس مخدومہ و مظلومہ کے احسانات کا ایسا بدلہ نہیں دے سکتا۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ تاجدارِ وفا حضرت ابوالفضل العباسؑ علمدارِ لشکرِ مظلومین کربلا

حضرت علیؑ کے قابلِ فخر فرزند ہیں۔ اور جناب زینبؑ یقیناً مولا علیؑ کی بیٹی ہیں۔ ایسی صورت میں حسنینؑ کے والدِ گرامی قدر مولا علیؑ کو خدا ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

مزید یہ کہ قرآن مجید پارہ ۳ سورہ بقرہ آیت ۲۵۵ (جس کا نام آیت الکرسی ہے) قابلِ توجہ ہے۔ جس میں شانِ خدا یہ بتائی گئی ہے لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ کہ اس کو نہ ہی اونگھ آتی ہے اور نہ نیند" لیکن شبِ ہجرت کے واقعہ میں حضرت علیؑ کا بسترِ رسولؐ پر سونا ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اور حضرت علیؑ خود فرماتے ہیں کہ "میں بسترِ رسولؐ پر اس رات اتنی گہری نیند سویا کہ اتنی گہری نیند کبھی نہ سویا" پس حضرت علیؑ کو خدا کہنا یا سمجھنا قرآن مجید کا انکار ہے جو صریحاً کفر ہے۔

لہٰذا حضرت علیؑ کو (معاذاللہ) خدا وہی کہہ سکتا ہے جو قرآن کا منکر ہو۔ حضرت علیؑ کو جھٹلانے والا ہو۔ اور خاندانِ رسولؐ کی توہین کرنے والا ہو۔ یا پھر جس کی عقل کو نشوں نے معطّل کر دیا ہو۔ وہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ حضرت علیؑ "ب" کا نقطہ ہیں "الف" نہیں۔ کیونکہ خود انہوں نے اپنے آپ کو "بسم اللہ" کی "ب" کا نقطہ کہا ہے "الف" نہیں کہا ہے۔ اور حروفِ ابجد میں "ب" بعد میں آتا ہے "الف" پہلے ہے جو ذاتِ واحد خدا پر دلالت کرتا ہے۔ اور نقطے کے اوپر جو "ب" کی شکل "ٮ" ہے وہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ پاک پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس کے نیچے نقطے کا ہونا "نقطہ" کو ماتحت ثابت کرتا ہے۔ یعنی علیؑ ماتحتِ رسولِ اکرمؐ ہیں۔ رسولِ کریمؐ کا مقام علیؑ سے بلند ہے۔ اور "ا" کا حرف "ب" سے پہلے ہونا دلالت کرتا ہے کہ اللہ کی شان محمدؐ اور علیؑ دونوں سے بلند ہے۔

خلاصہ کتاب

یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی تمام مشکلات کا حل، انسانیت کے تمام دکھوں، دردوں اور تکالیف کا علاج اور امتِ محمدیہ کی ترقی و خوشحالی کا راستہ صرف "تمسک بالثقلین" یعنی قرآن مجید

اور عترتِ رسولؐ اہلبیتِ طاہرینؑ کی پیروی ہے۔ اور حضراتِ محمد و آلِ محمد علیہم السلام والصلوٰۃ سے بہتر پیشوا کوئی نہیں۔ تمام مخلوقات میں اُن جیسا عالم کوئی نہیں اور نہ ہی کوئی مخلوق ان کا ہمسر ہو سکتا ہے۔ خدایا ہم سب مسلمانوں کو اُن کے تعلیمات پر عمل پیرا ہونے، اُن سے علمی فیوض حاصل کرنے کی توفیقات کرامت فرمائے۔ سلام ہو اس پر جو رسولِ خداؐ کے پیغام کو تسلیم کر کے اس پر عمل کرے۔

تمام شد

ہدیۂ تشکّر

مولا کے فضل و کرم و برادرانِ ایمانی کی حوصلہ افزائی کے باعث کتاب ہٰذا کا تیسرا ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ یہ میری انتہائی احسان فراموشی ہوگی اور بے مروّتی کا مظاہرہ اگر میں اُن قدرشناسوں کی خدمات میں ہدیۂ تشکّر پیش نہ کروں جنھوں نے حقیر کی پشت پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے تقریری و تحریری تقاریظ سے اپنے حلقۂ ارادت میں میری محنت کو زیورِ تعریف و توصیف سے آرائش بخشی، میں ان تمام علماءِ کرام، زعماءِ عظام اور اکابرینِ قوم کا تہہِ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے قیمتی تاثرات، انمول تبصرے اور مقتدر آراء سے میری ہمت بڑھائی۔ بلاشبہ ان کے پرخلوص جذبات کا اظہار، میری ذہنی جلا اور فکری بقا کا دائمی سرمایہ ہے۔ ربِّ کریم ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

سرکار ادیبِ اعظم مولانا سیّد ظفر حسن صاحب نقوی امروہوی قبلہ مدّظلہ العالی، بشیر الملّۃ علاّمہ محمد بشیر صاحب قبلہ انصاری آف ٹیکسلا، تاج العلماء علاّمہ محمد تقی صاحب قبلہ مجتہد، زبدۃ العلماء آغا مہدی لکھنوی مدّظلہ، مولانا سیّد عنایت حسین صاحب قبلہ جلالوی، حضرت مولانا مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ، سرکار علاّمہ طالب جوہری صاحب، جناب علاّمہ محمد عباس صاحب کمیلی مدّظلہ، علاّمہ عباس حیدر عابدی صاحب، مولانا عبدالمہیمن صاحب، مولانا عرفان حیدر عابدی صاحب، علاّمہ عقیل ترابی صاحب،

حضرت مولانا مظہر الحق صاحب (فاضل دیوبند) اور خطیب ہند سرکار علاّ سیّد کلب صادق صاحب مدظلہ کا بصد ادب و احترام شکریہ ادا کرتا ہوں کہ موصوفین نے اپنی تقاریر میں اس کتاب کے مطالعہ کی سفارشات نشر فرمائیں اور حقیر کیلئے نیک جذبات کا اظہار فرمایا۔

مَیں مجلس ملّی جامعہ امامیہ ناظم آباد کراچی کا از حد شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ایک خصوصی اجلاس کا اہتمام کیا اور اس روح پرور جلسہ میں جناب ڈاکٹر سیّد ندیم الحسن نقوی صاحب نے ایک بصیرت افروز تقریر میں میرا تعارف کرایا۔ اراکین مجلس جناب سیّد محمود رضوی صاحب، پروفیسر عباس صاحب، پروفیسر ڈاکٹر سرور رضوی صاحب اور دیگر تمام احباب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی اور نظرِ عنایت سے اعانت فرمائی۔

جناب سید بشارت حسین صاحب کامل مرزاپوری، جناب سیّد حسین رضوی صاحب، ڈاکٹر سیّد منظور حسین صاحب شفا جعفری، جناب الطاف حسین صاحب ہمدانی اور جناب علی اکبر رضوی صاحب ملّت جعفریہ کے جانے پہچانے اور کہنہ مشق قلمکار ہیں، اور سیّد عبدالواحد صاحب رضوی، خطیب محمد علی حسینی صاحب، جناب تاثیر نقوی کی ذوات محتاج تعارف نہیں ہیں۔ میں ان تمام مکرّمین کا از حد شکر گذار ہوں، انھوں نے اپنے گرانقدر تاثرات سے احقر کو سرفراز فرمایا۔

سابق وزیر ٹرانسپورٹ حکومت سندھ جناب سیّد صغیر حسین جعفری کے ناطقہ تاثرات اور پرخلوص اظہار تحسین و ستائش بھی میرے لئے مفرح و مقوی ہیں میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نیز مَیں سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ مغربی پاکستان جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب کی خدمت میں عاجزانہ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے بڑے عادلانہ و منصفانہ طرز نگارش سے میری محنت کی قدردانی فرمائی اسی طرح ان تمام حضرات و خواتین کا بھی متشکر ہوں جنھوں نے تحریراً یا تقریراً

اپنی تحسینی نوازشات کی متاعِ عظیم عطا فرمائی۔

ناشرانِ طبع سوم بھی مستحق دعا و تشکر ہیں کہ انھوں نے ایک خصوصی روحانی اشارے کے تحت اس کتاب کی افادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تبلیغی جذبات کے تحت بلاخواہش نفع مادی ارزاں قیمت پر چھپوایا اور سعیٔ جمیلہ کے ثواب کو اپنے محترم والد مرحوم جناب سید ذوالفقار حسین رضوی کے لئے وقف فرمایا۔ ناظرین سے التماس ہے کہ مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کیلئے "سورۂ فاتحہ" کی تلاوت فرمائیں، شکریہ، والسلام،

(شکر گذار)
عبدالکریم مشتاق
۱۶ر جنوری ۱۹۷۸ء

۷۸۶

میں نے (صرف ایک راستہ) نامی کتاب مصنفہ عبدالکریم مشتاق میں قرآنی آیات کو حرفاً حرفاً بغور پڑھا ہیں تصدیق کرتا ہوں کہ ان آیات کے متن میں کوئی کمی بیشی اور کتابت میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ حافظ محمد یٰسین سند یافتہ

امام نایاب جامع مسجد
ڈاکخانہ 1 لیاقت آباد کراچی

دیباچہ طبع سوم

علم کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ جب شہرِ علمؑ کے دروازے پر گداگری کی نیت ہو جائے تو بخشش و عطا کرنے والا سخی ہاتھ ہر دوسرے در سے مستغنی کر دیتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں کیا ہوں۔ میں کچھ بھی تو نہیں مگر گدائے درِ بتولؑ ضرور ہوں۔

صاحبانِ علم و ہنر نے جو سرمایۂ علمی قوم کے لیے چھوڑا ہے میں نے اُسی کو جمع کر کے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں پیش کر دیا اور بین الاقوامی سطح پر یہ دعویٰ بلند کیا کہ کائنات کے جملہ مسائل روحانی و مادی کے حل کا واحد طریقہ "تمسک بالثقلین" ہے۔ ثقلین ہی کی برکت سے میری کاوش خراجِ تحسین کی مستحق قرار پائی اور ہر طبقہ کے دانشوروں نے تقریظی حوصلہ افزائی فرمائی جس کے لئے انتہائی ممنون ہوں۔

اس ایڈیشن میں مجموعی طور پر نہ ہی کوئی اضافہ کیا گیا ہے اور نہ ہی ترمیم، لیکن یہ طبع ایک خاص اہمیت کی حامل ہے کہ اسے انتہائی ارزاں قیمت پر ایک تبلیغی سعیٔ جمیلہ کے تحت ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ طابع نے محض حصولِ ثواب اور اخروی منفعت کی خاطر یہ کتاب بلا منافع (تجارتی) بلکہ لاگت سے بھی کم دام پر اس ایڈیشن کی نشر و اشاعت کی ہے۔ یہ جذبۂ خیر لائقِ تحسین و آفرین ہے۔ لہٰذا دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ثقلینِ رسولؐ کے طفیل طابعین کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور دینی و دنیوی مراعاتِ جمیلہ سے نوازے (آمین)

دُعا گو

عبد الکریم مشتاق

تقریظ سرکار علامہ نصیر الملۃ سید نصیر الاجتہادی صاحب

(اعلیٰ اللہ مقامہ)

بہ تبصرہ ہفت روزہ عظیم شمارہ ۱۵، ۱۶ ۱۶ر اپریل تا ۲۳ر اپریل ۱۹۷۶ء

جناب عبدالکریم مشتاق اپنی مقبول عام کتابوں کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس سے پہلے انکی تصانیف میں چودہ مسئلے، اصول دین، تصدیق لفظ شیعہ، نبی رحمۃ للعالمین بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ اب انکی ایک معرکۃ الآرا کتاب "صرف ایک راستہ" منظر عام پر آئی ہے جس کی تالیف، ترتیب اور تدوین میں انہوں نے بہت زیادہ محنت اور سلیقہ سے کام لیا ہے۔ قرآن پاک کے علاوہ فریقین کی تقریباً ایکسو اکاون کتابوں سے اس کتاب کی تالیف میں مدد لی ہے۔ اور تقریباً ۹۰ عنوانات قائم کئے ہیں۔ جو دین و دنیا کے تمام معاملات پر حاوی ہیں فاضل مؤلف نے انتہائی عرق ریزی اور تحقیق سے کام لیتے ہوئے علوم اہل بیت کی روشنی کو عام کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ انسانی زندگی جو اس مادی دور میں تاریکی میں ڈوب چکی ہے۔ اور بے راہ روی کا شکار ہو چکی ہے۔ مذہب سے بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔ سچے اور سیدھے راستے سے آشنا ہو کر فلاح دینی و دنیوی حاصل کر سکے۔ یہ ایک ایسی بنیادی اور اہم ضرورت ہے جو ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کی فطری طلب اور تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ انسان آج کسی ضابطہ کا پابند نہیں رہا۔ نہ دینی، نہ اخلاقی، نہ سماجی، نہ سیاسی اور نہ عائلی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قدم قدم پر دشواریاں اور پریشانیاں حائل ہوتی ہیں۔ اور انسان غیر انسانی حرکات کا

مرتکب ہونے لگتا ہے۔ اسلام ایک سچا اور حقیقت پسند دین ہے اور اسکی تعلیمات تمام عالم انسانیت کے لئے ہیں۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے کوشش کی ہے کہ انسان کو فلاح کا راستہ دکھایا جائے اور صحت مند معاشرے کے قیام کیلئے ایسی جد و جہد کی جائے جس میں دین کو بھی سربلندی حاصل ہو اور دنیاوی فوائد بھی نصیب ہوں۔ ہم بلاخوف و تردید کہہ سکتے ہیں کہ "صرف ایک راستہ" ایک سیدھا اور سچا راستہ ہے۔ اس کتاب کا پڑھنے والا اگر فائدہ اٹھانا چاہے تو پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے اور یہی اس کتاب کی تالیف کا مقصد ہے۔ یہ کتاب صوری حیثیت سے بھی نہایت خوبصورت اور دلنواز ہے۔ ہم اپنے قارئین سے اسکے مطالعہ کی پرزور الفاظ میں سفارش کرتے ہیں۔

تقریظ سرکار علامہ خطیب ہند سید کلب صادق صاحب قبلہ

نشری تقریر بمقام مرکزی امام بارگاہ لیاقت آباد کراچی (۱۰ محرم یوم عاشورہ)

• کراچی کے ایک مصنف عبد الکریم مشتاق صاحب جنھوں نے ابھی حال ہی میں مذہب حقہ اختیار کیا، دو تین روز قبل مجھے ملے، انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے "صرف ایک راستہ" میں نے اس سے کافی استفادہ حاصل کیا ہے۔ آپ بھی اسے ملاحظہ فرمائیے، بہت ہی اچھی کتاب ہے، "صرف ایک راستہ"!!

تقریظ عالی مرتبت جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب مدظلہ

سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ مغربی پاکستان

سابق گورنر صوبہ سندھ

۱۵ اپریل ۱۹۸۱ء

مکرمی و محترمی جناب عبدالکریم مشتاق صاحب

وعلیکم السلام۔ آپکی کتاب "صرف ایک راستہ" اور آپ کا عنایت نامہ موصول ہوئے کتاب بھیجنے اور خط تحریر کرنے کا شکریہ۔

آپنے فرمائش کی ہے کہ میں اپنے تاثرات بیان کروں۔ اس لئے میں شروع میں ہی یہ عرض کردوں کہ میں دین کو فرقوں میں بانٹنے کے خلاف ہوں، اختلاف رائے کو برا نہیں سمجھتا۔ نہ اس کی تبلیغ کو برا سمجھتا ہوں' آپ کی کتاب میں یہ باتیں نہیں ہیں۔ یہ اس کی خوبی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی تاثرات ہیں۔

سب سے پہلے یہ عرض کردوں کہ کتاب کی لکھائی' چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے۔ کتاب کو دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے جس محنت سے یہ کتاب لکھی ہے اور جو اس کا مضمون ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ذہن ایمانیت سے معمور ہے۔ اور منطقی الجھنوں سے بالاتر ہے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ یہ کتاب سیدھے سادے' سچے مومنوں کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے اسکا استدلال عقیدت مندانہ ہے ...... اس سلسلہ میں جو چوتھا تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی کتاب کا مرکزی نقطہ "حدیث ثقلین" اور "آیت تطہیر" ہے۔

آپ نے یہ کتاب لکھی ہی اس غرض سے ہے کہ خلقِ خدا اُن عقائد سے مستفید ہو جو آپ کے نزدیک حتمی طور پر سچے اور پاک ہیں۔ اگر یہ ایمان نہ ہوتا تو

آپ اتنی محنت اور کوشش سے یہ کتاب لکھتے۔ آپ کی نیک نیتی اپنے طرز میں قابلِ تحسین ہے۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے نزدیک اللہ کو پانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے جو کچھ آپ نے کہنا چاہا ہے اس کا بیان صاف اور سلجھا ہوا ہے۔

مخلص

قدیر الدین احمد

"تبصرہ"

ماہنامہ "خواجگان" لاہور
(شمارہ ماہ مارچ ۱۹۷۶ء)

محترم گرامی قدر جناب مولانا مولوی عبدالکریم مشتاق صاحب علمی اور تحقیقی جذبات اور دین حقہ کے ساتھ ان کی وابستگی محمدؐ و آلِ محمدؐ کیساتھ محبت کے لئے کسی تعریف کی محتاج نہیں ہے۔ مولانا صاحب کی طرف سے اس وقت تک متلاشیانِ حق کی تشنگی کو دور کرنے کے لئے جو خدمات سرانجام دی ہیں ان میں چودہ مسئلے، اصولِ دین، تصدیق لفظ شیعہ، وصی رحمت العالمین، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کے ذریعہ تعلیمات محمدؐ و آلِ محمدؐ کی روشنی میں دشمنانِ مذہب حقہ کے اعتراضات اور شکوک و شبہات کے عام فہم

زبان میں شافی جواب دے کر شہرت عام حاصل کر چکے ہیں۔

اب قبلہ مولانا نے "صرف ایک راستہ" کتاب کے ذریعہ دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کو خصوصی اور ساری دنیا میں بسنے والے انسانوں کو عمومی طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ پاک تک پہونچنے کے لئے مکمل دین صرف اسلام ہی ہے اور صحیح اسلام کو سمجھنے کے لئے کتاب اللہ جامع اور مکمل کتاب ہے جس میں ہر خشک و تر کا بیان موجود ہے۔ اس کتاب اللہ کو سمجھنے کے لئے وارثانِ علم الانبیاء و مرسلین محمد و آلِ محمد کے ساتھ تمسک ضروری ہے، جنھوں نے زمین و آسمان، موت و حیات، جنت و دوزخ، جن و انس اور

اسرار و رموز حق کو اپنی زبانِ مبارک سے دنیا پر روشن کیا جو اللہ پاک کی ہر قسم کی مخلوقات کے لئے رہبر بن کر آئے ہیں۔ وہی صحیح رہنما ہیں۔ اور انہی کا بتایا ہوا راستہ برحق ہے۔ اس مادی دنیا میں واقع ہونے والی دنیاوی الجھنوں، مصیبتوں روحانی اور دنیاوی بیماریوں کا اگر واقعی علاج مقصود ہے۔ تو دنیا کو محمد و آلِ محمد کا دامن تھامنا ہی پڑے گا۔ ان کے بغیر نہ شفا ملے گی نہ نجات،

قبلہ مولانا صاحب نے اپنے مقصد کو بڑے اچھے طریقے سے علیحدہ علیحدہ ابواب اور فصلیں قائم کر کے کتاب کو بڑے سلیس اردو زبان میں تحریر کئے ہیں جس کی وجہ سے یہ کتاب عام پڑھے لکھے افراد کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ اس کتاب کا ہر مسلمان کے گھر میں ہونا ضروری ہے۔

تقریظ حضرت مولانا سید عبدالواحد رضوی صاحب (ایم اے) مرحوم

آج سے چند برس پہلے ایک کتاب "چودہ مسئلے" نامی مصنفہ ذات گرامی جناب عبدالکریم مشتاق ادیب فاضل، نظر نواز ہوئی جس سے اُس وقت مصنف موصوف کے معیار تحقیق کی اُٹھان یہ پتہ دیتی تھی کہ اگر اُنکے مطالعے کی رفتار اسی نہج پر گامزن رہی تو اُمید واثق ہے کہ بہت جلد وہ اپنے مطالعہ کا نچوڑ ایک اَمر شاہکار کی صورت میں قوم کے سامنے پیش کرسکینگے، الحمدللہ کہ آج انہوں نے ہماری توقعات سے بڑھ کر ایک ایسی جامع اور مفید تر کتاب بنام "صرف ایک راستہ" قوم کو عطا کی جو اُن کی وسعت مطالعہ کا مُنہ بولتا ثبوت ہے جس کاوش اور دماغ سوزی سے انھوں نے مختلف موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے اُسے دیکھ کر بیساختہ کہنا پڑتا ہے کہ ع

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

اس عاجز کی آخری ناچیز رائے یہ ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ہر مومن کے لئے خصوصاً ہر مسلمان کے لئے عموماً رفاہِ دُنیوی اور نجاتِ اُخروی کا باعث ہوگا۔

مزید براں ناشران حضرات نے اس کتاب کی عمدہ کتابت اعلیٰ کاغذ پر طباعت دیدہ زیب سرورق کا ناطق ڈیزائن پیش کرنے میں جو سعیٔ بلیغ فرمائی ہے اس کیلئے مستحق صد مبارکباد ہیں۔

احقر الانام بندہ سید عبدالواحد رضوی (ایم اے)
(سادات منزل بلاک ۱۵ ڈیرہ غازی خاں)

تقریظ عالی مرتبت جناب ابو العباس الخطیب سید محمد علی الحسینی مدظلہ (گلگت)

اس وقت میں آپ کو دل وجان سے مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے "صرف ایک راستہ" جیسی کتاب کی اشاعت کی" دریا بہ حباب اندر" یا میرا نظریۂ تخیل "کریم اندر حباب آیا" (جس پر ایک پورا کلام لکھ چکا ہوں) کی صحیح مصداق ہے۔ عبدالکریم اسم با مسمّٰی بہ واقع ہوا۔ الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ اپنی توفیق عبدالکریم مشتاق کا رفیق قرار دے اور بارگہہ مرکزِ انوارِ احدیت، منبعِ ینابیع حکمتِ صمدیت، مخزنِ اسرارِ غیب ہویت، مہبطِ تنزیل وتاویل وتکوین وشریعت، شیر خوردگانِ بتولِ عذرا، انسیہ حوراء فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا حور ہر عصمت یعنی آئمۂ حق وصداقت وہدایت سے، علامت قبولیت و پسندیدگی کی نشانی کے طور پر ایسی ہی کتب لکھنے اور ایسی علوم کی کتابت اور نشر واشاعت میں مدد نصیب ہو۔ مرحبا صد مرحبا۔

تقریظ عالیجناب مولانا فیروز الدین صاحب حنفی الرضوی لاہور

کتاب مستطاب "صرف ایک راستہ" کے مطالعہ کا شرف نصیب ہوا۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی فرمودہ مسلمہ حدیث ثقلین کو دور جدید کے تقاضوں کے مطابق پیش کر کے مسلم امہ پر بہت بڑا احسان کیا گیا ہے۔ بے شک پیغمبرؐ نے امت کو ثقلین ہی کے سپرد فرمایا تاکہ وہ ہر قسم کی گمراہی سے محفوظ رہے۔ مصنف مولوی عبدالکریم مشتاق صاحب کی یہ کوشش انتہائی کامیاب ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے کسی دوسرے مکتب کی دل آزاری نہیں ہوتی۔ انداز بیان بڑا شائستہ اور مطالب مفید ترین ہیں۔ طباعت و اشاعت بھی بہت عمدہ ہے۔ آج کے سائنسی دور میں اس قسم کی کتابوں کی شدید ضرورت ہے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس کے فیوض حاصل کرنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین

دیباچہ طبع ہفتم

مولف کتاب احقر العباد بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہے اور محمد وآل محمد علیہم السلام کی ذوات مقدسہ کا تہ دل سے ممنون ہے کہ انہوں نے اپنی نظر کرم سے ناچیز کی یہ محنت جو دراصل ان کی عطا کردہ توفیق ہی کی بدولت تھی کو قبول و مقبول فرمایا۔ اور اب ماشاء اللہ اس کا ساتواں ایڈیشن ہدیہ قارئین کیا جارہا ہے۔

کچھ برس قبل اس کا تیسرا ایڈیشن رعایتی نرخ پر شائع کیا گیا تھا موجودہ گرانی کے پیش نظر احباب کی فرمائش تھی کہ اس مفید کتاب کو پھر مناسب قیمت پر طبع کیا جائے چنانچہ یہ باکفایت ساتواں ایڈیشن اسی حکم کی تعمیل میں پیش خدمت کیا جارہا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ قاری پر کم سے کم مالی بوجھ ڈالا جائے اور کتاب کے معیار پر بھی آنچ نہ آنے دی جائے۔ البتہ اس کے حسن و قبیح کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ التماس ہے کہ اپنی گرانقدر رائے اور قیمتی مشوروں سے ہماری رہنمائی جاری رکھیں۔ شکریہ

والسلام

نیازمند

مصنف ناچیز

۱۹۔ اپریل ۱۹۹۴ء

دخل در معقولات

قرآن مجید میں کئی جگہ پر ارشادِ خداوندی ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا اور خود انسان کا اور ان تمام چیزوں کا خالق ہے جن سے انسان اس دنیا میں مستفید ہوتا ہے چنانچہ تخلیقِ کائنات پر سوچتے ہوئے کسی بھی نظام پر نظرِ مطالعہ ڈالی جائے تو کئی اسرار ایسے بھی نظر آتے ہیں۔ جو آج کے ترقی یافتہ سائنسی دور میں ہنوز وضاحت طلب ہیں۔ عقلِ انسانی ابھی تک مفروضوں کا سہارا لئے ہوئے ہے۔ حقیقت کیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا سورج۔ چاند۔ ستارے وغیرہ کیا ہیں۔ ادراکِ انسانی سمجھنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ خالق سے پوچھنا پڑتا ہے کہ کائنات کیا ہے؟ تو ارشادِ خداوندی ہوتا ہے کہ قرآن میں موجود ہے سب کچھ۔ ہر علم ہے اس کتاب میں۔ خود انسان کی تخلیق کے متعلق ارشاد ہوا۔

" کیا تم نے غور کیا، یہ نطفہ جو تم ٹپکاتے ہو اس سے بچہ تم پیدا کرتے ہو یا اس کے خالق ہم ہیں؟ (الواقعہ) آج کی سائنس بچے کی پیدائش کے جو مدارج بتاتی ہے وہی آج سے چودہ سو سال پہلے تعلیم ہوئے۔ یعنی مٹی، نطفہ، مضغہ، علقہ، عظام، لحم اور پھر خلقتِ آخر۔ ہادیانِ برحق نے جو تشریح جسمِ انسانی فرمائی ہے آج تک مسلّم ہے۔ ایک معمولی جرثومے سے تخلیقِ انسانی خالق کی صناعی کی عظمت بیان کرتی ہے۔

اسی خالقِ کائنات نے اس زمین کے انسانوں کے لئے اپنے ارشادات نازل فرمائے۔ علوم کا ایک ذخیرہ قرآن کریم میں موجود ہے۔ کوئی بھی ایسا علم نہیں جو قرآن میں موجود نہ ہو اور تخلیق انسان کے لئے ہے۔ ذرّہ سے لے کر آفتاب تک ہر نہاں وعیاں انسان کے تصرّف کے لئے ہے۔ اور ان موجودات کے سمجھنے کے لئے رہبری قرآن میں ہے۔ اب یہ عقلِ انسانی ہے کہ وہ اسے کہاں تک حاصل کرے۔ تاہم اس خالق نے کوئی کام نامکمل نہیں کیا۔ جو کچھ بھی تخلیق کیا اس کا علم

انسان تک ہادی برحقؑ کے ذریعے قرآن میں تعلیم فرمادیا۔ امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے کہ "کیا تجھے یہ خیال ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جرم ہے۔ حالانکہ تیرے اندر ایک بڑا عالم سمایا ہے" اب اگر انسان اپنے آپ کو محدود کرے تو یہ اس کی بدقسمتی ہے ورنہ اسلام کی تعلیمات اسے کیا نہیں بنا سکتیں۔ اور مسلمان کے لئے تو خصوصی طور پر یہ مقام عبرت ہے کہ اس نے علم قرآن سے استفادہ نہیں کیا۔ ہر مسلمان اس بات کو تو مانتا ہے کہ قرآن میں سب کچھ ہے۔ لیکن تلاش نہیں کرتا جبکہ رسول صلعم نے کھلے لفظوں میں واضح کر دیا کہ "قرآن اور میرے اہل بیتؑ ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے" تو آئیے اہل بیت سے پوچھیں کہ قرآن میں کیا ہے؟ اہل بیتؑ ہر اس نکتے کی وضاحت کرتے ہیں جہاں عقل انسانی خاموش ہو جاتی ہے۔ انسان کی حد تو یہ ہے کہ ابھی تک نظام شمسی کو نہیں سمجھ سکا صرف اتنا فرض کیا ہے کہ ہر ستارے کی گردش کا انحصار سورج پر ہے سورج کی گردش اگر متاثر ہو تو پورا نظام درہم برہم ہو جائے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ سورج پلٹتا ہے تو کچھ نہیں ہوتا۔ چاند کے ٹکڑے ہوتے ہیں تو نظام شمسی متاثر نہیں ہوتا۔ ماننا پڑے گا کہ ان ہستیوں کا ان پر تصرف ہے اور یہ گردش ان کے زیر حکم ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ ان کے بارے میں نہ بتا سکیں۔

یہ اہل بیتؑ ہی ہیں جو چودہ سو سال پیشتر بغیر کسی موجودہ سائنسی آلے کے سورج کا محیط، فاصلہ اور بناوٹ بتاتے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے کی تعلیم تو ایک ظاہری بات ہے۔ یہ ہستیاں تو ازل سے راہ ہدایت بتا رہی ہیں۔ اس کتاب میں شامل "حشیشۃ البتول" کا تذکرہ مثال کے لئے کافی ہے۔ یہ مادی دور تحقیق کی راہیں تلاش کر رہا ہے جبکہ ہادیان برحق نے ہر راہ متعین فرمادی ہے۔ اگر یہ تحقیق ان راہوں پر کی جائے تو وہ نتائج برآمد ہوں گے جن کی تلاش میں ہر ذی علم سرگرداں ہے۔ اہل بیتؑ ان کی رہنمائی ہر علم میں کرتے ہیں۔

اہل علم نے اپنی حد تک کوششیں کی ہیں۔ لیکن ان علوم سے کما حقہٗ واقفیت

حاصل کرنے کے لئے صحیح راہ صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ وارثانِ علمِ قرآن سے رجوع۔ اس سلسلے میں ارشادِ رسول صلعم رہنمائی کرتا ہے جو اس کتاب کا موضوع ہے۔ لائقِ صد احترام جناب عبدالکریم مشتاق کا احسانِ عظیم ہے کہ انہوں نے بندۂ ناچیز کو اس کارِ خیر میں شامل فرمایا۔

عنوان "صرف ایک راستہ" کے تحت ہم نے ارشادِ نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے اہلِ بیتؑ کے ارشادات مختلف علوم میں جمع کئے ہیں۔ اس کتاب کی وسعت اس قدر نہیں کہ تمام فرمودات سما سکیں اور نہ ہی یہ ہمارے بس میں تھا کہ تمام فرمودات جمع کر سکیں تاہم اس قدر مواد شامل کیا گیا ہے جس سے قاری پوری طرح مستفید ہو سکے۔

احقر

محمد یحییٰ خالد

تقریظ سرکار علامہ تاج العلماء حضرت سید محمد نقی صاحب

قبلہ مدظلہ العالی مجتہد العصر

"صرف ایک راستہ" اور "چودہ مسئلے" ماشاءاللہ دونوں تصنیفیں افادیت نظر سے خوب ہیں۔ بہت سی مفید معلومات کا ذخیرہ ہیں۔

مصنف کی صلاحیتوں اور سلیقۂ عمل کا منہ بولتا ثبوت ہیں طرز تحریر مخصوص مخاطبین کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے نہایت موزوں اور مناسب ہے۔

وہ تصنیف لائق قدر و تحسین ہے جو اپنی غرض تالیف کو اپنے میں بدرجہ اتم سموئے۔ حصول غایت میں امتیاز رکھتی ہو۔

یہ خوبیاں "۱۴ مسئلے" اور "صرف ایک راستہ" میں اچھی طرح موجود ہیں جن اہل انصاف نے ان کا مطالعہ کیا امید ہے ان کی رائے بھی یہی ہوگی۔ جن محترمین نے ابھی تک نہیں پڑھا ہے وہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور پڑھیں گمان غالب تو یہی ہے کہ وہ بھی اپنا یہی پاکیزہ خیال ظاہر فرمائیں گے۔ یہ کتابیں گھر کی لائبریری میں ضرور ہونا چاہئیں یعنی نفع ہی نفع ہے۔ ضرورت کے وقت بہت کار آمد ہیں۔

دعا ہے خداوند عالم مشتاق صاحب سلمہٗ کے زور قلم اور ذوق تحریر و تحقیق میں اضافہ فرمائے۔ آپ کی پاکیزہ خدمات سے اہل شوق کو بہرہ اندوز رکھے۔

الفقیر الی رحمۃ ربہ القوی الغنی

(محمد نقی)

مہر شریف و دستخط

تقریظ سرکار علامہ حجۃ الاسلام طالب جوہری صاحب مدظلہ

فاضل مصنف جناب عبدالکریم مشتاق صاحب ان اصحابِ قلم میں ہیں۔ جن کے متعلق یہ احساس ہوتا ہے کہ انہیں حضرت صاحب الامر علیہ السلام کی خصوصی توجہ حاصل ہے۔ ان کے موضوعاتِ نگارش کی ندرت اور تحقیق مسائل کے تجزیہ کا اندازہ اپنا ذاتی ہے کسی سے مستعار نہیں ہے اور وہ میدان جو انہوں نے اپنے قلم کے لئے منتخب کیا ہے وہ ہر دور میں طلب گار مرد رہا ہے۔ بلاشبہ عبدالکریم مشتاق اس میدان کے مرد ہیں۔

زیر نظر "صرف ایک راستہ" پوری محنت اور کاوش سے تحریر کی گئی ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تک پہونچنے کا راستہ صرف ایک ہے اور اس راستے کی طرف ہدایت اللہ کا عمل ہے جو اس نے انبیاء و مرسلین کے ذریعہ انجام دیا۔

آج کے عہد میں ـــ وہ عہد جو ادیان و مذاہب کا جنگل ہے۔ اس صحیح راستے کی نشان دہی سب سے بڑا امر بالمعروف ہے اور اسے فاضل مصنف نے بطریق احسن انجام دیا ہے۔ یہ کتاب ہر مکتبِ خیال کے لوگوں کے لئے دعوتِ فکر اور صحیح متجسس انسانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ خدا مصنف کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

طالب جوہری
۲۵ صفر ۱۳۹۸ھ

الف ۵۳/۱ بلاک الف
شمالی ناظم آباد کراچی

درخواست سورۂ فاتحہ
برائے سید جبار حسین و کنیز حسنا
بزاز
9/6/2003